سلسلۂ مطبوعاتِ ادارۂ ادبیاتِ اردو شمارہ ۲۹۶

تاریخِ گولکنڈہ

(از)

عبدالمجید صدیقی

ایم اے۔ ال ال بی۔ سابق پروفیسر جامعہ عثمانیہ

۱۹۶۴ء

اعجاز پرنٹنگ پریس حیدرآباد دکن

طبع دوم

قیمت سات روپے

فہرست مضامین

صفحہ

۱- دیباچہ ۵
۲- دیباچہ طبع ثانی ۷
۳- مقدمہ ۹

حصۂ اول
سلطنت کی تاسیس

پہلا باب - قطب شاہی گھرانا ۱۷
دوسرا باب - سلطنت کا آغاز ۳۰
تیسرا باب - عہدِ انتشار ۴۴

حصۂ دوم
سلطنت کا استحکام

چوتھا باب - ابراہیم قطب شاہ تخت نشینی سے پہلے ۶۱
پانچواں باب - ابراہیم قطب شاہ کی تخت نشینی ۷۳
چھٹا باب - سلاطینِ دکن کی باہمی کشمکش ۸۲
ساتواں باب - جنگ تالیکوٹ ۹۳
آٹھواں باب - سلطنت کی تعمیر ۱۰۱

حصۂ سوم
سلطنت کا عروج

نواں باب - دورِ جدید ۱۰۹
دسواں باب - دکن کا سیاسی توازن ۱۲۶
گیارھواں باب - دکن پر مغلوں کے حملے ۱۳۹
بارھواں باب - سلطنت کی توسیع و ترقی ۱۴۹
تیرھواں باب - عہدِ ارتقاء ۱۵۸

حصۂ چہارم
سلطنت کا زوال

صفحہ
چودھواں باب - حکومت کی کمزوری ۱۶۹
پندرھواں باب - احمد نگر کا خاتمہ اور گولکنڈے کی حکم برداری ۱۷۹
سولھواں باب - کرناٹک کی فتوحات اور ان کا بندوبست ۱۹۶
سترھواں باب - مغل سلطنت سے پرخاش ۲۱۲
اٹھارھواں باب - ابوالحسن قطب شاہ کی تخت نشینی ۲۳۳
انیسواں باب - مادنا کی وزارت ۲۵۱
بیسواں باب - جنگ ملکھیڑ ۲۷۴
اکیسواں باب - گولکنڈے کا محاصرہ اور اس کا خاتمہ ۲۹۴

حصۂ پنجم
گولکنڈے کا تمدن

بائیسواں باب - سیاست و معاشرت ۳۳۳
تئیسواں باب - معاشی حالت ۳۶۴
چوبیسواں باب - علمی سرپرستی ۳۸۱
پچیسواں باب - شہر و عمارات ۴۰۷
ضمیمہ - شاہجہاں اور سلطان عبداللہ قطب شاہ کے مابین مراسلت ۴۲۷

اشاریہ - مرتبہ وقار خلیل - ۴۳۶

فہرست تصاویر

	صفحہ
۱۔ سلطان قلی قطب شاہ	۱۶
۲۔ سلطان جمشید قلی قطب شاہ	۱۶
۳۔ سلطان ابراہیم قلی قطب شاہ	۱۷
۴۔ سلطان محمد قلی قطب شاہ	۱۷
۵۔ سلطان محمد قطب شاہ	۱۶۸
۶۔ سلطان عبداللہ قطب شاہ	۱۶۸
۷۔ سلطان ابوالحسن تاناشاہ	۱۶۹
۸۔ حضرت شاہ راجو	۱۶۹
۹۔ خیرات خاں	۲۳۲
۱۰۔ موسیٰ خاں	۲۳۲
۱۱۔ شیخ محمد ابن خاتون	۲۳۳
۱۲۔ نیک نام خاں	۲۳۳
۱۳۔ میر محمد مومن	۲۳۲
۱۴۔ محمد امین میر جملہ	۲۳۲
۱۵۔ مادنا دیوان ابوالحسن تاناشاہ	۲۳۳
۱۶۔ اکنا پیشکارہ	۲۳۳

دیباچہ

میں ایک زمانے سے گولکنڈے کی مبسوط تاریخ لکھنا چاہتا تھا! اس خطۂ زمین میں میری پشتیں گذری ہیں اور میں اس تاریخ نگاری کو اپنا فرض سمجھتا ہوں۔ گولکنڈے کی تاریخ کے بغیر دکنی تمدن وسیاست کا پورا نقشہ آنکھوں کے سامنے نہیں آسکتا۔ اس موضوع پر اب تک قلم نہیں اٹھایا گیا۔ اپنی دوسری مصروفیتوں کی وجہ سے میں نے بھی اس میں بہت تاخیر کی۔ تاہم میں اس موضوع کا برابر مطالعہ کرتا رہا، اور بدفعات مضامین بھی لکھے تھے جو تقریباً ہر دور اور عہد پر حاوی تھے، اور خیال تھا کہ انھیں مضامین کو جوڑ کر ایک کتاب کی شکل میں پیش کردوں لیکن جب میں ان مضامین کو جمع کرنے بیٹھا تو معلوم ہوا کہ یہ کافی نہیں ہیں، بلکہ اس میں ابھی بہت کچھ کام کرنا ہے۔ کیوں کہ اس موضوع کے مطالعے میں جن ماخذوں سے سابقہ پڑتا ہے وہ کئی طرح کے ہیں۔ کچھ تو مقامی ماخذ ہیں اور کچھ بیرونی مورخوں اور سیّاحوں کے بیانات ہیں۔ بعض مورخوں اور سیّاحوں نے جنھیں قطب شاہی تاریخ کی پوری واقفیت نہیں تھی بہت غلط بیانی سے کام لیا ہے، اور بعض مورخوں نے دانستہ اشتہار بازی کی ہے۔ اس طریقے سے قطب شاہی سلطنت کے نصب العین سے متعلق صحیح رائے قائم کرنا مشکل ہو جاتا ہے! اس میں بڑی چھان بین کی ضرورت ہے جو آسان نہیں ہے۔ مجھے اعتراف ہے کہ باوجود اس محنت کے میں اس مضمون کا حق ادا نہیں کرسکا۔ ابھی اس کے بعض ماخذ ایسے ہیں جو میری دسترس سے باہر ہیں، اگر ان کا مطالعہ ہو تو اس تاریخ میں بیش بہا اضافہ ہو سکتا ہے۔

لیکن جو کچھ رطب ویابس ناظرین کے سامنے پیش ہے وہ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور کا

رہین منت ہے۔ ڈاکٹر صاحب موصوف جن کی بدولت آج حیدرآباد میں علمی کام کرنے والوں کی بڑی حوصلہ افزائی ہو رہی ہے، اس تالیف کے اصل محرک ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ موصوف کے شدید تقاضے اور اصرار سے یہ کتاب تیار ہوئی ورنہ اس میں بہت تاخیر ہوتی۔ اس کے علاوہ ہمارے ادبی کرم فرما پروفیسر عبد القادر صاحب سروری کی حوصلہ افزائی اور ادبی مشوروں کا میں بہت شکر گذار ہوں، موصوف نے ہر آڑے وقت میری حوصلہ افزائی کی۔ نیز مجھے بھوپال راؤ صاحب ام۔ اے کا شکریہ ادا کرنا ہے جن کی وجہ سے مجھے کرناٹک اور مادنا کے خاندان سے متعلق معلومات دستیاب ہوئیں۔ یہ معلومات مدراس کے مشرقی کتب خانے اور تلنگی ماخذوں سے حاصل ہوئی ہیں۔ آخر میں عبد الحفیظ صاحب صدیقی بی اس سی (عثمانیہ) کا بھی شکریہ ضروری ہے جنھوں نے مسودوں کی ترتیب، کاپیوں اور پروف کی اصلاح میں پوری مدد دی۔ مولوی عبد الحق صاحب کامل نے میرے دوسرے فرایض اپنے ذمے لے کر میرا کام بہت ہلکا کر دیا، ورنہ یہ کام جلد نہ ہو سکتا۔ مجھے افسوس ہے کہ لکھائی اور چھپائی کا تجربہ نہ ہونے کی وجہ سے کتابت کی غلطیاں رہ گئیں جو بعض جگہ بدنما معلوم ہوتی ہیں، لیکن کتاب کے آخر میں ایک صحت نامہ منسلک کر دیا گیا ہے جس سے اس خرابی کی تلافی ہو جاتی ہے۔

صدیقی

صدیق ولا، حیدرآباد دکن
جمادی الاول سنہ ۱۳۵۸ھ
جون سنہ ۱۹۳۹ء

دیباچہ طبع ثانی

۱۹۳۹ء میں یہ تاریخ پہلی مرتبہ ہدیۂ ناظرین کی گئی تھی اور افضالِ الٰہی سے بہت مقبول ہوئی۔ اہلِ ذوق نے اس کو بہت شوق سے پڑھا جس کو میں اپنی محنت کا صلہ سمجھتا ہوں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بہت دنوں سے اس کی مانگ تھی اور تاریخ داں طبقے میں اس کی ضرورت محسوس کی جارہی تھی۔ ۱۹۵۶ء میں اسی تاریخ کو انگریزی جامے میں پیش کیا گیا، کیوں کہ انگریزی داں طبقہ اور خصوصاً آندھرا پردیش کے باسی جو اُردو زبان سے نابلد ہیں اُردو تاریخ سے استفادہ نہیں کرسکے، اور جن لوگوں کو اس کے استفادے کی شدید ضرورت تھی انھوں نے اُردو دانوں کی مدد سے اس کو پڑھا اور اپنی ضرورت پوری کی۔ لیکن اب انگریزی اشاعت سے یہ کمی پوری ہوگئی ہے۔ اب رہی اُردو تاریخ، تو، اس کی طبع ثانی کئی سال سے معرضِ بحث میں تھی، اس کے تمام نسخے ختم ہوچکے تھے۔ اہلِ ذوق کی طرف سے کئی سال سے جدید اشاعت کا تقاضا ہورہا تھا، اس لئے ادارۂ ادبیاتِ اُردو کی مجلسِ انتظامی نے اس کی طبع ثانی پر بہت زور دیا، چنانچہ اب یہ جدید اشاعت گہری نظرِ ثانی اور کثیر اضافوں کے ساتھ منظرِ عام پر آرہی ہے۔ پہلی اشاعت میں بہتیری خامیاں رہ گئی تھیں، کچھ تو کتابت کی غلطیاں تھیں جو بدنما معلوم ہوتی تھیں، اس کے علاوہ تاریخ کے بعض ضروری گوشے بھی چھوٹ گئے تھے۔ بعض مغل تاریخوں اور تلنگی ماخذوں سے پورا استفادہ نہیں ہوا تھا۔ قدیم تلنگی مطبوعات میں گولکنڈے کا بہت کچھ مواد ملتا ہے۔

یوں بھی نقشِ ثانی کو نقشِ اول سے بہتر ہونا چاہیئے۔ جوں جوں زمانہ آگے بڑھتا ہے نئے پردے کھلتے ہیں اور معلومات میں اضافہ ہوتا ہے۔ پہلی اشاعت کے بعد آج چوبیس سال کی ایک بڑی مدت گذر چکی، اس دوران میں معلومات کا جو ذخیرہ جمع ہوا ہے اس کو کیسے نظرانداز کیا جاسکتا ہے اس کو نئی اشاعت میں سمونا ضروری ہے۔

آخر میں دو لفظ ڈاکٹر زور مرحوم کی جناب میں لکھنا ضروری ہے۔ تاریخ گولکنڈہ کی تدوین مرحوم کی ترغیب و تحریص کا نتیجہ تھا، مرحوم نے بار بار مجھے توجہ دلائی اور لکھنے پر آمادہ کیا تھا۔ اس نقشِ ثانی کو بھی میں مرحوم کے روحانی فیض کا اثر سمجھتا ہوں۔ خدائے تعالیٰ اُن پر اپنی رحمتیں نازل فرمائے۔ آخر میں مولوی عبدالحق صاحب کامل اور محمد اکبرالدین صاحب صدیقی کا شکریہ ادا کرنا ضروری ہے، ان صاحبان نے میری عدم موجودگی میں آخری ابواب کی تصحیح فرمائی۔

صدیقی

ہمایوں نگر، حیدرآباد دکن

اگست سنہ ۱۹۶۴ء

مُقدّمہ

گولکنڈہ کی تقریباً دو سو سال کی تاریخ ہے، دکن کی اور ہمسر سلطنتوں کے ساتھ پندرھویں صدی کے آخری عشرہ میں اس کی داغ بیل پڑی تھی اور سترھویں صدی کے اواخر میں اس کا خاتمہ ہوا۔ چونکہ یہ ہندوستان کے جنوبی اور مشرقی گوشہ میں واقع تھی اس لئے اپنے موقع و محل کے اعتبار سے یہ ہندوستان کے بڑے سیاسی اور تمدنی مرکزوں سے بہت دور تھی۔ اس کا بہت سوں کو علم نہیں تھا، اور اب بھی ہندوستان کی تاریخ لکھنے والے بادلِ ناخواستہ اس کا ذکر کرتے ہیں اور اس کو بہ مشکل تاریخ ہند کے ایک گوشہ میں جگہ ملتی ہے۔ لیکن گہری نظر سے دیکھا جائے تو سلطنتِ گولکنڈہ آندھرا دیش کی بہت بڑی سلطنت تھی۔ اس کی ایک وسیع تاریخ ہے جس کے مد و جزر میں تمدن کی بڑی حقیقتیں پوشیدہ ہیں۔ یہ وہ سلطنت تھی جس کا خوشگوار تمدن دو سو سال تک تلنگانہ کے رہنے والوں کو گرویدہ کئے ہوئے تھا۔ اگرچہ بعض ممالک میں یہ "ہیروں کی سلطنت" مشہور تھی، اور وسط ایشیا کے تاجر صرف ہیروں کی وجہ سے اس کو جانتے تھے، لیکن مغربی سیّاحوں کو اس کا درخشاں تمدن کھینچ لاتا تھا۔ جو سیّاح شمالی ہندوستان کی سیر کرنے آتے تھے وہ گولکنڈہ دیکھنے کے لئے ضرور آتے تھے اور اپنے ساتھ نئے تاثرات لے جاتے تھے۔ فرانسیسی انشاپرداز لوتی نے گولکنڈہ کا نظر افروز مرقع کھینچ کر لکھا تھا:— "یہ ہے وہ گولکنڈہ جو دو تین صدیوں تک ہندوستان کا عجوبہ بنا ہوا تھا۔"

جس علاقہ میں گولکنڈہ کی سلطنت قائم ہوئی تھی وہ دکن کا مشرقی خطہ ہے جس کو آج

"آندھرا پردیش" اور قرونِ وسطیٰ میں تلنگانہ کہتے تھے۔ یہ تیرھویں صدی کا زمانہ تھا جبکہ تقریباً اس خطہ پر کاکتیا راجگان کی عملداری قائم تھی۔ یہ خطہ شمال میں سکاکول سے شروع ہوتا ہے اور جنوب میں چتوڑ پر ختم ہوتا ہے۔ اس کے مغرب میں اور شمال مغرب میں کوہیر اور کولاس واقع ہیں تو مشرق میں ساحلِ مسولی پٹم اور موٹ پلی وغیرہ ہیں۔ اس ملک کو تقریباً بیچ میں مشرقی گھاٹ کے پہاڑی سلسلے جُدا کرتے ہیں۔ آب و ہوا اور زمین کی زرخیزی کے لحاظ سے ان دونوں خطوں میں بہت فرق ہے۔ شمالِ ہند کے مقابلے یہاں سخت سردی اور گرمی نہیں پڑتی اور بارش کافی ہوتی ہے۔ اس میں گوداوری کرشنا، تنگبھدرا اور پنار جیسی بڑی ندیاں بہتی ہیں اور اس خطہ کو زرخیز بناتی ہیں۔ انھیں ندیوں کی بہ دولت اس خطۂ ملک میں دو فصلہ زراعت ہوتی ہے۔ چنانچہ اس زرخیزی کو دیکھ کر باہر کے حملہ آور یہاں بار بار گھس آئے اور بہت مالدار ہو گئے یہاں تلنگی زبان بولی جاتی اور تلنگی تمدن پھیلا ہوا ہے۔ تلنگی قدیم قوم ہے، چنانچہ تلنگی زبان اور تلنگی باشندوں کا قدیم زمانہ سے سُراغ ملتا ہے۔ ایتارا برہمنا میں ان کا ذکر موجود ہے جو حضرت مسیح سے آٹھ سو سال پہلے لکھی گئی تھی۔ یونانی سفیر میگس تھنیز نے اہلِ تلنگانہ کو ایک طاقتور قوم بتایا تھا جس کے قبضۂ اقتدار میں بے شمار قصبات، دیہات، قلعے اور فوج تھی۔ اس خطہ کے قدیم حکمرانوں میں ستواہن راجگان کا حال ملتا ہے جو دکن کے اور خطوں کے ساتھ چار سو سال تک یہاں راج کرتے رہے اور جب ان کو زوال ہوا تو دکن کے حصّے بخرے ہو گئے۔ کدمبا اور رگنگا جیسے چھوٹے خاندانوں کی راجدھانیاں قائم ہو گئیں۔ لیکن چھٹی صدی عیسوی کے وسط میں چالوکیہ خاندان کے فروغ پانے سے پھر دکن میں یک جہتی پیدا ہو گئی۔ چالوکیہ راج تو پورے دکن پر حاوی تھا لیکن پلکیسن ثانی کے عہد میں آندھرا خطہ کو ایک انفرادیت حاصل ہو گئی اور وہ اس طرح ہوئی کہ اس کا بھائی کبجا وشنو وردہن مشرقی دکن یعنے آندھرا کا گورنر ہو گیا تھا اور چند روز کے بعد یہ اور اس کے جانشین خود مختار ہو گئے۔ اس طریقہ سے تلنگانہ کی اکائی الگ ہو گئی اور اس کی بہ دولت تلنگی زبان اور تمدن کو

بہت فروغ ہوا۔ جب بارھویں صدی میں چالوکیہ خاندان کو زوال ہوا تو پھر دکن کے ٹکڑے ہوگئے۔ مہاراشٹرا میں یادو خاندان، کرناٹک میں بلال اور تلنگانہ میں کاکتیا کی عملداری قائم ہوگئی، چنانچہ بارھویں اور تیرھویں صدی تلنگانہ کی غیر معمولی ترقی کا زمانہ ہے۔ کاکتیا خاندان کی سرپرستی میں تلنگانہ کی زبان اور تمدن کو بہت فروغ ہوا، لیکن چودھویں صدی کے اوائل میں دکن کی سیاسی بساط پھر اُلٹ گئی، کیونکہ خلجی اور تغلق حملہ آوروں نے یہاں تُرکی عملداری قائم کردی اور اس ملک کے نظم ونسق کے لئے جو ترک یہاں آباد کئے گئے تھے وہ پچاس سال کے اندر دہلی کے اقتدار سے علحدہ ہوگئے اور ۱۳۴۵ء میں دکن کی خودمختار سلطنت قائم کرلی جو تمام دکن پر پھیل گئی اور صرف دو سال کے بعد اس نئی سلطنت نے علاؤالدین بہمن شاہ کی سرکردگی میں بہمنی روپ اختیار کرلیا۔

چودھویں صدی کے وسط میں یعنے ۱۳۴۷ء میں بہمنی سلطنت قائم ہوئی تھی اور اپنے لائق بادشاہوں کی رہنمائی میں سو سال تک پروان چڑھتی رہی۔ اس کے بانی دکن کے "تاریخ ساز اُمرائے صدہ" تھے جنھوں نے اپنے ایک برگزیدہ حلیف علاؤالدین حسن بہمن شاہ کو ۷۴۸ھ/۱۳۴۷ء میں اپنا بادشاہ منتخب کرکے اس سلطنت کی داغ بیل ڈالی اور رفتہ رفتہ اس کو مستحکم اور اقبال مند بنایا۔ فیروز شاہ بہمنی کے آخری عہد تک، جو اس سلطنت کا بامِ عروج تھا، اس کی رفتارِ ترقی میں کوئی فرق نہیں آیا، چنانچہ اس زمانہ میں اس سلطنت نے دکن کی خوابیدہ طاقتوں کو جگایا، تہذیب وتمدن کی روشنی پھیلائی، لیکن فیروز شاہ کے جانشین احمد شاہ ولی بہمنی کے عہد سے جو ۸۲۵ھ/۱۴۲۲ء میں تخت نشین ہوا تھا، یہ سلطنت بدقسمتی سے طبقہ واری کش مکش کا شکار ہونے لگی جو بالآخر اس کے لئے پیامِ موت ثابت ہوئی۔ بات یہ ہے کہ ملک کی آبادی دو مخالف فرقوں میں بٹ گئی تھی جو دکنی اور غیر دکنی کہلاتے تھے! اول الذکر تو

سلطنتِ بہمنی کے معمار "اُمرائے صدہ" کی اولاد تھے جو اپنے کو دکن کا حقیقی وارث سمجھتے تھے، کیونکہ انھیں کے آباء واجداد نے دکن کو اپنا گھر بنایا اور بہمنی سلطنت کو سنوارا تھا۔ آخر الذکر طبقہ میں وہ تُرک وایرانی تھے جو نو وارد تھے اور جو حکومت کی مہمان نوازی سے فائدہ اُٹھا کر چپکے چپکے سلطنت پر چھا گئے۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ دونوں طبقوں میں رقابت پیدا ہوگئی جو بالآخر بہت شدید ہوگئی۔

یہ بہت دلخراش منظر تھا کہ جو طاقتیں مِل جُل کر مُلک کی خدمت کر رہی تھیں وہ اب ایک دوسرے کی رقابت میں ضائع ہونے لگیں اور اس سے مُلک کو بہت نقصان پہنچنے لگا۔ اس کش مکش کا پہلا منظر علاؤالدین ثانی کے عہد میں اور دوسرا منظر محمد شاہ لشکری کے عہد میں سامنے آیا جب کہ خون کی ندیاں بہنے لگیں۔ ملک حسن بحری اور محمود دگاواں اسی کش مکش کے شکار ہوئے۔ مشکل یہ تھی کہ محمود دگاواں جو محمد شاہ لشکری کا وزیر تھا، تمام مملکت پر ایسا چھا گیا تھا کہ اس کے مرنے کے بعد کوئی شخص اس سلطنت کا سربراہ نہیں ہو سکا۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ محمود دگاواں کے قتل کے بعد جو ۸۸۶ھ/۱۴۸۱ء میں ہوا، سلطنتِ بہمنی کا فوراً شیرازہ بکھرنے لگا۔ جو لوگ اس سلطنت کے عمائد سمجھے جاتے تھے وہ علانیہ سرتابی کرنے لگے، اور جب ایک سال کے بعد ہی محمد شاہ لشکری کا انتقال ہوگیا اور اس کا کم سن بیٹا محمود شاہ اس کا جانشین قرار دیا گیا تو حالات بد سے بدتر ہو گئے، چنانچہ ۸۹۶ھ/۱۴۹۰ء میں جس کو سلطنتِ بہمنی کی آخری تاریخ سمجھنا چاہئے، تمام صوبہ دار جو مختلف صوبوں کے حاکم تھے خود مختار ہو گئے اور اس تلاطم میں نظام شاہی، عادل شاہی اور عماد شاہی سلطنتیں قائم ہوگئیں۔

اگرچہ اس گھٹا ٹوپ اندھیرے میں قطب شاہی سلطنت بھی قائم ہوئی تھی مگر عادل شاہی اور نظام شاہی سلطنتوں کی طرح اس سلطنت کو طبقہ واری کش مکش کی راست پیداوار سمجھنا صحیح نہ ہوگا۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ قطب شاہی سلطنت کے بانی سلطان قلی قطب شاہ کو طبقہ واری کش مکش سے قطعاً تعلق نہ تھا، کیونکہ بیدر میں اس کا ورود محمود شاہ بہمنی کے عہد میں ہوا تھا جب کہ محمود دگاواں اور نظام الملک بحری

راہی عدم ہو چکے تھے اور اگرچہ طبقہ واری کش مکش کی آگ ابھی سُلگ رہی تھی لیکن اس کے بڑے شعلے بُجھ گئے تھے۔ جب سلطان قلی بہمنی دربار میں داخل ہوا تو اس کو کسی فرقہ بندی سے سابقہ نہیں پڑا، گو محمود گاواں کے فریق کی طرح یہ بھی نو وارد تھا، اور اس میں کوئی شک نہیں کہ جب اہلِ بیدر نے ۸۹۲ھ / ۱۴۸۷ء میں خود محمود شاہ پر چڑھائی کی تھی تو حسن علی سبزواری اور سید مرزائی مشہدی کے ساتھ سلطان قلی نے بھی بادشاہ کی مدد کی اور اس کی جان بچائی تھی لیکن اس کو نو واردوں کے ساتھ خاص ہمدردی اور اہلِ مُلک کے ساتھ کوئی رقابت نہ تھی۔ برخلاف اس کے سلطان قلی نے اپنے بلند کردار کی وجہ سے مُلک اور شاہی محل میں بہت جلد اپنا سکہ بٹھا دیا اور اسی وجہ سے اس کو بہت جلد سلطنت کی بڑی بڑی خدمتیں دی جانے لگیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ سلطان قلی ۹۰۱ھ / ۱۴۹۶ء میں تلنگانہ کا صوبہ دار ہوا تھا جو سلطان محمود شاہ کی عطا تھی۔ برخلاف اس کے نظام شاہی اور عادل شاہی سلطنتوں کے بانی محمد شاہ لشکری کے عہد کے صوبہ دار تھے اور یہ اپنے صوبوں میں ۸۹۶ھ / ۱۴۹۰ء میں اس وقت خود مختار ہو گئے تھے جب کہ سلطان قلی تلنگانہ کا صوبہ دار بھی نہیں ہوا تھا نیز سلطان قلی نے اپنے مُربی محمود شاہ کے انتقال کے بعد ۹۲۴ھ / ۱۵۱۸ء میں اپنی خود مختاری کا اعلان کیا۔ اس طویل عرصہ تک اس نے نہ صرف صوبہ داری پر قناعت کی بلکہ اپنے بادشاہ کی ہر طرح مدد کی جو اس کی وفاداری کی دلیل ہے۔ اس طریقہ سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ تلنگانہ کی قطب شاہی سلطنت آواخر پندرھویں صدی کی طبقہ واری کش مکش سے علیحدہ تھی اور اس کا پس منظر وہ نہیں تھا جو نظام شاہی اور عادل شاہی سلطنتوں کا ہے۔

گولکنڈہ کی سلطنت بڑے آب و تاب کے ساتھ قائم کی گئی تھی۔ اس کی تعمیر میں وہ نصب العین شامل تھا جو متمدن سلطنت کے لئے ضروری ہے۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ اس سلطنت کی تاسیس اور تعمیر ایسے افراد کے ہاتھوں سے ہوئی تھی جو بڑے تمدن کے حامل تھے اور بڑی خاندانی روایات کے ساتھ

تلنگانہ میں آئے تھے۔ جب سلطنت قائم ہوئی تو اس کے لئے وہ اسلوب اختیار کیا گیا جو اس کے جغرافی اور طبعی خصوصیات کے لئے مناسب تھا۔ پہلے تو قطب شاہوں نے اپنے آپ کو اس سرزمین سے ایسا پیوست کیا کہ دو پشتوں کے بعد یہ بالکل دکنی ہو گئے۔ تلنگی رعایا کو اپنا تمدن دیا اور ان کی روایتیں خود اختیار کر لیں۔ ملک کی رہنمائی کے لئے لائق ارباب بست وکشاد مامور کئے، سلطنت کو قدرتی حدود تک پہنچایا، ملک میں بہترین تمدنی ذخائر جمع کئے، شہروں کی تعمیر کر کے اہل تلنگانہ کی ذہنی و اخلاقی قوتوں کو اجاگر کیا، مسجدیں، مدرسے، شفاخانے، خانقاہیں اور کاروان سرائیں بنائیں، باغ و عمارات کے ذریعہ فنون لطیفہ کی اس قدر خدمت کی کہ سلطنت جگمگانے لگی۔ علوم و فنون کی ترقی سے تلنگانہ کے تمام طول و عرض میں علمی روشنی پھیلا دی۔ اسلامی علوم و فنون کے ساتھ اُردو اور تلنگی زبان کی اس طرح خدمت کی کہ گویا یہ ان کی زبانیں تھیں، چنانچہ قطب شاہی دَور کو اُردو، تلنگی کا سنہری زمانہ کہنا چاہئے، اور یہ ایسا پائدار تمدن تھا کہ گولکنڈہ کے زوال کے بعد یہ فنا نہیں ہوا۔ اب بھی تلنگانہ کے طول و عرض میں قطب شاہی تمدن کے بہتیرے آثار اور نقوش پائے جاتے ہیں۔ تلنگانہ کی معاشرت میں اب بھی اس کے اجزا موجود ہیں۔ گولکنڈہ اُجڑنے کے بعد بھی اس سلطنت کے شاعر و ادیب جنوبی دکن یعنے کرناٹک میں اپنی جگہ کر کے شعر و سخن کی خدمت کرتے رہے اور بہت بڑا ادبی سرمایہ چھوڑا جس کو قطب شاہوں کی یادگار سمجھنا چاہیئے۔

حصّہ اوّل

سلطنت کی تاسیس



سلطان قلی قطب شاہ



سلطان جمشید قلی قطب شاہ



سلطان ابراہیم قلی قطب شاہ



سلطان محمد قلی قطب شاہ

پہلا باب

قطب شاہی گھرانا

آباء و اجداد سلطان قلی قطب شاہ جس کے مبارک ہاتھوں سلطنتِ گولکنڈہ کی بُنیاد پڑی تھی، ترکستان کے ایک بہت بڑے قبیلہ قراقونیلُو کا رُکن تھا۔ گولکنڈہ کی تاریخوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس قبیلہ نے ترکستان کے ایک بڑے حصہ پر حکومت کی تھی اور وہاں سے پیش قدمی کر کے یہ قبیلہ مغربی ایران پر قابض ہو گیا تھا۔ قرا یوسف، سکندر ثانی اور جہاں شاہ جیسی زبردست شخصیتیں اس قبیلہ میں پیدا ہوئیں جو ایران کی جلیل القدر حکمران تھیں، اور وسطِ ایشیا کی تاریخ میں تیمور صاحبقران کے بعد انھیں کا درجہ تھا۔ اس قبیلہ نے چنگیز خاں کا زبردست مقابلہ کیا تھا اور اس کی کبھی اطاعت اختیار نہیں کی۔ چنانچہ کہا جاتا ہے کہ یہ لوگ ابوسعید مرزا کے زمانہ تک خود مختار رہے۔ قرا یوسف، تیمور کا ہمعصر تھا جس نے تیمور کی بڑھتی ہوئی طاقت کا مقابلہ کر کے اپنے اور اپنے قبیلہ کی ہستی قائم رکھی تھی۔ ترکستان کا یہی واحد قبیلہ تھا جس کے مقابلہ میں تیمور اور اس کے جانشینوں کو ناکامی کی صورت دیکھنی پڑی تھی۔ جہاں شاہ نے شاہ رُخ مرزا کو بارہا شکستیں دی تھیں۔ جب اس کا انتقال ہوا تو یہی جہاں شاہ تیموری سلطنت کے ایک وسیع حصہ پر مسلط ہو کر شاہ رخی تخت و تاج کا مالک ہو گیا تھا۔[۱]

---

[۱] تاریخ قطب شاہی، کتب خانہ آصفیہ ص ۳۔ تاریخ فرشتہ نولکشور ۱۶۔ تاریخ ادبیات ایران ادورڈ براون جلد سوم صفحات ۴۰۲، ۳۴۰ و ۴۰۳

چوتھی اور پانچویں صدی ہجری ترک قبیلوں کے احیا کا زمانہ ہے۔ اسلام سے وابستہ ہونے کے بعد ان میں تہذیب و شائستگی پیدا ہوئی اور وہ منتشر ہو کر دنیا کے مختلف حصوں پر قابض ہو گئے۔ قبیلۂ قراقونیلو کی ترقی بھی غالباً اسی زمانہ میں ہوئی ہے۔ چوتھی صدی ہجری کے اوائل میں اس قبیلہ میں زندگی کے آثار نمودار ہوئے اور یہ قبیلہ یک جہت ہو کر شاہ راہِ ترقی پر گامزن ہو گیا۔ اس قبیلہ کا سب سے پہلا سردار اغرخان بن قراخان بتایا جاتا ہے جس نے سب سے پہلے اس قبیلہ کی تعمیر کی تھی۔ اکثر مورخ لکھتے ہیں کہ یہ شخص یافث بن نوح علیہ السلام کی اولاد سے تھا۔[۱] اگرچہ حضرت نوح علیہ السلام کے زمانہ سے یہ لوگ ترکستان کے حاکم تھے، لیکن اس قبیلہ کی اصل ترقی اغرخان کے زمانہ سے شروع ہوتی ہے جس نے اسلام قبول کر کے قراقونیلو قبیلہ میں روح پھونکی تھی، چنانچہ اغرخان کی وجہ سے یہ لوگ ترکستان کے اکثر اقطاع پر قابض ہو گئے۔ اغرخان نے تقریباً ستر سال بادشاہی کی تورہ بیگ ترکستان کا والی ہو گیا تھا۔ یہ ترکستان کا وہ پُر آشوب زمانہ تھا جب کہ اس ملک پر چنگیز خاں کے حملے شروع ہو گئے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ پہلے پہل تورہ بیگ اس بڑھتی ہوئی آندھی سے گھبرا کر ماوراء النہر کی طرف بھاگ گیا۔ مگر جب چنگیز خانی سیلاب سلطان خوارزم پر اُمنڈنے لگا تو تورہ بیگ نے کفارِ منگول کا مقابلہ ضروری سمجھا اور اپنی بساط کے موافق چنگیز خاں کی مزاحمت کی اور اپنی سلطنت کو بچائے رکھا۔ چنانچہ اسی پُر زور مدافعت کا نتیجہ تھا کہ یہ لوگ چنگیز خاں اور اس کی اولاد کے کبھی حلقہ بگوش نہیں ہوئے[۲] لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے انھیں حملوں سے ہٹ کر یہ مغربی ایران پر مسلط ہو گئے تھے اور ہمدان ان کا مرکز بن گیا تھا۔

قرا یوسف، تورہ بیگ کی چھٹی پشت میں تھا جو اپنی خاندانی سلطنت کا

---

[۱] حدیقۃ السلاطین قطب شاہی، نظام الدین صاعدی، مطبوعۂ ادارۂ ادبیات اُردو ص ۵۔ [۲] تاریخ قطب شاہی ص ۳، حبیب السیر خوندمیر، جلد سوم حصۂ سوم ص ۱۰۵۔

جانشین ہوا۔ یہ وسطِ ایشیا کے جلیل القدر حکمرانوں میں سے ہے جو تیمور صاحبقران کا
ہمعصر تھا۔ جب ۷۸۵ھ ہجری میں تیمور کے حملے شروع ہوئے تو اس قبیلہ پر بڑی
مصیبت آگئی۔ لیکن قرا یوسف کی عظمت تیمور کی سدِّ راہ تھی۔ قرا یوسف نے
تیموری افواج کی پوری مزاحمت کی۔ اس نے نہ صرف اپنی سلطنت کو بچائے رکھا
بلکہ تیمور کی بڑھتی ہوئی طاقت کے مقابلہ میں اس نے ایران میں غیر معمولی
طاقت فراہم کرلی۔ تیمور کے انتقال کے بعد اس کے جانشینوں کے ساتھ کئی معرکے
ہوئے، چنانچہ قرا یوسف کی تمامتر زندگی اسی جدال و قتال میں گزری۔ ان تیموری
سیلابوں کے باوجود، جن کے سامنے کسی طاقت کا ٹھیرنا محال تھا، قرا یوسف کی
عظیم الشان سلطنت قائم تھی جو عراق و عرب کی آخری سرحد سے لے کر
آذربائیجان تک پھیلی ہوئی تھی۔[1] ۸۲۳ھ ۱۴۲۰ء میں اس کا انتقال ہوا، اور اس کی جگہ
اس کے بیٹے میرزادہ سکندر کو جو "سکندرِ ثانی" کے نام سے مشہور ہے، تخت نشین
کیا گیا۔ جہاں شاہ، سکندر کا بھائی تھا، جب سکندر کو اس کے بیٹے کیقباد نے
قتل کردیا تو جہاں شاہ نے اپنی طاقت بڑھائی اور عراق عرب پر قابض ہوگیا،
اور جب ۸۵۰ھ ۱۴۴۶ء میں شاہ رخ مرزا کا انتقال ہوگیا تو اس کے لئے اور بھی
راستے صاف ہوگئے، چنانچہ اس وقت تاجِ شاہی زیبِ سر کرکے اس نے
اپنے نام کا سکّہ و خطبہ جاری کردیا اور اس قدر تدریسے بیش قدمی شروع
کردی کہ ۸۵۷ھ ۱۴۵۳ء میں یہ عراق عرب و عجم کے پورے ملک پر قابض ہوگیا اور
اس کے حدودِ سلطنت آذربائیجان سے دریائے عمان تک پہنچ گئے۔ ۸۵۹ھ ۱۴۵۵ء میں
یہ بغداد پر قابض ہوا، اور ۸۶۲ھ ۱۴۵۷ء میں شاہ رخی تخت پر بیٹھ گیا۔[2] قبیلہ قراقونیلو کی

---

[1] تاریخ قطب شاہی ص ۱۳۔ تاریخ ادبیاتِ ایران، براؤن جلد سوم ص ۴۰۲-۴۰۳۔
تاریخ ایران، ملکم جلد اول ص ۱۶۱۔ حبیب السیر، خوندمیر جلد سوم حصہ دوم ص ۱۰۵۔

[2] تاریخ قطب شاہی ص ۲۳-۲۷۔ حبیب السیر، خوندمیر ص ۱۸۴۔

یہ غیر معمولی ترقی تھی۔ جہاں شاہ کو صرف یہ ڈر تھا کہ سکندرِ ثانی کے بیٹے شاہزادہ الوند اور کیقباد اس کی مخالفت کریں گے۔ ان شاہزادوں کے ساتھ اس نے کوئی دشمنی نہیں کی، بلکہ بزرگِ خاندان کی طرح ان کی سرپرستی کی۔ کیقباد کا تو انتقال ہوگیا تھا، مگر الوند اپنے باپ کا جانشین ہوگیا، جہاں شاہ نے نہ صرف اپنا موروثی ملک ہمدان اس کے سپرد کردیا بلکہ اس کے ساتھ ازدواجی تعلقات بھی پیدا کرلئے۔ الوند کے بیٹے پیر قلی بیگ سے شاہزادہ یوسف کی بیٹی یعنے اپنی پوتی خدیجہ بیگم کی شادی کردی جس کے بطن سے اویس قلی اور اللہ قلی دو بیٹے پیدا ہوئے، ان میں سے اویس قلی اپنے باپ پیر قلی کے انتقال کے بعد ہمدان کا والی ہوگیا۔ اویس قلی کی شادی ملک صالح کی بیٹی مریم خاتون سے ہوئی تھی جو اکابرِ ہمدان سے تھا، اس کے بطن سے گولکنڈہ کی سلطنت کا بانی سلطان قلی پیدا ہوا، اس کے نانا ملک صالح نے بچے کے خاندانی روایات کا لحاظ کرتے ہوئے اس کا نام "سلطان قلی" رکھا تھا[۱]۔ بعض تاریخوں میں محمد قلی بھی لکھا گیا ہے جو صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ اس سلسلۂ نسب سے ظاہر ہوتا ہے کہ سلطان قلی، ترکستان کے ایک بہت ہی معزز اور جلیل القدر حکمران خاندان کا رکن تھا۔ اس کا سلسلۂ نسب ایک طرف قرا یوسف اور سکندرِ ثانی تک پہنچتا ہے تو دوسری طرف یہ اپنی ماں کی طرف سے جہاں شاہ کی اولاد میں ہے، اس لئے اس خاندان قطب شاہیہ کو "قرا یوسفیہ" اور "جہاں شاہیہ" بھی کہتے ہیں[۲،۳]۔ مورخ فرشتہ کے نزدیک یہ سلسلۂ نسب زیادہ موثق نہیں ہے، وہ

---

[۱] تاریخ قطب شاہی ص ۱۳۱۔ [۲] تذکرۃ الملوک، خافی، مخطوطۂ کتب خانۂ آصفیہ ص ۱۲۴۔

[۳] حدیقۃ السلاطین ص ۸۰۔ فرشتہ ص ۱۶۷۔ قطب شاہی شجرۂ نسب کی مزید توثیق سلطان محمد قطب شاہ کی تحریر سے ہوتی ہے جو اس بادشاہ نے کنز اللغات پر اپنے قلم سے ثبت کی تھی وہ یہ ہے:۔ "سلطان محمد قطب شاہ ابن مرزا محمد امین ابن ابراہیم قطب شاہ ابن سلطان قلی قطب الملک ابن اویس قلی ابن پیر قلی ابن الوند بیگ ابن مرزا اسکندر ابن قرا یوسف ابن قرا محمد ترکمان"۔ یہ لغت مخطوطہ کی شکل میں کتب خانہ سالار جنگ میں محفوظ ہے۔ نیز دیکھو مآثر دکن، علی اصغر بلگرامی ضمیمہ ص ۴۔

سلطان قلی کو قوم بہانہ لو سے منسوب کر کے میر علی بشیر کو اس کا مورثِ اعلیٰ تصور کرتا ہے[۱]، لیکن گولکنڈے کی مستند تاریخوں سے اس کی تصدیق نہیں ہوتی۔

سلطان قلی کا دکن سے تعلق ہر تاریخ سے واضح ہوتا ہے کہ سلطان قلی کے دکن آنے کا بہت بڑا سبب خاندان جہاں شاہیہ کی تباہی اور قبیلۂ قراقونیلو کا غلبہ ترکستان سے ہے۔ یہ ترکستان کا دوسرا حریف قبیلہ تھا جو دیارِ بکر کا حاکم تھا۔ اس قبیلہ کے اراکین اور رئیس قدیم زمانہ سے قراقونیلو قبیلہ کے دشمن تھے اور اس کی بڑھتی ہوئی طاقت کو تباہ کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ جہاں شاہ کا ہمعصر امیر حسن بیگ جو دیارِ بکر کا حکمران تھا، خاندان قرایوسفیہ کی بیخ کنی کے درپے تھا۔ لیکن جہاں شاہ کی سطوت کے سامنے اس کی ایک نہیں چلتی تھی۔ ۸۷۲ھ ۱۴۶۷ء میں جہاں شاہ کا اس قدر طوطی بول رہا تھا کہ سوائے اس امیر حسن بیگ کے ترکستان میں اس کا کوئی حریف نہ تھا لیکن جہاں شاہ کی بدقسمتی سے ایک موقع پر امیر حسن بیگ کی آرزو پوری ہوگئی۔ جب جہاں شاہ نے دیارِ بکر پر حملہ کیا تو حسن بیگ نے ملمع سازی کر کے صلح کرلی اور جھوٹی اطاعت کا اظہار کیا۔ جہاں شاہ نے غلطی سے اس اطاعت پر اعتماد کر کے دشمن سے غفلت کی اور عیش و عشرت میں مشغول ہوگیا۔ اب حسن بیگ کو موقع مل گیا۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے ان حالات سے فائدہ اُٹھا کر جہاں شاہ پر حملہ کردیا جس میں ایران کا یہ بڑا تاجدار مارا گیا۔ اس کے بیٹے شاہزادہ یوسف اور شاہزادہ محمد گرفتار ہوئے اور تمام سامانِ شاہی دشمن کے ہاتھ لگا۔ جہاں شاہ کا، جس نے ایران میں (۳۵) سال حکومت کی تھی، اس طرح مارا جانا ہمدان کے خاندانِ قرایوسفیہ کا خاتمہ تھا۔ آقونیلو، جہاں شاہ کی تمام سلطنت پر قابض ہوگئے اور قرایوسفی خاندان کے تمام اراکین کو قتل کرنے لگے۔ ہمدان کے اس چھوٹے سے خاندان کی تباہی آنکھوں کے سامنے تھی[۲]۔ اس وقت ہمدان میں چونکہ پیر قلی اپنے باپ کا جانشین اور وارثِ خاندان تھا،

---

[۱] فرشتہ ص ۱۶۷۔
[۲] تاریخ قطب شاہی ص ۳۱۔

اب امیر حسن بیگ کی دشمنی کا نشانہ بن گیا۔ قرائن یہ تھے کہ اس کا بھی خاتمہ ہو جاتا لیکن اتفاق سے حالات کچھ موافق ہو گئے، اکابرِ ہمدان کی سفارش سے اُس کی جان بچ گئی۔ یوں بھی پیر قلی نہایت خاموش اور خانہ نشین آدمی تھا، اکابرِ ہمدان نے حسن بیگ کو یہ سمجھایا کہ پیر قلی ایک خانہ نشین اور بے ضرر آدمی ہے اس کو مارنے سے کیا فائدہ۔ اس بیچ بچاؤ سے پیر قلی چھوٹ گیا اور چند دنوں کے لئے ہمدان کے اس قدیم خاندان کی ہستی باقی رہ گئی۔

جب تک حسن بیگ اور اس کا بیٹا خلیل سلطان زندہ رہے اس وقت تک ہمدان کے قرایوسفیہ خاندان کے لئے کوئی خطرہ نہیں تھا لیکن جب ان کے مرنے کے بعد امیر یعقوب بادشاہ ہوا تو بُرے دن عود کر آئے۔ امیر یعقوب نے رعایا کی چھان بین شروع کی اور ہمدان کا جائزہ لیا۔ اس وقت اویس قلی کا بیٹا سلطان قلی سنِ شعور کو پہنچ چکا تھا، اور اس میں سیاسی قابلیت کے آثار نمودار ہو رہے تھے۔ یعقوب کے ہمدردوں نے اسے سمجھایا کہ یہ شخص اپنے باپ اور دادا کی طرح خاموش نہیں بیٹھے گا بلکہ اس میں جہاں شاہی سطوت کے آثار پائے جاتے ہیں۔ اور جب اہلِ نجوم سے حالات دریافت کئے گئے تو انھوں نے سلطان قلی کا زائچہ کھینچ کر اس کی بادشاہی کی پیشین گوئی کی، اس سے امیر یعقوب بہت گھبرایا، اور سلطان قلی کو مار ڈالنے کی کوشش کی۔ جب اویس قلی کو یہ خبر معلوم ہوئی تو اس نے اکابرِ ہمدان سے اس معاملہ میں مشورہ کیا۔ ان لوگوں نے یہ رائے دی کہ امیر یعقوب پر اعتماد نہیں کرنا چاہئے،[۱] اس سے ہمیشہ جان و مال کا خطرہ لگا ہوا ہے، اور بچاؤ کی صورت یہ ہے کہ سلطان قلی کو قسمت آزمائی کے لئے ہندوستان بھیجا جائے۔ چنانچہ یہ صلح و مشورہ بہت مفید ثابت ہوا،[۲] اور اویس قلی نے اپنے بیٹے سلطان قلی کو اس کے چچا اللہ قلی کے ساتھ جس کا نام بعض جگہ عُلی قلی بھی بتایا جاتا ہے ہندوستان روانہ کر دیا اور اس کے ساتھ قیمتی تحفے بھی رکھے گئے تھے۔[۳]

---

[۱] تاریخ قطب شاہی ص ۳۲۔ [۲] حدیقۃ العالم ص ۱۰۰۔ [۳] حبیب السیر خوندمیر، جلد سوم حصہ سوم ص ۱۸۵ ص ۱۸۶۔

قرائن ظاہر کرتے ہیں کہ سلطان قلی کے ہندوستان آنے کے یہی اسباب ہونے چاہئیں گو، ایک مورخ کا خیال یہ ہے کہ ان لوگوں کے ہندوستان آنے کا مقصد گھوڑوں کی تجارت تھا، یہ عراق کے گھوڑے لے کر ہندوستان آئے اور جب ہندوستان میں گھوڑوں کی قدر نہ ہوئی تو یہ بیدر آئے اور یہاں انھوں نے اپنے گھوڑے اچھے داموں میں فروخت کیے، اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس تجارت کے لئے وہ دو مرتبہ دکن آئے تھے[1] لیکن ہمیں معلوم ہے کہ سلطان قلی اور اس کا چچا ہمدان کے رئیس تھے تو پھر ان کے متعلق گھوڑوں کی تجارت کا خیال کرنا کہاں تک قرینِ عقل ہوسکتا ہے؟ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان لوگوں کے ساتھ عراقی گھوڑے بھی تھے، لیکن یہ گھوڑے تجارت کے لئے نہیں تھے بلکہ تحفوں کی غرض سے آئے تھے۔ اُن کے ہندوستان آنے کا ایک ہی سبب ہوسکتا ہے اور وہ ان کے خاندان کا زوال ہے، کیوں کہ اس زمانہ میں ہمدان کی دُنیا ان پر تنگ ہو رہی تھی، اور اس واقعہ کی تمام تاریخوں سے تصدیق ہوتی ہے۔ سلطان قلی دو مرتبہ ہندوستان آیا تھا، اس سے پہلے وہ ایک مرتبہ اور اپنے چچا کے ساتھ آیا تھا، اور اپنے تحفوں کے ساتھ دربارِ دکن میں باریاب ہوا تھا اور دکن کی تہذیب اور طرزِ معاشرت سے ایسا متاثر ہوا تھا کہ اسی زمانہ میں وہ دکن میں متوطن ہونا چاہتا تھا مگر چچا کے اصرار سے مجبوراً اس کو عراق واپس ہونا پڑا[2] گو، یہ بتانا مشکل ہے کہ وہ پہلی مرتبہ دکن کیوں آیا تھا، غالباً ہمدان کا سیاسی پیچ و تاب ان لوگوں کو مجبور کر رہا تھا کہ ہمدان سے باہر ایک دوسری دُنیا پیدا کریں۔ راستہ میں یہ مسافر، یزد پر سے گزر رہے تھے، یہاں یزد کے مشہور پیرِ طریقت حضرت شاہ نور الدین نعمت اللہ ثانی قدس سرہٗ سے ان کی ملاقات ہوئی، چونکہ حضرتؒ کی بیوی جہاں شاہ مقتول کی بیٹی تھیں اس لئے حضرتؒ کو سلطان قلی سے نزدیک کی قرابت ہوتی تھی۔ حضرتؒ نے اس سفرِ ہندوستان کے متعلق

---

[1] تذکرۃ الملوک خانی ص ۱۳۴ [2] تاریخ قطب شاہی ص ۳۶ - حدیقۃ العالم ص ۱۱-

اپنی خوشنودی کا اظہار کیا اور فرمایا کہ "ہم تم کو ہندوستان کے اقطاع عنایت کرتے ہیں"۔ اور جانماز کے نیچے سے چند اشرفیاں نکال کر دیں اور دعا دے کر رخصت کیا۔[1]

قرائن یہ ہیں کہ سلطان قلی نے شمالی ہند میں کہیں قیام نہیں کیا بلکہ ترکستان سے کوچ کر کے سیدھا دکن آیا تھا۔[2] بات یہ ہے کہ اہلِ ایران و ترکستان بہمنی سلطنت سے ناواقف نہیں تھے، اور جس زمانہ میں سلطان قلی دکن آیا تھا اس وقت محمود شاہ بہمنی کا راج تھا، اور یہ وہ زمانہ ہے جب کہ دکن میں ترک اور ایرانی بہ کثرت تھے اور یہاں ان کی بہت آو بھگت ہوتی تھی۔ یوں تو محمد شاہ ثانی اور فیروز شاہ بہمنی کے عہدِ حکومت سے عجم کے علماء دکن آنے لگے تھے اور خود خواجہ حافظ شیرازی کو بھی دعوت دی گئی تھی، لیکن بہمنی سلطنت کے آخری دور میں تو بیدر تمام ممالکِ عجم کا زبردست مرکز بن گیا اور ان لوگوں کی آمد و رفت سے دکن اور عجم کے ڈانڈے مل گئے تھے۔ ترکستان اور ایران کے اکثر خطے دربارِ دکن کی شان و شوکت اور اس کی علم نوازی سے خوب واقف تھے۔ اس کے علاوہ شمالی ہندوستان میں ان دنوں طوائف الملوکی کا بازار گرم تھا۔ خاندانِ سادات و لودی کی کمزوری اور تیمور کے حملوں سے دہلی کی پٹھان سلطنت کا شیرازہ بکھر رہا تھا اس لئے یہاں باہر کے نوواردوں کے لئے کوئی کشش نہ تھی اور سلطان قلی یہاں رہتا تو کیا کرتا۔ گو، بعض تاریخوں سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ سلطان قلی پہلے شمالی ہندوستان میں ٹھیرا اور جب دہلی کے ہمت شکن ماحول سے اس کے حوصلے پست ہو گئے تو پھر دکن آیا۔[3] ممکن ہے کہ وہ حالات کو دیکھنے کے لئے یہاں چند روز ٹھیرا ہو، لیکن شمالی ہند کا خلفشار اس کو زیادہ دنوں تک ٹھیرنے کی اجازت نہیں دیتا تھا، اس لئے ہر طرح اس کا بیدر آنا صحیح ہے۔ اور ادھر غالباً حکومتِ دکن کو نوواردوں کی خبر ہو جاتی تھی اور دربار میں ان کو بلایا جاتا تھا۔ کچھ اسی طریقہ سے سلطان قلی اور اس کا چچا سلطان محمود شاہ بہمنی کے

---

[1] تاریخ قطب شاہی ص ۳۴ - حدیقۃ العالم ص ۱۱ [2] تاریخ فرشتہ ص ۱۶۷ [3] تذکرۃ الملوک خافی ص ۴۴۲۔

دربار میں، جس کی اس زمانہ میں شہرت تھی، باریاب ہو گئے۔[1]

---

[1] فرشتہ وضاحت کے ساتھ لکھتا ہے کہ سلطان قلی، محمد شاہ ثانی کے عہد میں آیا تھا، چنانچہ اس کے الفاظ یہ ہیں کہ:- "محمد شاہ لشکری کو تُرک غلاموں کا بہت شوق تھا، اور اس نے بہت سے تُرک غلام جمع کر رکھے تھے، اس لئے سلطان قلی بھی تُرک غلاموں میں شریک ہو گیا (تاریخ فرشتہ ص ۱۶۷)"۔ اول تو دوسری تاریخوں سے جیسے تاریخ قطب شاہی۔ تذکرۃ الملوک، خافی۔ تاریخ قطبیہ اور تاریخ ظفرہ سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ سلطان قلی، محمد شاہ کے عہد میں آیا تھا، بلکہ فرشتہ کے علاوہ تمام تاریخیں بالاتفاق واضح کرتی ہیں کہ سلطان قلی، محمد شاہ کے انتقال کے بعد محمود شاہ بہمنی کے عہد میں آیا تھا۔ چونکہ تاریخ قطب شاہی اور تاریخ قطبیہ، گولکنڈہ کے حالات میں فرشتہ سے زیادہ مستند ہیں اس لئے محمود شاہ بہمنی کا عہد ہی قابل تسلیم ہوگا۔ اس کے علاوہ تذکرۃ الملوک میں سلطان قلی اور اس کے چچا کا دوسری مرتبہ آنا ۸۹۲ھ (۱۴۸۶ء) میں بتایا گیا ہے جو صریحاً محمود شاہ کا عہد ہے۔ کیوں کہ محمد شاہ لشکری کا انتقال ۸۸۷ھ (۱۴۸۲ء) میں ہو چکا تھا۔ (تذکرۃ الملوک خافی ص ۱۳۵) مگر فرشتہ بھی اس کو تسلیم کرتا ہے کہ سلطان قلی کی تمام تر ترقی محمود شاہ کے عہد میں ہوئی ہے، اس لئے اگر ہم یہ تسلیم بھی کریں کہ سلطان قلی، محمد شاہ کے آخری عہد میں آیا تھا تو اس سے زیادہ حرج نہیں ہوتا کیوں کہ بالآخر سلطان قلی اپنی تمام سیاسی زندگی کے اعتبار سے محمود شاہ سے وابستہ ہے، لیکن فرشتہ کے یہ الفاظ بحث طلب ہیں کہ سلطان قلی، محمد شاہ کے غلاموں میں شریک ہوا تھا۔ اول تو سلطان قلی کی آمد محمد شاہ کے عہد میں ثابت نہیں ہوتی، دوسرے سلطان قلی کا تُرک غلاموں کی صف میں کھڑا ہونا بالکل خلاف قیاس اور خلاف واقعہ معلوم ہوتا ہے۔ ہم دیکھ آئے ہیں کہ سلطان قلی، ایران کے ایک بہت بڑے خاندان کا سپوت تھا جس کی فہرست میں قرا یوسف، سکندر ثانی اور جہان شاہ جیسے جلیل القدر سلاطین دکھائی دیتے ہیں۔ گو، اس زمانہ میں جب کہ سلطان قلی دکن آیا ہے (بقیہ ص ۲۶ پر)

جب یہ دونوں مسافر یعنے سلطان قلی اور اللہ قلی بیگ، چچا بھتیجے بہمنی دربار میں باریاب ہوئے تو محمود شاہ بہمنی نے ان کی بہت آدبھگت کی اور جب اس کو یہ معلوم ہوا کہ یہ دونوں مسافر ہمدان کے شاہی خاندان کے سپوت ہیں تو ان کی بڑی قدر و منزلت کی گئی۔ اللہ قلی بیگ نے تحفے پیش کئے جن کو بادشاہ نے منظور کیا۔ چند دنوں کے بعد ترکستان سے امیر یعقوب کے انتقال کی خبر آئی اور یہ ہمدان کے شاہی خاندان کے لئے اچھا موقع تھا، اور یہ اپنی کوشش سے پھر اپنی عملداری قائم کر سکتے تھے اس لئے اللہ قلی بیگ نے بادشاہ سے اپنی واپسی کی اجازت چاہی، مگر بادشاہ ان دونوں نو واردوں کی قابلیت اور وجاہت سے اس قدر متاثر تھا کہ ان کو جانے کی اجازت نہیں دیتا تھا۔ اللہ قلی نے کہا کہ ترکستان میں ہمارے قبائل اور املاک ہیں ہم ان کو نہیں چھوڑ سکتے ہمارا وہاں جانا ضروری ہے۔ بادشاہ اللہ قلی بیگ کے اصرار سے مجبور ہو گیا اور کہا کہ "اللہ قلی بیگ!

(سلسلۂ حاشیہ ص ۲۵) یہ خاندان قرایوسفیہ اپنی آخری سانسیں لے رہا تھا تاہم اس کی سیاسی عظمت ابھی باقی تھی، ہمدان اس کا لوہا مانتا تھا، اور اس کا مال و جائداد اور اراضی ابھی باقی تھے۔ چنانچہ جب سلطان محمود نے اللہ قلی کو قیام دکن کے لئے مجبور کیا تو اس نے اپنے مال و جائداد کا عذر کیا تھا (تذکرۃ الملوک خافی ص ۱۳۴)

ان حالات میں سلطان قلی کو ترک غلام سمجھنا خلاف واقعہ ہے۔ تمام قطب شاہی تاریخوں سے واضح ہوتا ہے کہ سلطان قلی اور اس کا چچا قیمتی تحفوں کے ساتھ بہمنی دربار میں آئے تھے، اور اگر ان کی حیثیت شاہانہ نہیں تو غلامانہ بھی نہیں تھی۔ ان کے خاندانی حالات اور وجاہت کو دیکھ کر بہمنی دربار نے ان کی بہت آدبھگت کی۔ جب سلطان قلی اور اس کا چچا پہلی مرتبہ دکن آئے تو ان کے لئے تا قیام وظیفہ مقرر کیا گیا تھا جب یہ دوسری مرتبہ آئے تو ان کو مختلف عنایات سے سرفراز اور ٹھیرنے کے لئے مجبور کیا گیا یہی اسباب ہیں جن کی وجہ سے سلطان قلی دربار دکن سے بہت متاثر ہوا اور اپنے پہلے ورود میں اس نے دکن کے توطن کا ارادہ کر لیا تھا، مگر چچا کے اصرار کی وجہ سے اس کو واپس ہونا پڑا۔

اگر تومی روی، مختاری، مگر سلطان قلی بیگ را بہ ہیچ وجہ رخصت انصراف نمی دہیم" اللہ قلی، بادشاہ کے ان الفاظ سے سہم کر رہ گیا۔ بھتیجے کی جدائی اس کے لئے حد درجہ دل خراش تھی۔ گھر واپس ہو کر سلطان قلی سے گفتگو کی۔ سلطان قلی پہلے سے ترکستان سے بیزار تھا اور آق قونیلو قبیلہ کی دست درازیوں سے دل برداشتہ تھا۔ چنانچہ پہلی ہی آمد میں اس کا یہاں جی لگ گیا تھا اور اس مرتبہ تو وہ کسی طرح واپس جانے کے لئے تیار نہ ہوا۔ بھتیجے کے اس رجحان کو دیکھ کر اللہ قلی تنہا جانے پر مجبور ہو گیا، یہ جدائی اس پر شاق گزر رہی تھی۔ جب دوسرے روز یہ دونوں چچا بھتیجے محمود شاہ کے دربار میں حاضر ہوئے تو بادشاہ نے دریافت فرمایا:۔ "اللہ قلی بیگ! دی روزہ چوں شد و بہ چہ قرار یافت؟" اللہ قلی نے جواب دیا:۔

"امر از بادشاہ دیں پناہ است ع بہ ہر چہ شاہ اشارت کند سعادت ماست!"

اس طرح اللہ قلی کو تحفے دے کر رخصت کر دیا گیا[1] اور سلطان قلی ہمیشہ کے لئے دکن میں بس گیا۔

سلطان قلی کی استقامت سے محمود شاہ بہت خوش ہوا اور اس کو اپنے مقرب درباریوں میں شریک کر لیا، اور سلطان قلی سے کہا کہ تم ہمارے ساتھ رہنا اور عراق کا کبھی خیال نہیں کرنا۔ سلطان قلی کی ترقی کا بڑا سبب اس کی ذاتی قابلیت تھی جس کی بہ دولت اس نے دربارِ دکن میں بہت جلد رسوخ حاصل کر لیا۔[2] اگر فرشتہ کا

---

[1] حدیقۃ العالم ص ۱۳۳ [2] تاریخ قطب شاہی میں سلطان قلی کی ترقی کا پہلا زینہ ایک شکار کا واقعہ بتایا گیا ہے، چنانچہ اس کا بیان ہے کہ ایک روز بادشاہ شکار کے لئے گیا اور شکار کی کوشش کی، بادشاہ کے تمام درباریوں نے متعدد شکار کئے لیکن بادشاہ کو کوئی شکار پسند نہیں آیا۔ اتفاق سے سلطان قلی کا شکار بہت اچھا ثابت ہوا اور بادشاہ کو بہت پسند آیا۔ اس سے خوش ہو کر بادشاہ نے سلطان قلی کو ایک سو پچاس عربی اور ترکی گھوڑے مع ساز و سامان عطا کئے اور خلعت عنایت کی اور اس کے اخراجات کے لئے کرنگل اور اس کے مضافات عطا کئے اور "خواص خاں" (بقیہ ص ۲۸ پر)

بیان صحیح سمجھا جائے تو سلطان قلی کی ترقی اس کی علمی اور سپاہیانہ قابلیت کی بدولت ہوئی اسی مورخ کے بیان کے مطابق سلطان قلی علمِ حساب اچھا جانتا تھا اور بہت خوش خط لکھتا تھا۔ اسی قابلیت کی وجہ سے بادشاہ نے اس کو محلاتِ شاہی کا محاسب بنایا اور بیان کیا جاتا ہے کہ اس خدمت کو سلطان قلی نے نہایت خوش اسلوبی سے انجام دیا، شاہی حرم اس کے کام سے بہت خوش تھیں اور اس کی تعریف کرتی تھیں۔ اس پر اضافہ یہ ہوا کہ اس اثنا میں تلنگانہ سے یہ شکایت وصول ہوئی کہ وہاں بعض پرگنات میں چور اور ڈاکو لوٹ مار کر رہے ہیں اور رعایا ادائی مال گزاری میں کوتاہی کر رہی ہے اگر ان کی خاطر خواہ سرکوبی نہ کی جائے تو ان پرگنوں کی مال گزاری وصول نہ ہوگی۔ بادشاہ نے ان پرگنوں کے لئے دو تین ہزار سوار بھیجنے کی کوشش کی۔ جب سلطان قلی کو یہ حال معلوم ہوا تو اس نے بعض اہلِ حرم سے بادشاہ کے پاس اپنی سفارش کروائی اور یہ درخواست کی کہ اگر یہ خدمت میرے سپرد کی جائے تو میں بغیر فوج کے یہ خدمت انجام دے سکتا ہوں۔ چنانچہ بادشاہ نے یہ درخواست منظور فرمالی اور سلطان قلی اپنے چند ساتھیوں کو لے کر تلنگانہ کے پُر آشوب پرگنوں میں جا پہنچا اور اکثر زمین داروں کو ہموار کر کے ان پرگنوں کو ان کے ساتھ ان اقطاع کو بھی جو اکثر اُمراء سے متعلق تھے، پُر امن بنا دیئے۔ چوروں اور ڈاکوؤں کی خاطر خواہ سرکوبی کی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ باغی زمین دار مال گزاری کی ادائی کے لئے مجبور ہو گئے۔ یہ درحقیقت سلطان قلی کی بڑی قابلیت تھی کہ اس نے محض اپنے زورِ بازو سے یہ خدمت انجام دی۔ ایک اجنبی کے لئے جو تلنگانہ سے قطعاً ناواقف ہو، زمین داروں کو اپنی قابلیت سے ہموار کرنا اور ان کی مدد سے وہاں

(بقیہ حاشیہ ص ۲۷) خطاب سرفراز ہوا (تاریخ قطب شاہی ص ۳۷) لیکن یہ چیز غور طلب ہے کہ شکار کے ایک معمولی اور اتفاقی واقعہ کی بناء پر بادشاہ اس قدر خوش ہوا کہ اُس کو غیر معمولی عنایات سے سرفراز کیا۔ بلکہ قیاس کہتا ہے کہ اس کی ترقی کے کچھ اور ہی اسباب ہونے چاہئیں۔

اپنی جگہ پیدا کرنا بہت مشکل ہے اور بہت بڑی قابلیت کی دلیل ہے، یہ اس کی آئندہ بادشاہی کا نشان تھا۔[1] سلطان قلی کی ترقی کا پہلا زینہ شکار نہیں، بلکہ اس کی علمی، فوجی اور سیاسی قابلیت تھی، چنانچہ فرشتہ کے قول کے مطابق اس واقعہ سے اس کو غیر معمولی شہرت حاصل ہوئی، اس کو "خواص خاں" خطاب ملا اور کرڑنگل اور اس کے مضافات جاگیر میں دئے گئے۔[2] چونکہ اس میں علمی اور فوجی دونوں طرح کی قابلیت موجود تھی اس لئے فرامین میں اس کو "صاحب السیف والقلم" لکھا جاتا تھا۔

---

[1] فرشتہ اس واقعہ کو محمد شاہی عہد کی طرف منسوب کرتا ہے، لیکن اگر سنہ کی تحقیق کی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کا تعلق محمود شاہ کے عہد سے ہے، کیونکہ سلطان قلی محمد شاہ کے انتقال کے تقریباً چار سال بعد آیا ہے۔[2] گولکنڈہ کا صوبہ دار ہونے سے پہلے سلطان قلی نے اپنی جاگیر کرڑنگل میں کئی سال سکونت اختیار کی تھی، اس کے مسکونہ مکان اور قلعہ کے آثار اب تک کرڑنگل میں موجود ہیں، اس کے قریب اس نے "حسین آباد" کے نام سے ایک قصبہ اور آباد کیا تھا اور بارہ اماموں کے نام سے ایک لنگر خانہ قائم کیا اور اس کے اخراجات کے لئے چند موضع وقف کئے تھے جو حسین آباد کے کتبہ سے واضح ہوتا ہے حسین آباد کا کتبہ قطب شاہی خاندان کا سب سے بڑا اور سب سے پہلا کتبہ ہے جو ۹۱۹ھ (۱۵۱۴ء) میں نصب ہوا تھا۔ اس کا چربہ ادارۂ ادبیات اردو کے میوزیم میں محفوظ ہے۔ کرڑنگل موجودہ تانڈور سے بجانب مغرب بارہ میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔

دوسرا باب

سلطنت کا آغاز

۸۹۲ھ (۱۴۸۷ء) کے غیر معمولی واقعہ سے، جب کہ اہلِ بیدر نے طبقہ واری رقابت میں محمود شاہ بہمنی کو قتل کرنا چاہا تھا، سلطان قلی کی عظمت دوبالا کردی۔ اہلِ بیدر نے قلعہ پر اچانک دھاوا بول دیا اور قلعہ کے چاروں طرف تمام راستے بند کر دیئے تاکہ باہر سے کوئی مدد نہ مل سکے۔ اگر اس وقت تُرک و ایرانی مدد نہ کرتے تو بادشاہ کا خاتمہ ہو جاتا۔ قلعہ کے اندر حسن علی سبزواری اور سید مرزائی مشہدی کے ساتھ سلطان قلی بھی مع دس سلحدار جوانوں کے موجود تھا، باہر سے امداد آنے تک اس نے حملہ آوروں کو روک رکھا اور بادشاہ کی جان بچائی۔ اس سچی وفاشعاری سے خوش ہو کر بادشاہ نے اس کو "قطب الملک" کا خطاب عطا کیا[1]۔ اس واقعہ کے تین سال بعد یعنے ۸۹۹ھ (۱۴۹۳ء) میں مغربی ساحل پر ایک اور بغاوت کھڑی ہو گئی جو سلطان قلی کے لئے مزید ترقی کا باعث ہوئی[2] یعنے اس کی بہ دولت وہ تمام تلنگانہ کے ممالک کا صوبہ دار بن گیا۔ مغربی ساحل، جس میں گوا وغیرہ شامل تھے، بہادر گیلانی نامی ایک بہمنی امیر کے زیرِ نگین تھا۔ اس سیاسی انتشار کے زمانہ میں یہ بھی اور اُمرائے بہمنی کی طرح سرکش ہو گیا۔ اس کی

---

[1] [2] تاریخ فرشتہ ص ۲۶۶ - تاریخ قطب شاہی ص ۳۷ - ۳۹۔

سرکشی سے نہ صرف بہمنی سلطنت کو شکایت پیدا ہوئی، بلکہ گجرات کی سلطنت کو بھی ایک ٹھیس لگ گئی۔ کیوں کہ اسی سنہ میں بہادر گیلانی نے بنادرِ گجرات کی متعدد کشتیوں کو، جو تجارتی مال سے لدی ہوئی تھیں لوٹ لیا تھا۔ سلطان محمود والیِ گجرات نے محمود بہمنی کے دربار میں سفیر بھیجے اور بہادر گیلانی کی دست درازیوں کی شکایت کی۔ دکن کی حکومت یوں بھی اس کا تدارک ضروری سمجھتی تھی، گجرات کی شکایت سے بہادر کی سرکوبی ناگزیر سمجھی گئی۔ چنانچہ محمود شاہ بہمنی نے بہ ذاتِ خود اس کی سرکوبی کا ارادہ کیا۔ قاسم برید اس کے ساتھ شریک تھا۔ یوسف عادل خاں۔ ملک احمد بحری۔ فتح اللہ عماد الملک وغیرہ نے اپنی فوجوں سے بادشاہ کی مقدور بھر مدد کی۔ بہمنی افواج قلعۂ جام کھنڈی پہنچیں جو بہادر کے زیرِ تصرف تھا قطب الملک دکنی کو جو تلنگانہ کا گورنر تھا اس قلعہ کی تسخیر کے لئے مقرر کیا گیا، لیکن یہ بہت جلد دشمن کے حملہ کا شکار ہوگیا۔ قلعہ پر سے جب گیلانیوں کے حملے شروع ہوئے تو یہ ان کی زد میں آگیا۔ اس کے انتقال کے بعد سلطان قلی کو جس کا خطاب صرف "خواص خاں" تھا، قطب الملک کا خطاب دے کر اس کی جگہ متعین کیا گیا، اور یہ ایسا مبارک خطاب تھا جو دو سو سال تک سلطان قلی کے جانشینوں کا خاندانی لقب ہوگیا۔ اسی خطاب کی بہ دولت بعد کو یہ قطب شاہ ہوگئے۔ قلعۂ جام کھنڈی کی تسخیر کے بعد منگلیر اور مرچ پر قبضہ کیا گیا۔ بادشاہ کی طرف سے پیش قدمی کی گئی اور کلہر پر تسلط کیا گیا۔ قلعۂ پناله میں بہتیرے بہمنی سپاہی کام آئے۔ اس کی تسخیر میں خواجہ جہاں فخر الملک کے ساتھ سلطان قلی قطب الملک بھی تھا۔ اس قلعہ میں بہادر گیلانی کو شکست فاش ہوئی۔ چونکہ خواجہ جہاں اور قطب الملک نے اس میں خاطر خواہ حصہ لیا تھا اس لئے ان کو خطابات دئے گئے اور خوشنودی کا اظہار کیا گیا۔ خواجہ جہاں کے نام کے ساتھ "مخدوم" کا لفظ اضافہ کیا گیا اور جب بادشاہ اس مہم سے فارغ ہوکر بیدر آیا تو محمود شاہ گجراتی کو تحفے وغیرہ بھیجے، اور چونکہ قطب الملک دکنی کے انتقال کی وجہ سے تلنگانہ کی صوبہ داری خالی ہوگئی تھی

اس لئے قطب الملک سلطان قلی کو ان خدمات کے صلہ میں تلنگانہ کا صوبہ دار بنایا گیا اور اس کی قدیم جاگیر میں گولکنڈہ اور ورنگل کا اضافہ کیا گیا۔[1]

سلطان قلی کی ترقی کا پہلا زینہ خواہ کچھ ہی ہو، اس کی متعاقب ترقیوں کا ذمہ دار دکن کا سیاسی انتشار تھا جس سے فائدہ اُٹھاکر یہ اور اس کے معاصر اُمراء اور سپہ سالار خود مختار سلطنتیں قائم کر رہے تھے۔ ان ہی حالات میں سلطان قلی نے بھی ترقی کر کے گولکنڈہ کی خود مختار سلطنت قائم کر لی۔ محمود شاہ بہمنی کا عہد حکومت ایک سیاسی انتشار کا زمانہ تھا جو بہمنی سلطنت کے زوال کا باعث ہوا۔ محمود شاہ بہمنی کے باپ محمد شاہ لشکری کے عہد سے بیدر میں غیر ملکیوں کا تانتا بندھ گیا تھا جن میں تُرک مغل اور ایرانی شامل تھے۔ یوں تو تمام سلاطین بہمنی علم و فن کے بڑے قدر دان تھے، اور جو علماء باہر سے آتے تھے ان کا دل سے خیر مقدم کرتے تھے۔ لیکن محمد شاہ لشکری کے عہد سے حالات بدل گئے، علماء کے علاوہ سیاسی لوگ بھی باہر سے آنے لگے اور بڑی بڑی خدمات پر فائز ہو گئے۔ فرشتہ کے قول کے مطابق محمد شاہ کو ترک غلاموں کا بہت شوق تھا جس کی وجہ سے تُرک و مغل کثیر تعداد میں مُلک میں بھر گئے۔ خلف حسن بصری، محمود گاواں اور حسن علی سبزواری تو نمایاں شخصیتیں تھیں، لیکن ان کے علاوہ بے شمار تُرک و ایرانی بیدر میں جمع ہو گئے اور

---

[1] تاریخ قطب شاہی میں قلعۂ مرچ کی تسخیر بھی سلطان قلی کی طرف منسوب کی گئی ہے، چنانچہ اس تاریخ کا بیان ہے کہ اس قلعہ پر ایک مرہٹہ سردار پوٹہ نائک مسلط تھا سلطان قلی نے اس کا دو بہ دو مقابلہ کر کے اس کو زیر کیا۔ بادشاہ نے اس کارگزاری پر اظہار مسرت کر کے قلعہ کا تمام مالِ غنیمت سلطان قلی کو عنایت کر دیا۔ یہ تمام فوجی کارگزاری سلطان قلی کی غیر معمولی ترقی کا باعث ہوئی اور وہ تمام ممالک تلنگ کا صوبہ دار بن گیا (تاریخ قطب شاہی ص ۴۳)۔ تاریخ قطب شاہی کے خلاف فرشتہ کا خیال یہ ہے کہ سلطان قلی کو اسی موقع پر قطب الملک کا خطاب عطا ہوا تھا (تاریخ فرشتہ ص ۱۷۱)۔

رفتہ رفتہ ملک کی تمام سیاست پر چھا گئے اور یہ لوگ اپنے بڑھتے ہوئے اثر سے کام لے کر فوجی اور غیر فوجی عہدے اپنے ہاتھ میں رکھتے اور اپنے ہواخواہوں کو دیتے تھے، اور ان کے مقابلہ میں دکن کے حقیقی فرزند جن کے آباء واجداد سلطنت دکن کے معمار تھے بے دست و پا ہو کر رہ گئے، دربار میں ان کی کوئی شنوائی نہیں ہوتی تھی۔ محمود شاہ کے عہد میں دربار کا رنگ ایسا بدل گیا کہ اس میں صرف اجنبیوں کا جمگھٹا ہوتا تھا اور اس کے برخلاف اہلِ ملک کی کوئی رسائی نہ تھی۔ یہ کشمکش اور خانہ جنگی کا سامان تھا۔ اہلِ ملک جن کے ساتھ حبشی بھی شامل تھے اپنے حقوق کی بازیافت کے لئے سر بکف میدان میں آگئے اور کشمکش کا بازار گرم ہوگیا۔ یہ صورتِ حال محمد شاہ کے عہد سے، یا زیادہ صحت کے ساتھ کہا جائے تو علاؤ الدین ثانی کے عہد سے رونما ہو چکی تھی۔ خلف حسن بصری اور محمود گاواں اسی فرقہ وارانہ رقابت کے شکار ہوئے اور محمود شاہ کے عہد میں جب اس رقابت کا پیمانہ لبریز ہوگیا تو اہلِ ملک نے ۸۹۲ھ/۱۴۸۷ء میں خود بادشاہ کا خاتمہ کرنے کی تیاری شروع کردی۔ قلعہ کے تمام رکھوالوں کو اپنے ساتھ ہموار کر کے قلعہ پر دھاوا بول دیا اور حالات اس قدر نازک تھے کہ بادشاہ کی جان کے لالے پڑ گئے۔ صرف ترک اور ایرانیوں کی مدد سے فساد فرو ہوا، اور جب بادشاہ کی جان بچ گئی تو اہلِ ملک کو سخت سزا دی۔ مغلوں اور ترکوں کو حکم دیا کہ دکھنیوں اور حبشیوں کے گھروں میں داخل ہو کر ان کو تلوار کے گھاٹ اتاریں اور ان کا مال لوٹ لیں۔ چنانچہ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ دو تین روز تک شہر میں قتل و غارت گری کا بازار گرم رہا۔ چند بزرگوں کے بیچ بچاؤ سے ان کے گناہ معاف ہوئے۔

اس واقعہ سے حکومت کو سبق لینا چاہئے تھا۔ ترک اور ایرانی بادشاہ کی ضرور مدد کرتے تھے، لیکن وہ ملک کے حقیقی ہمدرد نہیں تھے۔ ان لوگوں نے اپنے ذاتی مفاد کے لئے سلطنت کے ٹکڑے کردئے جس کی وجہ سے سلطنت کا شیرازہ بکھر گیا۔ کیوں کہ اول تو دکنی اور حبشی اس قدر کمزور ہو گئے تھے کہ ان میں ابھرنے کی سکت نہ تھی،

دوسرے انھوں نے اپنی بے قدری اور کس مپرسی سے مایوس ہو کر سلطنت کی مدد کرنا چھوڑ دی۔ محمود شاہ نے باہر والوں پر بھروسہ کیا، اور ان لوگوں نے اس کو مجبور کر کے جگہ جگہ اپنی خود مختار سلطنتیں قائم کر لیں۔ فرشتہ کے الفاظ میں قاسم برید نے محمود شاہ کو اس قدر مجبور کر رکھا تھا کہ اس کو بغیر اجازت پانی بھی میسر نہیں آتا تھا۔ چنانچہ مرکزی حکومت پر قاسم برید کے مرنے کے بعد اس کا بیٹا امیر برید قابض ہو گیا اور شاہی خاندان کو ہمیشہ کے لئے بے دخل کر دیا۔ سلطنت کے اردگرد بیرونی صوبوں پر دوسرے امراء اور صوبہ دار قابض ہو گئے اور اس طریقہ سے دسویں صدی ہجری کے اوائل، یا پندرھویں صدی عیسوی کے اواخر میں بہمنی سلطنت کے حصے بخرے ہو گئے۔ بیجاپور، احمد نگر اور برار کے ساتھ گولکنڈے کی قطب شاہی سلطنت بھی قائم ہو گئی۔

سلطنتِ گولکنڈہ کی تاسیس بھی اسی سیاسی انتشار میں ہوئی تھی جو ہم اوپر لکھ آئے ہیں۔ اگرچہ دسویں صدی ہجری کے اوائل میں بہمنیوں کی مرکزی حکومت اس قدر کمزور ہو گئی تھی کہ اس کے تمام صوبے اس کے ہاتھ سے نکل گئے، لیکن نویں صدی ہجری کے اواخر سے ہی سلطنت کا سیاسی شیرازہ بکھرنے لگا تھا، چنانچہ ۸۹۵ھ ۱۴۸۹ء میں احمد نگر، بیجاپور اور برار کے بانیوں نے بالا تفاق سلطان محمود کا نام خطبہ سے خارج کر کے اپنے نام داخل کر دئے اور پانچ وقت نوبت بجوائے جس سے خود مختاری کا اعلان ہوتا تھا[1]۔ اسی طرح سلطان قلی قطب کو بھی تلنگانہ میں جہاں وہ صوبہ دار تھا اپنی خود مختار سلطنت قائم کرنے کے مواقع حاصل تھے۔ احمد نگر، بیجاپور اور برار کے شمالی صوبوں کے مقابلہ میں تلنگانہ کا جنوب مشرقی صوبہ اپنے قدرتی اور جغرافی خصوصیات کی بناء پر ایک جداگانہ سلطنت بننے کے زیادہ قابل تھا، اور یہ علاقہ

---

[1] تاریخ فرشتہ ص ۳۶۷۔ سکہ اور خطبہ کے ساتھ پانچ نوبت بجوانا شاہی خود مختاری کا اعلان سمجھا جاتا تھا۔ بہمنی سلطنت کے زمانہ میں شاہی محلات میں دن میں پانچ دفعہ نوبت بجتی تھی اور یہ شاہی امتیاز تھا۔

مرکزی حکومت سے اس قدر دور تھا کہ کسی گرفت میں نہیں آسکتا تھا لیکن سلطان قلی نے دوسرے صوبہ داروں کی طرح ان حالات سے فائدہ نہیں اُٹھایا۔ سچ تو یہ ہے کہ سلطان قلی کی خود مختاری بہت بعد کو عمل میں آئی۔ پہلی بات یہ ہے کہ جس زمانہ میں احمد نظام شاہ اور یوسف عادل شاہ نے خود مختاری کا اعلان کیا تھا سلطان قلی تلنگانہ کا صوبہ دار ہی نہیں ہوا تھا، کیوں کہ وہ بہادر گیلانی کے خاتمہ کے بعد ۹۰۱ھ/۱۴۹۶ء میں تلنگانہ کا صوبہ دار ہوا تھا، اس وقت اس کی خود مختاری کا کوئی سوال ہی نہ تھا، لیکن صوبہ دار ہونے کے بعد بھی اس نے فوراً اعلانِ خود مختاری نہیں کیا۔ ہم جانتے ہیں کہ تلنگانہ کا صوبہ دار ہونے کے بعد اس نے کافی طاقت فراہم کرلی تھی، بیجانگر کے مقابلوں سے اس کے ہاتھ پیر خوب مضبوط ہو چکے تھے، لیکن اس کے باوجود سلطان قلی کا جذبۂ وفاداری اور حق پرستی اس کو اعلانِ مختاری کی اجازت نہیں دیتا تھا، حالانکہ مرکزی حکومت اس قدر کمزور تھی کہ اس کو کسی مزاحمت کا اندیشہ نہیں تھا۔ شمال کے تمام صوبے خود مختار ہو چکے تھے اور سلطان قلی کو اس سے خاطر خواہ ترغیب ہوتی تھی۔ نیز یہ بھی کہا جاتا ہے کہ شمال کے والیانِ احمد نگر و بیجاپور نے خود مختاری کے لئے بہتیرا اُبھارا، لیکن سلطان قلی اپنے جذبۂ وفاداری سے مجبور تھا۔ اس کی وفاداری اس واقعہ سے زیادہ واضح ہوتی ہے کہ جب سلطان محمود بہمنی نے والی بیجاپور یوسف عادل خاں پر حملہ کر دیا تو سلطان قلی بادشاہ کے مطالبہ پر فوراً چلا آیا اور بادشاہ کی مدد کی[1] حالانکہ اس حملہ سے یوسف عادل خاں کی سرکوبی مقصود تھی کیوں کہ وہ بیجاپور میں شیعہ مذہب رائج کر رہا تھا اور بادشاہ اس حرکت کو دکن کی پُرانی روایت کے منافی سمجھتے تھے، اور اس پر طرّہ یہ کہ سلطان قلی خود شیعہ مذہب کا پیرو تھا اور مذہباً اس کو بادشاہ کی مدد نہیں کرنی چاہئے تھی، لیکن اس نے کبھی وفاداری اور فرض شناسی کو اپنے ہاتھ سے جانے نہیں دیا، اور

---

[1] تاریخ فرشتہ ص ۳۷۲۔

اس کے علاوہ جب سلطان محمود پر بریدیوں کی خود غرضی کی وجہ سے اس قدر عرصۂ روزگار تنگ ہوگیا کہ اس کی روزمرّہ ضروریات پوری نہیں ہوتی تھیں تو سلطان قلی خفیہ طور پر بادشاہ کی خدمت میں گولکنڈہ سے پانچ ہزار ہون بھیجا کرتا تھا، اور جب تک سلطان محمود زندہ رہا ہے غالباً یہ ہون ہر مہینہ برابر بھیجے جاتے تھے[1]۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فرشتہ کو سلطان قلی ..... کے عملی اقتدار سے دھوکا ہوتا ہے، کیوں کہ جس زمانہ سے وہ تلنگانہ کا صوبہ دار مقرر ہوا تھا یہاں وہ بلاشرکتِ غیرے حکومت کرتا تھا لیکن فرشتہ کا یہ بیان کہ سلطان قلی ۹۱۸ھ/۱۵۱۲ء میں خود مختار بن بیٹھا، حقیقت سے دُور پڑتا ہے۔ سلطان قلی کے عملی اقتدار میں تو کوئی شبہ نہیں کیوں کہ نویں صدی کے اواخر میں بہمنی سلطنت اس قدر کمزور ہوگئی تھی کہ اس کے صوبہ دار سب سرتابی کر چکے تھے، لیکن سلطان قلی کی وفاداری کے اور واقعات کے ساتھ جو خود فرشتہ بیان کرتا ہے، خود مختاری کا اعلان ایک بے جوڑ سی بات ہوگی حقیقت یہ ہے کہ سلطان قلی نے اعلانِ خود مختاری اپنے مُربی سلطان محمود بہمنی کی زندگی میں نہیں بلکہ اس کے انتقال کے بعد کیا تھا۔ تاریخ قطب شاہی کا مولف سلطان محمود بہمنی کا انتقال ۹۱۲ھ/۱۵۰۶ء بتاتا ہے[2]۔ اگر یہ سنہ صحیح ہے تو فرشتہ کے بیان کے مطابق سلطان قلی کا اعلانِ خود مختاری سلطان محمود کے انتقال کے چھ سال بعد یعنی ۹۱۸ھ میں ہوا ہوگا، لیکن تاریخ قطبیہ میں سلطان محمود کا سنہ انتقال ۹۲۴ھ/۱۵۱۸ء ہے جو عام طور پر مشہور ہے، اور تاریخ قطبیہ کے مطابق یہی سنہ سلطان قلی کے اعلان خود مختاری کا سمجھنا چاہیے[3]۔

---

[1] تاریخ فرشتہ ص ۳۷۳ - فرشتہ کہتا ہے کہ سلطان قلی نے ۹۱۸ھ/۱۵۱۲ء میں خطبہ سے سلطان محمود کا نام خارج کرکے اپنا نام داخل کردیا اور قطب شاہ کا لقب اختیار کرکے پانچ نوبت بجوائے۔ لیکن گولکنڈہ کی تاریخوں سے اس کی تصدیق نہیں ہوتی۔

[2] تاریخ قطب شاہی ۵۔

[3] تاریخ قطبیہ ص ۲۱۔

چونکہ تاریخ قطبیہ، تاریخ قطب شاہی سے ماخوذ معلوم ہوتی ہے، اس لئے سنہ کے بارے میں اس کا اختلاف کرنا واقعات ثابت کرنے کے لئے زیادہ مستند ہے۔ تذکرۃ الملوک خافی نے اس کا ذکر ہی نہیں کیا ہے بلکہ وہ کہتا ہے کہ دوسرے اُمرائے دکن خود مختار ہو گئے تھے، لیکن سلطان قلی اپنی وفاداری پر قائم رہا۔[1] اس کے علاوہ سلطان قلی نے اپنے مفوضہ پرگنات پر جو اس کی صوبہ داری میں دیے گئے تھے، قناعت کی اور شاہی علاقوں پر کبھی دست درازی نہیں کی۔ حالانکہ اس زمانہ میں دوسرے حکامِ دکن نے کئی شاہی علاقے ہضم کر لئے اور خود سلطان قلی کو ترغیب دی کہ قریب تر علاقوں پر قبضہ کر کے اپنی مملکت کی توسیع کر لے اور اس معاملہ میں مدد کا وعدہ بھی کیا تھا، لیکن سلطان قلی اس اقدام کو سخت بے وفائی خیال کرتا تھا کہ اگر مملکت کی توسیع مقصود ہے تو یہ کام غیر مقبوضہ علاقوں میں جو بہمنی سلطنت کے تسلط میں نہیں آئے ہیں، ہونا چاہئے۔ تاریخ قطب شاہی کے مولف نے تاریخ مرغوب القلوب سے خود سلطان قلی کے یہ الفاظ نقل کئے ہیں جن سے اس کی وفاداری ثابت ہوتی ہے:-

"من خود اندیشہ می کردم کہ مملکت سلطان را بے رضائے او قابض و متصرف گشتن نہایت نمک بہ حرامی است۔ عاقبت رائے صواب نمائے ما بر آں قرار یافت کہ ایں ولایت کہ تو داری سرحدِ مملکتِ تلنگانہ ولایتِ کفار است بہ ہمیں پرگنات کہ سلطان بہ رضا و رغبت بہ تو دادہ قانع شوی و شروع در تسخیر ولایت کفا نمائی کہ اگر بادشاہ حقیقی جل وجلالہ خواستہ باشد کہ تزا مملکت و سلطنت دہد در غزا و جہاد کافراں مظفر و منصور خواہد ساخت بنا بریں اصلاچوں اُمرائے دیگر وخل در مملکت موروثی سلطان نہ کردم و شروع در جہاد کفار نمودہ بہ تسخیر ممالک آنہا پرداختم۔"[2]

---

[1] تذکرۃ الملوک خافی ص ۱۳۷ [2] تاریخ قطب شاہی ص ۷۲۔

نیز "مسجد صفا" کا کتبہ سلطان قلی کی وفا شعاری کو پوری طور سے ثابت کرتا ہے۔ یہ مسجد ۹۲۴ھ/۱۵۱۸ء میں یعنے جس سال محمود شاہ کا انتقال ہوا تھا، تعمیر ہوئی تھی۔ غالباً یہ گولکنڈے کی پہلی مسجد ہے۔ اس کے کتبہ میں سلطان قلی نے اپنے نام کی جگہ سلطان محمود بہمنی کا نام درج کیا تھا۔ کتبہ کے الفاظ یہ ہیں:۔

"بناء ہذا المسجد الجامع فی زمان السلطان الاعظم المتوکل علی اللہ البہمنی ابی الغازی محمود شاہ ابن محمد البہمنی"۔

اگرچہ ۹۰۱ھ/۱۴۹۶ء میں سلطان قلی تلنگانہ کا صوبہ دار ہوا تھا لیکن اس واقعہ کے تقریباً دس سال پہلے سے ہی وہ تلنگانے میں مقیم تھا اور ورنگل میں اس کی سکونت تھی۔ اب رہا یہ سوال کہ گولکنڈہ کب مستقر سلطنت قرار دیا گیا بحث طلب ہے۔ قطب شاہی تاریخوں سے مترشح ہوتا ہے کہ صوبہ داری کے زمانہ میں گولکنڈہ سلطان قلی کا مستقر نہیں تھا بلکہ اس کی قیام گاہ گولکنڈہ سے فاصلہ پر کسی اور جگہ تھی غالباً ورنگل میں اس کا قیام تھا۔ لیکن جہاں تک گولکنڈہ کا تعلق ہے وہ اس وقت پایہ تخت قرار دیا گیا ہے جب کہ سلطان قلی نے خودمختاری کا اعلان کیا تھا، کیوں کہ تمام مورخ بالاتفاق واضح کرتے ہیں کہ سلطان قلی نے قلعہ اور شہر کی تعمیر سے فارغ ہو کر اپنی خودمختاری کا اعلان کیا تھا، اور ظاہر ہے کہ اعلانِ خودمختاری ۹۲۴ھ/۱۵۱۸ء میں ہوا ہے۔ "تاریخ قطبیہ" میں اس کی صراحت موجود ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ قلعہ اور شہر کی تعمیر اس وقت ہوئی ہے جب کہ وہ تلنگانہ کی بعض فتوحات سے فارغ ہو چکا تھا اور اس کی فتوحات کے چرچے سُن کر بے شمار لوگ اس کے اِرد گرد جمع ہو رہے تھے اور ان کی سکونت کے لئے ایک شہر کی ضرورت داعی ہوئی۔ قلعہ اور شہر کی تعمیر کا اصلی محرک وجیانگر کی ہمسایہ سلطنت کے حملوں کا ڈر تھا، اور ایسی جگہ کی تلاش تھی جہاں سے وجیانگر پر آسانی سے حملے ہو سکیں، اور جب فوجیں جنوب سے واپس آئیں تو اُن کو قریب ہی قیام و آرام کا موقعہ مل سکے اس لئے گولکنڈہ نہایت موزوں سمجھا گیا۔ گو یہ تلنگانہ کا مرکز ثقل نہیں ہے، لیکن جغرافی اعتبار سے یہ ایسا موقعہ تھا کہ اس کے ذریعہ سے

ایک طرف بریدی اور عادل شاہی مغربی طاقتوں کا مقابلہ ہوسکتا تھا اور دوسری طرف جنوبی سلطنت وبجیانگر کی روک تھام ممکن تھی۔ گولکنڈہ اور اس کے قلعہ کا وجود پہلے سے پایا جاتا ہے، اس کو قدیم زمانہ میں مانگل[۱] کہتے تھے۔ ممکن ہے کہ یہ قدیم سلطنت چالوکیہ کا ایک صوبہ رہا ہو۔ جب سلطنت چالوکیہ کا خاتمہ ہوگیا اور اس کی جگہ دکن میں منتشر راجدھانیاں قائم ہوئیں تو گولکنڈہ یا مانگل میں بھی ایک راجدھانی قائم ہوگئی تھی، چنانچہ تمام تاریخوں میں یہاں کے ایک راجہ کا نام دیو رائے بتایا جاتا ہے۔ لیکن قرین قیاس یہ ہے کہ گولکنڈہ سلطنت ورنگل کا مشرقی صوبہ ہوگا، اور دیو رائے اصل میں ورنگل کا راجہ ہے جس کے بزرگوں نے گولکنڈہ کا قلعہ بنایا تھا، لیکن اس وقت اس کی دیواریں مٹی کی تھیں بہمنی سلطنت کی توسیع کے ساتھ جب ورنگل تک قبضہ ہوگیا تو گولکنڈہ اس سلطنت میں ضم ہوگیا۔ محمد شاہ اول بہمنی کے عہد میں (۷۵۹ھ ۱۳۵۸ء تا ۷۷۶ھ ۱۳۷۵ء) ورنگل کے راجہ نے گولکنڈہ کا قلعہ بہمنی سلطنت کے سپرد کردیا، اس زمانہ سے یہ سلطنتِ بہمنی کا بہت اہم قلعہ سمجھا جاتا تھا۔ اور ظاہر ہے کہ اس قلعہ کے ذریعہ سے تمام مشرقی حدود کی حفاظت اور مشرق میں فوجی نقل وحرکت ہوتی تھی۔ جس وقت سلطان محمود بہمنی نے سلطان قلی قطب کو تلنگانہ کا صوبہ دار بنایا تو اس صوبہ داری کے ساتھ گولکنڈہ اس کی جاگیر میں دیا گیا تھا جس سال سلطان محمود بہمنی کا انتقال ہوا اسی ۹۲۴ھ ۱۵۱۸ء میں سلطان قلی قطب نے گولکنڈہ کو "محمد نگر" سے موسوم کرکے اپنا پایہ تخت قرار دیا اور اس کو آباد و مستحکم کرنے کی کوشش کی۔ اگرچہ گولکنڈے کی پہاڑی پر قلعہ کا ضروری استحکام پہلے سے موجود تھا اور پچھلے راجگان اس کو قلعہ کے طور پر استعمال کرتے تھے، مگر سلطان قلی قطب شاہ نے اس کو

---

[۱] گولکنڈہ کے ایک کتبہ میں جو نواب نیک نام خاں کی قبر پر نصب کیا گیا ہے اس مقام کو "منگوارم" لکھا گیا ہے ۔ مآثر دکن، بلگرامی ص ۔ ۱۷۴ ۔

اپنے اغراض و مقاصد کے مطابق کافی مضبوط کرلیا اور قلعہ سے باہر ایک مستحکم فصیل

بنائے شہرِ گولکنڈہ

بنا کر شہر گولکنڈہ کی بنا ڈالی۔ اگر قلعہ کی بنیاد قطب شاہی نہیں ہے تو شہر کا قطب شاہی ہونا یقینی ہے جو اس کے آثار قدیمہ سے ظاہر ہے۔ فصیل کے اندر ضروری عمارتیں بنائی گئیں، کچھ محل تعمیر ہوئے اور ایک جامع مسجد بنائی گئی جو اپنے حمام اور دیگر ضروریات سے مزین تھی۔ مسافروں کے لئے مسافر خانوں کا انتظام تھا۔ ان تعمیرات سے شہر کی رونق اس قدر بڑھ گئی تھی کہ یہاں باہر سے ہزاروں آدمی آکر بسنے لگے۔ چنانچہ قطب شاہی تاریخوں کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ "چند روز میں یہ شہر رشکِ ہر دیار و غیرت افزائے سائر بلاد و امصار ہوگیا۔"[1]

فتوحات

تلنگانہ کا بہمنی صوبہ جو سلطان قلی کے تفویض کیا گیا تھا وہ اپنے طول و عرض میں بہت مختصر تھا، مغرب میں اس کے حدود گولکنڈے کے قرب و جوار سے شروع ہوتے تھے اور مشرق میں یہ ورنگل سے آگے نہیں تھے، کیوں کہ ورنگل سے آگے مشرق میں جو اقطاع قطب شاہی سلطنت میں شامل ہوئے ہیں ان میں سے اکثر و بیشتر وہ ہیں جو خود سلطان قلی قطب شاہ نے فتح کئے تھے۔ فی نفسہ تلنگانہ جس کا قدیم نام "آندھرا" ہے جنوبی ہند کا ایک وسیع خطّہ ہے جو اپنے طول و عرض، جغرافی خصوصیات اور قدیم تاریخی روایات کے لحاظ سے خاص اہمیت رکھتا ہے۔ اس کا اصلی پھیلاؤ شمال سے جنوب کی طرف ساحلِ کارومنڈل کے برابر چلا گیا ہے۔ اس کے شمال میں چاندا اور اڑیسہ کا وہ حصہ شامل ہے جو ضلع سکاکول سے ملحق ہے۔ مغرب میں محمد آباد (بیدر) اور جنوب میں کرناٹک واقع ہیں۔ جس وقت سلطان قلی اس تلنگانہ کا صوبہ دار ہوا ہے اس کے تمام مشرقی اقطاع ورنگل سے مچھلی پٹم تک ہندو راجگان کے زیر تصرف تھے اور جنوبی حصہ تمام تر دیجیا نگر کے

---

[1] تاریخ قطب شاہی ص ۵۵ ۔ تاریخ قطبیہ ص ۲۱۔

زیرِ نگیں تھا، لیکن مرکز گیر طاقتیں برابر کام کر رہی تھیں اور حالات ملک کی سیاسی شیرازہ بندی چاہتے تھے کہ مغرب سے مشرق تک منتشر راجدھانیاں جُڑ کر ایک متحدہ سلطنت قائم ہو جائے۔ اس کے علاوہ گولکنڈے کی روز افزوں سلطنت جس کی رہنمائی اب سلطان قلی قطب شاہ کے ہاتھ میں آگئی تھی اپنی محدود چار دیواری میں بند نہیں رہ سکتی تھی، بلکہ اس کو اپنے قدرتی حدود تک پہنچنا ضروری تھا۔ نیز سلطان قلی قطب شاہ ایک دُور اندیش مدبر تھا۔ صوبہ داری کے دوران میں جو تقریباً ۲۴ سال کا زمانہ ہے اس نے تسخیرِ ملک کی بہت زیادہ کوشش نہیں کی، بلکہ صرف زیرِ نگیں علاقوں کا خاطر خواہ انتظام کیا اور اپنے صوبہ میں امن قائم رکھا اس زمانہ میں غالباً وجیانگر کے تابڑ توڑ حملے اور دربارِ بیدر کی سیاسی اُلجھنیں اس کو آگے بڑھنے سے روکتی تھیں۔ صوبہ داری کے زمانہ میں اس کو سلطان محمود شاہ بہمنی کی تائید میں یوسف عادل خاں پر حملہ کرنا پڑا اور دستور دینار کی سرکوبی کے لئے بادشاہ کا ساتھ دیا۔ دستور دینار گلبرگے کا گورنر تھا، محمود شاہ کے عہد میں اس نے بغاوت کی تھی، ممکن ہے کہ یہی اسباب اس کو مشرق میں پیش قدمی کرنے سے روکتے ہوں، لیکن ۹۲۴ھ (۱۵۱۸ء) میں سلطان محمود کے انتقال کے بعد جب وہ خود مختار ہو گیا تو اس نے قلعہ گولکنڈہ کی تعمیر کر کے اس کو مستحکم کر لیا، اور جب اس طرح اس کے کل پُرزے مضبوط ہو گئے تو مشرقی تلنگانہ کے مختلف قلعوں پر وار کرنے شروع کر دیئے۔ جن قلعوں پر اس نے حملے کئے تھے ان میں سب سے پہلے راجمندری کا نام آتا ہے، اس کے محاصرے میں سلطان قلی کے اکثر سیاسی عہدہ دار کام آئے لیکن بالآخر یہ مسخر ہو گیا اور یہاں کا والی وینکٹی نائک گرفتار ہو گیا، اس کے بعد دیور کنڈے کے مضبوط قلعہ کی تسخیر ہو گئی، لیکن اس تسخیر سے وجیانگر کی بلائے بے درماں سر پر آگئی۔ کشن رائے نے جو وجیانگر کا راجہ تھا، سلطان قلی کی بڑھتی ہوئی طاقت کو روکنے کے لئے تلنگانہ کے جنوب مشرقی حدود پر حملہ کر دیا، سلطان قلی کے لئے اس کی مزاحمت آسان نہ تھی، لیکن سلطان قلی کی پختہ کاری سے قطب شاہی فوج

کامیاب ہوگئی اور وجیانگر کی فوج بھاگ گئی۔ اس سے فارغ ہو کر جنوبی قلعہ پانگل پر حملہ کیا گیا جو دریائے کرشنا کے قریب واقع ہے۔ وجیانگر کی پیش قدمی کو روکنے کے لئے اس پر قبضہ کرنا ضروری تھا، بڑے معرکہ کے بعد یہ قلعہ فتح ہوا، اور گھنپور جو پانگل اور کویل کنڈہ کے درمیان واقع ہے بہت توجہ کا محتاج تھا۔ پانگل سے گھنپور کی طرف فوجیں بڑھیں اور اس کو مسخر کیا گیا اور اس کے ساتھ کویل کنڈہ بھی فتح ہوا جو جنوب میں کرشنا اور تنگبھدرا کی وادیوں پر قابو رکھنے کے لئے بہت اہمیت رکھتا تھا۔ یہ دونوں قلعے قریب قریب واقع ہیں۔ ان فتوحات سے فارغ ہو کر سلطان قلی، گولکنڈہ واپس ہوا، لیکن چند سال کے بعد یہ معلوم ہوا کہ کھمم میٹ کا راجہ قطب شاہی حدود پر دست درازی کر رہا ہے تو اس کے مقابلہ کے لئے سلطان قلی نے بذات خود پیش قدمی کی۔ چونکہ کھمم کی فوجی طاقت کافی تھی اس لئے قطب شاہی فوج سے بڑا رن پڑا۔ بالآخر کھمم میٹ کی منہزم طاقت شمالی تلنگانہ کی طاقتوں سے متحد ہوگئی اور سلطان قلی کے مقابلہ میں آمادۂ پیکار ہوگئی۔ جو راجے لڑنے کے لئے متحد ہوئے تھے اُن کے نام تکجارام۔ رام چندر اور ہری چندر بتائے جاتے ہیں۔ ان کی متحدہ فوج تقریباً تین لاکھ پیدل اور تیس ہزار سواروں پر مشتمل تھی، بڑا بھاری رن پڑا سلطان قلی بڑھتا ہوا دریائے گوداوری کے کنارے پہنچ گیا اور اس زور سے یلغار کیا کہ دشمن کے پیر اُکھڑ گئے اور ایک بڑے علاقہ پر قبضہ ہو گیا، بہت سا مالِ غنیمت ملا اور شمالی طاقتوں سے صلح ہو گئی، لیکن جب سلطان قلی گولکنڈہ واپس ہوا تو کشن رائے نے پھر قطب شاہی حدود میں دست درازی شروع کردی، اس کے ساتھ کئی معرکے ہوئے اور بالآخر بلم کنڈہ اور کونڈبیر کے بڑے قلعے مسخر ہو گئے۔ آخر میں نلگنڈہ کی لڑائی قابلِ ذکر ہے جو یہاں کے راجہ ہری چندر سے ہوئی تھی۔ اس قلعہ کا سخت محاصرہ ہوا اور بڑی کش مکش کے بعد یہ فتح ہوا اس طرح تقریباً تیس سال کے دوران میں سلطان قلی نے ساٹھ ستر قلعے اور حصار فتح کئے اور سلطنت کو ورنگل کی سرحد سے مشرق میں اتنا پھیلایا کہ گولکنڈہ باعظمت سلطنت بن گیا۔

توسیع سلطنت سے متعلق خود سلطان کے الفاظ یہ ہیں :-

"الحال قریب شصت سال باشد کہ شب و روز با کافران غزا نمودہ بہ توفیق و تائید او سبحانہٗ از سرحدِ ورنگل تا بندرِ مچھلی پٹم و راج بندری قریب شصت و ہفتاد قلعہ و حصار رفیع و مستحکم مثل قلعۂ کوئل کنڈہ، دیور کنڈہ و پانگل وغیرہ بہ شمشیرِ آب دار در تصرفِ اولیائے دولت ابد پیوند در آوردم"[1]

سنہ ۹۵۰ھ / ۱۵۴۳ء آواخر جمادی الاول میں دکن کے اس جلیل القدر حکمران کا انتقال ہوا۔ اسکی موت کا باعث اس کا بیٹا جمشید قلی تھا، انتقال کے بعد سلطان قلی قطب شاہ کو لنگر حوض قیقی اثر میں سپردِ خاک کیا گیا جہاں اُس کا مقبرہ اب تک موجود ہے۔ سنہ ۹۵۰ھ / ۱۵۴۳ء تک سلطان قلی قطب شاہ نے تقریباً پچاس سال دکن میں حکومت کی۔ منجملہ اسکے ابتدائی چوبیس (۲۴) سال اس کی صوبہ داری کے ہیں اور باقی خود مختاری اور بادشاہی کے۔ اگر اس کا ابتدائی زمانہ بھی اس میں شامل کر لیا جائے جب کہ وہ سلطان محمود کے دربار میں بیدر آیا تھا تو اس طریقہ سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس نے تقریباً ساٹھ سال دکن کی سیاسی خدمت کی تھی جو خود اس کے الفاظ سے ظاہر ہے، کیوں کہ اس ابتدائی دور میں بھی اس نے تلنگانے کے سرکشوں کی سرکوبی کی تھی اور اسی زمانہ سے یہ اس خطۂ ملک کی سیاست سے وابستہ تھا۔ یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ اس پچاس یا ساٹھ سال کی مدت میں سلطان قلی قطب شاہ نے جنوبی ہند کے تمدن و سیاست میں ایک بہت بڑا تغیر پیدا کر دیا۔ یہاں کی منتشر اکائیوں کو ایک رشتہ میں منسلک کر کے اس ملک کی خاطر خواہ شیرازہ بندی کر دی تھی جو تمدنی ترقی کے لئے بہت ضروری ہے اور سچ پوچھو تو یہ تلنگانے کی بہت بڑی خدمت تھی کہ اسکی منتشر اکائیوں کو ایک رشتہ میں منسلک کیا گیا۔ سلطان قلی کی فتوحات سے پہلے یہاں مختلف وحدتیں اور راجدھانیاں تھیں، ہر قلعہ اور حصار ایک راجہ اور نائک کے زیر نگیں تھا، اور اس سے جو نقصان پہنچ رہا تھا وہ ظاہر ہے۔ اب یہ اس کے جانشینوں کا کام تھا کہ اس متحدہ سلطنت کو نظم و نسق کے زیور سے سنوارتے۔

---

[1] تاریخ قطب شاہی ص ۵۰۔

تیسرا باب

عہدِ انتشار

سلطان قلی قطب شاہ کا انتقال جو تقریباً ساٹھ سالہ عہدِ حکومت کے بعد ننانوے ۹۹ سال کی عمر میں ہوا تھا، کسی طرح بے وقت نہیں کہا جا سکتا۔ گولکنڈے کی نوخیز سلطنت مستحکم ہو چکی تھی اور اس کے حدود مشرق میں مچھلی پٹم تک پہنچ گئے تھے، لیکن سلطان قلی کا انتقال ایسے وقت میں ہوا ہے جب کہ سلطان کے متعدد بیٹے دعویدارِ سلطنت تھے اور خانہ جنگی کا پہلے ہی سے سامان ہو چکا تھا سلطان قلی قطب شاہ کے چھ ۶ بیٹے تھے[ا]۔ فرزندِ اکبر حیدر قلی جو سلطان کی جانشینی کے لئے نامزد تھا اور جس کی قابلیت کے ساتھ سلطنت اور والیِ سلطنت کی تمام اُمیدیں وابستہ تھیں باپ کی زندگی میں مرچکا تھا۔ اس کے بعد سلطان قلی قطب شاہ نے مجبوراً حیدر قلی کے دوسرے بھائی قطب الدین کو ولی عہدی کے لئے نامزد کر دیا تھا، لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قطب الدین میں کچھ منچلاپن اور حکومت کرنے کا خاطر خواہ جذبہ نہیں تھا جو سلطنت کو کامیابی کے ساتھ چلانے کے لئے ضروری ہے۔ اس کے مقابلہ میں اس کے دوسرے بھائی جمشید قلی۔ عبدالکریم اور دولت قلی بہت تیز طبیعت اور حوصلہ مند

ا۔ فرشتہ نے سلطان قلی کے صرف تین بیٹے بتائے ہیں جمشید قلی۔ حیدر قلی اور ابراہیم قلی جو صحیح نہیں ہے۔ تاریخ فرشتہ جلد دوم حصۂ سوم ص ۱۶۸۔

واقع ہوئے تھے، اور یہ تینوں سلطنت کے مدعی اور اپنے بھائی قطب الدین کا خاتمہ کر کے سلطنت پر قابض ہونا چاہتے تھے۔ چھٹا اور سب سے چھوٹا بیٹا ابراہیم قلی تھا جو ان سب سے زیادہ لائق تھا۔ اس کے بلند کردار اور قابلیت کی بدولت سلطنت کے بعض کاروبار اس کے سپرد تھے، چنانچہ سلطان قلی کے انتقال کے وقت یہ دیورکنڈہ میں تھا عبدالکریم نے باپ کے خلاف کھلی بغاوت کر دی اور ملک سے باہر جا کر گولکنڈے کے محلات بڑا فساد برپا کر دیا تھا لیکن جب حدودِ سلطنت میں اس کی ایک نہیں چلی تو بیجاپور جا کر باغیانہ مواد فراہم کرنے کی کوشش کی لیکن یہ تمام کوششیں بار ور نہیں ہوئیں اور بالآخر وہ بیجاپور کے علاقہ ہی میں مر گیا! اس کے علاوہ گولکنڈے میں جمشید قلی اور دولت قلی بھی آمادۂ فساد تھے اور ان کی باغیانہ ذہنیت بھی فاش ہو چکی تھی۔ غالباً دولت قلی سے بعض ناشائستہ حرکتیں سرزد ہوئی تھیں اسی وجہ سے لوگ اس کو "دیوانہ ملک زادہ" کہتے تھے۔ اس مخدوش رویہ کی وجہ سے سلطان قلی قطب شاہ نے جمشید قلی اور دولت قلی کو مختلف قلعوں میں قید کر دیا تھا تاکہ یہ دونوں آپس میں ملنے نہ پائیں۔ اور بغاوت کی آگ نہ پھیلے۔ جمشید گولکنڈے کے قلعہ میں اور دولت قلی بھونگیر کے قلعہ میں مقید تھے[1]۔ چونکہ دولت قلی مرکزی حکومت سے بہت دور تھا اس لئے وہ بے بس تھا اور کسی سازش میں حصہ نہیں لے سکا اور بھونگیر ہی کے قلعہ میں عمر بھر قید رہا اور قید ہی میں مر گیا لیکن جمشید قلی کا خود قلعۂ گولکنڈے میں قید ہونا اس کے لئے فائدے سے خالی نہ تھا، اس کے یہاں تمام ذرائع مہیا ہو گئے۔ یہ صرف اسکی جسمانی قید تھی، اس کا دماغ مفسدہ پردازی میں برابر مصروف تھا، اس نے قید میں سے سازش کا جال پھیلا دیا۔ اس وقت اس کو اپنے بھائی قطب الدین سے زیادہ ڈر نہیں تھا کیوں کہ وہ سمجھتا تھا کہ قطب الدین جیسے کمزور آدمی کو راستہ سے ہٹانا کچھ مشکل نہیں ہے۔ سب سے بڑی رکاوٹ اسکے باپ کیطرف سے تھی جو قطب الدین کیطرف

---

[1] تاریخ قطب شاہی ص ۱۰۵۔

مائل تھا۔ جمشید کو یہ ڈر تھا کہ اگر سلطان قلی طبعی موت سے مرے تو قطب الدین کے لئے راستہ صاف ہو جائے گا۔ ممکن ہے کہ زندگی ہی میں وہ قطب الدین کو اپنا جانشین بنا دے، اس لئے جمشید نے خود باپ کو قتل کرنے کی کوشش کی اور ایک شخص میر محمود ہمدانی کو اس کام کے لئے مقرر کیا جس نے موقع پا کر جب کہ سلطان قلی مسجد صفا میں نماز پڑھ رہے تھے حملہ کر کے قتل کر دیا۔ اس وقت یہ مسجد صفا، یا جامع مسجد، جو خود سلطان قلی قطب شاہ کی بنائی ہوئی ہے، زیر تعمیر تھی، یعنے اس کے بعض حصے تعمیر کئے جا رہے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ سلطان اس وقت معماروں کو ضروری ہدایات دے کر نماز میں مشغول ہوئے تھے کہ محمود ہمدانی کے حملہ کا شکار ہو گئے[1]۔ باپ کے قتل کے بعد[2] جمشید قید سے باہر نکلا اور اپنے ہمدردوں کے تعاون سے سلطنت کے تمام کل پرزے اپنے ہاتھ میں لے لئے۔ چونکہ قطب الدین ایک خاموش آدمی تھا، اور اس کے پست حوصلوں کی وجہ سے اس کا کوئی ہمدرد بھی نہ تھا اس لئے اس موقع پر قطب الدین اور اس کے بے حس ہمدردوں کی طرف سے کوئی جنبش نہ ہوئی۔ جمشید کے آدمیوں نے فوراً قطب الدین کے گھر پر دھاوا بول دیا اور اس کے گھر میں گھس کر اس بے گناہ اور بدقسمت ولیعہد سلطنت کو اندھا کر دیا[3]۔

---

[1] تاریخ قطب شاہی ص ۱۷۔ [2] تاریخ فرشتہ مقالہ سوم ص ۱۶۸۔ [3] فرشتہ ان تمام واقعات کو حذف کر کے صرف سلطنت کی حرص و آز کو اس فعل قبیح کا ذمہ دار قرار دیتا ہے۔ اس کے نزدیک جمشید قلی فرزند اکبر تھا اور اس طرح اس کو اپنے کسی دوسرے بھائی سے کوئی خدشہ نہ تھا۔ باپ کو قتل کرنے کی وجہ یہ تھی کہ اس کی عمر غیر ضروری طور پر طویل ہو رہی تھی اور جمشید حکومت کی آرزو میں بوڑھا ہو رہا تھا۔ اس لئے قدرتی طریقہ کار کے مقابلے، جو بہت سست ہوتا ہے، آسان اور سریع ذرائع سے کام لے کر باپ کا اپنے وقت سے پہلے خاتمہ کر دیا اور اپنے حسب منشا تخت حاصل کر لیا۔ لیکن اس بیان کی گولکنڈہ کی تاریخوں سے تصدیق نہیں ہوتی۔

۹۵۰ھ / ۱۵۴۳ء میں جمشید قطب شاہ، جس کا اصل نام "یار قلی جمشید خاں" تھا، گولکنڈہ کے تخت پر بیٹھا اور ۹۵۷ھ / ۱۵۵۰ء تک سات سال حکومت کی۔ یہ سات سالہ عہدِ حکومت تاریخ گولکنڈہ کا ایک تاریک باب ہے۔ اگرچہ تخت نشین ہونے کے بعد جمشید نے رعایا و برایا کو خوش کرنے کی کوشش کی، انعامات سے سرفراز کیا، اپنے نام کا خطبہ پڑھایا، دیگر سلاطینِ دکن کی طرف سے تعزیت و تہنیت وصول ہوئی، مگر اس کے باوجود راعی و رعایا میں وہ خوشگوار تعلقات پیدا نہیں ہو سکے جو اس کے پیشرو عہدِ حکومت میں تھے۔

اول تو جمشید کے ہاتھ دو آدمیوں کے خون سے رنگے ہوئے تھے، ایک طرف تو وہ اپنے باپ کے خون کا ذمہ دار تھا، تو دوسری طرف اپنے بھائی قطب الدین کو اندھا کر کے اس کو بے دست و پا کرنے کی قبیح ذمہ داری اپنے سر لی۔ پدر کشی ایسا قبیح فعل ہے کہ قدیم و جدید کوئی تمدن اس کو گوارا نہیں کر سکتا، بلکہ ہر جگہ اور ہر زمانہ میں ایسے پدر کش ہر طرح مطعون رہے اور عوام میں کبھی ان کی ہر دلعزیزی پیدا نہ ہو سکی۔ جمشید کی گردن پر محمود ہمدانی کا تیسرا خون بھی تھا جس نے انعام و اکرام کے لالچ میں سلطان قلی قطب شاہ کو قتل کیا تھا، لیکن اس کی یہ آرزو پوری نہیں ہوئی یہ بھی جمشید کی تلوار کے گھاٹ اتر گیا۔ محمود ہمدانی، سلطان کو قتل کر کے جب جمشید کے پاس پہنچا تو کہا جاتا ہے کہ اس واقعہ کو چھپانے کے لئے جمشید نے محمود ہمدانی کو اپنی تلوار کے گھاٹ اتار کر اس کو ایک گڑھے میں دفن کر دیا تاکہ یہ راز فاش نہ ہونے پائے، اس طرح یہ قاتل بھی جمشید کی حرص و آز کا شکار ہوا۔

یہ قبیح افعال جو بہت جلد طشت از بام ہو گئے، جمشید کو ملک میں کبھی ہر دلعزیز نہیں کر سکے۔ ملک میں ہر جگہ ان واقعات کے چرچے تھے، بوڑھے اور بچے اس کو طعن و تشنیع سے یاد کرتے تھے۔ اگرچہ نئے بادشاہ کی تخت نشینی ہمیشہ مسرت و شادمانی کا پیام لاتی ہے اور اہلِ ملک خوشی کا اظہار کرتے ہیں، لیکن جمشید قطب شاہ کی تخت نشینی کی رسم بجائے مسرت کے ملک میں غم و غصہ بڑھاتی رہی۔ لوگ سلطان مرحوم کی مظلومانہ موت اور قطب الدین کی بے بسی پر آنسو بہانے لگے۔ امراء و عہدہ دار دربار میں

شریک تو ہوئے لیکن وہ دل سے خوش نہیں ہوئے اور بادلِ ناخواستہ بیعت کی۔ اس سے جمشید کی تلخ طبیعت نے بھی اس فضا کو اور مکدر بنا دیا تھا۔ یہ صحیح ہے کہ جمشید باپ کی زندگی میں ہی بوڑھا ہو گیا تھا جب مرنے کے وقت سلطان قلی کی عمر ننانوے سال کی تھی تو جمشید ساٹھ سال سے کم نہ ہو گا اور یہ ساٹھ سال اس کے کچھ اچھی طرح نہیں گزرے تھے۔ ابتدائی بچپن کا حال تو نہیں معلوم ہو سکتا لیکن سنِ شعور کو پہنچنے کے بعد جب اسکے بُرے جذبات کا پتا چلا تو شروع ہی سے اس کو قید و بند میں رکھا گیا۔ چنانچہ سلطان قلی کے مرنے تک وہ قید میں تھا اور زندگی کے بُرے دن کاٹے تھے۔ قید و بند کی روحانی اور جسمانی تکلیفیں انسان کی طبیعت پر جو بُرا اثر کرتی ہیں وہ ظاہر ہے۔ اس تنگ و تاریک فضا میں جس شخص کی اٹھان اور پرورش ہوئی ہو وہ فراخ دل اور بلند خیال کیسے ہو سکتا ہے۔ چونکہ جمشید کی زندگی کا بڑا حصہ قید اور تلخ کامیوں میں گذرا تھا اسلئے اسکا تنگ دل اور ترش مزاج ہونا لازمی تھا۔ ایک ساٹھ سالہ آدمی تخت نشین ہونے کے بعد اپنی دیرینہ بد مزاجیوں کو جو اس کی طبیعت میں مرکوز ہو چکی تھیں کیوں کر دُور کر سکتا ہے۔ چنانچہ جمشید بہت تُند خو اور بد مزاج بن چکا تھا اور ہر چیز کو تنگ نظری سے دیکھتا تھا اور معمولی سے معمولی بات پر اُمراء و عمائدِ سلطنت پر بُری طرح بگڑتا تھا۔[1] تمام درباری نہ صرف اس سے بیزار ہو گئے تھے بلکہ دربار چھوڑ کر بھاگ گئے اور ان میں اکثر ایسے بھی ذی اثر لوگ تھے جو جمشید کے دوسرے بھائیوں کو تخت نشین کرنا چاہتے تھے اور ہر طرف سازش کا جال پھیلا رہے تھے۔

بہرحال مُلک میں ہر جگہ بے چینی محسوس ہو رہی تھی اور سلطنت کے ذمہ دار عہدہ دار جمشید کے دوسرے بھائیوں کو تخت نشین کرنے کی کوشش میں مصروف تھے جمشید کا چھوٹا بھائی ابراہیم جو دیور کنڈے سے بھاگ کر ملک برید کے پاس بیدر پہنچ چکا تھا، برید کی امداد کے ساتھ گولکنڈے کی دیواروں تک پہنچ گیا۔ اگرچہ یہ حملہ

---

[1] فرشتہ کہتا ہے کہ جمشید بات بات پر لوگوں کو قتل کرتا تھا، اس بیان میں مبالغہ معلوم ہوتا ہے۔ فرشتہ حصۂ سوم ص ۱۶۹۔

برہان نظام شاہ والی احمد نگر کی تائید سے رفع ہوگیا اور ابراہیم ناکام ہو کر بیجا نگر واپس چلا گیا، لیکن ملک برید اس حملے کے بعد سے گولکنڈے کی سیاسی فضا اور جمشید کی کمزوریوں سے کافی طور پر واقف ہوگیا اور اس نے نہایت اطمینان کے ساتھ گولکنڈے کی سلطنت کے مختلف حصوں پر کئی حملے کر دیئے اور سلطنت کو خوب ستایا۔ دولت قلی کی طرف سے علٰحدہ خطرہ لگا ہوا تھا، اگرچہ وہ مرکزی حکومت سے بہت دور تھا، لیکن بعض ہمدرد اس کو قید سے چھڑا کر تخت نشین کرنا چاہتے تھے۔ یہ تمام حالات گولکنڈے کی فضا کو اس قدر تلخ اور مکدر کئے ہوئے تھے کہ سلطنت کو بہت کم اطمینان نصیب ہو سکا، خصوصاً سلطان قلی قطب شاہ کے عین بعد ہی اس تاریک دور کا آنا ایک بین فرق ظاہر کرتا ہے۔ لوگ محسوس کرتے تھے کہ سلطنت گزشتہ دور کی خوشحالی اور طمانیت سے محروم ہوگئی چونکہ جمشید کے قبیح اثرات اس کے مرنے کے بعد بھی باقی رہے تھے اس لئے یہ بے اطمینانی اور خانہ جنگی جمشید کے مرنے کے بعد بھی جاری رہی اور اس وقت تک اس کا سلسلہ چلتا رہا جب تک کہ اس کا بھائی ابراہیم قطب شاہ بیجا نگر سے واپس آکر تخت گولکنڈے پر جلوہ افروز نہ ہوا۔

جمشید قطب شاہ کے عہد کی لڑائیاں | گولکنڈے کی اس ناگوار سیاسی فضا کی وجہ سے جبکہ گھر میں بے چینی اور باہر سے ہر وقت حملوں کا ڈر لگا رہتا تھا اس عہد میں سلطنت کی کوئی توسیع نہ ہو سکی جو حدود سلطنت سلطان قلی قطب شاہ کے عہد میں حاصل ہوئے تھے ان میں کوئی اضافہ نہ ہو سکا۔ اگرچہ سلطنت کی فوجی طاقت وہی تھی جو سلطان قلی قطب شاہ کے عہد میں پائی جاتی تھی، لیکن پہلے عہد کا سا ولولہ باقی نہ تھا، گو جمشید اچھا سپاہی تھا مگر اس کی اخلاقی حالت، فوج کی تنظیم اور کارکردگی پر بری طرح اثر انداز تھی۔ فوجوں میں جو کچھ طاقت تھی وہ یا تو خانہ جنگی کی نذر ہوئی یا دکن کے سلاطین کی باہمی رقابتوں کے بھینٹ چڑھ گئی۔ ان حالات میں سلطنت کی توسیع ناممکن تھی۔

بہمنی سلطنت کے زوال کے بعد جب دکن میں پانچ سلطنتیں قائم ہوئیں تو شروع سے ہی ان میں رقابت کی آگ سلگتی رہی اور بالآخر خانہ جنگیاں برپا ہوگئیں۔ جمشید کا عہد تو بس انھیں لڑائیوں کی داستان ہے اس کی بنیاد سلطان قلی قطب شاہ کے

عہد ہی میں پڑ چکی تھی۔ جمشید قطب شاہ کے عہد میں سب سے پہلی لڑائی اس کے چھوٹے بھائی ابراہیم کے حملہ سے ہوئی جو اپنے باپ کی زندگی کے آخری زمانہ میں دیور کنڈے میں تھا، جمشید اس کا بھی خاتمہ کرنا چاہتا تھا، کیوں کہ یہ اپنے تمام بھائیوں سے زیادہ لائق تھا اور جمشید کو اس سے بہت ڈر لگتا تھا، لیکن ابراہیم دیور کنڈے سے بھاگا اور والئ بیدر کی مدد سے گولکنڈے پر حملہ آور ہوا، اس کا یہ اقدام جمشید کے لئے کچھ کم تشویشناک نہ تھا، مگر احمد نگر کی امداد سے جمشید کامیاب ہوگیا اور ابراہیم کو شکست ہوگئی۔ والئ احمد نگر برہان نے بروقت امداد کردی۔ جمشید اس وقت امداد سے اس قدر خوش ہوا کہ خود احمد نگر گیا، اور برہان سے مل کر اپنی احسانمندی ظاہر کی۔ احمد نگر میں جمشید کی بڑے تزک و احتشام کیساتھ آؤ بھگت ہوئی آفتاب گیری اور "شاہ" کا خطاب پیش کیا گیا۔ اس نے دعوتیں تو قبول کیں، لیکن شاہی اعزازات قبول نہیں کئے اور اس کے جواب میں حسب ذیل اشعار کہے تھے:۔

مرا عیست باچترِ شاہی نیاز — خطابے نہ خواہم بہ عمرِ دراز
کہ شاہانِ مُلکِ دکن بالتمام — گرفتند از آں چترِ شاہی بنام
کہ از روے مردی و مردانگی — ہماں زورِ شمشیر و فرزانگی
ربودند گوے از سپہرِ دورنگ — زِ میدانِ مردی بہ چوگانِ جنگ
چو من ضرب دست شجاعت بہ شاہ — نمایم بگیرم خطاب و کُلاہ
من آنگہ کنم چترِ شاہی قبول — کہ گیرم زِ دشمن بہ عونِ رسول

چونکہ اس زمانہ میں سرحدی نزاع اور خصوصاً شولاپور کی وجہ سے بیجاپور اور احمد نگر کے تعلقات کشیدہ ہو رہے تھے اس لئے برہان نظام شاہ کے لئے جمشید قطب شاہ کی دوستی اور اتحاد بے معنے نہ تھے۔ غالباً یہی وجہ تھی کہ احمد نگر کے رہنمائے سیاست شاہ طاہر نے برہان کو برید کے مقابلہ میں گولکنڈے کی مدد کے لئے اُبھارا تھا، اور جب جمشید برہان سے ملنے کے لئے احمد نگر گیا تو وہاں اس کی حد سے زیادہ آؤ بھگت ہوئی اور اس کے جذبۂ خودداری کی داد دی گئی اور یہ تمام ذرائع حصولِ اتحاد کے لئے استعمال کئے گئے، اور اتفاق سے اسی زمانہ میں جب کہ

جمشید احمد نگر میں مہمان تھا شولا پور پر حملہ کرنے کا مسئلہ گرم تھا اور فوجی تیاریاں ہو رہی تھیں، جمشید کی آمد بہت غنیمت سمجھی گئی۔ چنانچہ برہان نظام شاہ نے ایک طرف جمشید قطب شاہ کو اپنے ساتھ لیا اور دوسری طرف اپنے ہمسایہ رئیس عماد الملک کو شریکِ کار کر کے غالباً ۹۵۱ھ / ۱۵۴۴ء میں شولا پور پر دھاوا بول دیا۔ ابراہیم عادل شاہ اول اس سیاسی اتحاد سے بالکل بے خبر تھا، اس کو توقع نہ تھی کہ دکن کی تین سلطنتوں کی متحدہ فوجیں اچانک شولا پور پر چڑھ دوڑیں گی۔ چونکہ ابراہیم عادل شاہ اتنی زبردست فوج کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا اس لئے دشمنوں کی توجہ کو پراگندہ کرنے کے لئے فوراً احمد نگر کے مقبوضہ ضلع پرینڈہ پر حملہ آور ہو گیا اور دونوں حریف فوجیں پرینڈہ پر برسرِ پیکار ہو گئیں۔ برید کی فوجیں بھی ابراہیم عادل شاہ کے ساتھ تھیں۔ بیجاپور کی فوجوں نے اس قدر ڈٹ کے مقابلہ کیا کہ معرکہ بہت سخت ہو گیا اور جنگ طول کھینچنے لگی۔ اس موقع پر جمشید اور اس کی فوجوں نے بڑا کام کیا، اس نے آگے بڑھ کر دشمن کی فوج پر کئی وار کئے اور اس کو تتر بتر کر دیا۔ بالآخر ابراہیم اور برید میدان چھوڑ کر بھاگ گئے، مگر جمشید نے برید کا بیدر کی دیواروں تک تعاقب کیا اور بہت سا مالِ غنیمت لے کر گولکنڈہ واپس ہوا۔ جمشید کی یہ امداد اور اس کا دلیرانہ حملہ احمد نگر کے لئے باعثِ ممنونیت تھا، اس لئے احمد نگر کی سلطنت نے گولکنڈے کی رفاقت کبھی نہیں چھوڑی۔

اس شکست کے بعد علی برید خاموش نہیں رہا، اور احمد نگر سے زیادہ گولکنڈے سے انتقام لینے کی کوشش کی، کیوں کہ وہ سمجھتا تھا کہ اس ہزیمت میں جمشید کا زیادہ حصہ تھا، اور اس سے بڑھ کر یہ کہ جمشید نے بیدر کی دیواروں تک برید کا سخت تعاقب کیا تھا، اس لئے برید نے غالباً ۹۵۲ھ / ۱۵۴۵ء میں گولکنڈے پر حملہ کر دیا، لیکن گولکنڈے میں قوتِ مدافعت کافی تھی، جمشید نے اس موقع پر ایک خاص تدبیر سے کام لیا، گولکنڈے میں تو اس کی ہلکی سی مدافعت کی اور قلعہ کو دوسرے سپہ سالاروں کے سپرد کر کے خود دوسرے راستوں سے بیدر پہنچ گیا اور وہاں حملہ کر بیٹھا جب برید کو

اس حملے کی خبر پہنچی تو وہ فوراً بیدر کو بچانے کے لئے بھاگا۔ پٹن چیرو اور کلپا گور کے درمیان جمشید اور بریدی فوجوں کا سامنا ہوا، بہت سخت لڑائی ہوئی۔ کہا جاتا ہے کہ عین لڑائی میں جمشید ہاتھی سے نیچے اتر گیا اور اس کی عدم موجودگی سے کچھ دیر کے لئے فوج میں بدحواسی پھیل گئی، لیکن بالآخر گولکنڈے کی فوجیں دشمن پر غالب آگئیں اور یہ دونوں فوجیں اپنے اپنے مستقر کو واپس ہو گئیں۔[1]

ان متعدد ہزیمتوں کے باوجود برید چین سے نہیں بیٹھا، بلکہ اس کا جذبۂ انتقام ہر روز بڑھتا ہی گیا۔ اس کی کوشش یہ تھی کہ کسی طرح گولکنڈے کی قوت توڑے۔ چونکہ ابراہیم عادل شاہ والی بیجاپور سے اس کا اتحاد تھا اس لئے بیجاپوری فوج کی مدد سے غالباً ۹۵۳ھ ۱۵۴۶ء میں قلعۂ میدک پر قبضہ کر لیا اور وہاں چالیس ہاتھی اور سات ہزار ہون مالِ غنیمت حاصل کئے۔ جمشید نے اس کا جواب دینے کی کوشش کی۔ پہلے تو بیدر پر حملہ کرنا چاہا، لیکن آخر کو کولاس پہنچ کر بریدی سلطنت کے مختلف حصوں پر چھاپے مارنے شروع کئے تاکہ بریدی پریشان ہو کر میدک چھوڑ دیں۔ برید آٹھ ہزار فوج لے کر مقابلہ کے لئے آیا۔ تارابن کھیڑ کے قریب یہ دونوں فوجیں ملیں اور بڑے گھمسان کا رن پڑا۔ جمشید نے بڑھ کر حملے کئے تو بریدی فوج کے بہت سے پہلو منتشر ہو گئے۔ چنانچہ بہت دنوں کے لئے میدان جنگ میں خاموشی چھا گئی۔ دوسری بات یہ ہوئی کہ عین الملک کا بیٹا جو برید کے بڑے سپہ سالاروں میں سے تھا برید کو چھوڑ کر گولکنڈے کی فوجوں سے مل گیا۔ اس دوران میں گولکنڈے کے بڑے مشہور جنرل جگدیو رائے نے جس کو تاریخوں میں "اعظم جگدیو راؤ" کے نام سے لکھا جاتا ہے، جمشید کو یہ رائے دی تھی کہ کولاس کے قرب و جوار میں قدرتی پہاڑ پر ایک نیا قلعہ تعمیر کر کے اپنی طاقت بڑھائے۔ یہ بہت اچھی تجویز تھی جس کو بادشاہ نے منظور کر لیا اور جگدیو راؤ نے نئے قلعہ کی تعمیر شروع کر دی اور یہ نیا قلعہ تارابن کھیڑ کی جنگ کے وقت مکمل ہو چکا تھا،

---

[1] تاریخ قطب شاہی ص ۱۱۴۔

اس اثنا میں جب یہ جنگ ذرا تھم گئی تو جمشید اس قلعہ کے معائنہ کے لئے کولاس گیا۔ اس کی عدم موجودگی سے فائدہ اُٹھا کر برید نے اچانک حملہ کر دیا۔ گولکنڈے کے جنرل جن میں عین الملک کا بیٹا بھی تھا کھانے پینے میں مصروف ہو گئے، ان کی اس غفلت سے گولکنڈے کی فوجوں کو بُری طرح شکست ہوئی اور عین الملک کا بیٹا مارا گیا، منہزم فوج کولاس تک بھاگ آئی۔ جمشید نے فوراً متفرق فوجوں کو یکجا کر کے برید پر پیش قدمی کی، لیکن برید اس مقابلہ کے لئے تیار نہ تھا، بیدر بھاگ گیا۔ جمشید نے نارائن کھیڑ، حسن آباد وغیرہ پر قبضہ کر لیا اور قلعۂ کولاس کو فوجوں اور اسلحہ سے مستحکم کیا اور یہ تمام ولایت جگدیو رائے کے تفویض کر کے گولکنڈہ واپس ہو گیا۔

اگرچہ برید کو ان لڑائیوں میں شکست ہوتی رہی، لیکن اس کا بار بار حملہ کرنا گولکنڈے کے لئے پریشانی کا باعث تھا جس کی وجہ سے سلطنت کو ہر وقت چوکس رہنا پڑتا تھا۔ جمشید اس صورتِ حال پر غور کرنے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا کہ ہمیشہ کے لئے برید کا استیصال کر دیا جائے اور برہان نظام شاہ کو اس معاملے کی طرف توجہ دلائی کہ کسی طرح برید کا خاتمہ کرنا ضروری ہے ورنہ اس کی ریشہ دوانیوں اور بار بار کے حملوں سے دکن کا سیاسی مطلع ہمیشہ غبار آلود رہے گا اور کسی بھی سلطنت کو اطمینان حاصل نہ ہوگا۔ برہان نے جمشید کی اس رائے سے اتفاق کر لیا، اور تجویز یہ ہوئی کہ چاروں طرف سے حملہ کر کے برید کے تمام علاقے مسخر کر لینے چاہئیں۔ چنانچہ اسی زمانے ۹۵۳ھ ۱۵۴۶ء میں برہان نے بھی قلعۂ اودسہ اور اودگیر پر حملہ کر ہی دیا، اور اِدھر سے جمشید قطب شاہ اپنی فوجوں کو لے کر کولاس پہنچ گیا۔ پہلے اودسہ جا کر برہان نظام شاہ سے ملاقات کی جو دونوں سلاطین کے لئے مسرت کا باعث تھی اور اس کے بعد برہان کی رائے سے قلعۂ میدک پر جو ابھی تک برید کے قبضہ میں تھا، حملہ کر دیا۔ قلعہ کے محاصرہ میں بہت دیر لگی اور بڑی خونریزی کے بعد یہ قلعہ فتح ہوا۔ اس قلعہ کی تسخیر سے جمشید کو بہت سا مالِ غنیمت حاصل ہوا۔ دوسری طرف برہان کے حلیف عماد شاہ نے ادسہ اور اودگیر فتح کر لئے۔ جب اس طرح برید کو سخت پریشانی

لاحق ہوئی تو وہ بیجاپور سے مدد کا طالب ہوا۔ ادھر بیجاپور اور احمد نگر میں رقابت تھی اس لئے اول الذکر سلطنت برید کے اتحاد کو ضروری سمجھتی تھی۔ چنانچہ ابراہیم عادل شاہ نے برید کی امداد کے لئے پانچ ہزار کی ایک مضبوط فوج روانہ کردی، اور یہ عادل شاہی جنرل اخلاص خاں کی سرکردگی میں آئی۔ برید اس فوج کے ساتھ قلعۂ کولاس پر حملہ آور ہوگیا، بڑا بھاری رن پڑا جس کو جمشید قطب شاہ کے عہد کا بڑا معرکہ کہنا چاہیے۔ جمشید نے اس مقابلہ کے لئے اپنی فوج کی باضابطہ صف آرائی کی اور خود قلب لشکر میں کھڑا رہا، اور میمنہ و میسرہ پر شفقت خاں، عین الملک اور جگدیو راؤ کو متعین کیا گیا۔ دشمن کی طرف سے برید اور اس کے معاون جنرل اخلاص خاں نے خاطر خواہ زور دکھایا، لیکن گولکنڈے کی فوجوں کے سامنے ان کی ایک نہ چلی۔ جگدیو راؤ اور عین الملک کی کارگزاری قابل تعریف تھی۔ برید کو بڑی ہزیمت ہوئی اور وہ بیدر بھاگ گیا جمشید بہت کچھ مال غنیمت حاصل کرکے گولکنڈہ واپس ہوگیا۔[1] اگرچہ کولاس کی اس لڑائی میں برید کو خاطر خواہ شکست ہوئی تھی، لیکن اس کی طاقت ابھی باقی تھی اور خطرہ جوں کا توں تھا کیوں کہ عادل شاہ اس کی پشت پناہی کرتا تھا، اگر عادل شاہ اس کے پیچھے نہ ہوتا تو ۹۵۲ھ کی لڑائیوں میں جو ہم اوپر دیکھ آئے ہیں برید کی سلطنت کا خاتمہ ہوجاتا۔

۱۵۴۵ء
جمشید گولکنڈہ واپس تو ہوگیا لیکن اس کو برید کی فکر لگی رہی۔ برید کے ساتھ اس وقت بیجاپور کا خطرہ اور تھا کیوں کہ بیجاپور کی سلطنت برید کی تائید کررہی تھی، اس کے ہوتے ہوئے برید والا منصوبہ کیوں کر پورا ہوتا، اور سچی بات یہ ہے کہ بریدشاہی اور عادل شاہی حکمران ہی دکن کی سیاست کو گندہ کر رہے تھے۔ چنانچہ اس معاملہ میں جمشید نے برہان نظام شاہ سے مشورہ کیا کہ بیجاپور کو برید سے جدا کرنے کی کیا تدبیر ہے۔ نظام شاہ سے کہا گیا کہ بیجاپور سے اس معاملے میں بات چیت کرے۔ اس زمانہ میں احمد نگر اور بیجاپور کے تعلقات کچھ زیادہ کشیدہ نہ تھے اسلئے برہان نظام شاہ نے ابراہیم عادل شاہ کو اس مضمون کا خط لکھا کہ برید کے شر و فساد سے ہمیشہ دکن کا مطلع غبار آلود رہتا ہے

---

[1] تاریخ قطب شاہی ص ۱۲۱ - ۱۲۲۔

اس سے نہ صرف بے گناہ خلق اللہ کا ناحق خون ہوتا ہے بلکہ سلاطین دکن علیحدہ پریشان ہوتے ہیں۔ اس لئے برید کے استیصال میں سب کا فائدہ ہے۔ ابراہیم نے اس تجویز سے اتفاق کرلیا اور برید کا ساتھ چھوڑ کر احمد نگر اور گولکنڈے کی تائید پر آگیا۔ اس بات پر سب متفق ہوئے کہ نظام شاہ قندھار پر جو برید کا بڑا قلعہ تھا حملہ کرکے مسخر کرے اور ابراہیم سے یہ کہا گیا کہ بجائے خاموش بیٹھنے کے وجیانگر کی ہندو سلطنت پر حملہ کرکے جو ہاتھ لگے حاصل کرے۔ چنانچہ ۹۵۴ھ/۱۵۴۷ء میں سلاطین دکن نے پھر چوطرف اپنی فوج کشیاں شروع کردیں۔ برہان نے فوراً پیش قدمی کرکے قندھار پر قبضہ کرلیا۔ برید پریشان ہوکر امداد کے لئے بیجاپور بھاگ آیا۔ اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ اُس وقت اس کے شر وفساد کا بھانڈا پھوٹ چکا تھا اس لئے ابراہیم نے اس کی کوئی مدد نہ کی، اُلٹے اس کو بیجاپور میں گرفتار کرلیا اور خود وجیانگر کی طرف پیش قدمی کی اور یہاں بہتیرے قلعے فتح کرلئے۔

لیکن اس اثناء میں احمد نگر اور بیجاپور کی دیرینہ رقابت پھر عود کر آئی۔ برہان کو یہ ڈر ہوا کہ وجیانگر کی فتوحات سے بیجاپوری طاقت غیر معمولی طور پر بڑھ جائے گی اور احمد نگر کے لئے خطرناک ہوگی۔ اس بڑھتی ہوئی طاقت کا فوری سدباب کرنے کے لئے برہان نے شولاپور پر حملہ کردیا۔ ابراہیم بیجاپور کو چھوڑ کر شولاپور کو بچانے کے لئے دوڑ آیا اور یہ دونوں جمشید قطب شاہ کو امداد کے لئے بلانے لگے اور برید علیحدہ جمشید سے التماس کررہا تھا کہ خدا کے لئے اس کو قید سے چھڑایا جائے۔ جمشید کے لئے یہ صورتِ حال بہت نازک تھی۔ چونکہ احمد نگر سے اس کے دیرینہ تعلقات تھے، اس کے مقابلہ میں وہ بیجاپور کی کیسے مدد کرتا۔ لیکن برید کی لجاجت سے متاثر ہوکر اس کو رہا کرانے کی کوشش کی اور اس غرض کے لئے ذرا فریب سے کام لیا۔ بیجاپور کے ایلچی کو مدد کی ترغیب دلائی کہ میں اس شرط پر مدد کرسکتا ہوں کہ برید کو رہا کردیا جائے۔ اس لالچ میں ابراہیم نے برید کو رہا کردیا۔ جب برید

رہا ہو گیا تو امداد کا سوال پیدا ہوا۔ تمام عمائدِ سلطنت نے جمشید کو یہ رائے دی کہ اس وقت کسی کی مدد نہیں کرنی چاہیئے بلکہ برید کو ساتھ لے کر گولکنڈے کی طرف کوچ کر دینا چاہیئے۔ چنانچہ جمشید نے اس وقت کسی کی مدد نہیں کی بلکہ گولکنڈے کیطرف مراجعت کر دی۔ چونکہ بیدر راستہ میں پڑتا تھا اس لیے کچھ دنوں وہاں قیام کیا۔ برید نے اظہارِ ممنونیت میں جمشید کی بڑی آؤ بھگت کی اور نذرانے پیش کئے جن میں قیمتی جواہرات بھی تھے۔ جمشید نے یہ جواہرات ملازمین میں تقسیم کر دئے اور خود گولکنڈہ واپس ہو گیا۔ یہ سلاطینِ دکن کی رقابت کا چھوٹا سا مرقع ہے جس سے نہ برید کا خاتمہ ہو سکا اور نہ بیجاپور میں فتوحات حاصل ہو سکیں بلکہ شولاپور میں جنگ کی آگ برابر بھڑکتی ہی رہی۔[1]

بیدر سے واپس آنے کے بعد جمشید کے دو تین سال آرام سے گزرے اور یہ اس کے اطمینان کا زمانہ تھا۔ چار پانچ سال کی متواتر جنگ و جدال کے بعد اسکو اب تھوڑا سا آرام نصیب ہوا تھا اور یہ بھی بہت دنوں تک نہیں رہا۔ دو سال کے بعد

---

[1] اس واقعے کے متعلق فرشتہ نے نہایت مبالغہ سے کام لیا ہے۔ اس کا بیان ہے کہ اس موقع پر جمشید نے احمد نگر کی امداد کے لئے بیجاپوری علاقوں پر حملہ کر دیا تھا، اور کوکن کے علاقہ میں ایک قلعہ بنا لیا تھا۔ ابراہیم نے برہان اور والی وجیانگر رام راج سے صلح کر کے جمشید کا مقابلہ کیا اور اس کو شکست دے دی۔ بیجاپور کے مشہور جنرل اسد خاں لاری نے اس کا گولکنڈہ کی دیواروں تک پیچھا کیا، چنانچہ فرشتہ کے بیان کے مطابق خود جمشید اس لڑائی میں زخمی ہو گیا تھا، اور اس کا ہونٹ اس بُری طرح کٹ گیا کہ وہ کھانے پینے سے معذور ہو گیا تھا، اور دوسروں کے سامنے کھانا نہیں کھاتا تھا۔ لیکن گولکنڈے کی تاریخوں سے ان واقعات کی تصدیق نہیں ہوتی۔ بیجاپور اور اسد خاں لاری کی مدح سرائی میں یہ فرشتہ کا مبالغہ معلوم ہوتا ہے (تاریخ فرشتہ ص ۱٦۹)۔

جمشید بڑے سخت مرض میں مبتلا ہو گیا جو مہلک ثابت ہوا۔ فرشتہ اس کو مرضِ دق لکھتا ہے۔ لیکن تاریخ قطب شاہی کے الفاظ میں یہ مرض سرطان تھا جس کے اثر سے وہ بالآخر ۹۵۷ھ / ۱۵۵۰ء میں فوت ہو گیا۔ صرف سات سال اس نے حکومت کی اور سلطان قلی قطب شاہ کے مقبرہ کے قریب دفن کیا گیا۔ اس کی قبر پر جو گنبد ہے وہ اپنی تعمیر کاری میں انوکھا ہے۔

یہ تو جمشید کے عہد کی لڑائیاں ہوئیں، اب رہے اس کے اخلاق و عادات اور اچھے کام تو ان پر پردہ پڑا ہوا ہے۔ چونکہ حصولِ تخت و تاج کے لئے جمشید سے قبیح افعال سرزد ہوئے تھے اور وہ کچھ تند مزاج بھی واقع ہوا تھا اس لئے ان برائیوں میں اس کے اچھے اوصاف بھی نظروں سے اوجھل ہو جاتے ہیں۔ لیکن ان برائیوں سے قطع نظر کر کے دیکھا جائے تو اس میں بہت سے اوصاف ایسے پائے جاتے ہیں جو سراہنے کے قابل ہیں۔ فوجی تنظیم اس کی نہایت اچھی تھی اور وہ خود بھی اس قدر جری سپاہی واقع ہوا تھا کہ فوج میں بہ ذاتِ خود حصہ لیتا تھا۔ اس نے اکثر لڑائیوں میں خود پیش قدمی کی اور آگے بڑھ بڑھ کے وار کئے اور دشمن کے دل توڑ دیئے۔ چنانچہ اس دلیری اور جرأت کا نتیجہ تھا کہ سوائے نارائن کھیڑ والی جنگ کے جہاں عین الملک کے بیٹے کی غفلت سے کام خراب ہوا، گولکنڈے کی فوجوں کو کبھی شکست نہیں ہوئی اور دکن کے سلاطین ہمیشہ اس کی امداد کے طالب رہے۔ اس چیز کو جمشید اپنے لئے بڑا طغرائے امتیاز سمجھتا تھا۔ جب برہان نے اس کو خطاب اور شاہی اعزازات دینے چاہے تو اس نے لینے سے انکار کر دیا اور کہا کہ:-

"مجھے اس کی ضرورت نہیں، مجھ میں شجاعت اور سپاہیانہ جوہر ہیں، یہی میرے لئے طغرائے امتیاز ہیں۔"

اس سے نہ صرف اس کی شجاعت بلکہ انتہائی خودداری ثابت ہوتی ہے۔

ان اوصاف کے ساتھ جمشید قطب شاہ میں علمی قابلیت بھی تھی، وہ ایک اچھا شاعر تھا بعض دفعہ اس نے فی البدیہ اشعار بھی کہے ہیں۔

یہ شجرہ "کلام الملوک" مؤلفہ میر سعادت علی رضوی صاحب سے لیا گیا ہے:-

قرا خاں
اغز خاں
توزہ بیگ
قرا تورامش
قرا بیرم
قرا المنصور
قرا تورسن
قرا محمد
قرا یوسف
امیر زادہ اسکندر
امیر زادہ الوند
پیر قلی

- اویس قلی
  - سلطان قلی قطب الملک (قطب شاہ)
    - حیدر خاں
    - قطب الدین
    - یار قلی (جمشید قطب شاہ)
      - سبحان قلی
    - عبدالکریم
    - دولت خاں (دیوانہ ملک زادہ)
    - ابراہیم قلی قطب شاہ
- اللہ قلی

حصۂ دوم

سلطنت کا استحکام

چوتھا باب

ابراہیم قطب شاہ تخت نشینی سے پہلے

ابو المظفر ابراہیم قطب شاہ جو ۹۵۷ھ ۱۵۵۰ء میں تخت نشین ہوا گولکنڈے کی سلطنت کا حقیقی معمار ہے۔ اس کو گولکنڈے کی تعمیر اور توسیع کا واقعی ذمہ دار سمجھنا چاہئے لیکن یہ ان حکمرانوں میں سے ہے جن کو حصولِ سلطنت تو کجا خود اپنی بقا کے لئے زندگی کے سخت تلاطم سے گزرنا پڑا تھا۔ اس کی ابتدائی زندگی کشاکشِ زیست کا ایک دل چسپ مُرقع ہے۔ جب گولکنڈے کے بانی مبانی سلطان قلی قطب شاہ کا انتقال ہوا تو اُس کے جانشینوں کی خود غرضی کی وجہ سے گولکنڈے کے درو دیوار پر تاریکی چھاگئی، سیاست کے تارو پود جگہ جگہ سے بکھرنے لگے۔ راعی و رعایا کے خوشگوار تعلقات باقی نہ تھے۔ لائق لوگ یا تو پابہ زنجیر تھے یا مُلک چھوڑ کر بھاگ رہے تھے۔ یہ جمشید قطب شاہ کے عہد کا ایک نچوڑ ہے۔ ابراہیم قطب شاہ انھیں افسوسناک حالات کا شکار تھا۔ اس کو پہلے اپنی جان بچانے کے لئے سلطنت کے حدود سے دُور بھاگنا پڑا، ایک غیر مُلک میں پناہ لینی پڑی، جلا وطنی کی تمام مشکلات برداشت کرکے اور مختلف مزاحمتوں کا مقابلہ کرکے اُس کا گولکنڈے کے تخت پر جلوس کرنا ایک افسانہ معلوم ہوتا ہے۔ اگر اس کو تخت نہ ملتا تو قطب شاہی خاندان کا بہت جلد خاتمہ ہو جاتا اور گولکنڈے کی دو سو سالہ عظمت کبھی نہ پیدا ہوتی۔

ابراہیم قطب شاہ، سلطان قلی کا چھٹا اور سب سے چھوٹا بیٹا تھا۔ اس کی

پاکیزہ زندگی بچپن سے اس کو ممتاز رکھتی تھی۔ اپنے دوسرے بھائیوں کے خلاف اس ہونہار شہزادے نے شروع ہی سے کچھ ایسی سنجیدگی اور باپ کے ساتھ وفاشعاری ظاہر کی کہ باپ اس سے بہت خوش تھا۔ ایسی تاریک فضا میں جب کہ اس کے بڑے بھائی سلطنت کے خواب دیکھتے تھے اور باپ کے خلاف بغاوت کرنے سے دریغ نہیں کرتے تھے ابراہیم کی سنجیدگی اور سعادت اس کی آیندہ عظمت کا پیام دیتی تھی۔ اس کے پاکیزہ رجحانات کو دیکھکر سلطان قلی قطب شاہ نے نہ صرف اسکی تعلیم و تربیت میں کافی دلچسپی لی بلکہ عملی تجربوں کے لئے سلطنت کے بعض انتظامی کام بھی اسکے تفویض کر رکھے تھے۔ چنانچہ سلطان قلی کے آخری زمانے میں یہ دیورکنڈے میں متعین تھا[1] تاکہ وہاں امن قائم کرے۔ چونکہ یہ مشرقی اضلاع سلطان قلی کے عہد میں فتح ہوئے تھے اس لئے یہاں خاطر خواہ امن نہیں تھا اور کچھ تعزیری انتظامات کی ضرورت تھی۔ یہ بتانا مشکل ہے کہ ابراہیم دیورکنڈے میں کب مامور کیا گیا تھا لیکن تاریخ کا یہ بیان کہ باپ کے انتقال کے وقت ابراہیم سنِ شعور کو نہیں پہنچا تھا[2] صحیح نہیں معلوم ہوتا کیونکہ دیورکنڈے کے انتظامات کی تفویض جو اس تاریخ سے معلوم ہوتی ہے وہ اس چھوٹی سی عمر میں کہاں ممکن ہے۔ نہ صرف نظم و نسق، بلکہ اس انتظامی قابلیت سے جو اس نے یہاں ظاہر کی تھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ سلطان قلی کے انتقال کے وقت، بلکہ اس سے پہلے جبکہ دیورکنڈے میں متعین کیا گیا تھا، وہ جوان ہوگا۔ ابراہیم کے سیاسی جوہر اس وقت ظاہر ہوئے جبکہ اس کو اپنے باپ کے انتقال کے بعد حدودِ سلطنت سے بھاگنا پڑا اور ایک اجنبی ملک میں پناہ لینی پڑی تھی۔ جنوب دکن کی ہندو سلطنت میں اپنی جگہ پیدا کرنا اور وہاں رہ کر حصولِ سلطنت کی کامیاب تدابیر اختیار کرنا ابراہیم کی غیر معمولی قابلیت کی دلیل ہے۔ اس کے پاکیزہ ذات اور سیاسی عظمت کا اثر یہ تھا کہ کئی آدمی اس کے ساتھ ایثار کرنے اور بیجا نگر کی ہولناک بادیہ نوردی میں اسکے ساتھ ہر قسم کی مصیبت جھیلنے کے لئے آمادہ ہوگئے۔ جمشید کے انتقال کے بعد جب گولکنڈے کی بساط الٹ گئی تو دوسرے بھائیوں کے مقابلے میں جو اس وقت زندہ تھے گولکنڈے کی سلطنت میں ابراہیم کے ساتھ عام ہمدردی کا اظہار کیا گیا اور جب ابراہیم کا قطب شاہی کاروان

---

[1] تاریخ قطب شاہی ص ۱۰۷۔ [2] تاریخ قطب شاہی ص ۱۳۳۔

گولکنڈے کی طرف آنے لگا تو لوگ جوق جوق اس کے گرد جمع ہونے لگے سیاسی مطلع صاف ہو گیا، دشمن کافور ہو گئے! در ابراہیم قطب شاہ بلا کھٹکے قطب شاہی تخت پر بیٹھ گیا اس میں قدرتی حالات کے ساتھ خود ابراہیم کی ذاتی قابلیت اور تدبر کو بڑا دخل ہے۔

اب یہ سمجھنے کے لئے کہ گولکنڈے کے سیاسی حالات ابراہیم کے لئے کیونکر ساز گار ہوئے، ذرا پیچھے جاکر دیکھنا چاہئے۔ ایک ناروا طریقے سے کام لے کر جمشید قطب شاہ ۹۵۰ھ میں سلطنت پر فائز تو ہو گیا لیکن ملک کی فضا اس کے موافق نہ تھی۔ ۱۵۴۳ء ایک تو رعایا کی ناراضی تھی، اس کی بدنما حرکت سے ان کا دل جلتا تھا، دوسری طرف سلطنت کے اور دعویدار باقی تھے جن کو راستے سے ہٹانا بھی ضروری تھا، ان دعویداروں میں دولت قلی اور ابراہیم تھے۔ ان کے متعلق یہ ڈر تھا کہ اگر یہ اپنی حالت پر چھوڑ دیئے جائیں تو ممکن ہے کہ اہلِ ملک جمشید کے خلاف تھے دولت قلی اور ابراہیم کا ساتھ دیں اور ان کو تخت پر بٹھا دیں۔ دولت قلی تو بھونگیر میں قید تھا، اس کی قید سخت کر دی گئی، لیکن ابراہیم کا مقابلہ بہت مشکل تھا اور اس سے بہت ڈر لگتا تھا، کیوں کہ ابراہیم آزاد تھا، دوسرے اس کی قابلیت کا سکہ بیٹھا ہوا تھا۔ جہاں دوسرے بھائی اپنے باغیانہ رویے کی وجہ سے مقید و مطعون تھے ابراہیم نہ صرف آزاد تھا بلکہ حکمرانی کے لائق سمجھا جاتا تھا لیکن ایسے دعویدار سلطنت کو شکنجے میں لانا بہت مشکل تھا۔ جمشید کے پاس صرف یہ چارہ کار رہ گیا تھا کہ ابراہیم کو مختلف طریقوں سے گولکنڈہ طلب کرے، چنانچہ جمشید نے اس کو بلانے کیلئے آدمی بھیجے اور خطوط لکھے۔

لیکن ابراہیم سمجھتا تھا کہ اس بلاوے کے کیا معنی ہیں۔ جب قطب الدین کو جو جائز وارثِ تخت تھا اندھا کر کے بے دست و پا کر دیا گیا تو ابراہیم کو جمشید سے کیا توقع ہو سکتی تھی! اس کی سلامتی اس بات میں تھی کہ وہ دیورکنڈے سے بھاگ کر کسی اور جگہ پناہ لے! اس بارے میں اس نے ان ہمدردوں سے رائے لی جو اسکے ساتھ تھے اور ہر ایثار کے لئے تیار تھے۔ اس کے ساتھ حمید خاں حبشی۔ سید جی سلحدار۔ دلاور خاں۔

اور کاماجی برہمن ایسے ہمدرد لوگ تھے جنھوں نے ابراہیم کا آخری وقت تک ساتھ دیا اور ہر مصیبت جھیل کر اس کو بالآخر تختِ سلطنت پر بٹھایا۔ ان ہستیوں کے نام اور کارناموں کو سراہے بغیر ابراہیم قطب شاہ کی سوانح حیات مکمل نہیں ہوتی۔ ان لوگوں نے اس کو فوراً بیدر جانے کی صلاح دی تا کہ والیِ بیدر سے اتحاد کر کے اپنی بقا کی تدبیر سوچے۔ چنانچہ ابراہیم پہلے بیدر گیا اور آخرالذکر سے امداد لی۔ بریدنے ابراہیم کا خاطر خواہ خیر مقدم کیا۔ علی برید کو ابراہیم سے کوئی ہمدردی تو نہ تھی لیکن یہ رفاقت بریدیوں کی شاطرانہ سیاست کے عین مطابق تھی کیونکہ یہ بہت کمزور تھے اور اپنی ہمسایہ سلطنتوں کو آپس میں لڑا کر اپنا بچاؤ چاہتے تھے، چنانچہ اس وقت اس دعویدارِ سلطنت کے بیدر آنے سے برید کو گولکنڈے پر حملہ کرنے کا اچھا موقع مل گیا اور اگر برید اور ابراہیم کا متحدہ حملہ گولکنڈے پر کامیاب ہو جاتا اور ابراہیم بادشاہ ہو جاتا تو ابراہیم کا بادشاہ ہونا برید کے لئے غیر مفید نہ ہوتا بلکہ گولکنڈے میں برید کے بہت اثرات پیدا ہو جاتے۔ چنانچہ اسی امید میں علی برید اپنی فوجوں کے ساتھ سنہ ۹۵۰ھ میں گولکنڈے کی دیواروں کے سامنے آگیا۔[1]
۱۵۴۳ء

ادھر ابراہیم کو دوسرے ہمسایہ سلاطین کی بہ نسبت کچھ برید ہی سے توقع تھی۔ حمید خاں اور سید جی وغیرہ نے جو رائے دی تھی وہ بے محل نہ تھی اور کامیابی کی توقع غالباً اسی وجہ سے تھی کہ گولکنڈے کی رعایا جمشید سے ناراض تھی۔ چنانچہ جب بریدی افواج گولکنڈے کی طرف بڑھیں تو قلعے کی دیواروں تک کوئی مزاحمت نہیں ہوئی اور ابراہیم و برید نے قلعے کا محاصرہ کر لیا۔ محاصرے کے دوران میں فریقین میں برابر کے معرکے ہوئے اور فریقین کا کافی نقصان ہوا، لیکن اس کے باوجود جمشید کی کامیابی بڑے خطرے میں تھی کیونکہ جو فوجیں اسکے تحت کام کرتی تھیں وہ اس سے خوش نہ تھیں، مگر خوش قسمتی سے اس موقعے پر نظام شاہی فوج گولکنڈے کی امداد کے لئے آگئی۔ شاہ طاہر نے جو اس زمانے میں احمد نگر کا سیاسی رہنما تھا برہان، کو مشورہ دیا کہ اگر علی برید گولکنڈے پر قابض ہو جائے تو

۱؎ تاریخ قطب شاہی ص ۱۰۸۔

ممکن ہے کہ تمام دکن پر اس کا سکّہ بیٹھ جائے۔ چنانچہ اس کے مشورے کے مطابق احمد نگر کی ایک بڑی فوج گولکنڈے کی طرف بڑھ آئی۔ اس پیش رفت میں شیعہ مذہب کی حمایت اور برید کی مخالفت بھی پوشیدہ تھی۔ برید کو پریشان کرنے کے لئے اس فوج نے قلعۂ کوہیر کا بھی محاصرہ کرلیا۔ علی برید بہت پریشان ہوا، کیونکہ خود بید رخطرے میں پڑگیا تھا اسلئے برید کو گولکنڈے کا محاصرہ اُٹھانا پڑا اور وہ کوہیر کو بچانے کے لئے بھاگا۔ اس طرح سے گولکنڈہ اس حملے کی زد سے بچ گیا۔ لیکن کہا جاتا ہے کہ برید نے بھاگتے ہوئے ابراہیم کے گھوڑے، ہاتھی اور دیگر سامانِ حرب سمیٹ لیا اور مغرب کی راہ لی۔[1] اب ابراہیم تنہا رہ گیا۔ برید کو ابراہیم سے دلی ہمدردی تو نہ تھی وہ صرف اپنے مطلب کے لئے گولکنڈہ آیا تھا۔

جب ابراہیم گولکنڈے کی مہم میں ناکام ہوگیا، بلکہ برید کے طرزِ عمل سے اُس کا پانسہ اُلٹا پڑا تو اس کے سامنے بالآخر ویجیا نگر کے سوا کوئی اور پناہ گاہ نہ تھی۔ بیدر سے اب کوئی توقع نہ تھی۔ احمد نگر کا یہ حال تھا کہ شاہ طاہر کے اثر سے یہ جمشید کی مدد پر تُلا ہوا تھا اور بیجاپور بہت دُور تھا اور یہاں اس کے بھائی عبد الکریم نے لاحاصل کوشش کرلی تھی۔ ان حالات میں ابراہیم کی دُور بیں نظر دریائے تنگبھدرا کے نیچے پڑی جہاں ویجیا نگر کی ایک طاقتور سلطنت تھی۔ اگرچہ سلطنتِ بہمنی اور سلطنتِ ویجیا نگر دونوں ایک ہی زمانے میں قائم ہوئی تھیں لیکن آخر الذکر سلطنت میں کچھ ایسا دم خم تھا کہ سلطنتِ بہمنی تو بہت جلد ختم ہوگئی لیکن یہ جنوبی سلطنت اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ قائم تھی۔ اس زمانے میں اس سلطنت کا مشہور حکمران رام راج جس کو دکن کے مورخ رائے اعظم کے نام سے یاد کرتے ہیں، اپنے زمانے کا بڑا اقبال مند راجہ تھا۔ اگر قطب شاہی مورخوں کا بیان صحیح سمجھا جائے تو رام راج کسی زمانے میں سلطنتِ گولکنڈے کا جاگیر دار اور سلطان قلی کا ملازم تھا[2] تو ابراہیم کے لئے اس سے بہتر کیا پناہ گاہ ہوسکتی تھی۔ رام راج ابراہیم سے ضرور واقف ہوگا اور اسی وجہ سے ابراہیم کے ہمدردوں نے اُس کو ویجیا نگر کی طرف بھاگنے کی صلاح دی ہوگی۔

ابراہیم کا ویجیا نگر بھاگنا اچھا منصوبہ ضرور تھا، لیکن پائے تخت تک اس کی

---

[1] تاریخ قطب شاہی ص ۱۰۹ [2] تاریخ قطب شاہی ص ۱۱۰۔ تاریخ قطبیہ ص ۵۶۔

رسائی آسان نہ تھی۔ دشمن چاروں طرف گھات میں لگے ہوئے تھے۔ جمشید کی فوجیں تعاقب کر رہی تھیں۔ جمشید کو یہ ڈر تھا کہ اگر شہزادہ ابراہیم ہاتھ سے نکل جائے تو یہ ہمیشہ کے لئے سنگ راہ ہوگا اور اس کو کبھی با امن زندگی نصیب نہ ہوگی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شہزادہ ابراہیم فوجی تعاقب سے تو بچ گیا، لیکن جنوبی فاصلے طے کر کے دریائے تنگبھدرا عبور کرنے لگا تو اس کو دوسرے دشمنوں سے سابقہ پڑا۔ جمشید نے ابراہیم کا راستہ روکنے کے لئے اُن رہزنوں سے کام لیا جو جنگل اور دریاؤں کی وادیوں کو اپنا مامن بنائے ہوئے تھے۔ چنانچہ دریائے تنگبھدرا کی وادی میں ان دنوں نارائن ماما پنڈت نامی رہزنوں کا ایک سردار قدم جمائے ہوئے تھا اور یہ دونوں سلطنتوں کی درمیانی حدود میں خود مختار بن بیٹھا تھا۔ اس موقع پر یہ جمشید قطب شاہ کا معاون ثابت ہوا، اس نے ابراہیم کے تمام راستے بند کر دیئے اور جمشید کو ان مفرورین کی اطلاع کر دی۔ جمشید کے لئے یہ اچھا موقع تھا اس نے حبیب خاں کے بھائی تخرش خاں کے ہمراہ پانچہزار ہون اور شاہی خلعت وغیرہ ماما پنڈت کے پاس بھیج دیئے، نیز ایک ہاتھی اور دو سو سوار روانہ کئے[1]۔ اس شاہی حوصلہ افزائی سے ماما پنڈت کی طاقت بہت بڑھ گئی اور گولکنڈے کے پناہ گزینوں کے لئے صورتِ حال بہت نازک ہو گئی تھی۔ تاریخ قطب شاہی کا بیان ہے کہ حمید خاں اور سید جی نے اس مقابلے میں اپنے آپ کو بے بس پا کر رام راج کو اپنے آنے کی خبر کر دی۔ اس اطلاع پر رام راج فوراً امداد کے لئے کھڑا ہو گیا اور پنڈت کو لکھا کہ شہزادہ ابراہیم کو چھوڑ دیا جائے ورنہ اس کا سر تن سے جُدا کر دیا جائے گا۔ اس فرمان سے پنڈت نے ابراہیم کو چھوڑ دیا[2]۔ اس کے بعد یہ پناہ گزیں دریا عبور کر کے وجیا نگر پہنچ گئے۔ رام راج نے ان کی غیر معمولی آؤ بھگت کی اور اگر تاریخ کا بیان صحیح سمجھا جائے تو پہلے رام راج نے شہزادہ ابراہیم کے استقبال کے لئے اکابرِ سلطنت کو جن میں اس کے عزیز و اقارب شامل تھے آگے بھیجا اور یہ لوگ ابراہیم اور اس کے ساتھیوں کو نہایت احترام کے ساتھ شہر لائے اور جب ابراہیم شہر میں پہنچا تو رام راج نے اس کی غیر معمولی عزت کی اور اپنے برابر تخت پر

---

[1] تاریخ قطب شاہی ص ۱۱۱

[2] 〃 〃 〃 〃

بٹھایا اور اتنی مدارات کی جو ایک شاہزادے کے شایانِ شان تھی۔[1]

ابراہیم کو اپنے بھائی جمشید کے انتقال تک وجیانگر میں سات سال رہنا پڑا تھا۔ یہ سات سال کی جلا وطنی ابراہیم کی زندگی کا ایک دلچسپ مرقع ہے۔ ممکن ہے کہ اسکے ذریعے سے رام راج برید کیطرح گولکنڈے کی مخالفت کا ضروری سامان جمع کرنا چاہتا ہو، اور اسی وجہ سے اس نے ابراہیم کے ساتھ غیر معمولی مدارات کی ہو لیکن اس میں خود ابراہیم کی قابلیت اور سلیقے کو بہت کچھ دخل ہے۔ اسباب کچھ بھی ہوں، وجیانگر کی جلا وطنی ابراہیم کے لئے بہت مفید ثابت ہوئی۔ یہاں اس کی نہ صرف جان بچ گئی بلکہ حصول سلطنت کی بہت سی راہیں پیدا ہو گئیں۔ ایک ایسے شخص کے لئے جو دکن کی ایک بڑی سلطنت کا ناخدا ہونیوالا تھا وجیانگر کا سیاسی ماحول بہت سبق آموز ثابت ہوا تھا۔ وجیانگر کے رکھ رکھاؤ اور اس کا تمدن جو عبد الرزاق ایرانی کے سیاحت نامے سے واضح ہوتا ہے بڑی کشش رکھتا ہے اور فرشتے کے قول کے مطابق خود بہمنی سلاطین بھی اپنے زمانے میں اس سلطنت کو دیکھنے کے متمنی رہتے تھے۔ چنانچہ مجاہد شاہ بہمنی اپنے حملے کے دوران میں وجیانگر کو بچشم خود دیکھنے کے لئے گیا تھا[2]۔ کچھ عجب نہیں کہ ابراہیم قطب شاہ نے یہاں سیاست اور تمدن کے بے شمار سبق سیکھے ہوں جو اس کے درخشاں عہدِ حکومت سے ظاہر ہوتے ہیں۔ گولکنڈے کی سیاست جس مسالے سے تیار کی گئی تھی اس میں اسلامی عناصر کے ساتھ تلنگانے اور کرناٹک کے بہت کچھ عناصر شامل تھے اور اسی وجہ سے یہ سلطنت تلنگانے کی جغرافی اور قومی خصوصیات کے ساتھ کچھ ایسی پیوست ہو گئی تھی کہ اہلِ تلنگانہ اس کو اپنی قومی سلطنت سمجھتے تھے۔

شہزادہ ابراہیم کو وجیانگر میں بہت سے واقعات پیش آئے، منجملہ انکے عین الملک کنعانی[3] کا واقعہ ہے۔ یہ شخص بیجاپور کے بڑے اُمراء میں شامل تھا لیکن کچھ اسباب ایسے پیدا ہوئے کہ وہ اپنی سلطنت سے روگرداں ہو گیا اور وجیانگر کا ملازم ہو گیا چونکہ یہ ایک دلیر سپاہی تھا اور اس کے ساتھ چار ہزار سوارہ فوج بھی تھی اس لئے رام راج اس کی بڑی قدر کرتا تھا اور اس کو اپنا بھائی کہتا تھا۔ تاریخ کہتی ہے کہ ایک روز عین الملک رائے اعظم سے مل کر دربار سے واپس جا رہا تھا کہ راستے میں شہزادہ ابراہیم کے ساتھ مڈبھیڑ ہو گئی۔ جمید خاں

---

[1] تاریخ قطب شاہی ص ۱۱۱ [2] فرشتہ مقالہ سوم ص ۲۹۷ [3] تاریخ قطب شاہی ص ۱۱۱۔

اور سیدجی شہزادے کے ساتھ تھے، راستہ بہت تنگ تھا، دونوں طاقتیں وقت واحد میں ایک ہی راستے سے گزرنا چاہتی تھیں، قرونِ وسطیٰ کا جذبۂ شجاعت اس بات کو گوارا نہیں کرسکتا تھا کہ ایک فریق دوسرے کے مقابلے میں ہتھیار ڈال دے اور چپ چاپ راستہ دیدے۔ عین الملک کے ساتھ اس کا پورا دستۂ فوج تھا، حمید خاں اور سیدجی نے کہا کہ دکن کے رواج کے مطابق دشمن کا مقابلہ کرکے راستہ پیدا کرنا ضروری ہے ورنہ ہماری کمزوری سمجھی جائے گی۔ چنانچہ تاریخ کہتی ہے کہ ابراہیم کے مٹھی بھر آدمیوں نے لڑ لڑا کر راستہ نکال لیا اور رام راج کے پاس پہنچ گئے۔ رام راج نے ان کی دلاوری کی بڑی داد دی، لیکن عین الملک انتقام کے لئے اپنی جگہ کھڑا رہا، تاکہ جب ابراہیم دربار سے لوٹے تو اس کا مقابلہ کرے۔ جب رام راج کو معلوم ہوا تو اس نے عین الملک کے نام احکام بھیجے کہ وہاں سے چلا جائے اور جب وہ اس کے بعد بھی نہیں ٹلا تو تہدیدی احکام بھیجے اور دھمکی دی کہ وجیانگر سے نکال دیا جائے گا، اس دھمکی کے بعد اسکو وہاں سے ہٹنا پڑا۔[۱]

---

[۱] فرشتہ عین الملک کا نام "عنبر خاں" بتاتا ہے، ممکن ہے عین الملک کا نام عنبر خاں ہو، لیکن اس کا مزید بیان یہ ہے کہ اسبابِ مخالفت صرف راستے تک ہی محدود نہ تھے، بلکہ رام راج نے عنبر خاں کا جاگیر کے اکثر حصے ابراہیم کی ضروریات کیلئے دے رکھے تھے اس وجہ سے عنبر خاں ابراہیم کا مخالف ہو گیا تھا جب راستے میں مڈبھیڑ ہو گئی تو سخت کلامی کے ساتھ لڑائی ٹھن گئی اور اس لڑائی میں ابراہیم نے عنبر خاں کو اپنے خنجر کے وار سے قتل کر دیا اور اس کے بھائی جو انتقام کے لئے آئے تو اُن کا بھی یہی حشر ہوا۔ نیز فرشتے نے ایک دلچسپ بات یہ لکھی ہے کہ اس لڑائی میں ابراہیم نے عنبر خاں کا علَم جس کو دکن میں "بیرق" کہتے ہیں، حاصل کر لیا اور اس کو اپنا نشانِ فتح سمجھ کر گولکنڈہ لے گیا اور اسی کو اپنی سلطنت کا پرچم بنایا (تاریخ فرشتہ روضۂ چہارم ص ۱۰۷) لیکن یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ ابراہیم کی اولو العزم زندگی اس چھوٹی سی جھڑپ اور کامیابی کو کہاں تک اپنا سرمایۂ حیات سمجھتی تھی۔ گولکنڈے کی تاریخوں سے اس کی تائید نہیں ہوتی۔

ادھر ۹۵۷ھ/۱۵۵۰ء میں جمشید کا انتقال ہوتے ہی گولکنڈے میں ایک سیاسی افراتفری مچ گئی اور ایسا معلوم ہونے لگا کہ وہ کمزور رشتہ جو جمشید کے عہد میں اجزائے مملکت کو کسی قدر مربوط کئے ہوئے تھیں اس کے مرتے ہی ڈھیلی پڑ گئیں اور گولکنڈے کی سلطنت چند روز کی مہمان معلوم ہونے لگی، گو ان حالات میں شاہی محل نے حصہ لیا۔ مرحوم بادشاہ کی بیوی بلقیس زماں اور خدیجۂ دوراں نے بعض عمائد سلطنت سے مشورہ کرکے جمشید کے بیٹے کو تخت نشین کرنے کی کوشش کی۔ جن لوگوں نے بلقیسِ زماں کے ساتھ اتفاق کیا تھا وہ فرشتے کے الفاظ میں مصطفےٰ خاں اردستانی۔ صلابت خاں تُرک اور دیگر عمائد تھے۔ جمشید کا بیٹا سبحان قلی جو اس وقت سلطنت کے لئے نامزد کیا گیا اس قدر چھوٹا تھا کہ گولکنڈے کے اکثر مدبّر اس کو تخت پر بٹھانے کے لئے تیار نہ تھے۔ اس لڑکے کی عمر سات سال تھی۔ فرشتے کا بیان ہے کہ وہ صرف دو سال کا شیر خوار بچہ تھا[۱] گو یہ عمر صحیح نہیں ہے لیکن سات سال کی عمر میں بھی وہ حکومت کے قابل نہ تھا، اس لئے جب سبحان قلی تخت نشین کیا گیا تو اس کی کمی کو پورا کرنے کے لئے بلقیس زماں نے سیف خاں عین الملک کو احمد نگر سے بلاکر وکالت اور پیشوائی کی خدمتِ جلیلہ تفویض کرنے کی کوشش کی۔ غالباً سیف خاں گولکنڈے کا پُرانا متوسل تھا، ممکن ہے کہ شاہی خاندان سے اس کا تعلق ہو، اور جمشید قطب شاہ کے طرزِ عمل سے بیزار ہو کر احمد نگر کی ملازمت اختیار کرلی ہو۔ اس وقت یہ کوشش کی گئی کہ سبحان قلی کے سنِ رُشد کو پہنچنے تک عین الملک کی مدد سے حالات بدستور قائم رکھے جائیں اور اُمورِ سلطنت خوش اسلوبی سے انجام پائیں[۲]۔

ان حالات میں اگر سبحان قلی اچھی عمر کا ہوتا تو غالباً جمشیدی دَور حسب حال رہتا، لیکن اس کی کمسنی کی وجہ سے اربابِ سیاست کا ایک بڑا طبقہ اس حکومت کا مخالف ہوگیا۔ جگدیو راؤ۔ جگپت رائے، بجری خاں جملۃ الملک اس زمانے کے بڑے عمائد تھے اور ان میں جگدیو راؤ کی بڑی عزت تھی، یہ سبحان قلی کا دشمن نہ تھا بلکہ اس کی کمسنی سے ڈر کر دوسرے ورثاء کو تخت دینا چاہتا تھا چنانچہ اسی زمانے میں جب کہ سبحان قلی کی رسمِ تخت نشینی ادا ہو رہی تھی اور سیف خاں عین الملک ابھی احمد نگر سے

۱؎ تاریخ فرشتہ ص ۱۶۹ و ۱۷۰ ۲؎ تاریخ قطب شاہی ص ۱۳۰۔

نہیں آیا تھا، یہ عمائدِ سلطنت اپنے منصوبے کے ادھیڑ بن میں لگ گئے اور کوشش کی کہ سیف خاں کے آنے سے پہلے اپنے منصوبے کی تکمیل کر لیں۔ جگدیو راؤ نے اپنے ساتھیوں کو دولت قلی کے لئے آمادہ کر لیا۔ یہ منصوبہ اس طرح اچھا تھا کہ دولت قلی کی عمر اس وقت کافی تھی اور وہ سبحان قلی کے مقابلے میں زیادہ لائقِ سلطنت تھا اور پائے تخت سے قریب بھی تھا، یعنے بھونگیر کے قلعے میں قید تھا، لیکن ابراہیم کے مقابلے میں اسے کوئی اہمیت حاصل نہ تھی، ابراہیم زیادہ لائق تھا۔ بچپن سے اس کو ذمہ دارانہ کام تفویض کیے گئے تھے، اور دولت قلی اپنی بداعمالی کی پاداش میں سلطان قلی قطب شاہ کے عہد سے مقید تھا اور جمشید کے عہد میں تو اس کی قید اور بھی سخت کر دی گئی تھی اور ملک میں اس کے کوئی ہمدرد بھی نہ تھے۔ اس بناء پر جگدیو راؤ اور اسکے شرکاء کار بجائے دولت قلی کے شہزادہ ابراہیم کو اپنا مرکزِ خیال بناتے تو بہتر ہوتا اور کئی خانہ جنگیوں کا سدباب ہو جاتا جو ابراہیم قطب شاہ کی تخت نشینی کے وقت برپا ہو جائیں۔ اس کے علاوہ دولت قلی کی قلعۂ بھونگیر سے رہائی اور تخت نشینی آسان بھی نہ تھی کیونکہ مرکزی حکومت کا سامنا تھا۔ ان حالات میں خانہ جنگی کی آگ بھڑک گئی، کیونکہ سیف خاں کے آنے سے پہلے جگدیو راؤ اپنے فوجی دستے کے ساتھ بھونگیر پہنچ گیا۔ قلعے کی فوج اور نائکواڑیوں کو اپنے ساتھ ہموار کر لیا اور قلعہ دار کو اپنا ہمخیال بنا کر دولت قلی کو قید سے باہر نکالا اور بھونگیر میں اس کی بادشاہی کا اعلان کر دیا۔ اس کے علاوہ بھونگیر کے آس پاس کئی قلعے فتح کر لئے اور اپنا قدم جما لیا[1]۔ اب جگدیو راؤ کو عین الملک کا سخت مقابلہ ٹھہر گیا، کیوں کہ اس دوران میں سیف خاں عین الملک گولکنڈہ پہنچ گیا اور عنانِ حکومت اپنے ہاتھ میں لے لی۔ اب اس کا فرض تھا کہ شاہی اقتدار کی حفاظت اور سبحان قلی اور اس کی ماں بلقیسِ زماں کے اقتدار کو بچائے۔ چنانچہ جگدیو راؤ اور اس کے اُمیدوار دولت قلی کو زیر کرنے کے لئے گولکنڈے کی بڑی فوج تیار کی گئی اور یہ فوج سیف خاں کی

---

[1] تاریخ قطب شاہی ص ۱۳۱۔

سرکردگی میں آگے بڑھنے لگی۔ اگرچہ جگدیو راؤ اس وقت کئی قلعوں پر قابض تھا لیکن گولکنڈے کی شاہی فوج کا مقابلہ کیسے کرتا! اس نقل و حرکت سے گھبرا کر جگدیو راؤ نے قریب کی عماد شاہی سلطنت سے مدد مانگی۔ سلاطینِ دکن کی باہمی رقابت تو ایسی امداد کے لئے ہمیشہ تیار رہتی تھی، چنانچہ عماد شاہی سلطنت کا مشہور سپہ سالار تفال خاں جگدیو راؤ کی امداد کے لئے آگیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سیف خاں نے اس فوج کا راستہ روکنے کی کوشش کی تاکہ وہ بھونگیر نہ پہنچ سکے اور جگدیو راؤ کی طاقت بڑھنے نہ پائے۔ سیف خاں کی یہ تدبیر کامیاب ہوگئی۔ عماد شاہی فوج شمال سے بھونگیر کی طرف پیش قدمی کر رہی تھی کہ سیف خاں نے گولکنڈے سے بڑھ کر موضع سنگرم[1] پر اس کا راستہ روکا، اور اس موقعے پر جو گھمسان کا معرکہ ہوا وہ تاریخ کے الفاظ میں:-

"در ہیچ زماں سلاطین و بادشاہ عظیم الشان

بہ آں مشابہ کارزار نشان ندادہ اند۔"[2]

ان الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بڑی سخت لڑائی تھی اور اس میں بے شمار سپاہی کام آئے۔ عین الملک کامیاب ہوگیا اور یہ پیش قدمی اس قدر معقول تھی کہ اس کے بعد قلعۂ بھونگیر میں جگدیو راؤ کی اکیلی طاقت کا مقابلہ کرنا کچھ مشکل نہ تھا۔ تفال خاں کی منہزم فوج بھونگیر کی طرف بھاگنے لگی تو عین الملک اس کا تعاقب کرتے ہوئے بھونگیر کے قلعے کے سامنے آگیا اور قلعے کا محاصرہ شروع کر دیا۔ تفال خاں کی فوج قلعے کے اندر محصور ہوگئی تھی، چونکہ بھونگیر کا قلعہ ایک پہاڑ پر واقع ہے اور محصورین کو قلعے پر سے وار کرنے کا اچھا موقعہ ملتا ہے اس لئے معلوم ہوتا ہے کہ جگدیو راؤ کے حملوں سے عین الملک کی فوجوں کو بہت نقصان پہنچنے لگا، اور اس قدر نقصان پہنچا کہ

---

[1] موضع سنگرم، کریم نگر سے جانبِ جنوب سات میل کے فاصلے پر واقع ہے، اس کے اردگرد پہاڑیاں ہیں۔

[2] تاریخ قطب شاہی ص ۱۳۱۔

عین الملک نے صلح کرنے کی کوشش کی لیکن جگدیو راؤ نے صلح سے انکار کر دیا، حالانکہ جگدیو راؤ کے لئے یہ اچھا موقع تھا۔ اس انکار سے عین الملک نے محاصرہ اور سخت کر دیا جو گولکنڈے کی آئندہ تاریخ کے لئے بہت مفید ثابت ہوا۔ اگر صلح ہو جاتی تو ظاہر ہے کہ سلطنتِ گولکنڈہ کے دو حصے ہو جاتے۔ محاصرے کے بعد محصورین کی رسد گھٹنے لگی اور یہ اپنی رسد سے اس قدر تنگ ہوئے کہ بالآخر جگدیو راؤ اور دولت قلی نے قلعے کے دروازے کھول دیئے اور عین الملک سے امان طلب کی لیکن دولت قلی کی قسمت میں عمر بھر قید لکھی تھی وہ پھر قید کر دیا گیا اور جگدیو راؤ کو پابہ زنجیر کر کے گولکنڈے کے قلعے میں مقید کر دیا گیا۔

پانچواں باب

ابراہیم قطب شاہ کی تخت نشینی

عین الملک کی کامیابی سے جس کا گزشتہ باب میں ذکر ہوا ہے، ایک خانہ جنگی کا خاتمہ تو ہوا، لیکن بعد کے واقعات سے حالات اور اُلجھ گئے اور یہ الجھن ابراہیم کے لئے فائدے سے خالی نہ تھی۔ جب عین الملک بھونگیر کے معرکے سے واپس ہوا تو اپنی اس کامیابی اور غیر معمولی اقتدار کے باعث بہت مغرور ہو گیا۔ تذکرۃ الملوک کے بیان کے مطابق طفلِ سلطنت کو بالائے طاق کر کے تمام اختیارات خود اینٹ لئے[1]۔ گولکنڈے کے عمائد اور خاندانی اُمراء کے ساتھ جابرانہ برتاؤ کرنے لگا اس سے تمام اُمراء و عمائدِ سلطنت کشیدہ ہو گئے اور سب کی نظر ابراہیم قطب شاہ پر پڑنے لگی۔ مُلک کے تمام طبقوں میں بے چینی ہر روز بڑھنے لگی، یہاں تک کہ شورش پسندوں نے محل پر حملہ کر کے دولت خانہ لوٹ لیا[2]۔ یہ واقعات ایک نئے انقلاب کی نشان دہی کر رہے تھے۔ جن توقعات سے مصطفےٰ خاں اور صلابت خاں، سبحان قلی کی بادشاہی کے لئے تیار ہوئے وہ اب بادِ ہوا ہو کر رہ گئے۔ چنانچہ ان سنجیدہ شخصیتوں کے سامنے جو مُلک کے حقیقی بہی خواہ تھے سوائے شاہزادہ ابراہیم کے اور کوئی مرجعِ اُمید باقی نہیں تھا۔ حکومت کے ممکنہ تجربے ہو چکے تھے

---

[1] تذکرۃ الملوک خافی ص ۱۰۷ [2] فرشتہ ان تمام واقعات کو اہلِ گولکنڈہ کی شورش پر زور دیتا ہے جو سبحان قلی کی تخت نشینی کے بعد ہوئی تھی (تاریخ فرشتہ روضۂ چہارم ص ۱۷۰)۔

سلطنت کے تمام امید واروں کو آزما لیا گیا، جو لائق شخصیتیں امورِ سلطنت کی اہل سمجھی گئی تھیں وہ غدار ثابت ہوئیں، اس لئے ان تمام تجربوں کے بعد یہ معلوم ہو رہا تھا کہ اس وقت سلطنتِ گولکنڈہ کے لئے شہزادہ ابراہیم ہی تنہا ناخدائے سیاست ہو سکتا ہے چنانچہ مصطفےٰ خاں اور صلابت خاں نے فوراً ابراہیم کو گولکنڈہ آنے کی دعوت دی، ان کا خیال یہ تھا کہ اگر اس وقت ابراہیم نہ آئے تو گولکنڈہ خانہ جنگیوں کا شکار رہ کر منتشر ہو جائے گا۔ مصطفےٰ خاں کی اس جنبش پر دیگر عمائد بھی چپکے چپکے اتفاق کرنے لگے اور ابراہیم کو اپنے ارادے سے واقف کرا دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تھوڑے دنوں میں ابراہیم کی خدمت میں کئی عرضداشتیں پہنچ گئیں کہ گولکنڈہ سبحان قلی کی بادشاہی سے راضی نہیں ہے اور سیف خاں عین الملک نے امراء کو تنگ کر رکھا ہے۔ عین الملک اور جگدیو راؤ کی باہمی کش مکش سے مُلک کو علٰحدہ نقصان پہنچ رہا ہے اس لئے مُلک کی نجات آپ کے ہاتھ میں ہے۔" عجیب اتفاق ہے کہ جو جنبش مرکزی حکومت میں ہو رہی تھی وہ بہت جلد مُلک کے دوسرے گوشوں میں بھی محسوس ہونے لگی۔ ابھی ابراہیم بیجانگر سے نکلا نہیں تھا کہ کوئل کنڈے[1] کے باشندوں نے اس موقعے پر ابراہیم کی مدد کا ایک پختہ منصوبہ بنا لیا۔ کوئل کنڈے کی اَن پڑھ آبادی میں سلطنت کی بہبودی کا یہ احساس اور مردم شناسی حیرت سے

---

[1] تاریخ قطب شاہی ص ۱۳۳ الف۔ قلعۂ کوئل کنڈہ کے تلنگی کتبے سے جو ابھی تین تیئیس سال پہلے دریافت ہوا ہے اس حقیقت کا اچھی طرح انکشاف ہوتا ہے کہ کس طرح مقامی آبادی ابراہیم کا خیر مقدم کر رہی تھی چنانچہ اہلِ کوئل کنڈہ نے اپنے طور پر ابراہیم کی مدد کا منصوبہ بنایا۔ کتبے میں دو نام درج ہیں ایک پیرو میاں دوسرے سید علی میاں جو اس منصوبے کے علمبردار تھے۔ ان لوگوں نے کوئل کنڈے کے تمام سپاہیوں اور عہدہ داروں سے ابراہیم کی تائید کا سخت وعدہ لیا اور قسم لی کہ وہ ابراہیم کے مقابلے میں سبحان قلی اور دولت قلی کی تائید نہ کریں گے۔ جب اس طرح منصوبہ پختہ ہو گیا تو انھوں نے ابراہیم کو اپنے پاس بلا لیا (رپورٹ آثار قدیمہ ۱۳۳۵ف) کوئل کنڈہ محبوب نگر سے چودہ میل کے فاصلے پر جانبِ جنوب مغرب واقع ہے۔

خالی نہیں ہے کہ ان میں کافی سیاسی دُوراندیشی تھی اور سلطنت کے مستقبل کا پورا خیال تھا اسی وجہ سے انھوں نے دوسرے دعویداران سلطنت کے مقابلے میں شہزادہ ابراہیم کو ترجیح دی۔ اگرچہ ابراہیم قطب شاہ کو مرکزی حکومت کی سازش سے ضرور فائدہ پہنچا، لیکن گولکنڈے کی امداد بھی جو بر وقت حاصل ہوئی فائدے سے خالی نہ تھی۔ ابراہیم کی تمام تر پیش قدمی جو پانگل سے شروع ہوئی تھی اہل گولکنڈہ کی امداد پر منحصر تھی۔ ابراہیم نے اسی جگہ اپنی طاقت بڑھائی اور اس کو اتنا اطمینان ہو گیا کہ اس نے بلا کھٹکے مرکزی حکومت کا رُخ کیا اور تخت پر قبضہ کر لیا۔

جب گولکنڈے سے مختلف عرضداشتیں ابراہیم کے پاس پہنچیں تو اس نے اپنے ہمدردوں سیدجی۔ خانِ اعظم اور حمید خاں کے مشورے سے گولکنڈے کی طرف کوچ کرنے کی تیاری شروع کر دی۔ قدرت نے ابراہیم کے لئے خاص حالات پیدا کر دیئے جو اس کے حصولِ سلطنت کے لئے بہت مفید ثابت ہوئے، ورنہ جمشید قطب شاہ کی اس قدر جلد موت واقع نہ ہوتی تو ابراہیم قطب شاہ کو گولکنڈے کی سلطنت حاصل کرنے کا کہاں موقعہ ملتا۔ ظاہر ہے کہ جب ابراہیم وجیانگر کی طرف بھاگا تھا تو اس کے ذہن میں حصولِ سلطنت کی کوئی اُمید ہو گی اور نہ ان حالات کا وہم و گمان ہو گا۔ ان تمام سازشوں کے باوجود جو اس کی تائید میں پختہ ہو گئی تھیں کئی مشکلات باقی تھیں اور گولکنڈہ پہنچ کر تختِ سلطنت پر قدم رکھنے تک مختلف زحمتوں کا سامنا کرنا تھا اور یہ مشکلات اس کو اور اس کے ساتھیوں کو ضرور ڈراتی ہوں گی۔ رام راج کی مخالفت تو تاریخ سے معلوم ہوتی ہے جو درحقیقت ہمدردی پر مبنی تھی۔ آئندہ خطرات کی پیش بندی کر کے جو حصولِ سلطنت کے راستے میں حائل تھے رام راج ابراہیم کی پیش قدمی نامناسب سمجھتا تھا، لیکن ابراہیم کی اولوالعزمی ہر خطرے کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار تھی اور اس کے ساتھی حمید خاں اور سیدجی جنھوں نے اپنی تمام عمر ابراہیم کی خدمت کے لئے وقف کر دی تھی، ہر خطرے کے لئے آمادہ تھے۔ انھوں نے نہایت جرأت کے ساتھ شہزادے کو نقل و حرکت کے لئے کھڑا کر دیا۔

اس طریقے سے یہ جلا وطن گولکنڈے کے سفر کے لئے آمادہ ہو گئے تو رام راج نے اپنے دیرینہ روابط اور وفا شعاری کے لحاظ سے شہزادہ ابراہیم کی مدد کی اور اپنے بھائی تکنا رائے کی سرکردگی میں اس نے دس ہزار سوار اور بیس ہزار پیدل کی ایک بڑی فوج پیش کی اور شہزادے کے ساتھ جانے کا حکم دیا۔ لیکن حمید خاں اور سید جی کی حمیت نے اس امداد کو گوارا نہیں کیا۔ یہ لوگ رام راج کی امداد کے بغیر آمادۂ سفر ہو گئے۔[1]

ابراہیم قطب شاہ اور اس کے ساتھی وجیا نگر سے کوچ کر کے سب سے پہلے پانگل پہنچے جو اس زمانے میں سلطنتِ وجیا نگر کے حدود میں داخل تھا۔ تلنگانے کی سرحد پر ہونے کی وجہ سے یہ ایسا مقام تھا جہاں سے گولکنڈے کی سیاسی ہلچل کا کسی قدر اندازہ ہو سکتا تھا۔ یہاں ہر حرکت کی صدائے باز گشت سنائی دیتی تھی۔ ابراہیم اور اس کے ساتھیوں نے یہاں چند روز قیام کر کے دور سے گولکنڈے کی رفتارِ سیاست کا مطالعہ کیا، اور یہ دریافت کیا کہ ملک میں ان کا کہاں تک خیر مقدم ہو سکتا ہے۔ پانگل سے ہی اس نے تمام تلنگانے میں اپنے آنے کی خبر پہنچا دی:-

بیا کہ رایتِ منصور بادشاہ رسید　　نویدِ فتح و بشارت بہ مہر و ماہ رسید

جمالِ بخت زِ روئے ظفر نقاب انداخت　　کمالِ عدل بہ فریاد داد خواہ رسید

جب لاسلکی پیاموں کی طرح اس کی آمد آمد کی خبریں دور دور پہنچنے لگیں تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ تمام تلنگانے کے طول و عرض میں مسرت کی لہر دوڑ گئی اور لوگ جوق جوق بادشاہ کے دیدار کے لئے آنے لگے کہ گویا اس کے خیر مقدم کے لئے تیار بیٹھے تھے۔[2] تھوڑے ہی عرصے میں ابراہیم کے ارد گرد تین ہزار سوار اور پانچ ہزار پیدل جمع ہو گئے اور اس پر طرّہ یہ کہ اسی جگہ کوئل کنڈے کی غیبی امداد کی خوش خبری

---

[1] تاریخ قطب شاہی ص ۱۳۳۔ حدیقۃ العالم/ ابوتراب ص ۱۳۵۔

[2] تاریخ قطب شاہی ص ۱۳۵۔

پہنچی[1]۔ یہاں گولکنڈے سے مصطفےٰ خاں اور اس کے بعد صلابت خاں بھی تین ہزار فوج کے ساتھ ابراہیم کی امداد کے لئے آ گئے اور ان کے پیچھے کئی امراء پہنچ گئے اور اس طرح ابراہیم کے پاس سات ہزار فوج جمع ہو گئی۔

پانگل کے بعد ابراہیم قطب شاہ کا دوسرا مقام کوئل کنڈہ تھا جہاں یہ قطب شاہی کاروان صدہا اُمید وبیم کے ساتھ نازل ہوا۔ اگرچہ اس وقت کوئل کنڈے کی حیثیت ایک معمولی موضع سے زیادہ نہیں ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس کو ابراہیم قطب شاہ کی سیاسی زندگی میں خاص اہمیت حاصل ہے۔ قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ قطب شاہی زمانے میں کوئل کنڈے کا قلعہ فوجی مستقر کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا اور یہاں سے سلطنت کے جنوبی حصوں پر گرفت رکھی جاتی تھی تاکہ سلطنتِ وجیانگر کی ہر پیش قدمی کا بروقت سدِ باب ہو سکے۔ اس کو ایک خوشگوار

---

[1] فرشتہ کا بیان ہے کہ جب ابراہیم کی جماعت تلنگانے کی سرحد پر پہنچی ہے تو سب سے پہلے مصطفےٰ خاں اس سے آکر ملا اور ابراہیم نے اس کی قابلیت اور اعلیٰ خدمات کا اعتراف کر کے اس کو میر جملہ کی خلعت عطا کی اور مصطفےٰ خاں کا کچھ ایسا اثر تھا کہ لوگ ابراہیم کی بادشاہی کے لئے راضی ہو گئے اور اس نے ہندو تاجروں سے دو لاکھ ہون قرض لے کر ضروری مصارف کا بندوبست کیا تھا (تاریخ فرشتہ ص ۱۷۰) ممکن ہے کہ مصطفےٰ خاں کی ملاقات پانگل میں ہوئی ہو، اور اسی جگہ اس کو خلعت عطا ہوئی ہو، لیکن یہ کہنا کہ اہلِ تلنگانہ محض مصطفےٰ خاں کے اثر سے ابراہیم کی بادشاہی کے لئے آمادہ ہوئے تھے صحیح نہیں ہے، گو مصطفےٰ خاں کی سیاسی اور مالی امداد سے جو بروقت ہوئی تھی بہت فائدہ پہنچا، اور ممکن ہے کہ کوئل کنڈہ والوں کے اتحاد میں بھی اس کا ہاتھ ہو، لیکن اس بات کو فراموش نہیں کیا جا سکتا کہ اس تمام سیاسی ہلچل میں خود ابراہیم کی زبردست شخصیت بھی کام کر رہی تھی۔

اتفاق سمجھنا چاہیئے کہ اس وقت یہ کوئل کنڈہ اپنے تمام اعضائے سیاسی کے ساتھ ابراہیم کی مدد کے لئے تیار ہوگیا، اور سچ تو یہ ہے کہ ابراہیم کی تمام کامیابی اسی تائید پر موقوف تھی، ورنہ اس کی پیش قدمی کوئل کنڈے تک اتنی آسان نہ ہوتی۔ اس قلعے کے کتبے سے معلوم ہوتا ہے کہ ابراہیم کی آمد سے یہاں ایک سنسنی پھیل گئی اور اس کی امداد کیلئے ایک زبردست اتحاد ہوگیا۔ تمام سپاہی اور نائک واڑی جن میں ہندو اور مسلمان دونوں شریک تھے اس سیاسی خدمت کے لئے تیار ہو گئے اور یہ اپنا فرض سمجھنے لگے کہ ابراہیم کو گولکنڈے کے تخت پر بیٹھا دیں۔ یہ ایسی اچھی پناہ گاہ تھی کہ اگر ابراہیم کو اپنی پیش قدمی میں شکست بھی ہو جاتی تو وہ یہاں واپس آکر دم لے سکتا اور پھر قسمت آزمائی کر سکتا تھا۔ اس لئے ابراہیم یہاں بہت دنوں تک ٹھیرا رہا اور ممکنہ طاقت فراہم کی۔ غالباً یہاں وہ دو مہینے رہا۔ اس دوران میں اس کو باہر سے بھی بہت کچھ مواد فراہم ہوتا رہا۔ چار ہزار جنگجو سوار جو اُمراء و خوانین پر مشتمل تھے اس کے ارد گرد جمع ہو گئے۔ ان میں اکثر گولکنڈے کے اکابر تھے جو ابراہیم کے لئے دوڑے آئے تھے۔[1]

ادھر مرکزی حکومت کا یہ حال تھا کہ ابراہیم قطب شاہ کی پیش قدمی سے ہر طرف پریشانی پھیل رہی تھی، ہر طبقہ اپنے مستقبل کی سوچ رہا تھا، جو لوگ اس وقت سبحان قلی اور عین الملک کے رسمی ہوا خواہ تھے وہ نئے تاجدار کے لئے بے تاب ہو گئے، اس لئے عین الملک کے لئے مدافعت کا سامان کرنا ضروری ہوگیا۔ دار السلطنت کی حفاظت کے لئے بحری خاں۔ جگپت راؤ۔ حاجی خاں سر نوبت اور اخلاص خاں حبشی متعین کئے گئے اور عین الملک کے ساتھ پیش قدمی کی غرض سے خداوند خاں حبشی علم خاں۔ سنجر خاں۔ مقبول خاں اور تاج خاں رکھے گئے۔ اس طریقے سے یہ مدافعتی فوج گھنپورہ پہنچ گئی۔ لیکن عین الملک کے کوچ کرتے ہی یہ معلوم ہوا کہ خود گولکنڈے میں سازش ہوگئی۔ اکثر نائک واڑی ابراہیم کی امداد کے لئے تیار ہو گئے۔ یہاں ان کے راستے میں کوئی رکاوٹ بھی نہیں تھی۔ ان لوگوں نے ابراہیم کی خدمت میں ایک

---

[1] تاریخ قطب شاہی ص ۱۳۵۔

متفقہ درخواست اس مضمون کی روانہ کی کہ "اگر آپ جگدیو راؤ کو قید سے رہا کرتے ہیں تو ہم آپ کی مدد کے لئے آمادہ ہیں" اور آئندہ اُمید میں جگدیو راؤ کو قید سے رہا کر دیا اور جو لوگ ابراہیم کے مخالف تھے وہ اکثر قتل کر دیئے گئے، چنانچہ بحری خاں، اخلاص خاں اور حاجی کے سر نیزوں پر چڑھا کر شہر میں گھمائے گئے، خود سبحان قلی کو قید کر دیا گیا اور شاہی خزانہ اپنے قبضے میں لے لیا گیا۔ اس ضروری بندوبست کے بعد ان لوگوں نے ابراہیم کو گولکنڈہ آنے کی دعوت دی۔ اس طریقے سے ابراہیم کے لئے گولکنڈے تک تمام راستے صاف ہو گئے۔ اب عین الملک کے لئے کامیابی کی کوئی صورت نہ تھی، کیوں کہ ان دو زبردست طاقتوں کا مقابلہ اس کے قابو سے باہر تھا۔ کہا جاتا ہے کہ ان حالات سے مجبور ہو کر اس نے ابراہیم سے معافی مانگنے کی کوشش کی[1]، لیکن ابراہیم سمجھتا تھا کہ عین الملک اس کا کبھی دوست نہیں ہو سکتا، چنانچہ تاریخ کے الفاظ یہ ہیں:-

"استدعائے عین الملک از صمیم قلب نبود"[2]

چنانچہ ابراہیم نے اس کو آنے کی اجازت نہیں دی، بلکہ اس کو لکھا کہ "میں خود آ رہا ہوں وہاں ملاقات ہو جائے گی"۔ اس سے عین الملک بہت گھبرایا اور بھاگنے کے سوائے اس کے پاس کوئی اور چارۂ کار نہ تھا، کیوں کہ وہ سمجھتا تھا کہ ابراہیم قطب شاہ اس سے ضرور انتقام لے گا، پانچ ہزار سوار اور چند سرداروں کے ساتھ جو اس کے ہمراہ تھے کولاس کے راستے سے سلطنتِ گولکنڈہ کی سرحد سے

---

[1] تذکرۃ الملوک کا بیان ہے کہ عین الملک نے گولکنڈے کا محاصرہ کر لیا تھا، لیکن جب گولکنڈے کی سازش کی اطلاع ملی تو پانچ ہزار قطب شاہی سواروں کے ساتھ کولاس کے راستے سے مُلک کے باہر بھاگ گیا (تذکرۃ الملوک خافی ص ۱۳۹) ممکن ہے کہ یہ صحیح ہو۔ لیکن تاریخ قطب شاہی کا بیان یہ ہے کہ اس نے گھنپورہ سے ابراہیم کی خدمت میں درخواست کی تھی کہ "بندے کو آستان بوسی کی اجازت دی جائے" (تاریخ قطب شاہی ص ۱۳۷)۔ [2] تاریخ قطبیہ ص ۷۶۔

باہر چلا گیا۔ اغلب یہ ہے کہ وہ سلطنتِ برار میں سکونت پذیر ہوا ہو۔ اگرچہ عین الملک کے جانے سے نقصان ضرور تھا، اس کے اغوا سے گولکنڈے کے بعض دینہ آدمی اسکے ساتھ چلے گئے اور بہت سا قطب شاہی سامان اس کے ساتھ غائب ہو گیا لیکن اس کے فرار ہونے سے ابراہیم کی رہی سہی مشکلات کا خاتمہ ہو گیا سچ تو یہ ہے کہ ابراہیم قطب شاہ کے راستے میں عین الملک کی تنہا مزاحمت باقی رہ گئی تھی جو گولکنڈے کے راستے میں کسی جگہ خونریزی کا باعث ہوتی لیکن اب مطلع بالکل صاف تھا۔ جگدیو راؤ کی ایک آدھ بغاوت جو ابراہیم کے تخت نشیں ہونے کے بعد ہوئی، وہ آسانی سے فرو ہو گئی۔ جب امین خاں دبیر نے گولکنڈہ آکر عین الملک کے بھاگنے کا ذکر کیا اور گولکنڈے کے تمام حالات بیان کئے تو ابراہیم نے کوچ شروع کر دیا۔[1]

قطب شاہی خاندان کے حقیقی وارثِ تخت کا سات سال کی جلاوطنی کے بعد گولکنڈے کی دیواروں کے سامنے آنا تلنگانہ کا ایک مسرت خیز واقعہ تھا جس کا اندازہ آج چار سو سال کے بعد نہیں کیا جا سکتا۔ اس نوجوان بادشاہ کی آمد سے جو اپنے تمام شاہی اوصاف کے ساتھ سلطان قلی قطب شاہ کا صحیح جانشین تھا تلنگانے کے جسدِ مردہ میں جان آگئی۔ تمام اہلِ گولکنڈہ اس وقت سے چشم براہ تھے جب کہ پانگل میں اس کا نزولِ اجلال ہوا تھا۔ ان چند مخالفوں کو چھوڑ کر جو یا تو قید تھے یا شہر بدر ہو چکے تھے، گولکنڈے کا بچہ بچہ انتہائی شادمانی میں ڈوبا ہوا تھا۔ مسرت کی جو لہریں کئی مہینوں سے پانگل کی سرحد سے تمام تلنگانے کے طول و عرض میں پھیل رہی تھیں آج ایک مرکز پر جمع ہو گئی تھیں۔ شاعر قصید ہائے مبارکباد لکھ رہے تھے، گویے مسرت کے گیت گا رہے تھے۔ تاریخ قطب شاہی کا بیان ہے کہ جب ابراہیم قطب شاہ کا جلوس گولکنڈے کے قریب پہنچا تو عام لوگوں کے علاوہ تمام اکابرِ سلطنت استقبال کیلئے قلعے کے باہر موجود تھے۔ جگدیو راؤ اور دوسرے نائک واڑیوں نے قلعے کی تمام کنجیاں ابراہیم قطب شاہ کے سامنے رکھ دیں اور قلعے میں آنے کی درخواست کی، چنانچہ

---

[1] تاریخ قطبیہ ص ۷۷۔

۱۲ار رجب ۹۵۷ھ کو دوشنبہ کے دن رسمِ تخت نشینی ادا ہوئی جو گولکنڈے کی تاریخ کا بہت ہی مبارک دن تھا۔ کیوں کہ آج سات سال کا تاریک دور اور خانہ جنگیاں ختم ہوگئی تھیں۔ یہ وہ دن تھا جو سلطنت کو آئندہ ترقیوں کا پیام دے رہا تھا۔ بات یہ ہے کہ قطب شاہی سلطنت کی اصل تعمیر ابراہیم قطب شاہ کے عہد سے شروع ہوئی جو محمد قلی قطب شاہ کے عہد میں جاکر مکمل ہوئی۔ ابراہیم قطب شاہ کو تخت سلطنت نصیب نہ ہوتا تو نہ صرف اس سلطنت کو یہ عظمت نصیب نہ ہوتی بلکہ قیاس یہ ہے کہ اس کا بہت جلد خاتمہ ہو جاتا۔ رسمِ تخت نشینی کے بعد ان لوگوں کو جنھوں نے وفاداری کا ثبوت دیا تھا مناصب جلیلہ سے سرفراز کیا گیا اور بارہ ہزار ہون غرباء و مستحقین میں تقسیم کئے گئے۔

۱۵۵۰ء

چھٹا باب

سلاطینِ دکن کی باہمی کشمکش

ابراہیم قطب شاہ کی تخت نشینی سے گولکنڈے کا وہ دَور شروع ہوتا ہے جس کو دورِ استحکام سمجھنا چاہیئے۔ تاسیس کے بعد ہر سلطنت کو انتظامی اور دفاعی بندوبست کرنا پڑتا ہے تاکہ وہ مستقل بنیادوں پر کھڑی ہو، اور حکومت کے فرائض خاطر خواہ انجام دے۔ اس کی بقا ہی استحکام میں ہے۔ گھر کے اندر اچھا نظم ونسق قائم ہو، تاکہ مُلک میں امن امان نصیب ہو، اور اہلِ مُلک کو ذہنی و اخلاقی تربیت کے ضروری مواقع ہاتھ آئیں۔ دوسری طرف بیرونی خطروں سے مُلک کی حفاظت ہو سکے۔ ابراہیم قطب شاہ سلطنتِ گولکنڈے کا معمار ہے اس میں سیاست کی خداداد قابلیت تھی۔ بیز وبجیانگر کی جلا وطنی سے اس کی نظریں ایسی وسیع ہو گئی تھیں کہ وہ اب سیاست کے تمام ہتھکنڈے جانتا تھا اس کو اچھی طرح معلوم تھا کہ مُلک میں کہاں استحکام کی ضرورت ہے اور ہمسایہ سلطنتوں کے مقابلے میں کیا مدافعتی ذرائع اختیار کرنا چاہیئے تاکہ گولکنڈے کی سلطنت محفوظ رہے اور اس کو آگے بڑھنے کا موقعہ ملے۔ اس کو شروع ہی سے اس بات کا بھی تجربہ تھا کہ سلطنت کو نظم ونسق کے زیور سے کس طرح سنوارنا چاہیئے۔ مصطفےٰ خاں اردستانی کو جس نے ابراہیم کے ساتھ پوری وفاداری کی تھی بہت ترقی دی گئی۔ بادشاہ نے

اپنی بہن سے مصطفےٰ خاں کی شادی کر دی جو بہت بڑی عزت تھی اور تمام اُمورِ سلطنت اس کے سپرد کر دئے۔ اس کو ہر جگہ "خانِ اعظم رکنِ سلطنت" لکھا جاتا ہے۔ غالباً "خانِ اعظم" اس کا خطاب تھا، اور اس وقت تو یہ سلطنت کا میر جملہ بنایا گیا اور بعد کو ترقی کر کے پیشوا ہو گیا۔ اس تمام عہد میں مصطفےٰ خاں کی سیاست چھائی ہوئی تھی اور ہر معاملے میں اس کے مشورے شریکِ حال تھے۔

ابراہیم قطب شاہ کی تخت نشینی کے بعد دکن کا سیاسی مطلع بیحد غبار آلود ہو گیا اور دکن کی سلطنتوں میں بین مملکتی لڑائیاں اس قدر زور و شور سے شروع ہوئیں کہ ان کی روک تھام بہت مشکل ہو گئی۔ قطب شاہی سلطنت ان سیاسی الجھنوں سے کنارہ کش نہیں رہ سکتی تھی۔ ابراہیم قطب شاہ کے پیشروؤں نے سیاستِ دکن سے متعلق کوئی ایسا خارجی مسلک نہیں بنایا تھا جو سیاسی دُور اندیشی کے ساتھ مستقبل کی صحیح رہنمائی کر سکے۔ اگرچہ جمشید قطب شاہ نے احمد نگر سے رشتۂ اتحاد جوڑنے کی کوشش کی تھی اور برہان نے برید کے مقابلے میں گولکنڈے کی مدد کی تھی، لیکن اس کو مستقل مسلک نہیں کہا جا سکتا۔ غالباً اس کی وجہ یہ تھی کہ ابراہیم سے پہلے دکن کے بین مملکتی تعلقات اس قدر پیچیدہ نہیں تھے اور نہ گولکنڈے کو ان الجھنوں میں پڑنے کی کوئی ضرورت تھی، لیکن ابراہیم کے عہد میں دکن کے بین مملکتی تعلقات بہت پیچیدہ ہو گئے۔ بیجاپور کے تخت پر ابراہیم عادل شاہ اول متمکن تھا اور احمد نگر میں برہان کا بیٹا حسین نظام شاہ اول ابھی ابھی تخت نشین ہوا تھا۔ چونکہ یہ سلطنتیں پاس پاس واقع ہوئی تھیں اور یہ ایک دوسرے کی رقیب تھیں اس لئے ایک کا دوسرے پر اثر پڑنا لازمی تھا۔ بعض سلطنتوں کے درمیان آئے دن سرحدی نزاعیں ہوتی تھیں جو ہر سلطنت کے لئے مہلک تھیں، چنانچہ ضلع شولاپور و کلیان کے لئے احمد نگر اور بیجاپور میں بارہا لڑائیاں ہوئیں اور فریقین نے اپنی امداد کے لئے دوسری سلطنتوں کو بھی دعوت دی اور اس میں

بیجاپور کی ہمیشہ زیادتی تھی۔ ویجیانگر کی ہندو سلطنت نے بیجاپور کی تائید میں احمد نگر کو بہت نقصان پہنچایا تھا۔ ان حالات میں گولکنڈے کو اپنا ایک خارجی مسلک مشخّص کرنا ضروری تھا۔ ابراہیم قطب شاہ نے وسیع نظر پائی تھی، مصطفےٰ خاں کے سیاسی مشوروں سے وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ پہلے تو بیجاپور کے مقابلے میں احمد نگر کی تائید کرنی چاہئے، کیوں کہ آخر الذکر سلطنت بیجاپور کی بہ نسبت بہت کمزور تھی اور اس کو بیجاپور سے بہت نقصان پہنچ رہا تھا اور ویجیانگر کی وجہ سے تو اس کو اس قدر نقصان پہنچا کہ برسوں تک اس کی تلافی نہ ہو سکی۔ اس طریقے سے دکن کا توازن خطرے میں پڑا ہوا تھا۔ اگر احمد نگر کی سلطنت بالکل مغلوب ہو جاتی تو بیجاپور کا پلہ بھاری ہو جاتا اور یہ صورت آئندہ گولکنڈے کے لئے خطرے سے خالی نہ ہوتی۔ اس طرح یہ گولکنڈے کا فرض تھا کہ بیجاپور کی مخالفت اور احمد نگر کی کمزور سلطنت کی مدد کرے۔ مصطفےٰ خاں کی دُور اندیشی کی بدولت مُلک کا یہ مستقل مسلک قرار دیا گیا اور اس کی پابندی کی گئی۔

اس اتحاد کے لئے خود گولکنڈے کی طرف سے پیش قدمی کی گئی مصطفےٰ خاں کو احمد نگر بھیجا گیا اور باہمی اتحاد کی تجویز پیش کی گئی۔ چونکہ یہ مسلک احمد نگر کے لئے بھی بہت مفیدِ مطلب تھا اس لئے اس کا بڑا خیر مقدم کیا گیا۔ اس خیال سے کہ اتحاد کے لئے بالمشافہ گفتگو بہت اچھی ہوتی ہے $\frac{٩٦٥}{١٥٥٨}$ھ میں ابراہیم قطب شاہ اور حسین نظام شاہ والی احمد نگر گلبرگے کے باہر ملے اور اتحاد کے لئے ہاتھ ملایا۔ اس ملاقات میں یہ طے ہوا کہ متحدہ یلغار کر کے گلبرگہ عادل شاہی سلطنت سے حاصل کریں۔[۱] دوسرے جنوب کی سلطنت ویجیانگر کا خاتمہ بھی قطب شاہی مسلک کا ایک بڑا ضمیمہ تھا۔ اس سلطنت کا دائمی خطرہ نہ صرف دکن کی ہر سلطنت کے لئے سوہانِ روح تھا بلکہ دوسری خرابی یہ تھی کہ دکن کے مسلمان سلاطین آپس کی رقابت میں ویجیانگر کو اپنا

---

[۱] برہان مآثر۔ علی بن عزیز اللہ ص ۳۹۵۔

شریکِ کار بناتے تھے۔ چنانچہ ویجیا نگر کی شرکت سے بعض مرتبہ اسلامی سلطنتوں کو غیر معمولی نقصان پہنچ گیا۔ غالباً ابراہیم قطب شاہ اور مصطفےٰ خاں کی دُور اندیش سیاست پہلے سے اس بات کو محسوس کرتی تھی کہ جنوب کی ہندو سلطنت کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ ہو جائے تو اچھا ہے۔

گلبرگے کا محاصرہ

حسین نظام شاہ اور ابراہیم قطب شاہ کے اتحاد سے احمد نگر کو بہت تقویت ہوگئی اور اس کی بدولت احمد نگر نے اپنے پُرانے منصوبے روبراہ کرلینے کی فوراً کوشش شروع کردی۔ غالباً اسی غرض کے لئے دونوں نے اپنی ملاقات کا موقع محل بھی گلبرگہ تجویز کیا تھا تاکہ اگر یہ جیز طے ہو جائے تو فوراً گلبرگے کا محاصرہ شروع کردیں۔ بالمشافہ گفتگو کے بعد دونوں فوجوں نے گلبرگے کا محاصرہ شروع کردیا۔ عادل شاہی فوجوں سے جو اس وقت گلبرگے میں تھیں جنگ شروع ہوگئی۔ چونکہ محاصرہ کرنے والی فوجیں زیادہ تھیں اس لئے عادل شاہی فوجوں پر سختی گزرنے لگی اور شہر کے محصورین بہت پریشان ہوئے اور گلبرگہ مسخر ہونے میں کوئی بات نہیں تھی اس اڑے وقت میں ابراہیم عادل شاہ نے رام راج والیِ ویجیا نگر کو اپنی امداد کے لئے طلب کیا اور ویجیا نگر سے ایک بڑی ہندو فوج بیجاپور کی امداد کے لئے پہنچ گئی اور معلوم نہیں کہ اس لڑائی کا نتیجہ کیا ہوتا، لیکن رام راج نے ابراہیم قطب شاہ کو اس جنگ سے باز رکھنے کی کوشش کی۔ اگرچہ عادل شاہی تاریخوں میں اس کا ذکر نہیں ہے[۱] تاہم صورتِ حال یہ معلوم ہوتی ہے کہ ابراہیم قطب شاہ نے اس وقت رام راج سے مخالفت کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ اول تو رام راج اور ابراہیم کے پُرانے تعلقات تھے، دوسرے بڑی بات یہ تھی کہ گولکنڈے کے جنوبی اور مشرقی حدود ویجیا نگر سے ملتے تھے اور ڈر تھا کہ ویجیا نگر کی ہندو فوجیں ابراہیم قطب شاہ کی مخالفت میں جنوب اور مشرق سے گولکنڈے پر

---

[۱] ابراہیم زبیری نے بساتین السلاطین میں اس کا کہیں ذکر نہیں کیا ہے۔

حملہ آور ہو جائیں۔ گولکنڈے کے عمائد نے بھی بادشاہ کو یہی رائے دی کہ اس وقت جنگ سے پہلو بچانا چاہیئے اور رام راج نے بھی یہی لکھا تھا[1]، اور یہ ڈر خلافِ قیاس نہیں تھا، کیوں کہ اسی اثناء میں یہ بھی معلوم ہوا کہ رام راج کے بھائی تیلم راج نے چند عادل شاہی افسروں کے ساتھ گولکنڈے کے حدود میں دست درازی شروع کر دی ہے۔ یعنے پانگل کے قریب پہنچ کر لوٹ مار کر رہا ہے، اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابراہیم ابھی ہمہ جہتی مدافعت کے لیئے تیار نہیں تھا۔ اگر وہ عادل شاہی فوج کے مقابلے کے لئے اڑ جاتا تو نہ صرف گلبرگے کے مقام پر گھمسان کا رن پڑتا، بلکہ اس کی سلطنت کے جنوبی اور مشرقی حصے بھی خطرے میں پڑ جاتے، اس لئے ابراہیم قطب شاہ نے ایسے موقع پر سیاسی مصلحت سے کام لیا، لیکن ساتھ ہی اس نے احمد نگر کے اتحاد کو بھی اپنے ہاتھ سے جانے نہیں دیا اور ہمیشہ اخلاقی ذمہ داری محسوس کی۔ دریائے کرشنا اور بھیما کے سنگھم پر ابراہیم عادل شاہ اور رام راج سے ملاقات کی اور مصالحتی گفتگو سے کام لے کر عادل شاہی اور وجیانگر کی فوجوں کو رخصت کر دیا، یہ کام آسان نہ تھا۔ گولکنڈے کا مورخ کہتا ہے کہ ان حملہ آوروں کو جو احمد نگر پر حملہ کرنے کے لئے آئے تھے اپنی تقریر سے اس طرح متاثر کیا کہ وہ دونوں اپنی سلطنتوں کو واپس ہو گئے[2]۔ اس ہتھکنڈے سے ابراہیم نے ایک طرف احمد نگر کو بچا لیا اور دوسری طرف بیجاپور اور وجیانگر سے اپنے تعلقات خوشگوار رکھے اور ایک موقعے پر جب کہ وجیانگر میں رام راج کے بھائیوں نے بغاوت کی تو دیرینہ تعلقات کی بناء پر گولکنڈے کی فوجوں سے رام راج کی مدد بھی کر دی تاکہ اس کی طرف سے وجیانگر کو کوئی بدگمانی نہ ہو۔

---

[1] تاریخ قطب شاہی ص ۱۴۲۔ [2] تاریخ قطب شاہی ص ۱۴۴۔ لیکن فرشتہ کہتا ہے کہ گلبرگے کے محاصرے کے دوران میں جو احمد نگر اور گولکنڈے کی فوجوں نے کیا تھا، محصورین مغلوب ہو رہے تھے تو ابراہیم اچانک محاصرہ اٹھا کر گولکنڈہ واپس ہو گیا تاکہ گلبرگے کے قبضے سے حسین نظام شاہ کی طاقت بڑھنے نہ پائے (تاریخ فرشتہ ص ۱۷۰-۱۷۱) برہان مآثر علی بن عزیز اللہ ص ۳۹۸۔

احمد نگر پر حملے لیکن ابراہیم عادل شاہ کے انتقال سے جو ۹۶۵ھ/۱۵۵۷ء میں ہوا سیاسی بساط پھر الٹ گئی۔ اس کا جانشین علی عادل شاہ اول دکن کا بہت بڑا سورما تھا۔ تخت نشین ہوتے ہی اس نے احمد نگر سے پھر پرانی پرخاش شروع کردی، شولاپور اور کلیان کا مطالبہ کردیا، اور دھمکی دی کہ اگر یہ واپس نہ کئے جائیں گے تو احمد نگر پر حملہ ہوگا۔ وجیانگر سے دیرینہ اتحاد کو تازہ کرکے پہلے سے حملے کی تیاری کرلی تھی۔ یہ خود وجیانگر گیا اور رام راج کے خاندان سے گہرے تعلقات پیدا کرلئے۔ رام راج کی بیوی علی عادل شاہ کو اپنا بیٹا اور رام راج کی بیٹیاں اس کو اپنا بھائی کہتی تھیں۔ راجہ کے حرم میں اس کی بے تکلف آمد و رفت ہوتی تھی[1]۔ ظاہر ہے کہ یہ تعلقات بیجاپور کے لئے بہت خوشگوار تھے، لیکن یہ احمد نگر اور دکن کے توازن قوت کے لئے بہت خطرناک ثابت ہوئے۔ دونوں طاقتوں کا احمد نگر پر متحدہ حملہ ہوگیا۔ رام راج نے ابراہیم کو بھی دعوت دی کہ معاہدے کے بموجب اس لڑائی میں شریک ہو۔ مصطفیٰ خاں کی رائے سے ابراہیم بھی شریک ہوگیا۔ حملہ آور احمد نگر پر اس زور سے آئے کہ ان کی مدافعت مشکل ہوگئی۔ احمد نگر کے مشہور جنرل تقال خاں نے انتہائی کوشش کی لیکن مقابلہ بڑا سخت تھا۔ نہ صرف تقال خاں بھاگا بلکہ خود حسین نظام شاہ نے اپنی ماں آمنہ بی بی کو چھوڑ کر احمد نگر سے بھاگ گیا اور دولت آباد میں پناہ لی۔ حملہ آوروں نے احمد نگر کو دل کھول کر لوٹا، تمام محلات۔ باغات اور مزرعے جلا کر خاک کردیئے۔ عمارتیں منہدم ہوئیں اور جلادی گئیں۔ وجیانگر کے ہندو سپاہیوں نے مقدس مقامات کی بے حرمتی کی۔ مسجدوں کو مسمار کیا اور قرآن شریف کی توہین کی۔ بیچارے حسین نظام شاہ کو مجبوراً کلیان دے کر صلح کرنی پڑی اور حملہ آور بہ دقت تمام احمد نگر سے واپس ہوئے۔ با تاریخ قطب شاہی کی روایت صحیح سمجھی جائے تو ابراہیم قطب شاہ کے بیچ بچاؤ کرنے سے حملہ آور واپس ہوئے۔ قطب شاہی مورخ کہتا ہے کہ ان حملہ آوروں کے ساتھ ابراہیم قطب شاہ بھی شریک تھا[2]

[1] بساتین السلاطین ص ۸۲ [2] تاریخ قطب شاہی ص ۱۵۲۔

لیکن اس میں احمد نگر کی دشمنی مقصود نہیں تھی، بلکہ اس کا مقصد یہ تھا کہ بیجاپور اور وبیجیانگر سے بھی اپنے تعلقات قائم رکھے اور احمد نگر کو بھی بچائے۔ مصطفےٰ خاں نے یہی رائے دی تھی ورنہ وبیجیانگر دشمن ہو جاتا۔ چنانچہ ایک طرف حسین نظام شاہ اور اس کی ماں بی بی آمنہ کو اطمینان دلایا اور دوسری طرف خفیہ طور پر اہل قلعہ کو رسد پہنچائی، لیکن جب حملہ آوروں نے بڑی اُدھم مچائی تو ابراہیم نے مختلف ترغیبوں سے کام لے کر ان کو احمد نگر سے واپس ہونے کے لئے مجبور کر دیا اور اپنی سلطنت میں سے کونڈہ پلی، یعنے مصطفےٰ نگر رام راج کو دینے کا وعدہ بھی کیا۔[۱]

معاملہ اسی پر ختم نہیں ہوا۔ احمد نگر کے جذبۂ انتقام نے پھر وہی مکدر فضاء پیدا کر دی جو ابھی ابھی ختم ہوئی تھی۔ پچھلی ہزیمت سے حسین نظام شاہ اس قدر متاثر تھا کہ اس نے بہت جلد انتقام کا سامان کر لیا۔ انتقام لینے کے لئے اس بات کی ضرورت تھی کہ بیجاپور کی طرح یہ بھی کسی مملکت سے اتحاد پیدا کرتا اور اپنی طاقت بڑھاتا۔ صرف گولکنڈے کی سلطنت ہی ایسی تھی جس سے اتحاد ہو سکتا تھا، یا پُرانا اتحاد مضبوط کیا جا سکتا تھا۔ نیز اتحاد ازدواجی تعلقات کی بہ دولت زیادہ مضبوط اور خوشگوار ہوتا ہے۔ اس موقع پر یہی ہوا۔ بیجاپور اور گولکنڈے کی تاریخ پر اعتماد کیا جائے تو خود حسین نظام شاہ نے سلطنتِ گولکنڈہ سے رشتہ داری پیدا کرنے کی خواہش کی۔ چنانچہ قاسم بیگ حکیم۔ شاہ جعفر جو شاہ طاہر کا بھائی تھا، اور مولانا عنایت اللہ کو گولکنڈہ بھیجا اور شادی کی سلسلہ جنبانی کی گئی۔[۲] لیکن فرشتہ کہتا ہے کہ احمد نگر سے واپس ہوتے ہوئے ابراہیم قطب شاہ نے خود خواہش ظاہر کی کہ حسین نظام شاہ کی بیٹی بی بی جمال سے اس کی شادی ہو جائے۔[۳] درخواست

---

[۱] تاریخ قطب شاہی ص ۱۰۲۔ لیکن فرشتہ کا بیان یہ ہے کہ محاصرے کے دوران میں جب کہ حملہ آور احمد نگر پر قابض ہونے والے تھے ابراہیم قطب شاہ احمد نگر کے قلعے سے فرار ہو گیا اور گولکنڈہ پہنچ گیا۔ اس کے بھاگنے سے علی عادل شاہ اور رام راج کو خطرہ محسوس ہوا اور یہ دونوں محاصرہ چھوڑنے پر مجبور ہو گئے۔ فرشتہ حصۂ سوم ص ۱۷۰۔
[۲] بساتین السلاطین ص ۸۶۔
[۳] فرشتہ حصۂ سوم ص ۱۷۱۔

خواہ کسی طرف سے ہو، بالآخر شادی کی قرارداد ہوگئی اور یہ طے ہوا کہ دونوں بادشاہ قلعۂ کلیان کے پاس ملیں اور اسی جگہ شادی رچائی جائے! اس کا مقصد یہ تھا کہ شادی کے بعد قلعۂ کلیان پر جو اس وقت عادل شاہی عملداری میں تھا دھاوا کیا جائے۔ ۹۷۱ھ / ۱۵۶۳ء میں دونوں سلاطین اپنے خدم وحشم کے ساتھ قلعۂ کلیان کے پاس پہنچ گئے اور نہایت مسرت کے ساتھ ابراہیم قطب شاہ کی شادی بی بی جمال سے رچائی گئی اور کئی روز تک جشن رہا۔ شادی کے بعد یہ متحدہ فوجیں قلعۂ کلیان پر چڑھ دوڑیں[۱]۔ علی عادل شاہ نے مدافعت کے لئے رام راج کو دعوت دی۔ والیِ برار اور والیِ بیدر امیر برید بھی اس اتحاد میں شریک ہو گئے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ رام راج دو لاکھ پچاس ہزار سوار کے ساتھ مقابلے کے لئے آیا تھا لیکن اس کو جنگ میں حصہ لیتے ہوئے پس وپیش ہوا[۲] اور غالباً یہ پس وپیش ابراہیم قطب شاہ کی وجہ سے ہوگا، کیوں کہ ابراہیم کے ساتھ ویجیانگر کے بڑے اچھے تعلقات تھے اور ابراہیم نے اس کی آڑے وقت مدد بھی کی تھی، لیکن عادل شاہ کے طریقۂ عمل کی وجہ سے اس کو مجبوراً جنگ میں شریک ہونا پڑا۔ اس متحدہ مدافعت کی وجہ سے کلیان کے محاصرین پریشان ہو گئے اور دوسری وقت[۳] یہ تھی کہ ابراہیم قطب شاہ کو پریشان کرنے کے لئے تلنگانے پر حملہ ہوگیا۔ رام راج کا بھائی وینکٹ پتی اور جگدیو راؤ، عین الملک کنعانی۔ میاں بدو۔ چند وخاں جو گولکنڈے کے باغی تھے پندرہ ہزار سواروں کے ساتھ تلنگانے پر حملہ آور ہو گئے۔ گو زبیری کہتا ہے کہ ابراہیم قطب شاہ عادل شاہی حملے سے ڈر گیا تھا[۴]۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس عین موقعے پر ابراہیم کو اپنی سلطنت کا بچانا ضروری ہو گیا اسی وجہ سے حسین نظام شاہ اور ابراہیم قطب شاہ دونوں کلیان کے محاصرے سے پیچھے ہٹ گئے اور اپنے گھر چلے گئے تاکہ پہلے اپنی سلطنتوں کی حفاظت کریں۔

---

[۱] تاریخ قطب شاہی ص ۱۵۸
[۲] برہان مآثر علی بن عزیز اللہ ص ۴۰۷۔
[۳] بساتین السلاطین ص ۸۷۔

علی عادل شاہ کو پوری کامیابی ہوئی۔ مالِ غنیمت کے علاوہ جس میں ہاتھی اور گھوڑے تھے، نیز نظام شاہی سلطنت کے علم و نشان۔ دمامہ و ماہی مراتب اور سبز علم جو نظام شاہی خاندان کا مخصوص علم تھا حاصل ہوئے۔

چونکہ واپسی ایسے راستے سے ہوئی تھی جہاں دشمنوں کی فوجیں تھیں اس لئے احمد نگر کا مشہور جنرل مرتضٰے خاں تین ہزار سواروں کے ساتھ ابراہیم کے ہمراہ ہوگیا، لیکن عادل شاہی اور وجیانگر کی فوجوں نے اس کا تعاقب ضرور کیا۔ ابراہیم نے اپنے پیچھے منتخب جنرلوں کو جن کے نام شیر خاں، حسن خاں۔ عزیز خاں۔ دولت خاں۔ شیخ محمد اور میاں بھائی بتائے جاتے ہیں، دشمن کے مقابلے کے لئے مقرر کر دیا[1] اور بڑی لڑائی ہوئی۔ بعض قطب شاہی افسر عرب خاں اور شیخ محمد دشمن کے ہاتھوں گرفتار ہو گئے۔ اسی دار و گیر میں ابراہیم گولکنڈہ تو پہنچ گیا لیکن رام راج اور علی عادل شاہ تاڑپلی تک جو گولکنڈے سے آٹھ میل کے فاصلے پر ہے تعاقب کرتے ہوئے آئے اور انھوں نے جگدیو راؤ اور عین الملک کنعانی کو تلنگانے میں تاخت و تاراج کے لئے آمادہ کیا۔ اس کے علاوہ رام راج نے مرتضٰے نگر گنٹور کے راجہ سری تما کو پچاس ہزار سوار کے ساتھ مصطفٰے نگر بھیج دیا تاکہ وہاں لوٹ مار کرے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دارالسلطنت کے ارد گرد بھی لوٹ مار ہونے لگی۔ جگدیو راؤ نے اپنے پرانے اثرات سے کام لیا جو اس کو تلنگانے میں حاصل تھے اور رام راج کی عنایتوں کا لالچ دلایا اور اس طرح اس نے کوئل کنڈہ۔ گھنپورہ اور پانگل کے نائک واڑیوں کو اپنے ساتھ فراہم کر لیا۔ چنانچہ اندر کنڈے کے نائک واڑی کیسری راؤ نے حکومت سے علانیہ سرتابی کی۔ سدی تمیا مصطفٰے نگر سے اور سابہ خاں راجمندری سے ویلور آئے اور ان علاقوں کا محاصرہ کر لیا۔ اس سے گولکنڈے کو ایسی پریشانی ہوئی کہ اس سے پہلے کبھی نہیں ہوئی تھی۔ موت اور زندگی کا سوال پیدا ہوگیا۔ ابراہیم نے اپنی پوری قوت سے مقابلہ کرنے کی کوشش کی۔ یہ دیکھ کر اس کا دل بھر آیا کہ جو سلطنت اس کے باپ نے اپنے زورِ بازو سے اور بڑی بڑی فتوحات کے ساتھ بنائی تھی وہ ان نازک حالات میں

---

[1] تاریخ قطب شاہی ص ۱۵۸ [2] برہان مآثر علی بن عزیز اللہ ص ۷۔ ۴۰۶ [3] بستاتین السلاطین ص ۸۷۔

[4] تاریخ قطب شاہی ص ۱۶۱۔

دشمنوں کے ہاتھ میں جا رہی تھی وہ خود مقابلے کے لئے اٹھا۔[1] اس کی تائید میں کچھ حالات بھی بدلے۔ علی عادل اور علی برید جو اس کے سخت ترین دشمن تھے وہ اسکی مدد کے لئے آمادہ ہو گئے۔ رام راج کی کامیابیوں سے جو تلنگانے میں ہو رہی تھیں علی برید اور علی عادل شاہ دونوں کو پریشانی ہوئی کہ دکن میں اس کا پلّہ[2] بھاری ہو جائے گا اور وہ پورے دکن کے لئے خطرناک ہو گا اس تشویش سے یہ دونوں رام راج سے علیحدہ ہو گئے اور اس کو صلح کے لئے مجبور کیا اس بارے میں ابراہیم کو اطلاع دی گئی۔ صلح کی گفتگو کے لئے گولکنڈے سے مصطفےٰ خاں کو بھیجا گیا۔ مصطفےٰ خاں نے ایک طرف جگدیو راؤ کو شرم دلائی اور دوسری طرف علی عادل شاہ سے مل کر دکن کے معاملات پر گفتگو کی۔ علی عادل شاہ نے اس کو باریاب کیا اور اس نُسیدِ صافی ضمیر کی تقریر دل پذیر سے معاملات سُلجھ گئے۔ رام راج کو اس بات پر آمادہ کیا گیا کہ پانگل اور گھنپورہ جو قدیم زمانے سے وجیانگر کی عملداری میں تھے اس کو دیئے جائیں گے اور وہ صرف انھیں مقبوضات پر قناعت کرے اور دوسرے علاقوں پر دست درازی سے باز آجائے اس تصفئے کے بعد علی عادل شاہ، علی برید اور رام راج اپنے اپنے گھر چلے گئے اور مصطفےٰ خاں کامیابی کے ساتھ گولکنڈہ واپس آیا۔ تاریخ قطب شاہی کا مورخ مصطفےٰ خاں کے تدبّر کی بڑی تعریف[3] کرتا ہے کہ اس نے اپنے تدبر سے گولکنڈے کی سلطنت کو ایک بڑے خطرے سے بچا لیا۔

اس سفارت سے واپس آنے کے بعد مصطفےٰ خاں نے ابراہیم کو مشورہ دیا کہ قلعۂ گولکنڈہ کو مستحکم کرنا ضروری ہے کیوں کہ اس وقت قلعے میں مدافعت کا پورا انتظام نہیں تھا۔ سلطان قلی کے عہد میں قلعے کی جو بنیادیں رکھی گئی تھیں وہ ناکافی تھیں۔ ان نازک حالات نے جو ابھی گولکنڈے پر گزرے ثابت کر دیا کہ قلعے کے لئے کس قدر استحکام کی ضرورت ہے۔ بہر حال بڑے اہتمام سے قلعے کی تعمیر شروع ہوئی۔ مضبوط فصیل اور برج بنائے گئے۔ گولکنڈے کا مشہور بالا حصار تیار ہوا۔ بیرونی فصیل کے اندر محل، رہائش کے مکان اور بازاروں کا انتظام ہوا اس تعمیر کے لئے منتخب انجینیر اور معمار مقرر کئے گئے تھے۔

---

[1] تاریخ قطب شاہی ص ۱۶۳ - [2] حدیقۃ العالم میر ابوتراب ص ۱۳۵ و ۱۳۶ [3] تاریخ قطب شاہی ص ۲۴۱

پہلے خود قلعے کی تعمیر جو آبادی کے بیچ میں پہاڑی پر واقع ہے مدِ نظر تھی، یہ پایۂ تکمیل کو پہنچی۔ دوسرے آبادی اور شہر کی حفاظت کے لئے اردگرد فصیل کھینچی گئی تاکہ اگر باہر سے حملہ ہو تو عام شہریوں کو ضرر نہ پہنچے۔[۱] یہی قلعہ جو اس وقت ابراہیم کے عہد میں تعمیر ہوا تھا وہ آئندہ ایک صدی تک سلطنتِ گولکنڈہ کی حفاظت کرتا رہا۔ ملک کے جن باغیوں نے دشمنوں کا ساتھ دیا تھا ان کی خود مصطفےٰ خاں نے سرکوبی کی جس کے صلے میں مصطفےٰ خاں کو جو اب تک میر جملہ تھا پیشوا اور وکیلِ مطلق بنایا گیا! اس کے علاوہ دارالسلطنت میں سارو راؤ نامی ایک بڑا نائک واڑی اور تھا! اس نے بھی بغاوت کی ٹھانی اور چاہتا تھا کہ بادشاہ کی عدم موجودگی میں شورش برپا کرکے قلعہ رام راج کے حوالے کردے اور اس طرح قطب شاہی سلطنت کا بالکل خاتمہ ہو جائے۔ مصطفےٰ خاں نے اس کی بروقت خبر لی۔ چونکہ باغیوں کی کثرت تھی، پہلے ہلے میں ان کا قلع قمع نہیں ہو سکتا تھا، بلکہ ان باغیوں نے بادشاہ سے یہاں تک کہہ دیا کہ مصطفےٰ خاں کو ان کے حوالے کردے تو وہ بادشاہ کی اطاعت کرنے آمادہ ہیں، مصطفےٰ خاں مُلک کی سلامتی کی خاطر پوری وفاداری کی اور خود دشمنوں کے پاس جانے راضی ہو گیا لیکن بادشاہ نے باغیوں کی ایک نہ سُنی اور ایک ایک کرکے سب کی سرکوبی کی۔ راجمندری اور ایلور میں، جہاں شتاب خاں نے سر اُٹھایا تھا، رفعت خاں لاری کو ملک نائب کا خطاب دے کر بھیجا گیا، اور اس کے ساتھ آدم خاں۔ ملک شیرن اور تاج خاں عزیز الملک بھیجے گئے تھے۔ ان سپہ سالاروں نے موسم کی تمام مشکلات کا مقابلہ کرکے باغیوں کی سرکوبی کی اور ان تمام اقطاع پر قبضہ کرلیا۔ اس طرح سلطنتِ گولکنڈہ اپنے قدرتی حدود تک محفوظ ہو گئی۔[۲]

---

[۱] حدیقۃ العالم میر ابو تراب ص ۱۳۵ و ۱۳۶۔ تاریخ قطب شاہی ص ۲۳۱۔

[۲] ” ” ” ص ۱۳۶ و ۱۳۸۔ ” ” ص ۲۳۱۔

ساتواں باب

جنگ تالیکوٹ

ابراہیم قطب شاہ کی تخت نشینی سے آئندہ سات سال تک دکن کی باہمی رقابت اور وجیانگر کی مداخلت سے دکن میں جو افسوسناک حالات گزرے وہ رنگ لائے بغیر نہیں رہ سکتے تھے۔ اگرچہ احمد نگر اور بیجاپور کی رقابت نے دکن کی فضا ہمیشہ مکدر رکھی اور اس سے دکن کے سیاسی اطمینان اور رفتارِ تمدن کو بہت نقصان پہنچا، لیکن اس رقابت کا تاریک پہلو یہ تھا کہ بیجاپور کی خودغرضی نے وجیانگر کی ہندو سلطنت کو اپنے ساتھ شریک کر لیا اس سے نہ صرف وجیانگر کو خود بہ خود سطح مرتفع دکن کا راستہ مل گیا اور اس کو شمالی دکن کی سیاست میں حصہ لینے اور اپنا قدم جمانے کے مواقع ہاتھ آگئے، بلکہ اس سے یہ نقصان پہنچا کہ وجیانگر کی ہندو فوجوں نے مسلمانوں کے خلاف بُری طرح دل کا بخار نکالا۔ احمد نگر میں قبریں اور مسجدیں مسمار ہوئیں، قرآن شریف کی توہین کی گئی جو مسلمانوں کے لئے ناقابلِ برداشت چیز تھی۔ اگرچہ ابراہیم اور علی عادل شاہ نے اپنی تائید کے لئے رام راج کو دعوت دی تھی، لیکن تاریخ کہتی ہے کہ ان کا منشاء ہرگز یہ نہ تھا کہ اس سے اسلام کی توہین ہو، بلکہ انھوں نے حملے سے پہلے اس بات کی ہدایت کر دی تھی کہ مقدس مقامات کی بے حرمتی نہ ہونی چاہئے لیکن اس کو سننے والا کون تھا۔[1] اس کے علاوہ توازنِ قوت بھی خطرے میں پڑ رہا تھا۔ رام راج کی

---

[1] بساتین السلاطین ص ۹۰۔

دست درازیاں جس طرح احمد نگر پر ہوئی تھیں اسی طرح گولکنڈے کی سلطنت پر ہوئیں، بلکہ ابراہیم نے جو احمد نگر کا ساتھ دیا تو رام راج نے گولکنڈے کو بہت نقصان پہنچایا جو گولکنڈے کی حکومت کے لئے نہایت تشویشناک تھا۔ اگر بروقت بیچ بچاؤ نہیں ہوتا اور مصطفےٰ خاں کی سیاسی علمبرداری معاملات کی یکسوئی نہ کرتی تو گولکنڈے کی سلطنت کے لئے بہت بُرے دن آجاتے اور یہ نوخیز سلطنت قبل از وقت جنوبی سلطنت کا شکار ہو جاتی اور اس کا نتیجہ ہوتا کہ تلنگانے کے الحاق سے ویجیانگر کی ایک ناقابلِ مزاحمت طاقت کا شکار ہو جاتی۔ گو پہلے پہل عادل شاہی اور عماد شاہی حکومتیں موقعے کی یہ نزاکت محسوس کرنے سے قاصر تھیں، لیکن جب تلنگانے میں رام راج کا غلبہ ہونے لگا تو شمال کی اسلامی سلطنتیں خوفزدہ ہو گئیں اور اس خطرے کو رفع کرنا اور گولکنڈے کو بچانا ضروری سمجھا۔

ان کامیابیوں سے جو رام راج کو احمد نگر اور گولکنڈے کے حدود میں حاصل ہوئی تھیں، اس کے اس قدر حوصلے بڑھ گئے کہ وہ اب غالباً تمام دکن کی علمبرداری کا خواب دیکھنے لگا تھا اور اس کو یہ خیال ہو گیا کہ تقریباً تمام دکن پر قبضہ کرنا کچھ مشکل نہیں ہے۔ دکن کے مورخ کہتے ہیں کہ ویسے بھی ویجیانگر کی سلطنت بہت بڑی تھی۔ اگر فرشتہ کا بیان صحیح سمجھا جائے تو ویجیانگر کی اتنی بڑی سلطنت تھی کہ اس کی ساٹھ ستر بندرگاہیں، بے شمار قلعے اور الماس و زمرد کی کانیں تھیں اسکے علاوہ اور بہت سی قیمتی اشیا اس میں پیدا ہوتی تھیں۔ اس سلطنت کی آمدنی کوئی بیس کروڑ ہون یا اسی کروڑ روپے تھی اور اس کی فوج تین چار لاکھ سوار اور تو دس لاکھ پیدل پر مشتمل تھی[1]۔ خود یہ چیزیں احمد نگر اور گولکنڈے کو ڈرانے کے لئے کافی تھیں۔ اس کے علاوہ اگر رام راج تلنگانے پر بھی قابض ہو جاتا تو وہ بے پناہ طاقت کا مالک ہو جاتا اور اس کے لئے تلنگانے پر پیش قدمی کرنا کیا مشکل تھا! اس کی بعض حرکتوں سے تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ اس کے حوصلے روز بروز بڑھتے جا رہے ہیں اور شمالی دکن کے سلاطین اس کی نظر میں بے حقیقت ہیں۔ چنانچہ دکھنی سلطنتوں کے سفیروں کے ساتھ

---

[1] بساتین السلاطین ص ۸۹۔

جو وجیانگر میں رہتے تھے بُرا سلوک ہوتا تھا دربار میں ان کو جگہ نہیں ملتی تھی۔

یہ صورتِ حال مسلمان سلاطینِ دکن کے لئے از حد تشویشناک تھی۔ گو علی عادل شاہ اب تک اپنے ذاتی اغراض کے لئے رام راج کا دم بھرتا تھا لیکن ہندو فوجوں کی دل آزاریوں اور رام راج کی دست درازیوں سے اسکو بھی ٹھیس لگی، چنانچہ زبیری کہتا ہے کہ "علی عادل شاہ ازیں بے باکی و ناپاکی خاطرش سیر آمدہ گرانی کمال بہم رسانیدہ از غصہ و حمیتِ اسلامی برخود می پیچید۔ صلاح دینی و دنیوی جز در دفعش نمی دید"۔[1] اپنے عمائدِ سلطنت سے جن کے نام کشور خاں اور شاہ ابوتراب بتائے جاتے ہیں، مشورہ کر کے علی اس نتیجے پر پہنچا کہ وجیانگر کا خاتمہ کرنا ضروری ہے اور چونکہ یہ کام تنہا اس سے نہیں ہو سکتا تھا اسلئے تمام سلاطینِ دکن کو باہم متحد کرنا ضروری سمجھا گیا۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس منصوبے کی پہلی اُفتاد گولکنڈے کے دربار میں پڑی تھی، کیوں کہ رام راج سے احمد نگر اور گولکنڈے کو زیادہ نقصانات پہنچے تھے اور اگر حالات موافق نہیں ہوتے تو ان سلطنتوں کا ہمیشہ کے لئے شیرازہ بکھر جاتا۔ خاص طور پر گولکنڈے کو جو وجیانگر سے ملحق تھا دائمی خطرہ تھا، چنانچہ گولکنڈے کا مورخ کہتا ہے کہ رام راج کی دست درازیوں سے خائف ہو کر ابراہیم قطب شاہ کے ذہن میں یہ خیال آیا کہ وجیانگر کا خاتمہ کرنے کی فوری تجویز ہونی چاہیئے اور اس کو روبراہ کرنے کے لئے اس نے حسین نظام شاہ کو اپنے منصوبے سے واقف کر دیا۔[2] اور یہ قرینِ قیاس بھی ہے۔ اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ علی عادل شاہ نے سب سے پہلے اس منصوبے کی سوچ بچار کی اور دوسرے سلاطین کو اس کی دعوت دی تو اس میں پُر زور حصہ لینے والا بالآخر ابراہیم قطب شاہ ہی تھا۔ کیوں کہ جب علی عادل شاہ نے ابراہیم کے پاس اتحاد کے لئے کشور خاں کے ذریعے پیغام بھیجا تو اس نے فوراً لبیک کہا۔ خود واسطہ بن کر احمد نگر اور بیجاپور میں یگانگت پیدا کرنے کی کوشش کی۔ یہی مصطفےٰ خاں پہلے بیجاپور اور اسکے بعد احمد نگر میں حسین نظام شاہ سے ملاقات کی اور خوش بیانی سے کام لے کر اتحاد کا راستہ صاف کر دیا۔ چونکہ احمد نگر اور بیجاپور میں دیرینہ رقابت تھی اسلئے اتحاد کی زنجیروں کو مضبوط کرنے کیلئے حسین نظام شاہ کی

---

[1] بساتین السلاطین ص ۱۰۹ [2] تاریخ قطب شاہی ص ۱۷۳

نامور بیٹی چاند بی بی کو علی عادل شاہ سے اور اس کی بہن بی بی ہدیہ سلطانہ کی حسین کے بیٹے مرتضےٰ سے شادی قرار دی گئی، اور چونکہ شولاپور کے لئے دونوں میں ہمیشہ نزاع رہتی تھی اس لئے یہ طے ہوا کہ یہ ضلع چاند بی بی کے جہیز میں بیجاپور کو دیا جائے۔ اس شادی کی قرارداد کے لئے مصطفےٰ خاں کے ساتھ احمد نگر سے قاسم بیگ۔ حکیم تبریزی اور مُلّا غیاث الدین قاسمی بیجاپور گئے تھے اور ان کے توسط سے یہ مُبارک قرارداد طے ہوئی تھی۔ شادیوں کی رسم بڑی دھوم سے انجام دی گئی! احمد نگر اور بیجاپور میں کئی روز تک جشن ہوئے اور مسرت کا اظہار ہوا۔

جب اس اتحاد کی تکمیل ہوگئی تو وجیا نگر سے چھیڑ چھاڑ شروع ہوگئی علی عادل شاہ نے رام راج سے پرگنہ ادتنکور۔ پاکری۔ قلعۂ رائچور اور مدگل واپس طلب کئے اور اس مطالبے کے لئے ایک ایلچی روانہ کیا۔ رام راج تو اپنی طاقت کے گھمنڈ میں تھا ہی اس نے ایلچی کو حدودِ وجیا نگر سے بُری طرح نکال دیا۔ اس ایلچی کے واپس آتے ہی سلاطین دکن نے ڈسمبر ۱۵۶۴ء میں وجیا نگر کی طرف کوچ کر دیا۔ والیِ بیدر علی برید بھی اس اتحاد میں شریک تھا۔ صرف برہان عماد الملک والیِ برار اس اتحاد میں شریک نہ ہوا، کیوں کہ اس کو حسین نظام شاہ سے پرخاش تھی۔ سب کی باہمی قرارداد کے مطابق ۹۷۲ھ / ۱۵۶۴ء میں چاروں سلاطین بیجاپور میں ملے اور یہاں سے کوچ کر کے دریائے کرشنا کے کنارے تالیکوٹ پہنچے۔ چونکہ یہ موضع سلطنتِ بیجاپور میں داخل تھا اسلئے علی عادل شاہ نے یہاں اپنی طرف سے سب مہمانوں کی دعوت کی اور اس کے بعد کوچ کا انتظام کیا گیا۔ اس اثنا میں رام راج کو اطلاع ہوگئی تھی کہ ایک متحدہ فوج حملہ کرنے کے لئے آرہی ہے۔ لیکن اس بات کی بھی اطلاع تھی کہ اگر حملہ آوروں کے شرائط پورے ہو جائیں، یعنے عادل شاہی اور قطب شاہی مقبوضات جو اس نے زبردستی حاصل کر لئے تھے واپس کر دیئے جائیں اور اس کے بعد وہ کوئی دست درازی نہ کرے تو حملہ آور واپس ہو جائیں گے اور اس کے لئے یہ مسلمان سلاطین بالکل راضی تھے۔ لیکن رام راج اپنی دفاعی قوت کے گھمنڈ میں لڑائی کیلئے اُتر آیا۔ یہ چھہتر ہزار سوار اور نو لاکھ پیدل کے ساتھ آمادۂ پیکار ہوگیا۔ اپنے چھوٹے بھائی تِرو مالا کو جسے

مسلمان مورخ یلتم راج کہتے ہیں، بیس ہزار سوار، پانچ سو ہاتھی اور ایک لاکھ پیدل فوج کیساتھ پہلے روانہ کیا[1] تاکہ حملہ آوروں کو دریا سے اُترنے نہ دے اور اس کے پیچھے اپنے منجھلے بھائی وینکٹادری کو بھیجا۔ جب یہ دونوں فوجیں دریائے کرشنا کے کنارے پہنچ گئیں اور عبور کا راستہ مسدود کر دیا تو رام راج خود بڑی فوج کے ساتھ ہگری ندی کے کنارے پہنچ گیا۔

دکھنی فوجوں کے لئے دریا کا عبور کرنا بہت مشکل ہو گیا۔ جو راستے عبور کے تھے سب مسدود تھے۔ حملہ آور دشمن کو دھوکہ دینے کے لئے دریا کے کنارے کنارے بہت آگے نکل گئے اور وجیانگر کی فوجیں بھی ان کا راستہ روکنے کے لئے ان کے ساتھ ہو گئیں اور بہت دُور نکل گئیں تاکہ دکھنی فوجیں دوسری جگہ سے راستہ حاصل نہ کر لیں، لیکن یہ ان کی غلطی تھی۔ جب دکھنی فوجوں نے دیکھا کہ ہندو فوجیں اپنی جگہ سے بہت دُور نکل گئی ہیں تو بڑی سُرعت کے ساتھ پیچھے ہٹ گئیں اور پانچ روز کی مسافت ایک دن میں طے کر گئیں اور ہندو فوج کے آنے سے بہت پہلے ایک پایاب جگہ سے ایسا اچانک دریا عبور کر لیا کہ ہندو فوجوں کو خبر تک نہیں ہوئی۔ یہ عبور رات کی تاریکی میں ہوا۔ صبح کو معلوم ہوا کہ تمام دکھنی فوجیں دریائے کرشنا کے جنوبی کنارے جمع ہو گئیں اور دس میل آگے بڑھ کر رام راج کے مقابلے کے لئے تیار ہو گئیں۔ اس اچانک پیش قدمی اور عبور سے ہندو فوجیں بہت خوفزدہ ہو گئیں اور ان کے لئے مقابلہ مشکل ہو گیا۔

۲۰ جمادی الثانی ۹۷۲ھ (۲۳ جنوری ۱۵۶۵ء) کو یہ لڑائی ہوئی دکھنی فوجوں کی صفیں اس طرح آراستہ ہوئی تھیں کہ دکن کے پُرانے دستور کے مطابق قلب لشکر میں حسین نظام شاہ اور میمنہ پر علی عادل شاہ، میسرہ پر ابراہیم قطب شاہ اور علی برید کھڑے ہو گئے اور ہاتھی اور توپیں مناسب جگہ قائم کی گئیں۔ دوسری طرف خود رام راج کی فوجوں کی تنظیم یہ تھی کہ قلب لشکر میں تو وہ خود سینتیس ہزار سوار اور پانچ لاکھ پیادے، پانچ سو ہاتھیوں کے ساتھ کھڑا ہو گیا، اور میمنہ پر ایلتم راج کو بیس ہزار سوار، دو لاکھ پیدل پانچ سو ہاتھیوں کے ساتھ کھڑا کر دیا، اور حکم دیا تھا کہ اگر نظام شاہ گرفتار ہو تو اس کا سر میرے سامنے لایا جائے اور علی عادل شاہ اور ابراہیم قطب شاہ گرفتار ہوں تو ان کو زندہ پابہ زنجیر

---

[1] تاریخ وجیانگر کے ماخذ کرشنا سوامی اینگار ص ۸ تاریخ قطب شاہی ص ۱۸۱۔

لایا جائے تاکہ انھیں عمر بھر قید میں رکھا جائے گا۔ تقریباً دوپہر کو لڑائی شروع ہوئی۔ رام راج نے یہ غلطی کی تھی کہ گھوڑے پر سوار ہونے کے بجائے سنگاسن میں بیٹھ گیا۔ لڑائی کا پہلا رنگ دکھنی فوجوں کے خلاف پڑتا تھا۔ رام راج کی فوجوں نے تقریباً پانچ ہزار بان۔ بندوق۔ توپ اور ضرب زن سر کرنے شروع کر دیے اور ان کی فوج جو راج بیدر پر مشتمل تھی اپنی تلواروں کو سوت کر دشمن پر جا پڑی۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ دکھنی فوج کے قدم لڑکھڑانے لگے۔ لیکن حسین نظام شاہ نے جو قلبِ لشکر میں تھا کایا پلٹ کر دی، اس نے فوج کے سامنے دو سو بڑی توپیں اور دو سو درمیانی توپیں اور دو سو زنبورک جو بندوق سے بڑی ہوتی ہیں اس سلیقے سے قائم کر دی تھیں کہ دشمن کے لئے مقابلہ کرنا ناممکن تھا۔ چلبی رومی خاں جو توپ چلانے میں اُستاد تھا ان کے سر کرنے کے لئے مقرر تھا۔ اس کے علاوہ دو ہزار تُرکی تیر انداز بھی کام کر رہے تھے۔ ان لوگوں نے سپاہ گری کے قاعدے کے مطابق تیروں سے حملہ کر کے ہندو فوج کو توپ خانے کے روبرو ہٹا دیا اور جب رومی خاں نے توپیں سر کیں تو ہندو فوج کا بڑا حصہ کھیت ہو گیا۔ رام راج بہت گھبرایا اور اپنے مرصع شامیانے اور گدی پر بیٹھ کر سپر بھر بھر کے اپنے سپاہیوں اور سرداروں کو روپے تقسیم کرنے لگا اور جارحانہ کوشش کے لئے جُرأت دلائی۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ جنوبی فوجوں نے پھر زور سے حملہ کیا اور دکھنی فوجیں متزلزل ہو گئیں، لیکن اس مرتبہ بھی نظام شاہ کی ثابت قدمی سے بات رہ گئی۔ رومی خاں نے گولوں کی جگہ تانبے کے ٹکڑے بھر کے چھوڑے اور اس حملے سے پانچ چھ ہزار ہندو فوج میدان میں کھیت ہو گئی اور خود حسین نظام شاہ، کشور خاں لاری کے ساتھ رام راج پر حملہ آور ہوا اور اس کی تمام صفیں اُلٹ دیں، اور ایک نظام شاہی ہاتھی نے ایسا حملہ کیا کہ رام راج کے کہاروں نے سنگاسن زمین پر پٹک دی اور بھاگ کھڑے ہوئے، اور رام راج گرفتار ہو گیا اور رومی خاں اس کو نظام شاہ کے پاس لایا اور بادشاہ کے سامنے اس کا سر تن سے جُدا کیا گیا۔ اس واقعے سے وجیا نگر کی فوج فرار ہونے لگی اور انا گنڈی تک ان کا تعاقب ہوا۔ کہا جاتا ہے کہ اس دار و گیر میں ایک لاکھ ہندو فوج تہِ تیغ ہوئی تھی۔ میسرہ پر ابراہیم قطب شاہ نے وینکٹادری کو اور میمنہ پر علی عادل شاہ نے ایلتم راج کو

شکست دی اور اس کی فوجوں کو تہِ تیغ کیا۔[1]

فاتحین دس روز تک تو محاذِ جنگ میں رہے اور اس کے بعد خود وجیانگر میں قیام کیا اور یہاں چھ مہینے ٹھیرے رہے اور بڑے علاقوں پر قبضہ کر لیا۔ رائچور۔ مدگل۔ پرگنہ اُڈنگری اور تاکری کو جو رام راج نے زبردستی چھین لئے تھے دوبارہ حاصل کر لیا اور بہت سا مالِ غنیمت حاصل کیا۔[2] چونکہ اس تھوڑی سی مدت میں وجیانگر کے تمام علاقوں پر قبضہ کرنا ناممکن تھا اس لئے بعض علاقے رام راج کے بھائی وینکٹادری اور ایلتم راج کے ہاتھ میں چھوڑ دیئے گئے۔ تاہم یہ بہت بڑی فتح تھی اور اس کی خبر ہندوستان کے ہر گوشے میں پہنچ گئی۔ اس سلطنت کے خاتمہ سے نہ صرف شمالی دکن کے تمام سلطنتوں کو ہمیشہ کے لئے اطمینان ہو گیا بلکہ مادّی فائدے بھی ہوئے۔ گولکنڈہ اور بیجاپور نے آہستہ آہستہ حملہ کر کے اپنی سلطنتیں بہت وسیع کر لیں۔ چنانچہ آخری زمانے میں یہ سلطنتیں کرناٹک کے ایک بڑے حصے پر قابض ہو گئیں۔ اس قبضے سے ان کی دولت و اقبال میں بہت اضافہ ہوا۔

اس فتح وجیانگر سے گولکنڈے کو پہلا فائدہ یہ ہوا کہ اس کے مشرقی علاقے جو رام راج کے زہریلے اثر سے متلاطم تھے آسانی سے ہاتھ آ گئے۔ وجیانگر کی طاقت کے مٹ جانے سے مشرقی تلنگانے کے نائکوں کو مغلوب کرنا مشکل نہیں تھا۔ چنانچہ فتح وجیانگر کے ایک سال بعد ابراہیم قطب شاہ نے ملک نائب عین الملک۔ صلابت خاں اور ملک شیرن کو راج مندری کی تسخیر کے لئے بھیج دیا۔ سخت معرکوں کے بعد ۹۷۹ھ / ۱۵۷۱ء میں راج مندری فتح ہو گیا، اور جن نائکوں نے اپنا قدم جمایا تھا وہ بھاگ کر وجیانگر کی طرف

---

[1] فرشتہ حصہ سوم ص ۴۰۔ بساتین السلاطین زبیری ص ۱۰۲ و ۱۰۳۔ برہان مآثر علی بن عزیز اللہ ص ۴۲۳ و ۴۲۶۔ اصل لڑائی دریائے کرشنا کے جنوب اس موقع کے قریب ہوئی ہے جس کو رکساسی تنگادی کہتے ہیں۔ دیکھو سویل سلطنت از یادرفتہ فرگاٹن امپیر۔

[2] تاریخ قطب شاہی ص ۱۷۷۔

بھاگ گئے یا قاسم کوٹھ میں پناہ لی۔ جب ابراہیم قطب شاہ کو اس کی اطلاع ہوئی تو اس نے قاسم کوٹہ پر حملہ کرنے کا حکم دیا۔ اس کا راستہ بہت دشوار گزار اور قلعہ بہت مضبوط تھا، لیکن قطب شاہی فوجوں نے اس کا بہت جلد خاتمہ کر دیا۔ ۹۸۷ھ ۱۵۷۹ء میں عماد الدین شیرازی حیدر الملک نے کوندبیر فتح کر لیا اور تقریباً اسی زمانے میں امیر زنبیل اور دوسرے سپہ سالاروں نے گولکنڈے کے علاقے جو کاکن۔ ناکاوی اور کللکور کے نام سے موسوم تھے مسخر کر لئے۔ یہ مشرقی کوکن کے حصے سلطان قلی قطب شاہ کے عہد میں مفتوح ہوئے تھے، لیکن سبحان قلی کی کم سنی کی وجہ سے عادل شاہی فوجوں نے ان پر قبضہ کر لیا تھا۔ ان فتوحات سے گولکنڈے کی سلطنت نہ صرف بیرونی خطرات سے مطمئن ہو گئی، بلکہ چاروں طرف اپنے قدرتی حدود تک پہنچ گئی۔ یعنے جنوب میں شمالی کرناٹک، مشرق میں اڑیسہ اور مغرب میں کوکن تک پہنچ گئی۔ دوسرے الفاظ میں تمام تلنگانہ اپنے قدرتی حدود کے ساتھ قطب شاہوں کے زیرِ نگیں آ گیا اور اس طرح یہ ایک قومی اور جغرافی سلطنت ہو گئی اور اس ہم آہنگی سے اس کے سامنے آئندہ تمدنی اور معاشی ترقی کی کئی راہیں کھل گئیں جن سے ابراہیم کے جانشینوں نے پورا فائدہ اٹھایا۔

آٹھواں باب

سلطنت کی تعمیر

ابراہیم قطب شاہ نے قطب شاہی سلطنت کی ہر طریقے سے تعمیر کی۔ دکن کے بین مملکتی تعلقات میں ایک مستقل خارجی مسلک قرار دیا جو سلطنت کی بقا کا پوری طور پر ضامن ہو، ابراہیم کا بڑا کارنامہ ہے۔ یہ ہم اُوپر دیکھ آئے ہیں کہ اس نے کس طریقے سے سلطنت کا سفینۂ حیات دکن کے سخت منجدھار سے صحیح سالم نکال لیا، ورنہ گولکنڈے کی نوخیز سلطنت بیجاپور اور وجیانگر کے خطرناک سیلاب میں ایسی بہہ جاتی کہ اس کا پتا نہیں چلتا۔ ابراہیم کی بیدار مغزی سے اس سلطنت کی نہ صرف ہستی قائم رہ گئی بلکہ وہ اپنے قدرتی حدود تک پہنچ گئی جس میں اس کی آیندہ زندگی کا راز مضمر تھا۔ سلطنت اس وقت مضبوط ہو سکتی ہے جب کہ وہ اپنے پورے جغرافیے پر حاوی ہو۔ ادھوری سلطنتیں دیر پا نہیں ہو سکتیں۔ ابراہیم نے اپنی کوششوں سے تلنگانے کے تمام طول عرض اپنی سلطنت میں شامل کر لیے اور اس کے واسطے اپنی آخری عمر تک لڑتا رہا۔ ان لڑائیوں سے پہلے اس نے مرکزی استحکام کا پورا بندوبست کر لیا تاکہ باہر سے حملے ہوں تو ان کی خاطر خواہ مدافعت ہو سکے۔ خانِ اعظم مصطفےٰ خاں کے مشورے سے قلعۂ گولکنڈے کا ایسا دفاعی انتظام کیا گیا کہ آج سے آیندہ سو سال تک یہ سلطنت کی پوری حفاظت کرتا رہا۔ نو مہینے میں اس کی تکمیل ہوئی اور اس پر

بیس لاکھ روپے خرچ ہوئے۔ قلعہ تمام پتھر اور چونے سے بنایا گیا اور اس کے اردگرد دوہری فصیل بنائی گئی جس کا محیط آٹھ ہزار گز بتایا جاتا ہے۔ اس میں آٹھ آہنی دروازے ہیں، چبوتروں اور برجوں کی تعداد کوئی چار سو کے قریب تھی۔ قلعے کے استحکام کے ساتھ غالباً فوج کی بھی از سرِ نو تنظیم کی گئی اور فوج میں لائق سپاہی اور افسر مامور کئے گئے، کیوں کہ ابراہیم کے عہد میں جو بڑے بڑے معرکے سر ہوئے تھے ان سے قطب شاہی فوج کی کارکردگی معلوم ہوتی ہے۔

مرکزی حکومت میں لائق لوگ مامور کر کے اس کی کارکردگی بہت بڑھائی گئی جس میں ابراہیم کی مردم شناسی کو بہت دخل تھا۔ جس وقت ابراہیم گولکنڈے کے تخت پر بیٹھا تھا عین الملک اور جگدیو راؤ جو پچھلی حکومت کے عمائد تھے باغی ہو گئے اور ملک سے باہر چلے گئے اس لئے ابراہیم نے مصطفےٰ خاں اردستانی کو اپنا میرجملہ بنایا اور چند سال کے بعد جب اس سے بڑے بڑے کام انجام پائے تو ۹۷۱ھ/۱۵۶۳ء میں اس کو پیشوا بنایا گیا۔ تمام امورِ سلطنت، خواہ وہ خارجی ہوں یا داخلی، سب اسی کے مشورے سے روبراہ ہوتے تھے۔ اگر جنگِ تالیکوٹ کے بعد اس سے انتظامی غلطی سرزد نہ ہوتی تو وہ عمر بھر کام کرتا، اور ابراہیم قطب شاہ کے تمام عہدِ حکومت میں اس کی پیشوائی قائم رہتی۔[۱] رفعت خاں لاری کو ملک نائب بنایا گیا جو

---

[۱] جنگ تالیکوٹ کے بعد جب کئی قلعے فتح ہوئے تو اس سے اتفاقی طور پر ایک اصولی غلطی سرزد ہو گئی۔ قلعۂ رائچور۔ مدگل۔ ادمنگری۔ ذناکری پر قبضہ کرنے کے لئے پہلے ابراہیم قطب شاہ کی طرف سے مصطفےٰ خاں، حسین نظام شاہ کی طرف سے مولانا عنایت اللہ اور علی عادل شاہ کی جانب سے کشور خاں بھیجے گئے تھے مصطفےٰ خاں نے ان قلعوں پر قبضہ کر کے بلا اجازت ان کی کنجیاں کشور خاں کے سپرد کر دیں، اس سے ابراہیم قطب شاہ اور حسین نظام شاہ دونوں ناراض ہو گئے۔ آخر الذکر کے ایما سے ابراہیم نے مصطفےٰ خاں کو معزول کر دیا، اس معزولی کے بعد یہ بیجاپور میں ملازم ہو گیا اور علی عادل شاہ کے انتقال کے بعد ایک فساد میں مارا گیا (تاریخ قطب شاہی ص ۱۸۱-۱۸۲)۔

علمی و عملی قابلیت کی وجہ سے ممتاز تھا۔ تلنگانے کی اکثر فتوحات جو ابراہیم قطب شاہ کے عہد میں ہوئی تھیں سب ملک نائب نے سر کیں۔ راجمندری۔ ایلور وغیرہ اسی نے تسخیر کئے تھے۔ امیر شاہ محمد انجو بھی اسی عہد کے بڑے عہدہ داروں میں شامل تھا، اور یہ غالباً تمام قطب شاہی افواج کا سپہ سالار تھا۔ تلنگانے کے بعض مہموں کی اس نے کمان کی تھی حسین بیگ ترکمان جس کا قطب شاہی خاندان سے رشتہ تھا فوج کی بڑی خدمت پر مامور تھا۔ اکثر معرکوں میں اس کا بھی نام آتا ہے۔ حضرت حسین شاہ ولی بھی جو بادشاہ کے داماد تھے حکومت کے بعض فرائض انجام دیتے تھے۔ اکثر تعمیری کام انھیں کی نگرانی میں ہوئے ہیں۔ مرکزی حکومت کی کارکردگی میں خود بادشاہ کی بیدار مغزی کو بھی بہت دخل تھا۔ ابراہیم نے مرکزی حکومت کو اپنی دل سوزی اور لائق وزراء کی محنت اور قابلیت سے مضبوط اور باخبر بنانے کی پوری کوشش کی تھی۔ اس کی بیدار مغزی کا یہ حال تھا کہ وہ اپنے آپ کو مرکزی اور صوبہ واری امور سے پوری طور پر وابستہ رکھتا تھا۔ غالباً کوئی چیز اس کے علم سے خارج نہ تھی۔ ان اغراض کے لئے کہ مرکزی حکومت اپنے دُور دراز اضلاع کے حالات سے ہمیشہ باخبر رہے جاسوسی کو بہت ترقی دی گئی، اور اگر بعض مورخوں پر اعتماد کیا جائے تو اس نے جاسوسوں کا ایک بڑا محکمہ قائم کر دیا تھا جو گولکنڈہ تو کجا خود دکن کے لئے بھی ایک نئی چیز تھی۔ اس محکمے کے انتظام کی بدولت اسکے جاسوس تمام مُلک میں پھیل گئے اور اس سے حکومت کی کارکردگی بہت بڑھ گئی۔ اسی انتظام کا اثر تھا کہ قطب شاہی سلطنت میں غیر معمولی امن قائم ہو گیا جو ایک متمدن سلطنت کی شرط اولین ہے۔

قطب شاہی خاندان میں ابراہیم قطب شاہ سب سے پہلا حکمران ہے جس نے باضابطہ نظم و نسق قائم کر کے سلطنت کو پُر امن بنایا۔ "ولایتِ تلنگ کہ پُر از دزد و حرامی بود"[1] کے الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ تلنگانہ چوروں اور لیٹروں کا گھر تھا۔ راستے ایسے پُرخطر تھے کہ

---

[1] حدیقۃ العالم مقالۂ اول ص ۱۱۶۔

مسافروں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ گزرنا حد درجہ دشوار تھا۔ بڑے قافلوں کی ہمراہی کے بغیر کوئی شخص اطمینان سے راستہ طے نہیں کر سکتا تھا، اور یہاں کے چور اور لٹیرے بھی اپنے فن میں ایسے مشاق تھے کہ شاید دکن کے دوسرے حصوں میں ان کی نظیر نہ تھی۔ طرح طرح کی چوریاں کرتے تھے اور لوٹ مار سے مسافروں کو پریشان کرتے تھے، اور یہ حقیقت تاریخ کے ان الفاظ سے ظاہر ہوتی ہے کہ :- "مردم تلنگانہ درفن دزدی از رہزنان ممالک دیگر ممتاز اند"۔[۱] تاسیس سلطنت کے بعد غالباً ہر حکومت کا یہ پہلا فرض ہے کہ سلطنت کو پُرامن بنائے۔ ابراہیم قطب شاہ نے پورے اہتمام کے ساتھ تلنگانہ کے چوروں اور لٹیروں کا خاتمہ کرنے کی کوشش کی تاکہ ہر جگہ امن و امان قائم ہو اور اس کی بدولت تجارت اور صنعت و حرفت کو فروغ ہو۔ چوری اور ڈکیتی کے انسداد میں انتہائی سختی سے کام لیا گیا۔ چوروں اور لٹیروں کا سختی سے پیچھا کیا گیا، اور جرائم کی سخت سزائیں دی گئیں۔ بادشاہ کا حکم تھا کہ مجرموں کو کوڑے مار کر ان کے پیر کے ناخن جدا کریں اور اس کے سامنے پیش کریں۔ یہ بظاہر ایک وحشیانہ سزا معلوم ہوتی ہے۔ لیکن اس زمانہ میں اس کے بغیر جرائم کا انسداد اور قیام امن نا ممکن تھا۔ ابراہیم نے تلنگانے میں وہی کام کیا جو غیاث الدین بلبن نے شمال ہند میں کیا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ سلطنت بہت جلد پُرامن ہو گئی۔ تاریخ کا بیان یہ ہے کہ ابراہیم کے حسنِ انتظام کی وجہ سے چوری کا ارتکاب تو کجا کوئی شخص چوری کا لفظ زبان پر نہیں لاتا تھا۔ سزاؤں کی دہشت کی وجہ سے چوری و قزاقی بالکل مفقود ہو گئی۔ نیز کوئی چیز ضائع نہیں ہوتی تھی۔ جہاں کہیں جدید فتوحات ہوتی تھیں پہلے وہاں کے چوروں اور مفسدوں کا خاتمہ کیا جاتا تھا۔ چنانچہ اندر گنڈہ کی فتح کے بعد یہی انتظام کیا گیا۔ اگرچہ اس بیان میں مبالغہ معلوم ہوتا ہے کہ ابراہیم کے عہد میں ہر بڑھیا زر و جواہر کی کشتی لیے ہوئے تنہا گولکنڈے سے دور احمد نگر اور بیجاپور چلی جاتی تھی اور کوئی شخص اس کو ہاتھ نہیں لگا سکتا تھا۔[۲] تاہم اتنا تو صحیح ہے کہ سلطنت کے تمام راستے بے خطر تھے اور

[۱] تاریخ قطب شاہی ص ۱۳۳ - حدیقۃ العالم میر ابو تراب ص ۲۰۰ -
[۲] " " " " "

مسافر بے کھٹکے بغیر قافلہ کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک چلے جاتے تھے۔ اس کے علاوہ یہ بھی انتظام تھا کہ جب کبھی کسی تاجر کا کوئی جانور مرجاتا یا چوری ہوجاتا تو سرکار سے اس کا معاوضہ دیا جاتا تھا۔[۱] اس طریقہ سے ابراہیم کو عدل گستری کا پورا خیال تھا۔ ظاہر ہے کہ اس انتظام سے ملک میں نہ صرف امن قائم ہوگیا اور لوگ چین کی نیند سونے لگے، بلکہ اس سے تجارت اور صنعت و حرفت کو بہت فروغ ہوا اور دوسری تمدنی ترقیوں کی راہیں کھل گئیں جو کامیاب نظم و نسق کا قدرتی نتیجہ ہے اور تاریخ کے یہ الفاظ کہ :-

"آں حضرت را آنچہ در ضبطِ ملک و ملّت
دست دادہ در ہیچ تاریخ کسے نشان
نہ دادہ"[۲]

بالکل صحیح معلوم ہوتے ہیں۔

ابراہیم کی تعمیرِ سلطنت میں رفاہِ عام کے کام اور علمی سرپرستی بھی شامل ہیں۔ زراعت کی ترقی کے لئے کئی تالاب بنائے گئے جو اب تک موجود ہیں اور ان سے بڑی بڑی زمینیں سیراب ہوتی ہیں۔ کئی باغ لگائے گئے اور قصبات آباد ہوئے جن میں بعض ابراہیم کے نام سے موسوم ہیں۔ ابراہیم قطب شاہ اعلیٰ تعلیم یافتہ حکمران تھا اور شاعر بھی تھا۔ اس نے عربی و فارسی کے ساتھ مقامی زبان تلنگی کی بھی بہت سرپرستی کی تھی۔ اس کے دربار میں ہمیشہ علماء و فضلاء جمع رہتے تھے اور وہ ان کی صحبت سے فائدہ اٹھاتا اور ان سے اکثر مسائل پر بحث کرتا تھا۔ تقریباً تیس سالہ عہدِ حکومت کے بعد ۹۸۸ھ ۱۵۸۰ء میں اس کا انتقال ہوا، باغ لنگر میں اس کو دفن کیا گیا۔ انتقال کے وقت اس کی عمر صرف اکاون سال تھی جو زیادہ نہیں ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ

---

[۱] تاریخ قطب شاہی ص ۲۳۱۔ حدیقۃ العالم ابوتراب ص ۲۰۰۔

[۲] " " "

اس کو بہت مصیبتیں جھیلنی پڑی تھیں اور بادشاہ ہونے کے بعد اس کو سلطنت کے داخلی اور خارجی بڑے بڑے جاں گداز مسائل سے دو چار ہونا پڑا تھا۔

حصہ سوم

سلطنت کا عروج

نواں باب

دَورِ جدید

ابراہیم قطب شاہ کے انتقال کے بعد جو ۹۸۸ھ / ۱۵۸۰ء میں ہوا اس کا بیٹا محمد قلی قطب شاہ تخت پر بیٹھا۔ یہ مرحوم بادشاہ کا تیسرا بیٹا تھا جس کی عمر اس وقت صرف ۱۴ سال ۷ مہینے سے زیادہ نہ تھی۔ عبدالقادر عرف شاہ صاحب اور حسین قلی بڑے بیٹے تھے۔ ان دونوں کی عمریں باپ کے انتقال کے وقت بیس بائیس سال کے لگ بھگ تھیں۔ تین شاہزادے مرزا عبدالفتاح، مرزا خدابندہ اور مرزا محمد امین ... تھے جو محمد قلی قطب شاہ سے چھوٹے تھے۔ عبدالفتاح جو اچھا قاری تھا اور فنِ قرأت کی وجہ سے بہت مشہور ہے باپ کے انتقال کے وقت تیرہ سالہ تھا۔ یہ محمد قلی کے عہد میں سنہ ۱۰۰۳ھ / ۱۵۹۴ء میں فوت ہوا۔ پانچواں خدابندہ ہے جو محمد قلی کا سگا بھائی تھا اور اس کی عمر ۱۲ سال تھی۔ اس نے اپنے بھائی کے خلاف بغاوت کی تھی اس لئے قلعۂ گولکنڈہ میں قید کر دیا گیا تھا، اسی قید میں وہ فوت ہوا، اور اسی سال فوت ہوا جس سال محمد قلی کا انتقال ہوا تھا، یعنی سنہ ۱۰۲۰ھ / ۱۶۱۲ء۔ سب سے چھوٹا مرزا محمد امین تھا جسکی عمر صرف ۹ سال تھی۔ محمد قلی قطب شاہ سے اس کے تعلقات بہت خوشگوار تھے اور یہ اپنے پاکیزہ اخلاق کی بدولت بہت مشہور ہے سنہ ۱۰۰۴ھ / ۱۵۹۵ء میں اسکا انتقال ہوا۔

۱؎ تاریخ قطب شاہی ص ۳۲۳۔

اب رہی محمد قلی قطب شاہ کی تخت نشینی کہ اس کو بڑے بھائیوں کے ہوتے ہوئے کیوں کر تخت ملا، ایک رازِ سربستہ بنی ہوئی ہے۔ اس کو قطب شاہی مورخ پردے میں رکھنا چاہتے ہیں[1]۔ بات یہ ہے کہ اس وقت محمد قلی کے بڑے بھائی عبدالقادر اور حسین قلی بہ قیدِ حیات تھے۔ عبدالقادر سب میں بڑا تھا جس کی ماں گلبرگے کے ایک مشائخ گھرانے کی خاتون تھی اور خود اس شہزادے کی شادی باپ نے حضرت شاہ خلیل اللہ بُت شکن کے مشائخ گھرانے میں کی تھی جو بیدر کا بہت معزز گھرانا تھا۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاید یہ شاہزادہ باپ کے انتقال کے وقت گولکنڈے میں نہ تھا۔ مختلف تاریخوں میں اس کے متعلق بے سروپا روایتیں ملتی ہیں۔ ایک تاریخ کہتی ہے کہ اس کے باغیانہ رویہ کی وجہ سے اس کو گولکنڈے سے دُور رکھا گیا تھا، بلکہ بغاوت کے جُرم میں وہ دیورکنڈے میں نظر بند تھا جہاں وہ بیس سال کی عمر میں طبعی موت سے مر گیا[2]۔ دوسری تاریخ کہتی ہے کہ یہ زہر دے کر مارا گیا۔ ایک اور تاریخ میں لکھا ہے کہ اُمرائے وقت نے بادشاہ کو یقین دلایا کہ اس کو زہر دیا گیا ہے لیکن وہ مرا نہیں بلکہ وہ کہیں روپوش ہو گیا ہے[3]۔ من جملہ ان کے ایک روایت بھی قابلِ اعتنا نہیں ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پایہ تخت سے دُور وہ کہیں روپوش تھا۔ اسی وجہ سے محمد قلی کو عمر بھر اس کی پریشانی رہی۔ دوسرا شاہزادہ حسین قلی گولکنڈے میں موجود تھا اور اس میں سلطنت کی اہلیت بھی تھی اور تاریخ کے الفاظ میں "بہ زیورِ علم و فضل آراستہ بود و از علم و حکمت بہرہ تمام داشت و در وقتِ وفات شہریار بیست سالہ بود۔" اس کے علاوہ یہ

---

[1] گولکنڈہ کی تمام تاریخیں محمد قلی قطب شاہ اور اس کے جانشینوں کے زمانہ میں لکھی گئیں اس لئے وہ ان واقعات کو کیوں کر روشنی میں لا سکتی ہیں جن کی صراحت سے محمد قلی کے کردار پر حرف آتا ہو۔

[2] تاریخ قطب شاہی ص ۲۴۳ دربار آصف نگز اردوم ص ۱۸۸ و ۱۸۹۔

ولیعہدی کے لئے نامزد تھا۔ ان حالات میں محمد قلی کا بادشاہ ہونا تاریخ کا ایک بہت بڑا شاخسانہ معلوم ہوتا ہے۔ اس میں درباریوں کی بہت بڑی سازش تھی کہ ان لوگوں نے آن کی آن میں تختۂ وراثت اُلٹ دیا، یعنے ایک حقیقی وارثِ تخت کو زندہ درگور کر کے ایک غیر حقدار کو تاجِ شاہی پہنا دیا۔

واقعات کی چھان بین کی جائے تو تبدیلِ وراثت کا بڑا سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ جس وقت ابراہیم قطب شاہ کا انتقال ہوا ہے حسین قلی کے ہمدرد و ہوا خواہ پایہ تخت میں نہ تھے۔ حسین قلی کے سچے ہمدرد میر شاہ میر طبا طبا۔ میر جملہ اور اس کے حاشیہ کے لوگ تھے اور یہ سب سلطنت کے باہر یعنے نلدرگ میں تھے کیوں کہ اس زمانہ میں نلدرگ میں عادل شاہی اور قطب شاہی فوجوں کے درمیان معرکہ کارزار گرم تھا اور شاہ میر طبا طبا قطب شاہی فوج کی کمان کر رہا تھا۔ اور ہمیں معلوم ہے کہ شاہ میر سلطنت کا میر جملہ ہونے کی بدولت ابراہیم قطب شاہ کے عہد کا ایک جلیل القدر عہدہ دار تھا۔ اس کا بادشاہ اور رعایا پر ایسا اثر تھا کہ وہ دوسرے کو نصیب نہ تھا۔[1] اگر اس وقت یہ پایہ تخت میں ہوتا تو محمد قلی کو تخت ملتا تو کجا اس کی جان کی بھی خیر نہ تھی۔ شاہ میر حسین قلی کا طرفدار تھا اور اس کی بیٹی شاہزادے سے منسوب تھی۔ اس کی عدم موجودگی سے جب کہ وہ اور اس کے ہمخیال عہدہ دار سب کے سب نلدرگ میں اڑے ہوئے تھے حالات اچانک بدل گئے۔ اب پایہ تخت کے سارے[2] معاملات رائے راؤ کے ہاتھ میں تھے جو بوڑھے بادشاہ کا منہ چڑھا تھا۔ اسی نے غالباً ابراہیم قطب شاہ کو تبدیلِ وراثت اور ولیعہدی کا مشورہ دیا ہوگا چنانچہ ایک مورخ کے بیان کے مطابق بوڑھے بادشاہ نے اپنے بسترِ مرگ پر حسین قلی کی جگہ محمد قلی کو ولیعہدی کے لئے نامزد کر دیا۔[3]

---

[1] تاریخ قطب شاہی ص ۲۲۳۔ [2] برہان مآثر علی بن عزیز اللہ ص ۱۵۴۔

[3] تاریخ قطب شاہی ص   برہان مآثر ص ۵۲۷۔

غالباً رائے راؤ شائد حسین قلی کے مقابلہ میں محمد قلی کی بادشاہی کو بہتر سمجھتا تھا کیوں کہ ایک مورخ کے بیان کے مطابق محمد قلی کی ماں بھاگ رتی نامی ایک ہندو عورت تھی[1] اور یہ ہندو خاتون اور اس کا بیٹا محمد قلی راے راؤ کی زیادہ سرپرستی کرتے تھے اور یہ عزت اس کو حسین قلی کی بادشاہی میں نصیب نہ ہوتی اس وقت میر شاہ میر کا ملک میں سکہ چلتا، کیوں کہ میر شاہ میر ذی اثر ہونے کے علاوہ اس کی بیٹی حسین قلی سے منسوب تھی۔ اس پیش رفت میں دکھنی قومیت بھی کچھ کم اثر انداز نہ تھی۔ اہلِ دکن شاہ میر سے خوش نہ تھے، یہ غیر ملکی تھا اور غیر ملکی طبقہ کی سرپرستی کرتا تھا اور سرپرستی کی وجہ سے غیر ملکی ملک میں چھا رہے تھے اور غالباً اہلِ دکن نے شاہ میر کی بڑھتی ہوئی طاقت کو توڑنے کے لئے رائے راؤ کا ساتھ دیا اور حسین قلی کے مقابلے میں محمد قلی کی بادشاہی کو غنیمت سمجھا۔ اس طرح ملک کے تمام حالات محمد قلی کی تائید میں پیدا ہو گئے اور محمد قلی کی بادشاہی کا اعلان کر دیا گیا اور حسین قلی ایسا بے دست و پا کر دیا گیا کہ وہ جنبش نہ کر سکا جس کی تفصیل تاریخوں میں نہیں ملتی۔ ایک روایت یہ ہے کہ وہ ۲۶ سال کی عمر میں تالاب میں ڈوب مرا لیکن قرینِ قیاس یہ ہے کہ محمد قلی کی تخت نشینی کے چھ سال کے بعد قید میں مر گیا یا مارا گیا۔ اب رہا شاہزادہ عبدالقادر جو سب سے بڑا تھا وہ پایہ تخت میں نہ تھا بلکہ ملک میں یا ملک کے باہر کہیں چھپا ہوا تھا۔[2]

محمد قلی قطب شاہ ۴ر رمضان ۹۷۳ھ / ۱۵۶۵ء کو پیدا ہوا تھا۔ یہ تاریخ دکن کا یادگار سال ہے۔ اسی سال دکن کی مشہور جنگ تالیکوٹ واقع ہوئی تھی۔ اس معرکہ کے صرف تین مہینوں کے بعد محمد قلی پیدا ہوا تھا "باعثِ روزی اہلِ عالم" کے الفاظ سے اس کی تاریخ پیدائش نکلتی ہے۔ اس شہزادے کی پیدائش سے ابراہیم قطب شاہ کو بہت خوشی ہوئی تھی اور اس خوشی کے اظہار میں اس نے بڑا جشن کیا تھا۔ غربا کو امداد دی گئی

---

[1] ماہنامہ کتب خانہ آصفیہ حیدر آباد ص ۱۹۳۔

[2] سلطان محمد قلی قطب شاہ، ڈاکٹر زور ص ۲۶۹۔

علماء و مشائخین کو بیش بہا انعامات دیئے گئے۔ کئی شاعروں نے اس پیدائش کی مسرت میں نظمیں لکھیں اور بادشاہ کے سامنے پیش کی تھیں اور اس کے صلہ میں ان کو بیش بہا انعام ملے تھے۔ منجملہ ان نظموں کے یہ قطعہ بہت مشہور ہے:۔

شاہ را داد خُدا فرزندے — کہ شد از دیدنِ او دل خُرم
پئے شکرانہ شہِ دریا دل — کرد با خلق بہ صد لطف و کرم
سالِ مولودش را یافت فلک — باعثِ روزیِٔ اہلِ عالم[1]

مُلّا وجہی نے جو "قطب مشتری" کے نام سے مثنوی[۲] ۱۰۱۸ھ لکھی تھی اس میں محمد قلی کی پیدائش کو ان الفاظ سے سراہا ہے:۔

اُجالا پڑا آج یوں نور کا — کہ حاجت نہیں چاند اور سور کا
دو جگ آج نورِ علیؑ نور ہے — زمیں چاند اور آسماں سور ہے
یو نادان بالک ہنسا لاڈ کا — تواں پھول ہے شاہ کے جھاڑ کا[2]

اگرچہ محمد قلی قطب شاہ کم سنی میں تخت نشیں ہوا تھا اور اسکے علاوہ اس کی تمام عمر انتہائی عیاشی میں گزری تھی لیکن وہ سلطنت کے بست و کشاد سے کبھی غافل نہیں رہا۔ وہ بہت بیدار مغز بادشاہ تھا۔ اس کی نظر سلطنت کے چاروں گوشوں پر پڑتی تھی۔ مسلسل شورشوں کی روک تھام اور آزادیٔ دکن کی حفاظت گولکنڈے کا ہمیشہ مطمح نظر رہا ہے۔ محمد قلی بھی اسی مسلک کا پابند تھا۔ اس نے ہمیشہ اس بات کی کوشش کی کہ سلطنت کے دُور دراز حدود ایسے مستحکم رہیں جیسے خود مرکزی حکومت ہوتی ہے اور بیرونی خطروں کی روک تھام ہو جنوب اور جنوب مشرق میں قطب شاہی سلطنت کے حدود دریائے تنگبھدرا کے نیچے پنگنڈہ اور کنڈی کوٹہ تک پہنچ گئے تھے اور شمال مشرق میں دریائے گوداوری کے اوپر سکاکول تک جا ملتے تھے۔ بیرونی حملوں کی مدافعت کے لئے ان سرحدوں پر جابجا فوجیں متعین تھیں۔

---

[1] تاریخ قطب شاہی ص ۱۸۳ [2] قطب مشتری ملا وجہی و سلطان محمد قلی قطب شاہ ڈاکٹر زور ص ۱۷۱۔

دریائے گوداوری چھ راج مندری اور اس کے شمال میں سکاکول بڑا فوجی مستقر تھا اور اس کے بعد گنٹوڑ (مرتضےٰ نگر) مشرقی چھاؤنی تھی اور جب کبھی ضرورت ہوتی تھی ان چھاؤنیوں سے فوجی نقل وحرکت عمل میں آتی تھی، اور محمد قلی قطب شاہ کے عہد میں یہ نقل وحرکت بارہا ہوئی ہے۔ کیوں کہ جنگِ تالیکوٹ سے وجیانگر کا خاتمہ تو ہو چکا تھا لیکن رام راج کے بھائی یلیتم راج اور وینکٹ پٹی ابھی باقی تھے اور کرناٹک کے چند محدود علاقوں پر قابض تھے اور یہ کبھی انگڑائی لیتے تھے۔ اسکے علاوہ بعض اُمراء و جاگیردار بھی سرتابی کرتے تھے اور شاہی خاندان کے افراد بھی سَر اُٹھاتے تھے اس لئے محمد قلی کو اُن سب کی سرکوبی کرنی پڑی۔

سب سے پہلے علی خاں لُر نے بغاوت کی۔ یہ شخص گنٹوڑ کی فوجوں کا سپہ سالار تھا، اور یہ عہدہ اس کو طبل وعلم کے ساتھ ابراہیم قطب شاہ کے عہد میں ملا تھا۔ ۹۹۰ھ ۱۵۸۲ء میں اس نے سرتابی کی اور گنٹوڑ پر حملہ کر کے قبضہ کرنا چاہا۔ نوجوان بادشاہ نے رحیم داد خاں اور طاہر محمد خاں کی سرکردگی میں ایک بڑی فوج بھیج دی۔ علی خاں سے کئی مقابلے ہوئے۔ یہ گنٹوڑ سے کنڈاپلی اور پھر وہاں سے نظام پٹن کی طرف بھاگا اور بالآخر جب وہ گنٹوڑ کی طرف پلٹا تو بُری طرح محصور ہو گیا اور اس مقابلہ میں وہ اور اس کے تمام ساتھی کھیت ہو گئے۔ لیکن یہ فساد چار سال سے پہلے ختم نہیں ہوا۔[لہ] اس فساد سے رائے وجیانگر وینکٹ پٹی کو قطب شاہی سلطنت پر حملہ کرنے کی جُراءت ہو گئی، چنانچہ وہ حملہ کا سامان کرنے لگا۔ یہ ۱۰۰۳ھ ۱۵۹۵ء کا واقعہ ہے جب کہ محمد قلی شہرِ حیدرآباد کی تعمیر سے فارغ ہو گیا تھا، وہ خود مقابلے کے لئے باہر آیا اور ایسا یلغار کیا کہ ایک ہی حملہ میں قلعۂ موسلمورگ فتح کر لیا اور اس کے بعد اپنے میر جملہ امین الملک کو نندیال اور کللکور کی طرف روانہ کیا جو رام راج کے بھائی یلیتم راج کے قبضہ میں تھے

لہ تاریخ قطب شاہی ص ۲۴۰ - حدیقۃ العالم ۲۱۰ - ۲۱۲ - سلطان محمد قطب شاہ ڈاکٹر زور ص ۲۴۶ - ۲۴۸ -

لیکن قطب شاہی فوج کی آمد سے یلمنم راج ایسا سہم گیا کہ بغیر لڑے بھڑے قلعوں کی کنجیاں پیش کردیں۔[1] اس کے بعد امین الملک کو کندی کوٹ کی تسخیر کے لئے بھیجا گیا اور چند روز کے بعد خود بادشاہ بھی یہاں آگیا۔ یہاں رام راج کا بھانجا ترسم راج قابض تھا۔ اس قلعہ کا سخت محاصرہ ہوا، چاروں طرف توپیں لگ گئیں اور حیدری توپ کے گولے قلعہ کی بلندیوں تک پہنچنے لگے اور قلعہ کی عمارتیں اور مندر تباہ ہونے لگے تو ترسم راج نے ڈر کر صلح کرلی۔[2] اس کے بعد پنگنڈے کو مسخر کرنا ضروری تھا، کیوں کہ یہاں وینکٹ پٹی قدم جمائے ہوئے تھا اور اس نے علی خاں لُر کی بغاوت میں حصہ لیا تھا اور اپنی فوج سے اس کی مدد کی تھی، لیکن بادشاہ کے اس اچانک حملے سے وہ ڈر گیا اور معافی چاہی، کیوں کہ قلعے میں محاصرے کے لئے کافی رسد نہیں تھی، بادشاہ نے معاف کردیا، لیکن یہ سراسر دھوکا تھا کیوں کہ قطب شاہی فوجوں کی چشم پوشی سے فائدہ اُٹھا کر اس نے دو تین روز کے اندر قلعہ میں کافی رسد فراہم کرلی اور پھر لڑنے کے لئے تیار ہوگیا۔ وینکٹ پٹی کے اس فریب سے بادشاہ بہت برافروختہ ہوا، اب کرتا تو کیا کرتا، بات ہاتھ سے نکل چکی تھی۔ اس وقت مشکل یہ آن پڑی کہ برسات کا موسم شروع ہوگیا تھا اور دریائے کرشنا میں طغیانی کا ڈر لگ رہا تھا اس لئے بادشاہ کو چاروناچار گولکنڈہ واپس ہونا پڑا۔ واپس ہونے سے پہلے بادشاہ نے کندی کوٹ پر سنجر خاں اور موسلمورگ پر آسیر راؤ اور نند یال پر جگپت راؤ کو متعین کردیا۔[3]

پنگنڈے کی اس ناکامی سے قطب شاہی سلطنت کو بہت دھکا لگا، کیوں کہ وینکٹ پٹی نے اب پورے زور و شور سے اپنی ریشہ دوانیاں شروع کردیں اور آس پاس کے زمین داروں اور راجاؤں کو اپنے ساتھ ملانا شروع کیا، چنانچہ راجہ اودگیر اور

---

[1] حدیقۃ العالم ۲۰-۲۲۱-۲۲۔ ڈاکٹر زور ۲۴۹-۲۵۱۔

[2] حدیقۃ العالم ۲۲۱۔ ڈاکٹر زور ۲۵۲-۲۵۳۔

[3] حدیقۃ العالم ۲۲۲-۲۲۳۔ ڈاکٹر زور ۲۵۵-۲۵۶۔

پاس رائے کو گنڈور پر حملہ کرنے کے لئے آمادہ کیا۔ افضل خاں حوالدار نے اس کا مقابلہ کیا۔ ایسا سخت رَن پڑا کہ قطب شاہی فوجوں کے قدم ڈگمگانے لگے، لیکن عین وقت پر اژدہا خاں اپنے پانچ سو سواروں کے ساتھ آدھمکا۔ اس کے آنے سے جنگ کا پانسہ پلٹ گیا۔ دشمن کے تین ہزار سپاہی میدان میں کھیت رہے اور باقی فوج بھاگ کھڑی ہوئی۔ لیکن اس شکست سے وینکٹ پتی کے حوصلے پست نہیں ہوئے بلکہ اس نے آس پاس کے راجوں کو اپنے ساتھ ملا کر ایک لاکھ فوج کے ساتھ کنڈی کوٹ پر دھاوا بول دیا۔ یہاں سنجر خاں حوالدار تھا، وہ قلعہ بند ہو کر دشمن کا مقابلہ کرنے لگا۔ اس اثناء میں مرتضےٰ خاں نے دشمن کو پریشان کرنے کے لئے ویجیا نگر پر بڑھ کر وار کر دیا اور شہر کرپاک کو جو بہت آباد شہر تھا مسمار کر کے رکھ دیا۔[1] جب وینکٹ پتی کو اس حادثے کی خبر ملی تو اس نے بلیتم راج اور منوہر راج کی سرکردگی میں دس ہزار سوار مرتضےٰ خاں کے مقابلہ کے لئے بھیج دیئے۔ مرتضےٰ خاں کب ڈرنے والا تھا، اس نے حملہ آوروں کا ڈٹ کے مقابلہ کیا اور ان کو بھگا دیا اور بادشاہ سے نئی کمک مانگی۔ بادشاہ خود اس مہم کے لئے میدان میں آنا چاہتے تھے، لیکن اس عین وقت میں رُستم خاں نے اپنی خدمات پیش کر دیں۔ یہ شخص ابھی احمد نگر کی طرف سے بہ غرض سفارت آیا تھا۔ بادشاہ بڑے پس و پیش کے بعد راضی ہوئے، اس کو ایک بڑی فوج کے ساتھ کرناٹک بھیجا۔ لیکن رُستم خاں کی ناتجربہ کاری اور بے سمجھی سے تہ و بالا ہو گیا۔ مرتضےٰ خاں سے اس کی ... نہیں بنی۔ مرتضےٰ خاں موقع محل اور جنگ کے ہتھکنڈوں سے خوب واقف تھا اور اچھی رائے دیتا تھا لیکن رُستم خاں نے اس کی ایک نہیں سُنی اور دریا سے اُتر کر ایسی جگہ جنگ کا ڈھنگ ڈالا جہاں دلدل ہی دلدل تھی، قطب شاہی فوج دلدل میں پھنس گئی، اس سے فائدہ اُٹھا کر دشمن نے ان کو مارنا شروع کیا۔ یہ دیکھ کر رُستم خاں بھاگ کھڑا ہوا۔ اس وقت مرتضےٰ خاں نے

---

[1] حدیقۃ العالم ص ۲۲۳۔ ڈاکٹر زور ص ۲۵۹۔۲۶۰۔

کچھ عزت رکھ لی، اس نے پیچھے سے دشمن پر وار کیا اور اس کو منتشر کر دیا۔ اس طریقہ سے قطب شاہی فوج بڑی تباہی سے بچ گئی۔ بادشاہ اس شکست اور رُستم خاں کی بے سمجھی اور بُزدلی سے بہت خفا ہوئے اور اس کو ذلّت کے ساتھ حیدر آباد کے باہر کر دیا۔ لیکن اب قطب شاہی سلطنت کو اہلِ کرناٹک سے بدلہ لینا تھا۔ بادشاہ نے اعتبار خاں یزدی کو، جو اس زمانے میں گنٹور کا حوالدار تھا لکھا کہ علم خاں۔ ساباجی۔ بھالے راؤ اور دوسرے سرداروں کو لے کر بیجانگر کے علاقوں پر حملہ کرے۔ اعتبار خاں نے فوراً چڑھائی کی اور کرناٹک میں تہ و بالا کر دیا۔ اس کی یلغار سے قصبات اور دیہات کے لوگ جنگلوں کی طرف بھاگنے لگے۔ یہ دیکھ کر راجہ اینگیر نے قطب شاہی فوج پر شبخون مارنے کی کوشش کی اگرچہ برسات کی وجہ سے یہ منصوبہ ناکام ہو گیا لیکن راجہ اینگیر نے پچاس ہزار کی ایک اور فوج جمع کر لی۔ چنانچہ علم خاں۔ ساباجی۔ مہدی قلی بیگ اور حسن علی وغیرہ سرداروں سے اس فوج کا سامنا ہوا قطب شاہی سپاہیوں نے جان توڑ کوشش کی لیکن دشمن کی کثرت کی وجہ سے یہ بُری طرح ہٹ گئے: تاہم اعتبار خاں فوراً اپنی فوج کے ساتھ علم خاں اور ساباجی کی مدد کے لئے پہنچ گیا اور دشمن کو اس قدر پریشان کیا کہ وہ بھاگنے لگے، ان کا ہر جگہ تعاقب ہوا اور اس تعاقب میں کرناٹک کے کئی شہر مسمار ہو گئے۔ ان حملوں کے بعد پھر کئی سال تک ویجیانگر والوں نے قطب شاہی حدود میں حملہ کرنے کی ہمت نہیں کی۔[۱]

۱۰۰۵ھ / ۱۵۹۶ء میں کسمکوٹ (قاسم کوٹ) کا قضیہ سامنے آیا۔ اس کا راجہ بلندر رائے قطب شاہی سلطنت کا باجگذار تھا، لیکن اس کا بیٹا مکند رائے جو باپ کی جگہ گدی نشین ہوا تو اطاعت سے پھر گیا۔ برلاس خاں نے جو اس نواح کا حوالدار تھا بادشاہ کو اس شورش کی خبر کر دی۔ بادشاہ نے میر زین العابدین کی

۱۔ حدیقۃ العالم ص ۲۲۴۔ ۲۲۷۔ ڈاکٹر زور ص ۲۶۰۔ ۲۶۵۔

سپہ سالاری میں ایک بڑی فوج بھیج دی اور اس کے پیچھے امین الملک میر جملہ کو روانہ کر دیا۔ امین الملک تو بڑے رعب داب کا امیر تھا، اس کے آنے سے مکندر راج بہت ڈر گیا اور آس پاس کے راجاؤں سے مدد مانگی اور خود بیس ہزار سواروں کے ساتھ مقابلہ کے لئے آیا۔ بڑے زور کا رن پڑا، اس میں کئی قطب شاہی افسر کام آئے اور قطب شاہی فوج پسپا ہونے لگی۔ یہ دیکھ کر امین الملک نے دشمن کے قلب پر حملہ کر دیا اور اس زور سے یلغار کیا کہ دشمن کے پیر اُکھڑ گئے۔ مکندراج کسٹم کوٹ کی طرف بھاگا مگر امین الملک کب چھوڑنے والا تھا وہ برابر تعاقب کرتا چلا گیا۔ مکندراج کو سکاکول کی طرف بھاگنا پڑا، یہاں بھی اس کو چین نہیں ملا تو پنالور کی طرف پلٹ گیا اور یہاں کے راجہ رام چندر سے مدد مانگی۔ امین الملک نے پنالور پر حملہ کر دیا اور اس مُلک کو تباہ کرنا شروع کیا۔ بیچارے رامچندر نے امین الملک سے معافی مانگی اور باجگذار ہو گیا اس کے بعد امین الملک کسٹم کوٹ واپس آ گیا۔[1] لیکن ادھر راجندری میں ایک ہنگامہ برپا ہو گیا، یہاں ایک طاقتور قوج تھی جس کو ردیوار کہتے تھے۔ ان لوگوں نے میدان خالی دیکھ کر ایلور نڈول وغیرہ میں شورش برپا کر دی۔ جب بادشاہ کو اطلاع ہوئی تو اس نے گنٹور کے حوالدار عادل خاں اور چنگیز خاں سرنوبت کو حُکم دیا کہ وہ اپنی فوج کے ساتھ باغیوں کے سر پر پہنچ جائیں۔ جب یہ فوج وہاں پہنچی تو یہ پیچھے ہٹ گئے مگر دریائے گوداوری عبور کر کے قطب شاہی فوج پر زد کرنے لگے۔ اب قطب شاہی فوج کو دریا عبور کرنا بہت مشکل ہو گیا۔ بادشاہ کے حُکم سے میر زین العابدین توپوں اور تفنگچیوں کے ساتھ عادل کی مدد کے لئے پہنچ گیا اور ایک جگہ سے دریا عبور کرنے میں کامیاب ہو گیا اور دشمن پر اس زور سے حملہ کیا کہ یہ چور چور ہو گئے اور بادشاہ سے معافی کی درخواست کی۔ ان کی آہ و زاری سے متاثر ہو کر بادشاہ نے زین العابدین اور دوسرے افسروں کو واپس ہونے کا

---

[1] حدیقۃ العالم ص ۲۲۴-۲۲۷۔ ڈاکٹر زور ص ۲۶۰-۲۶۵۔

حکم دے دیا۔

یہ تو راجگانِ تلنگانہ و کرناٹک کی شورشیں تھیں لیکن اس کے علاوہ بعض ارکانِ سلطنت نے بھی سرتابی کی اور شاہی خاندان والوں نے علمِ بغاوت بلند کیا۔ ارکانِ سلطنت میں سب سے پہلے علی خاں لُر کی بغاوت ہم دیکھ آئے ہیں۔ اسکے بعد ۱۰۰۴ھ / ۱۵۹۵ء میں علم خاں بغاوت کر بیٹھا۔ اس کا نام طاہر محمد خاں تھا۔ علی خاں لُر کی بغاوت کے بعد اس کو جاگیر ملی تھی، کیوں کہ اس نے اس بغاوت کے فرو کرنے میں نمایاں حصہ لیا تھا۔ جب اس کی جاگیر سے مالِ دیوانی کا مطالبہ ہوا تو یہ لڑائی پر تُل گیا۔ اس کو امین الملک سے بڑی شکایت تھی۔ لیکن امین الملک نے نہ صرف اس کی سرکوبی کی بلکہ آس پاس کے تمام زمیں داروں کی خبر لی اور تمام فضا خاموش کر دی۔ لیکن اسی سال یعنے ۱۰۰۴ھ / ۱۵۹۵ء میں جب علم خاں برسرِ بغاوت تھا اور رینگنڈے کی شاہی فوجیں برسرِ پیکار تھیں شاہ عبد القادر کا غلغلہ بلند ہوا۔ اس شاہزادے کا ذکر اُوپر ہوا ہے۔ یہ محمد قلی کا بڑا بھائی تھا، جب اس کے باپ ابراہیم کا انتقال ہوا ہے اور محمد قلی تخت نشیں ہوا تو یہ کہیں چھپا ہوا تھا۔ اگر یہ بھی گولکنڈے میں رہتا تو اس کا بھی وہی حشر ہوتا جو حسین قلی کا ہوا تھا۔ ۱۰۰۴ھ / ۱۵۹۵ء میں جب کہ مُلک میں سیاسی بے چینی پھیلی ہوئی تھی یہ بہ حیثیت دعویدارِ سلطنت آمادۂ جنگ ہو گیا۔ بیدر کے بعض مشایخ جن میں شاہ محب اللہ بھی شامل تھے اس کو بڑی عزت کے ساتھ بیدر لائے۔ بیدر سے شاہزادے کا سُسرالی تعلق تھا۔ اس خبر سے مُلک میں ایک سنسنی پھیل گئی اور لوگ جوق جوق اس کے جھنڈے کے نیچے جمع ہونے لگے۔ جن طبقوں کو بادشاہ سے مذہبی شکایت پیدا ہو گئی تھی ان کو اچھا موقعہ ملا کیوں کہ محمد قلی گولکنڈے کی پُرانی روایت کے خلاف جعفری مذہب پھیلا رہا تھا۔ بادشاہ کو اس خبر سے بڑی تشویش ہوئی۔ اس نے پہلے تدبیر تو یہ کی کہ بعض معتبر

لہ تاریخ قطب شاہی ص ۲۵۸–۲۸۲۔ حدیقۃ العالم ص ۲۳۱–۲۳۶ ڈاکٹر زور ص ۷۹–۸۰۔

لوگوں کو جمع کر کے عبدالقادر کے مرنے کی گواہی لے لی۔ ان لوگوں نے یہ تصدیق کر دی کہ انھوں نے عبدالقادر کا مرنا اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ اس کے بعد والئی بیدر امیر برید کو لکھا کہ اس کو پکڑ کر گولکنڈہ بھیج دے۔ امیر برید اس کو پکڑنے والا تھا کہ اہلِ بیدر نے اس کو فوراً وجیا نگر کی سرحد پر پہنچا دیا۔ یہاں اس کی بہت آو بھگت ہوئی اور ایک بڑی طاقت جمع ہو گئی اور گولکنڈے کے عمائد مثلاً خدابندہ خاں حبشی اور خیرات خاں اس کے ساتھ ہو گئے اور یہاں اس کی بادشاہی کا اعلان ہو گیا۔ تلنگانے کے طول و عرض میں اس کی تائید میں بلوے ہونے لگے اور اس کے پاس جوجھی عرضداشتیں آنے لگیں جن میں اطاعت کا اظہار تھا اس کے بعد عبدالقادر کا لشکر قطب شاہی حدود میں داخل ہو گیا اور پانگل پر قبضہ کر کے گولکنڈے کی طرف پیش قدمی کرنا چاہتا تھا۔ یہ نقشۂ جنگ اور راستہ بالکل وہی معلوم ہوتا ہے جس سے ابراہیم قطب شاہ گزرا تھا۔ ہم جانتے ہیں کہ ابراہیم بھی اسی راستہ سے اور اسی طریقہ سے گولکنڈہ آیا تھا۔ جب عبدالقادر کی اس طرح طاقت بڑھ گئی تو اس نے محمد قلی کو ایک ذلّت آمیز خط لکھا جس کو دیکھ کر محمد قلی آگ بگولہ ہو گیا۔

پہلے اس نے اعتبار خاں کے تحت ایک فوج پانگل کی حفاظت کے لئے بھیج دی اور اس کے بعد حسین معمور خاں۔ تمازی خاں۔ علی خاں۔ یکجہت خاں اور اللہ قلی بیگ کے تحت ایک جرّار فوج روانہ کر دی۔ اگرچہ عبدالقادر کی فوج چھ ہزار سے زیادہ تھی تاہم وہ شاہی فوج کا کیا مقابلہ کرتی اور جب لڑائی ٹھن گئی تو شاہ عبدالقادر کا جرنیل خدابندہ خاں حبشی مارا گیا۔ اس کے مرنے سے فوج کے پیر اکھڑ گئے اور عبدالقادر میدان سے بھاگا اور بیجاپور جا کر پناہ لی۔ والئی بیجاپور ابراہیم عادل شاہ نے اس کو اپنے دربار میں جگہ دے دی۔ عادل شاہ کی سرپرستی سے معلوم ہوتا ہے کہ عبدالقادر حقیقی وارثِ سلطنت تھا، فرضی آدمی نہ تھا۔ اس شکست کے بعد پھر اس نے حملہ کرنے کی ہمت نہ کی۔[۱]

---

[۱] تاریخ قطب شاہی ۲۶۷، ص ۲۶۸۔ حدیقۃ العالم ص ۲۳۰-۲۳۱۔ سلطان قلی قطب شاہ ڈاکٹر زور ۲۶۸-۲۷۲۔

۱۵۸۰ء میں فوجی افسر راوت راؤ نے بغاوت کردی۔ اس کو علم خاں کی طرح امین الملک کی سخت گیری اور درشت بیانی سے شکایت تھی، اس سے بگڑ کر وہ راتوں رات گولکنڈے سے بھاگ گیا اور ہر بچیندر کو جو مکندرائے کا بھتیجا تھا اپنی مدد کے لئے بلایا۔ ان دونوں نے دس ہزار کی ایک بڑی فوج جمع کرلی اور امین الملک کے لشکر پر شبخون مار دیا۔ اس لڑائی میں راوت راؤ کے ایک تیر لگا اور اس کے ساتھی سب فرار ہو گئے[1] لیکن یہ لڑائی یہاں ختم نہیں ہوئی۔ ہر بچیندر نے دستا دیو کو ساتھ ملا کر جو اس علاقے کا طاقتور راجہ تھا، ایک نیا محاذ تیار کر دیا اور مکندراج بھی اسکی مدد کے لئے دوڑا آیا۔ امین الملک نے چنگیز خاں کو سپہ سالار بنا کر ایک بڑی فوج ان کے مقابلہ کے لئے بھیجی اور زین العابدین بھی مدد کے لئے آیا۔ مکندراج قلعۂ جلمور میں پناہ گزیں تھا، اس قلعہ پر بھی وار کیا گیا، یہ سب پسپا ہو گئے لیکن اس اثنا میں دستا دیو اور ہر بچیندر نے ایک اور فوج فراہم کرلی جو مقابلہ کے لئے میدان میں آگئی، لیکن یہ بھی منہزم ہو گئی۔ اس شکست سے دستا دیو ایسا مجبور ہو گیا کہ بالآخر خراج دینے کے لئے قطب شاہی سلطنت کی اطاعت اختیار کرلی، اسکے بعد قلعۂ جلمور پر حملہ کیا گیا جہاں مکندراج قلعہ بند تھا۔ اس قلعہ پر اس زور سے یلغار کیا گیا کہ مکندراج پریشان ہو کر بنگالے کی طرف بھاگ گیا[2] لیکن ۹۸۸ھ ۱۵۸۰ء میں کشتم راج میدان میں آگیا جو راوت راؤ کا بیٹا تھا، پھر کیا تھا، مکندراج کو پھر موقعہ ملا وہ بھی مدد کے لئے آگیا۔ ان دونوں نے پہلے مدواڑہ اور رپوٹور کے قصبات پر قبضہ جمایا اور اس کے بعد آس پاس کے دیہات کو مسمار کرنے لگے۔ اس وقت

---

[1] حدیقۃ العالم ص ۳۸-۳۹

سلطان محمد قلی قطب شاہ۔ ڈاکٹر زور ص ۲۸۲-۲۸۳۔

[2] حدیقۃ العالم ص ۲۴۰-۲۴۱۔

سلطان محمد قلی قطب شاہ۔ ڈاکٹر زور ۲۸۴-۲۸۵-۲۸۶۔

غالباً امین الملک کا انتقال ہو گیا تھا۔ صرف زین العابدین میدان میں تھا۔ اسکے ساتھ چنگیز خاں۔ سید تاج رضا خاں۔ مجاہد خاں۔ دھرما راؤ اور آسیر راؤ جیسے فوجی افسر مدد کے لئے تیار تھے۔ ان لوگوں نے دشمن کا پُر زور مقابلہ کیا صبح سے شام تک لڑائی ہوتی رہی۔ بالآخر چنگیز خاں نے میدان مار لیا، اور دشمن فرار ہو گئے، لیکن مکند راج مدداڑہ میں محصور ہو گیا جس کو ختم کرنا آسان نہ تھا کیوں کہ اس کے پاس گھنے جنگل تھے۔ دھرما راؤ کی رائے یہ تھی کہ مکند راج کو سابق کی طرح باجگزار بنا کر چھوڑ دیا جائے، لیکن زین العابدین اس کے لئے تیار نہ ہوا، بلکہ وہ تمام دشمنوں کو زیر کر کے تمام میدان صاف کرنا چاہتا تھا۔ بادشاہ کو دھرما راؤ کی بات پسند تھی اس لئے بادشاہ نے زین العابدین کو واپس بلا کر سید حسن کو سپہ سالار بنا کر بھیجا جو مصطفےٰ خاں کا بیٹا تھا اس کے آنے سے مطلع صاف ہونے لگا۔ سید حسن نے اپنے ماتحت افسروں کی رائے سے آس پاس کے قلعوں کو مضبوط کر دیا۔ یہ نئے قلعے مصطفےٰ آباد۔ قطب شاہ آباد اور محمد آباد کے نام سے موسوم ہوئے۔ ان قلعوں کی مضبوطی اور فوجی بھرتی سے مکند راج کے تمام راستے بند ہو گئے، اب اس کے لئے کوئی راستہ نہ تھا۔ اپنا راستہ بنانے کے لئے اس نے کشتم راج کو قلعۂ محمد آباد پر وار کرنے کے لئے بھیجا۔ اس مقابلہ میں کشتم راج مارا گیا۔ اس کے بعد مکند راج نے قلعۂ مصطفےٰ آباد پر وار کر دیا یہاں بھی اس کو شکست ہو گئی۔ اب سید حسن نے قلعۂ جلمور پر حملہ کر دیا جو مکند راج کی پناہ گاہ تھی۔ اس محاذ میں دشمنوں کو ایسی شکست ہوئی کہ پھر وہ سر نہیں اٹھا سکے۔[1]

اس طرح آٹھ دس سال تک سلطنت کی فضا خاموش رہی۔ لیکن ۱۰۰۸ھ ۱۶۰۰ء میں خود پایۂ تخت میں ایک نئی بغاوت کھڑی ہو گئی اور یہ خدا بندہ کی بغاوت تھی جو

---

[1] حدیقۃ العالم ص ۲۴۲ — ۲۴۳۔

سلطان محمد قلی قطب شاہ۔ ڈاکٹر زور ص ۲۸۸ — ۲۸۹ — ۲۹۰۔

محمد قلی قطب شاہ کا سگا بھائی تھا اور اس سے تین سال چھوٹا تھا اس کو یہ اُمید تھی کہ بھائی کے مرنے کے بعد اس کو تختِ شاہی ملے گا، کیوں کہ محمد قلی کو ایک بیٹی کے سوا کوئی اولادِ نرینہ نہ تھی۔ لیکن ۱۰۱۶ھ/۱۶۰۷ء میں جب سلطان محمد کی حیات بخشی بیگم سے شادی ہو گئی اور سلطان محمد کی بادشاہی کا اعلان ہو گیا تو خدا بندہ کی اُمیدوں پر پانی پھر گیا اس لئے اس نے تلوار کے زور سے تخت حاصل کرنے کی کوشش کی۔

اس بغاوت میں پھر وہی مذہبی اور قومی رنگ پیدا ہو گیا جو شاہ عبدالقادر کے خروج میں ہوا تھا۔[1] خدا بندہ بھی سُنّی مشرب تھا اور غیر مُلکیوں کے خلاف اہلِ دکن کی تائید کرتا تھا، اس لئے فتح الملک حسن علی خاں اور امور خاں جیسے دکھنی اُمرا اسکے ساتھ ہو گئے اور یہ سب لوگ حضرت شاہ راجو کے حلقۂ ارادت میں شامل تھے اور غیر مُلکیوں کا خاتمہ کر کے دکھنی راج قائم کرنا چاہتے تھے، کیوں کہ مُلک میں سب غیر مُلکی چھائے ہوئے تھے۔ اگرچہ محمد قلی اپنے بھائی کو دل سے چاہتا تھا اور اس کی بہت دلجوئی کرتا تھا لیکن جب خود جان کے لالے پڑ جائیں تو رشتۂ محبت کہاں باقی رہتا ہے۔ بغاوت کا راز فاش ہو گیا اور اب قریب ہی شاہ راجو کی خانقاہ سے علمِ بغاوت بلند ہونے والا تھا کہ بادشاہ کو خبر ہو گئی۔ تمام سازشی پکڑے اور پیٹے گئے۔ خدا بندہ قلعۂ گولکنڈہ میں قید ہو گیا وہ اسی قید میں مرا اور شاہ راجو اس گرفت سے بچنے کے لئے بیجاپور بھاگ گئے۔[2] اگرچہ یہ بغاوت جلد فرو ہو گئی لیکن اس واقعے سے محمد قلی قطب شاہ کو بہت صدمہ پہنچا اور اس کی صحت خراب ہو گئی جو اس کی موت کا باعث ہوئی۔ اس پر طرہ یہ کہ ۱۰۱۹ھ/۱۶۱۱ء میں جب کہ بادشاہ کی صحت گرتی جا رہی تھی دستر کے راجہ پرتاب شاہ کا ہنگامہ برپا ہو گیا جو اپنی راجدھانی سے باہر نکل کر قطب شاہی حدود میں دست درازی کرنے لگا۔

---

[1] حدیقۃ العالم ص ۲۴۲-۲۴۳ سلطان محمد قلی قطب شاہ۔ ڈاکٹر زور ۲۸۸-۲۸۹-۲۹۰۔

[2] تاریخ قطب شاہی ص حدیقۃ العالم ص ۲۵۱-۲۵۲ سلطان محمد قلی قطب شاہ۔ ڈاکٹر زور ص ۲۹۳-۲۹۴-۲۹۵۔

اس زمانہ میں بادشاہ بیمار تھے اور سلطنت کے کاروبار مرزا محمد امین میر جملہ کے سپرد تھے لیکن میر جملہ نے اس معاملہ میں چستی سے کام نہیں لیا۔ بالآخر خود بادشاہ نے ہی اس طرف توجہ کی اور فوجی پیش قدمی کا حکم دیا، کیوں کہ ایسے موقع پر خاموش رہنا خطرے سے خالی نہ تھا بلکہ دُور رس نتائج کا اندیشہ تھا۔ چنانچہ آسیر راؤ کو سید حیدر اور امجد الملک کے ساتھ مقابلہ کے لیئے روانہ کیا گیا۔ گو یہ فوج بڑی حد تک کامیاب ہوئی اور دشمن کا مُنہ توڑ جواب دیا، لیکن دستر کا قلعہ نا قابلِ تسخیر تھا، گھنے جنگلوں سے گھرا ہوا تھا، یہاں یہ فوجیں کیسے پہنچ سکتیں، اس لیئے بادشاہ کے حکم سے خود مرزا محمد امین روانہ ہوا اور اس کے پیچھے زبردست خاں۔ اعتبار خاں اور خیرات خاں آگئے اور یہ لوگ قلعۂ نلنگورا اور متدیر پر قابض ہو گئے اور دستر کا محاصرہ کر لیا جس میں پرتاب شاہ قلعہ بند تھا لیکن اس اثناء میں برسات شروع ہو گئی اور ایسا مینہ برسا کہ دلدل کی وجہ سے راستے بند ہو گئے۔ مرزا محمد امین اس میدان کا مرد نہیں تھا، وہ بہت پریشان ہوا اور اپنی سرحد کی طرف لوٹ گیا اور بادشاہ کو اطلاع کر دی۔ بادشاہ کو محمد امین کی پست ہمتی اچھی نہیں معلوم ہوئی تاہم اس نے ہمت نہیں ہاری بلکہ مالک پرست خاں کے تحت پانچ ہزار تفنگچیوں کی ایک بڑی کمک بھیج دی اور یہ محمد قلی قطب شاہ کی آخری مُہم تھی۔ اس فوج کی پیش قدمی سُننے کے لیئے وہ زندہ نہیں رہا بلکہ چند روز کے بعد وہ راہیِ عدم ہو گیا۔[1] بادشاہ کے انتقال کی خبر سے مرزا محمد امین گولکنڈہ واپس ہو گیا اور یہ مہم محمد قلی کے جانشین سلطان محمد قطب شاہ کے لیئے ملتوی رہی۔ نئے بادشاہ نے ۲۱-۱۰۲۰ھ / ۱۶۱۲ء میں سید کمال الدین ماژندرانی کو سید حیدر عرب اور چیتہ خاں کیساتھ

---

[1] حدیقۃ العالم ص ۲۵۷-۲۵۸- تاریخ قطب شاہی
سلطان محمد قلی قطب شاہ۔ ڈاکٹر زور ص ۲-۳-۴-۳۰-

دستر کی مہم کے لئے بھیجا، کیوں کہ مرزا محمد امین کی کاہلی کی وجہ سے یہ مہم ادھوری رہ گئی تھی۔ اس فوج نے ایسا یلغار کیا کہ پرتاب شاہ نے دب کر صلح کرلی اور خراج دینے کا وعدہ کیا۔ چنانچہ شرائطِ صلح اور باجگذاری طے کر کے یہ قطب شاہی فوج گولکنڈہ واپس ہوئی اور مرحوم بادشاہ کے آخری منصوبہ کو پورا کر دیا۔[لے]

دستر کی مہم کو ملا کر جس کا راجہ بعد کو باجگذار ہوگیا محمد قلی قطب شاہ نے اپنے جانشینوں کے لئے ایک وسیع اور پرامن سلطنت چھوڑی تھی جو اس کی بیدار مغزی اور مستعدی کا پھل تھا۔ محمد قلی کی بیدار مغزی قابلِ تحسین ہے۔ باوجود عیاشانہ زندگی کے وہ کسی چیز سے بے خبر نہیں رہا۔ جب کبھی شورش اور بغاوت ہوتی تھی فوراً اقدام کرتا تھا اور ہر شورش کا کلہ بہ کلہ جواب دیتا تھا۔ اس طریقے سے اس نے دشمنوں کو زیر کیا۔ اس کی سلطنت شمال میں دستر سے لے کر جنوب میں کنڈی کوٹہ تک پھیلی ہوئی تھی اور ایک چھوٹی شہنشاہت معلوم ہوتی تھی، کیوں کہ اس میں کئی راجہ مہارانیاں تھیں اور قطب شاہی سلطنت کی باجگذار تھیں۔ تلنگی انشاپردازوں نے محمد قلی کو ۸۴ قلعوں کا مالک بتایا ہے۔[لے] اس بیان کی صحت میں کوئی کلام نہیں ہوسکتا۔ اس کی سلطنت میں اس سے زیادہ ہی قلعے تھے۔

محمد قلی قطب شاہ نے اپنے کو ایک شعر میں "اُدھیراج" لکھا ہے:۔

سدا بارہ اماماں میرے نگہدار رہیں
ہوا ہوں ان کی غلامی تھے قطب راج "دُھیراج"[سے]

لہ تاریخ قطب شاہی حدیقۃ العالم ص ۲۷۳ — ۲۷۴۔

لہ دگجینتی ولاسم۔ شعر نمبر ۳۰ مصنفہ سارنگو تمیا۔ میں اس حوالے کے لئے ڈاکٹر رام راجو کا ممنون ہوں۔

سہ کلیات محمد قلی قطب شاہ مرتبہ ڈاکٹر زور۔

دسواں باب

دکن کا سیاسی توازن

محمد قلی قطب شاہ کا خارجی مسلک بھی سنجیدہ اصول پر مبنی تھا۔ اس مسلک میں بڑی دُور اندیشی پنہاں تھی۔ اصول یہ تھا کہ جہاں تک ہو سکے ہمسایہ طاقتوں سے برادرانہ تعلقات پیدا کئے جائیں اور جنگ کی آگ نہ بھڑکنے پائے۔ بین مملکتی تعلقات میں ہمیشہ امن و آشتی بہت زیب دیتی ہے کہ تمام مملکتیں جنگ و جدل سے دامن چھڑائیں اور خاموشی کے ساتھ اپنی سلطنتوں کی ذہنی اور اخلاقی تربیت کا سامان کریں۔ محمد قلی خود ایک مصلح اور معمارِ قوم تھا اور اپنی سلطنت کی تمدنی سطح بلند کرنا چاہتا تھا، نہ کہ ہمسایہ سلطنتوں سے لڑ کر خون کی ندیاں بہائے۔ لیکن یہ صلح و آشتی اس وقت زیب دیتی ہے جب کہ تمام ہمسائے اپنے حدود کے اندر رہیں اور اپنے خود غرضانہ مفاد کی خاطر دوسروں پر دست درازی نہ کریں۔ یعنے دوسرے الفاظ میں توازنِ قوت قایم رکھیں ورنہ ایک حملہ آور کے سامنے خواہ مخواہ سر جھکا لینا امن و آشتی نہیں ہے، اس سے تمام نظامِ حیات درہم برہم ہو جائے تو عجب نہیں، کیوں کہ غاصب کے سیلاب میں چھوٹی طاقتیں بہہ جاتی ہیں اور ان کو سانس لینے کا موقعہ نہیں ملتا۔ اس لئے گولکنڈے کی پُرانی روایت کے مطابق محمد قلی نے بھی بیجاپور کے مقابلے میں احمد نگر کی تائید کی اور شادی بیاہ کے ذریعہ آپس میں خوشگوار

تعلقات پیدا کئے۔ اس سے آگے اس نے سمندر پار ایران کی سلطنت سے بھی اپنا سیاسی رشتہ جوڑنے کی کوشش کی اور اس میدان میں اسی نے پہلا قدم رکھا تھا کیوں کہ محمد قلی کے بزرگوں نے ایران سے کبھی ہاتھ ملانے کی کوشش نہیں کی تھی اس میں صرف محمد قلی نے پہل کی تھی۔ اس اقدام کے پیچھے سیاست کے ساتھ مذہبی جذبہ بھی چھپا ہوا تھا۔ ایران کے صفوی حکمران سب شیعہ تھے اور ادھر محمد قلی نے اپنے بزرگوں کے خلاف اپنے مشرب میں شدت پیدا کر دی۔ یوں تو اس کے باپ دادا بھی شیعہ تھے لیکن ان میں بے حد رواداری اور ذہنی صفائی تھی لیکن محمد قلی کے مذہب میں زیادہ سختی پیدا ہو گئی اور اس وجہ سے اس نے ایران کے صفوی سلاطین کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ اب رہی سیاست، تو وہ بھی اس اتحاد کی محرک تھی۔ ہم جانتے ہیں کہ محمد قلی کے عہد میں دکن میں مغلوں کا بڑے زور سے سیلاب آنے لگا اور اس سیلاب کے سامنے نظام شاہی سلطنت لڑکھڑا رہی تھی اور اس کے پائے تخت احمد نگر پر مغل قابض ہو چکے تھے اور وہ دن دُور نہیں تھے کہ جنوب کی بیجاپور اور گولکنڈے کی سلطنتیں بھی اس سیلاب میں بہہ جائیں، اس لئے ان سلطنتوں کے حکمرانوں کو اپنی سلامتی کی تدبیر کرنا بہت ضروری تھا۔ محمد قلی ایک بیدار مغز اور دُور رس حکمران تھا، اس کی نظر سیاست کے دُور دراز گوشوں پر پڑتی تھی۔ اس کے ذہن میں غالباً یہ خیال تھا کہ ایران کے اتحاد سے مغل حملہ آوروں کی روک تھام ہو سکے گی اور شائد حملہ آور پیچھے ہٹ جائیں گے۔۔ دوسری طرف صفوی حکمران بھی دکھنی سلطنتوں کے اتحاد سے اپنی طاقت بڑھانا چاہتے تھے، کیوں کہ وہ دو بڑی طاقتوں کے درمیان گھرے ہوئے تھے۔ ان کے مغرب میں سلطنت عثمانیہ تھی جو یورپ اور ایشیا پر پھیلی ہوئی تھی اور مشرق میں ہندوستان کی مغلیہ سلطنت تھی۔ وسط ایشیا کا اس وقت یہی سیاسی نقشہ تھا، اور اگر یہ دو طاقتیں چاہتیں تو ایران کے ٹکڑے کر دیتیں اور اسی وجہ سے صفوی بھی دکھنی سلطنتوں کی طرف اپنا دستِ شوق بڑھانے لگے۔ چنانچہ گولکنڈے کے جواب میں ان لوگوں نے نہ صرف

بیش بہا تحفوں کے ساتھ اپنے سفیر بھیجے بلکہ شادی بیاہ کے ذریعہ رشتۂ اتحاد مضبوط کرنا چاہتے تھے۔

محمد قلی قطب شاہ کی تخت نشینی کے ساتھ بیرونی سفراء کی آمد کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ چنانچہ سب سے پہلے سفیر احمد نگر میر معین سبزواری گولکنڈہ آیا اور اس کی یہاں بہت آؤ بھگت ہوئی تاکہ دونوں سلطنتوں کا رشتۂ اتحاد مضبوط ہو جائے اور ان کے ذریعہ سے دکن کا سیاسی توازن قائم رہے۔ اس زمانے میں بیجاپور سے گولکنڈے کی لڑائی ہو رہی تھی اور بیجاپور کو نیچا دکھانے کے لئے احمد نگر کا اتحاد بہت ضروری تھا۔ میر معین بہت پڑھا لکھا اور شایستہ آدمی تھا اور شاعر بھی تھا، یہ کئی مرتبہ گولکنڈہ آیا اور شاہی بذل و عطا سے سرفراز ہوا، اس نے بادشاہ کی بیٹی حیات بخشی بیگم کی شادی اور داد محل تعمیر کے موقعے پر نظمیں لکھی تھیں۔ محمد قلی قطب شاہ نے اپنی طرف سے مولانا حاجی محمد اصفہانی کو احمد نگر کے دربار میں روانہ کیا تھا، یہ مولانا اس وقت احمد نگر پہنچے تھے جب کہ اس بدنصیب سلطنت پر جنگ کے بادل منڈلا رہے تھے۔ مغلوں نے احمد نگر کا محاصرہ کر رکھا تھا، اس وقت یہ قطب شاہی سفیر احمد نگر میں موجود تھا۔ چنانچہ جب قلعۂ احمد نگر میں مغل حملہ آوروں نے سُرنگ لگائی اور فصیل اُڑا دی اور چاند بی بی قلعہ کی مدافعت کے لئے شگاف پر کھڑی ہو گئی تو حاجی محمد اصفہانی بھی اپنے ساتھیوں کے ساتھ ملکہ کی مدد کے لئے پہنچ گیا اور اپنے علم و فضل اور بزرگی کے باوجود سر فروشی سے دریغ نہیں کیا۔[1] ۹۹۵ھ ۱۵۸۷ء میں بیجاپور کی طرف سے تعلقات ہموار کرنے کے لئے ابراہیم عادل شاہ ثانی نے خواجہ علی شیرازی کو سفیر بنا کر گولکنڈہ بھیجا تھا۔ اس سفیر کی وساطت سے ابراہیم نے محمد قلی کی بہن چاند سلطانہ سے شادی کی درخواست کی تھی تاکہ گولکنڈے اور بیجاپور کے تعلقات میں خوشگواری پیدا ہو جائے۔ اس وقت ان دو سلطنتوں میں کشمکش تھی اور نلدرگ پر جنگ ہو رہی تھی۔

---

[1] برہان مآثر علی بن عزیز اللہ ص ۶۱۷۔ سلطان محمد قلی قطب شاہ۔ ڈاکٹر زور ص ۳۲۱ و ۳۲۲۔

تخت نشین ہونے کے بعد ہی امیر شاہ میر کے مشورے سے خود محمد قلی بھی میدانِ جنگ میں آیا لیکن ادھر سے ابراہیم نے صُلح و آشتی کا پیام بھیج دیا۔ محمد قلی نے نہ صرف فوری جنگ بند کردی بلکہ شادی کی نسبت بھی منظور کردی۔ ۹۹۶ھ ۱۵۸۸ء میں یہ شادی ہوگئی۔ شاہزادی کی پالکی کے ساتھ گولکنڈے سے امیر زنبیل مصطفےٰ خاں۔ ملک امین الملک۔ اعتبار خاں یزدی۔ ملک فخر الملک امین خاں نلدرگ گئے۔ ابراہیم نے نلدرگ تک آکر شاہزادی کا استقبال کیا اور یہاں عقدِ نکاح باندھا گیا تھا اور ایک ہفتے تک شادی کا جشن منایا گیا اور اُمراء و وزراء کو انعام و اکرام دیئے گئے[۱]۔

یہ تو ہمسایہ سلطنتوں کی سفارتیں تھیں اور ایسی سفارتیں محمد قلی سے پہلے بھی آئی تھیں لیکن ایران کی سفارت جو اغزلو سلطان کے تحت آئی وہ گولکنڈے کی تاریخ و سیاست کے لئے بالکل نئی چیز تھی۔ والیِ ایران شاہ عباس صفوی نے اغزلو سلطان کو ۱۰۱۲ھ ۱۶۰۳ء میں دربار گولکنڈہ بھیجا تھا تاکہ گولکنڈے سے دوستی و یگانگت پیدا ہو۔ یہ ایرانی سفیر گووا کی بندرگاہ پر اُترا اور گولکنڈے سے امیر ضیاء الدین محمد نیشاپوری کو استقبال کے لئے بھیجا گیا۔ ضیاء الدین گووا جاکر اغزلو سلطان کو بڑی عزت کے ساتھ گولکنڈہ لایا۔ ہر جگہ اسکی ضیافت ہوئی اور شاہانہ خلعت دے گئے اور جب سفیر گولکنڈے کے حدود میں آیا تو دوسرے اُمراء نے اس کا یہاں استقبال کیا اور خود بادشاہ نے بھی قلعۂ محمد نگر تک جاکر کالے چبوترے کے پاس ایرانی سفیر کو بار یاب کیا۔ ایرانی سفیر نے شاہی مکتوب کے ساتھ جس میں دوستی و یگانگت کا اظہار تھا دربار ایران کے تحفے پیش کئے تحفوں میں موتیوں کا تاج۔ مرصع خنجر اور چالیس عراقی گھوڑے تھے جو زریں لگاموں سے لیس تھے۔ یہ سفیر اور اس کے ساتھی جن کی تعداد سو بتائی جاتی ہے کوئی پانچ سال حیدر آباد میں ٹھیرے رہے۔ ان کی نہ صرف شاندار ضیافتیں ہوئیں بلکہ شاہانہ خلعتوں سے سرفراز ہوئے۔ دوستی و یگانگت کے علاوہ عباس صفوی نے دربار حیدر آباد سے رشتۂ ازدواج کی بھی

---

[۱] تاریخ فرشتہ مقالۂ سوم ص ۱۷۲ سلطان محمد قلی قطب شاہ۔ ڈاکٹر زور ص ۳۰۹۔

خواہش کی تھی۔ یعنے وہ محمد قلی کی بیٹی حیات بخشی بیگم کی اپنے بیٹے سے شادی کرنا چاہتا تھا اور یہ خواہش دربار حیدر آباد کے لئے قابلِ قبول نہ تھی۔ محمد قلی قطب شاہ نے کئی روز تک اس کا جواب نہیں دیا۔ مورخ فرشتہ تو اس خواستگاری کو ایک ہندوستانی بادشاہ کے لئے بڑا سرمایۂ افتخار قرار دیتا ہے اور یہ بھی کہتا ہے کہ محمد قلی نے اس کو قبول کر لیا تھا[1]۔ لیکن یہ صحیح نہیں ہے بلکہ اس معاملے میں خاموشی اختیار کی گئی اور وہی انکار تھا۔ حیات بخشی بیگم سلطان محمد قطب شاہ سے منسوب ہو چکی تھی جو محمد قلی قطب کا جانشین ہونے والا تھا۔ یہاں تک کہ سفیر ایران کی موجودگی ہی میں یہ شاہی شادی ۱۰۱۶ھ میں رچائی گئی۔ اس تقریب میں اغزلو سلطان اور اس کے سب ساتھی شریک تھے۔ اغزلو سلطان ۱۰۱۸ھ میں حیدر آباد سے واپس ہوا۔ لیکن جب تک وہ حیدر آباد میں رہا اس کو شاہانہ خلعتوں اور انعامات کے علاوہ ہر سال دو ہزار تومان دیئے جاتے تھے اور اس طریقے سے اس کو جملہ دس ہزار تومان ملتے تھے۔ لیکن اس کی واپسی سے بہت قبل بادشاہ نے اپنے معتمدِ خاص حاجی قنبر علی کو بیش بہا تحفوں کے ساتھ ایران بھیج دیا تھا تاکہ اغزلو سلطان کی تعویق سے شاہِ ایران کے دل میں بدگمانی نہ پیدا ہو۔ حیدر آباد سے جو تحفے بھیجے گئے تھے ان میں جواہر آب دار اور دوسری قیمتی اشیاء شامل تھیں۔ اس کے علاوہ اغزلو سلطان کے ساتھ ایک اور امیر مہدی قلی سلطان کو رفیقِ سفر بنا کر بھیجا گیا، اس کے ساتھ نادر تحفے بھیجے گئے جن میں جواہر اور نفیس کپڑے تھے[2]۔ لیکن مہدی قلی سلطان کی واپسی میں اتنی دیر ہو گئی کہ اس اثنا محمد قلی کا انتقال ہو گیا۔

اب محمد قلی کے عہد کا بین مملکتی نقشہ یہ تھا کہ جب وہ تخت نشین ہوا تھا دکن میں خانہ جنگی کا بازار گرم تھا اور دکن کے ہر گوشے میں تلواروں کی جھنکار سنائی دیتی تھی، کیوں کہ جنگ تالیکوٹ کے لئے دکن کی سلطنتوں میں جو اتحاد ہوا تھا وہ بہت دنوں تک

---

[1] تاریخ فرشتہ مقالۂ سوم ص ۱۷۴۔
[2] سلطان محمد قلی قطب شاہ۔ ڈاکٹر زور ص ۳۱۵۔۳۱۸۔

قایم نہیں رہا، بلکہ جنگ کے عین بعد ہی اس کے پرخچے اُڑ گئے۔ جو طاقتیں ابھی باہم متحد ہو کر اپنے مشترک دشمن وجیانگر کے مقابلے کے لئے آئی تھیں، وہ اب دست بہ گریبان ہو گئیں۔ یہ دکن کے لئے بہت بُرا شگون تھا کہ جنگ سے واپس ہونے کے بعد دکن کے مشہور سورما اور فاتح تالیکوٹ حسین نظام شاہ کا بہت جلد انتقال ہو گیا، یعنے "آفتابِ دکن بہ شد پنہاں"۔[1] اس کی بے وقت موت سے دکن کی بساط بالکل اُلٹ گئی اور پھر پرانا نقش جم گیا جو جنگ سے پہلے تھا، کیوں کہ علی عادل شاہ اول جو دکن کے تمام تلاطم کا تنہا ذمہ دار تھا اپنی دست درازیوں کے لئے ابھی زندہ تھا اور اس کے سامنے احمد نگر کی سلطنت جو اس کے حرص و آز کا ہمیشہ نشانہ بنتی رہی پہلے سے زیادہ کمزور ہو گئی تھی، کیوں کہ اب اس کے تخت پر حسین نظام شاہ کا بیٹا مرتضےٰ نظام شاہ بیٹھا تھا جو ایک نیم دیوانہ شخص تھا، اس کی دماغی کمزوری کی وجہ سے اس کی ماں خونزہ ہمایوں حکومت کرتی تھی۔ اس طریقے سے مُلک کی مدافعت بہت مشکل ہو گئی اور علی عادل شاہ کی دست درازیوں کے لئے اچھے مواقع پیدا ہو گئے۔ معمولی بہانے سے اس نے احمد نگر پر وار کرنے شروع کر دیئے جو ایک کھلی بدعہدی اور بداخلاقی تھی۔ اب احمد نگر کی کمزور حکومت کے لئے یہ ضروری تھا کہ اپنی مدافعت کے لئے حسب سابق گولکنڈے کو دعوت دے۔ خونزہ ہمایوں نے اپنے وزراء کے مشورے سے گولکنڈے سے مدد کی درخواست کی۔ ابراہیم قطب شاہ بیجاپور کی بدعہدی سے بہت برافروختہ ہوا، فوراً احمد نگر کی امداد کے لئے کولاس پہنچ گیا، کیوں کہ دکن کے سیاسی توازن اور امن کے لئے احمد نگر کی امداد ضروری تھی اور گولکنڈے کا ہمیشہ یہی مسلک رہا ہے۔ دونوں متحدہ فوجیں بیجاپور پر حملہ آور ہو گئیں۔ علی عادل شاہ اس صورتِ حال سے اس قدر

---

[1] یہ حسین نظام شاہ کی وفات سے متعلق کہا گیا ہے جس سے اس کی تاریخ وفات سنہ ۹۷۲ھ / ۱۵۶۵ء نکلتی ہے۔ جنگِ تالیکوٹ کے صرف چار مہینے کے بعد اس کا انتقال ہوا ہے، یعنے یہ لڑائی جمادی الثانی میں ہوئی اور اس کی وفات ذیقعدہ میں واقع ہوئی۔

خائف ہوا کہ مجبوراً صلح کرلی کیوں کہ اس متحدہ طاقت کا مقابلہ اسکے بس کی بات نہ تھی۔ حملہ آور بھی یہی چاہتے تھے کہ دکن میں امن قایم ہو نہ کہ بیجاپور کی تسخیر اس لئے ان لوگوں نے صلح قبول کرلی اور واپس ہو گئے لیکن علی عادل شاہ نے دوسرا گل کھلایا۔ اب اس نے گولکنڈے کے خلاف دل کا بخار نکالنا چاہا، کیوں کہ یہ سلطنت اس کے راستوں میں مزاحم تھی اور اس کی وجہ سے علی عادل شاہ کے تمام منصوبے خاک میں مل رہے تھے۔ چونکہ گولکنڈے کا تنہا مقابلہ اس کے قابو سے باہر تھا اس لئے اس مرتبہ اس نے احمد نگر کو دھوکہ دے کر ہموار کرلیا۔ پہلے برار کی تسخیر کا سبز باغ دکھایا اور اس کے بعد خود گولکنڈے پر فوج کشی کی تجویزیں ہو گئیں۔ مرتضےٰ نظام شاہ جو بیجاپور کی سیاسی جوڑ توڑ سمجھنے سے قاصر تھا، علی عادل شاہ کے دام میں آ گیا، چنانچہ احمد نگر اور بیجاپور کی متحدہ فوجوں نے گاویل (برار) پر حملہ کردیا۔ تفال خاں جو اس زمانے میں برار کے پرانے عماد شاہی خاندان کو بے دست و پا کر کے سلطنت کا مالک بن بیٹھا تھا، بہت پریشان ہوا، اور حملہ آوروں کو ہتے چڑھا کر برار سے ٹلانے کی کوشش کی۔ مختلف تحفے تحائف اور دل آویز مراسلت سے کام لے کر علی عادل شاہ کو فراہم کرلیا۔ اب رہا مرتضےٰ نظام شاہ، تو وہ علی عادل شاہ کے ہاتھ میں تھا۔ دونوں حملہ آور برار سے واپس تو ہو گئے لیکن جنوب میں قطب شاہی سلطنت کا رخ کیا اور کولاس پہنچ گئے جو قطب شاہی شمالی حدود پر واقع تھا لیکن ایک عجیب اتفاق یہ ہوا کہ اس دوران میں عادل شاہی برگی فوج اور نظام شاہی فوج میں جھڑپ ہو گئی اور یہ معاملہ بہت طول کھینچا، لیکن بعض اربابِ سیاست کے بیچ بچاؤ سے یکسوئی تو ہو گئی لیکن قطب شاہی سلطنت پر حملہ ناممکن ہو گیا، اور یہ حملہ آور اس تلخی میں اپنے اپنے گھر واپس ہو گئے۔

اگرچہ اس اتفاقی حادثے سے یہ حملہ ٹل گیا، لیکن احمد نگر اور بیجاپور کا اتحاد نہ صرف تاریخ دکن کے لئے ایک نئی چیز تھی بلکہ اس سے دکن کے توازن کو سخت نقصان پہنچنے کا اندیشہ تھا، کیوں کہ احمد نگر کی اس ناحق شناسی سے گولکنڈے کا

ورنہ یہ مقصد خاک میں مل جاتا۔ اسی لئے ابراہیم قطب شاہ نے اس اتحاد کو توڑ کر پرانا سیاسی نقشہ جمانے کی کوشش کی۔ مرتضےٰ کو سمجھایا گیا کہ علی عادل شاہ کا اتحاد ایک دامِ فریب سے زیادہ نہیں ہے اور اس میں سب کا نقصان ہے۔ گولکنڈے کی معقول سفارتیں جس طرح پہلے کامیاب ہوتی رہی ہیں اس موقعے پر بھی کامیاب ہوئیں اور اب احمد نگر، گولکنڈے کاروائی اتحاد قایم ہو گیا، اور یہ بھی طے ہوا کہ والیِ وجیانگر بلیتم راج کو اس اتحاد میں شریک کر کے بیجاپور کو سبق دینا چاہئے تاکہ وہ پھر دکن کے امن میں خلل نہ ڈال سکے۔ دریائے کرشنا پر تینوں حکمرانوں کی ملاقات ہوئی اور بیجاپور پر حملہ ہو جاتا، لیکن مشکل یہ ہوئی کہ احمد نگر کے ایک غلط مسلک کی وجہ سے بلیتم راج اتحاد میں شریک نہیں ہو سکا، اس کی ذمہ دار مرتضےٰ کی ماں خونزہ ہمایوں تھی، اس نے بلیتم راج سے دو لاکھ ہون نعل بہا طلب کیا، بلیتم راج اس سے ناراض ہو گیا۔ ابراہیم نے مرتضےٰ اور خونزہ ہمایوں کو لاکھ سمجھایا لیکن وہ اپنی بات پر اڑی رہی، اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان متحدین میں پھر کشیدگی ہو گئی۔ ابراہیم اور بلیتم راج اپنے اپنے گھر واپس ہو گئے، لیکن احمد نگر کے اربابِ سیاست کو یہ مشکل آن پڑی کہ جب یہ لوگ اپنے گھر واپس ہونے لگے تو راستے میں عادل شاہی فوجیں مزاحم ہونے لگیں۔ مرتضےٰ اور خونزہ ہمایوں بہت پریشان ہوئے، اب ان کے لئے صرف یہ چارۂ کار تھا کہ دوسری طرف سے اپنا راستہ بنائیں، چنانچہ یہ کوئل کنڈہ اور گھنپور کی طرف سے گزرے اور قطب شاہی حدود میں لوٹ مار شروع کر دی جو بڑی زیادتی تھی اس سے احمد نگر اور گولکنڈے کے تعلقات اور زیادہ کشیدہ ہو گئے۔ ابراہیم قطب شاہ نے صلابت خاں اور مقرب خاں کو دو تین ہزار سوار کے ساتھ ان کی مزاحمت کے لئے بھیجا جسکی وجہ سے نظام شاہی فوج کو بہت نقصان پہنچا اور وہ میدان سے بھاگ گئی۔

خود احمد نگر میں اس کے اعضائے سیاسی کی کشمکش کی وجہ سے بے اطمینانی پھیل گئی۔ خونزہ ہمایوں کو گرفتار کر لیا گیا اور اس کے سب ہوا خواہ ملک سے باہر بھاگ گئے۔ علی عادل شاہ کے حرص و آز کے لئے پھر اچھا موقع پیدا ہو گیا، کیونکہ احمد نگر کی

مرکزی حکومت کمزور تھی اور گولکنڈے سے اس کے تعلقات کشیدہ تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ۹۷۵ھ ۱۵۶۷ء میں بیجاپور کی طرف سے کشور خاں لاری احمد نگر پر حملہ کرنے کے لئے آگیا اور کوندھانہ اور دھارور کے قلعے فتح بھی کر لئے، لیکن چنگیز خاں نے جو اس زمانے میں احمد نگر کا مشہور وزیر تھا حملہ آوروں کا پُر زور مقابلہ کیا اور کشور خاں کو تلوار کی گھاٹ اُتار دیا۔ عادل شاہی فوج بھاگ گئی، لیکن علی عادل شاہ نے عین الملک اور ظریف الملک کی سرکردگی میں ایک اور تازہ دم فوج بھیج دی۔ اس فوج نے بڑا ادھم مچایا جو احمد نگر کے لئے بڑی پریشانی کا سامنا تھا اور یہ محسوس ہونے لگا کہ گولکنڈے کی امداد کے بغیر یہ گتھی نہیں سلجھے گی۔ چنانچہ گولکنڈے سے امداد کی درخواست کی گئی۔ اس زمانے میں ابراہیم قطب شاہ راج مندری اور قاسم کوٹہ وغیرہ کی فتوحات سے بہت طاقتور ہو گیا تھا اور شمالی دکن کے حالات رو براہ کرنا چاہتا تھا اس لئے وہ فوراً امداد کے لئے احمد نگر پہنچ گیا۔ علی عادل شاہ کو سبق دینے کے لئے متحدہ فوجیں بیجاپور پر حملہ آور ہو گئیں اور یہ اس قدر پُر زور حملہ تھا کہ علی عادل شاہ کے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے۔ غالباً حملہ آور بیجاپور کو مسخر کر لیتے لیکن مشکل یہ ہوئی کہ علی نے اپنے پیشوا ابوالحسن ابن شاہ طاہر کو اس شبہ میں گرفتار کر لیا کہ حملہ آور اسی کے ایما سے متحد ہوئے تھے اور غالباً وہ قتل بھی ہو جاتا۔ لیکن ابوالحسن کے مُلک میں اکثر لوگ ہمدرد بھی تھے، منجملہ ان کے ایک سید مرتضےٰ بھی تھا جو پہلے احمد نگر کا ملازم تھا، وہ مرتضےٰ نظام شاہ کے پاس دوڑا آیا، اور درخواست کی کہ خدا کے واسطے صلح کر لیجئے ورنہ ابوالحسن کا خاتمہ ہو جائے گا، اگر شرطِ صلح ابوالحسن کی رہائی قرار دی جائے تو بہت اچھا ہے۔ مرتضےٰ نظام شاہ راضی ہو گیا اور صلح کے ساتھ ابوالحسن بھی رہا ہو کر مرتضےٰ نظام شاہ کے پاس آگیا۔ مرتضےٰ نظام شاہ کے اس طرزِ عمل سے گولکنڈے کو ایک نقصان تو پہنچا تھا، لیکن اس پر طرہ یہ ہوا کہ علی عادل شاہ نے سید مرتضےٰ کے توسط سے ایک اور منصوبہ یہ اختیار کیا کہ مرتضےٰ نظام شاہ اور ابراہیم قطب شاہ میں پھوٹ ڈال دی۔

مرتضیٰ کی بے وقوفی سے ابراہیم کے تمام منصوبے بے کار ہو گئے۔ وہ اس واقعے سے دلگیر ہو کر بیدر کے راستے گولکنڈہ پہنچ گیا۔

مرتضیٰ نظام شاہ کی بار بار بدعہدی کی وجہ سے دکن کے معاملے کو جو نقصان پہنچ رہا تھا اس سے ابراہیم بہت متاثر تھا اور اس نے بالآخر یہ کوشش کی کہ اب بجائے بیجاپور کو پریشان کرنے کے احمد نگر کو سبق دینا چاہیئے! اسکے لئے اس نے ایک بڑا اتحاد کر لیا جس میں تفال خاں والیِ برار اور برید والیِ بیدر شریک ہو گئے اور علی عادل شاہ کو بھی دعوت دی گئی جو گولکنڈے کے لئے نئی چیز تھی اور ان حالات میں ناگزیر سمجھی گئی۔ یہ اتحاد احمد نگر کے لئے بہت خوفناک تھا۔ مرتضیٰ سخت پریشان ہوا۔ اب اس کے لئے ایک ہی چارۂ کار تھا، یعنے علی عادل شاہ کو اس اتحاد سے جدا کرے۔ چنانچہ احمد نگر کے وزیر چنگیز خاں نے یہی کیا۔ مختلف ترغیبوں سے علی کو اس اتحاد سے علٰحدہ کیا گیا۔ علی کی اس بدعہدی سے گولکنڈے کے منصوبے کو پھر نقصان پہنچا۔ برید اور ابراہیم جو احمد نگر پر حملہ کرنے کے لئے آگے بڑھ رہے تھے واپس ہو گئے، لیکن علی عادل شاہ اور مرتضیٰ نظام شاہ نے متحدہ طور پر تلنگانے پر حملہ کر دیا جو علی کا پُرانا منصوبہ تھا، مگر گولکنڈے میں قوتِ مدافعت بہت تھی، قطب شاہی فوجوں نے ایسا دل کھول کر مقابلہ کیا کہ حملہ آور ہار مان گئے اور پسپا ہونے پر مجبور ہوئے۔ یہ واپس تو ہو گئے لیکن انھیں یہ ڈر ہوا کہ مبادا ابراہیم احمد نگر اور بیجاپور پر حملہ نہ کر دے، جاتے ہوئے کولاس کی سرحد پر تیس ہزار کی فوجیں چھوڑ دیں تاکہ اگر حملہ ہو تو بروقت مزاحمت ہو سکے، لیکن یہ فوجیں خاموش نہیں رہیں بلکہ قطب شاہی حدود میں شورش کرنے لگیں۔

ابراہیم نے ان کی سرکوبی کے لئے امیر شاہ محمد انجو اور مرزا حسین بیگ ترکمان کی سرکردگی میں ایک بڑی فوج بھیج دی۔ بڑی سخت لڑائی ہوئی اور اس میں دشمن کا بہت نقصان ہوا اور وہ بھاگ گئے۔ اس اثناء میں مرتضیٰ نظام شاہ نے برار فتح کر کے اپنی سلطنت میں ضم کر لیا تھا، لیکن علی برید کی ریشہ دوانیوں سے

اس کو بہت نقصان پہنچ رہا تھا۔ برار سے فارغ ہونے کے بعد مرتضیٰ نے بیدر پر حملہ کرنا چاہا، لیکن یہ کام بغیر گولکنڈے کی امداد کے نہیں ہو سکتا تھا، گولکنڈے سے پھر مدد کی درخواست کی۔ میر ابوالقاسم کو سفیر بنا کر بھیجا۔ چونکہ ابراہیم قطب شاہ کا نصب العین دکن کا توازن قایم کرنا تھا اس لئے باوجود ان ناگوار واقعات کے جو اب تک ہوتے رہے اس نے احمد نگر کی دعوت قبول کر لی اور امیر شاہ میر کی سرکردگی میں ایک فوج مرتضیٰ کی امداد کے لئے بھیج دی۔ بیدر پر حملہ تو ہوا مگر علی عادل شاہ کی امداد کی وجہ سے جو بیدر کے لئے بیجا پور سے بھیجی گئی تھی حملہ آور ناکام ہو گئے۔

لیکن علی عادل شاہ اول کے انتقال کی وجہ سے جو ۹۸۸ھ (۱۵۸۰ء) میں ہوا، دکن کے حالات بالکل بدل گئے۔ علی عادل شاہ کو اولاد نہیں تھی، اس کا بھتیجا ابراہیم عادل شاہ ثانی اس کی جگہ تخت پر بٹھایا گیا جو جنگ وجدل سے زیادہ خاموش ترقی کا قائل تھا۔ اگرچہ چند روز تک اس نے اپنے چچا کی تقلید جاری رکھی اور ملک کی مدافعت کی، لیکن اس کے صلح کل مسلک کی وجہ سے دکن سے سیاہ بادل بہت جلد چھٹ گئے۔ چونکہ علی عادل شاہ مرحوم نے علی برید کی مدد کی تھی اس لئے مرتضیٰ بیجاپور سے انتقام لینا چاہتا تھا اور اس کا یہ ارادہ بیجاپور کو بھی معلوم ہو گیا تو اپنے ارباب سیاست کے مشورے سے ابراہیم عادل شاہ نے پیش از پیش احمد نگر پر حملہ کر دیا۔ شاہ درگ پر لڑائی ہوئی۔ احمد نگر کی طرف سے بہزاد الملک نے مدافعت کی لیکن اس کو شکست ہو گئی۔ ایک روایت یہ ہے کہ بہزاد الملک نے جلدی کر کے بیجاپور پر دھاوا بول دیا اور بیدر کا بھی محاصرہ کر لیا۔ لیکن اس کو جب شکست ہو گئی تو گولکنڈے سے امیر شاہ میر کے تحت امدادی فوج آ گئی اور ان فوجوں نے قلعۂ نلدرگ کا محاصرہ کر لیا۔ اس دار و گیر میں مرتضیٰ کا بہت نقصان ہوا۔ اگرچہ عادل شاہیوں کو شکست ہو گئی لیکن قلعے کی محصور فوج کو مغلوب کرنا بہت مشکل ہو گیا، اس لئے یہ حملہ آور راتوں رات بیجاپور پہنچ گئے اور مرکز پر حملہ کر دیا۔ جو بیجاپوری فوج نلدرگ پر تھی وہ بھی مدافعت کے لئے بیجاپور آ گئی۔ یہاں کئی روز تک لڑائی ہوئی۔ اس دوران میں گولکنڈے کے ایک دوسرے جنرل

ابیر زئیل نے تاکادی ۔ کاکن اور کلکور مسخر کر لئے جو بیجاپور کے مقبوضات تھے اس سے بیجاپوری فوج زیادہ پریشان ہوئی اور ممکن تھا کہ حملہ آور خود بیجاپور کو مسخر کر لیتے لیکن قطب شاہی سپہ سالاروں کی نا اتفاقی اور بیجاپور کے ہتھکنڈوں سے معاملہ خراب ہوا اور حملہ آوروں کو بیجاپور چھوڑنا پڑا۔ یہ پھر نلدرگ آگئے اور قلعے کا محاصرہ کر لیا۔ چونکہ محاصرہ بہت سخت تھا اس لئے امیر شاہ میر نے خود بادشاہ سے درخواست کی کہ وہ محاصرے انصرام کیلئے آئے تو اچھا ہے لیکن عین اسی زمانے میں ابراہیم قطب شاہ کا انتقال ہو گیا اور اس کا بیٹا محمد قلی قطب شاہ سریر آرائے سلطنت تھا۔

قطب شاہی اور نظام شاہی کیمپ کے لئے ابراہیم قطب شاہ کی موت کی خبر سنسنی خیز تھی لیکن امیر شاہ میر نے بہت روز تک یہ خبر چھپائے رکھی اس خبر کے افشا سے پہلے اس نے نظام شاہی اور قطب شاہی تمام ارکانِ سپاہ کو جن میں سید مرتضےٰ ۔ جمشید خاں ۔ خداوند خاں اور بہزاد الملک تھے جمع کر کے ایک مجلس کی اور ایمان کی قسم دی تاکہ ان کے منصوبے میں کوئی فرق نہ آئے۔ ادھر گولکنڈے کے نوجوان بادشاہ نے بھی اپنے باپ کے منصوبے کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا، بلکہ مرتضےٰ نظام شاہ کی طرف سے مرحوم بادشاہ کی تعزیت اور نئے بادشاہ کی کیفیت کے لئے میر معین میرک سبزواری آیا اور اتحاد کی دعوت دی تو اس کا پورا خیر مقدم کیا گیا اور اس کے ساتھ امیر شاہ میر نے بھی دربار میں آکر قلعۂ نلدرگ اور اس کے محاصرے کی صورتِ حال بیان کی تو بادشاہ فوراً نلدرگ کے لئے اُٹھ کھڑا ہوا اور "ماہیچہ رایات" روانہ ہوئے۔ نوجوان بادشاہ کی آمد سے محاصرین میں بڑی تقویت پیدا ہو گئی۔ قطب شاہی توپیں محمدی وحیدری اور نظام شاہی لوگزی اور لیلی المجنون نصب کی گئیں اور محاصرہ بہت سخت ہو گیا۔ قلعہ دار وزیر الملک اور تمام اہلِ قلعہ بہت پریشان ہو گئے اور بیجاپور کو اطلاع دی گئی ابراہیم عادل شاہ کا صلح کل مسلک اس بات کی اجازت نہیں دیتا تھا کہ خواہ مخواہ خونریزی ہو اس نے فوراً حملہ آوروں سے صلح کی درخواست کی، حملہ آوروں نے بھی دکن کے امن کے لئے

یہ صلح منظور کرلی تاکہ خانہ جنگی ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے اور لڑائی کا مقصد بھی یہی تھا کہ ایسی دست دراز مملکتوں کو سبق دے کر جو امن میں خلل ڈالتی ہیں خانہ جنگی کا راستہ بند کیا جائے۔ یہ سیاسی توازن ابراہیم قطب شاہ کا دیرینہ نصب العین تھا جو اسکی زندگی میں نہیں بلکہ اس کے مرنے کے بعد پورا ہوا، اور ظاہر ہے کہ علی عادل شاہ کے ہوتے ہوئے جس کی ناجائز حرص و آز نے دکن کو پُر آشوب بنا رکھا تھا یہ توازن پیدا نہیں ہو سکتا تھا۔ اس کے جانشین کی صلح جو طبیعت نے بالآخر یہ گتھیاں سلجھا دیں اور گولکنڈے کا پاکیزہ نصب العین جس کے لئے اس نے ہمیشہ کوشش کی اور ہر دست درازی کا جواب دیا، بالآخر پورا ہو گیا! اس وقت جو سیاسی فضا خاموش ہوئی تو بہت زمانے تک اس میں رخنہ نہیں پڑا۔ گو ایک زمانے کے بعد بیجاپور اور احمد نگر میں کچھ لڑائیاں ضرور ہوئیں لیکن وہ بہت مختصر ہوئی تھیں اور ان سے دکن کی پوری فضا متلاطم نہیں ہوئی[1]۔ گولکنڈے سے تو کبھی پرخاش نہیں ہوئی اور گولکنڈے سے اتحاد کو مضبوط کرنے کے لئے ابراہیم عادل شاہ نے محمد قلی قطب شاہ کی بہن چاند سلطانہ سے شادی کر لی جس کا اوپر ذکر ہوا ہے۔ یہ شادی ۹۹۵ھ ۱۵۸۶ء میں رچائی گئی تھی اور ابراہیم عادل شاہ کی بہن خدیجہ سلطانہ کی مرتضیٰ نظام شاہ کے بیٹے میران حسین سے شادی کی گئی۔ اس ساکت فضا کی وجہ سے ان سلطنتوں کو خاموشی کے ساتھ ارتقائے تمدن کا موقع ملا۔ چنانچہ گیارھویں صدی ہجری یا سولھویں صدی عیسوی کا نصف اول ان سلطنتوں کے تمدنی عروج کا زمانہ ہے۔

---

[1] فرشتہ کہتا ہے صلح سے لے کر تاریخ تحریر تک کوئی بیس سال ہوتے ہیں کہ دکن میں کوئی خانہ جنگی نہیں ہوئی (تاریخ فرشتہ روضۂ چہارم ص ۲۷۲) تلدرگ کی آخری لڑائی کے متعلق فرشتے کا بیان بہت مختلف ہے، وہ کہتا ہے کہ محمد قلی قطب شاہ نے شاہ درگ اور رشولاپور پر حملے کئے تھے اور پھر بیجاپور پر حملہ کیا تھا۔

گیارھواں باب

دکن پر مغلوں کے حملے

یہ عجیب اتفاق ہے کہ وجیانگر کے خاتمے کے بیس پچیس سال کے بعد دکن کو ایک اور بڑی طاقت سے دوچار ہونا پڑا، اور یہ مغلوں کی طاقت تھی۔ فرق صرف یہ تھا کہ وجیانگر کا سیلاب جنوب سے آتا تھا تو اس کے برخلاف مغل شمال کی طرف سے گھس آئے۔ دکن کے حکمران سنہ ۹۷۳ھ (۱۵۶۵ء) میں وجیانگر کا خاتمہ کر کے بےفکر ہو گئے تھے اور انھیں یہ معلوم نہ تھا کہ چند سال کے بعد انھیں شمال کی ایک بڑی طاقت کا سامنا کرنا پڑے گا۔ عین اسی زمانے میں جب کہ وجیانگر کا خاتمہ ہوا ہے مغل سلطنت کی بنیادیں مضبوط ہو رہی تھیں۔ سنہ ۹۶۴ھ (۱۵۵۶ء) والی پانی پت سے مغلوں کے ہندوستان میں پھر ایسے قدم جم گئے کہ اب کوئی طاقت انھیں متزلزل نہیں کر سکتی تھی۔ جنگ پانی پت کے بعد مالوہ۔ بنگالہ۔ گجرات۔ راجپوتانہ۔ کشمیر۔ قندھار اور کابل فتح ہو گئے۔ چنانچہ سنہ ۹۹۸ھ (۱۵۹۰ء) تک مغل سلطنت تمام شمالی ہند پر چھا گئی۔ اس کے بعد اسکو دکن کی ہمسر سلطنتوں کی طرف توجہ کرنے کا موقع تھا، چنانچہ سنہ ۹۹۸ھ (۱۵۹۰ء) سے شہنشاہ اکبر نے دکن کے مسئلے پر دل سے غور کرنا شروع کر دیا۔ اگرچہ اس مغل پیش قدمی کا باعث خود شہنشاہ کا سیاسی نصب العین تھا کہ وہ تمام ہندوستان کی شیرازہ بندی کر کے ایک متحدہ سلطنت قایم کرنا چاہتے تھے لیکن دکن کے ناگوار حالات بھی

خود بہ خود اس کے محرک ہو گئے، یعنے آپس کی ناچاقی کی وجہ سے دکن کے بعض حکمرانوں نے خود شہنشاہ اکبر کو دعوت دی اور شہنشاہ حملہ کرنے کے لئے مجبور ہو گئے۔

جس زمانے میں اکبر کی فوجیں برار کی تسخیر کے لئے آگے بڑھنے لگیں تو تفال خاں نے جو برار کا والی بن بیٹھا تھا شہنشاہ اکبر سے امداد کی درخواست کی تھی اور شہنشاہ نے مرتضٰے نظام شاہ کو دھمکی دی تھی کہ وہ برار سے اپنی فوجیں ہٹالے، چونکہ یہ دُور کی دھمکی تھی اس لئے مرتضٰے نے اس کی پروانہ کی اور ۹۸۲ھ/۱۵۷۴ء میں برار پر قبضہ کر ہی لیا، مگر معلوم ہوتا ہے کہ شہنشاہ اس واقعے سے خوش نہیں ہوئے، کوئی فوجی نقل و حرکت تو نہیں کی لیکن شکار کے بہانے سے ۹۸۴ھ/۱۵۷۶ء میں بندھیاچل کے پہاڑوں کے نیچے شمالی دکن کی سیر کی۔ غالباً اس سے منشا یہ تھا کہ دکن کے حالات دریافت کرے اور سلاطینِ دکن کو خوف دلائے۔ اس کے بعد ۹۹۲ھ/۱۵۸۴ء میں احمد نگر کی خانہ جنگی سے دکن کے حالات اور بھی خراب ہو گئے۔ مرتضٰے نظام شاہ کے بھائی برہان نے بغاوت کی اور جب وہ اپنی بغاوت میں ناکام ہوا تو پہلے کوکن بھاگا اور پھر شہنشاہ اکبر کے دربار میں پہنچ گیا۔ اس کے پیچھے احمد نگر کے اکثر عمائد جیسے فتح اللہ شیرازی اور ۹۹۳ھ/۱۵۸۵ء میں سید مرتضٰے خاں سبزواری اور خداوند خاں بھی اکبر کے دربار میں آگئے اور وہاں ان کی بہت آؤ بھگت ہوئی اور خطاب و انعام ملے اور برہان کی امداد کے لئے اکبر نے مالوے کے گورنر مرزا عزیز کوکہ کو حکم دیا تھا کہ وہ احمد نگر پر حملہ کرے، لیکن یہ حملہ کامیاب نہیں ہوا۔

لیکن دو سال کے بعد احمد نگر کے حالات اور بھی خراب ہو گئے، مرتضٰے نظام شاہ کی دیوانہ وار حرکتوں کی وجہ سے ۹۹۶ھ/۱۵۸۷ء میں اس کا خاتمہ کر دیا گیا اور اکابرِ مُلک نے اس کے بھائی حسین کو حسین نظام شاہ ثانی کے نام سے تخت نشین کر دیا، اور یہ بھی بہت جلد یعنے صرف دس مہینوں کی حکومت کے بعد طبقہ واری کش مکش کا شکار ہو گیا۔ اب چونکہ اس کی کوئی اولاد نہیں تھی اس لئے اہلِ مُلک نے برہان کے بیٹے اسمٰعیل کو ۹۹۷ھ/۱۵۸۹ء میں تخت نشین کر دیا۔ کیوں کہ برہان اکبر کے دربار میں تھا۔ ان ناگفتہ بہ

حالات کے مدِ نظر شہنشاہ نے یہ چاہا کہ برہان کو اس کے دربار میں تھا ایک مغل فوج کے ساتھ احمد نگر بھیجے اور اس کو احمد نگر کے تخت پر بٹھا دے۔ گو بہ ظاہر یہ شہنشاہ کی نوازش تھی، لیکن اس کا سیاسی مقصد یہ تھا کہ احمد نگر مغل سیادت کے تحت آجائے۔ لیکن برہان اس ہتھکنڈے کو سمجھتا تھا۔ اس نے شہنشاہ کو یہ سمجھایا کہ مغل فوج احمد نگر لے جانا مصلحت کے خلاف ہے اس سے اہلِ دکن ناراض ہو جائیں گے بلکہ میں خود اپنے دست و بازو سے تخت حاصل کرتا ہوں۔ جب ۹۹۸ھ ۱۵۸۹ء میں یہ احمد نگر آیا تو اکابرِ ملک نے اس کا خیر مقدم کیا اور تخت پر بٹھا دیا۔

احمد نگر میں برہان نظام شاہ کی تخت نشینی مغل فوج کشی کا پیغام تھا، کیوں کہ برہان نے تخت حاصل کرنے کے بعد اکبر کی سیادت تسلیم نہیں کی بلکہ مغل سلطنت سے کوئی تعلق نہیں رکھا جو شہنشاہ کے منشا کے خلاف تھا۔ شہنشاہ اس وجہ سے بھی زیادہ برافروختہ ہوئے کہ برہان بادشاہ ہونے سے قبل مغل سلطنت کا ملازم و جاگیردار ہو گیا تھا اس طرح اس کو مغل شہنشاہت کا پاس رکھنا چاہیے تھا۔ برہان کی اس پہلو تہی کو شہنشاہ بغاوت سمجھتے تھے اس سے متاثر ہو کر شہنشاہ نے دکن پر حملہ کرنے کی تیاری شروع کر دی۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ عین اسی زمانے میں جب کہ گولکنڈے میں شہرِ حیدر آباد کی بنیاد پڑ رہی تھی شمال میں تسخیرِ دکن کے منصوبے باندھے جا رہے تھے۔ اپنے اصول کے مطابق شہنشاہ نے حملے سے پہلے ۹۹۹ھ ۱۵۹۱ء میں چاروں والیانِ دکن کے نام اپنے سفیروں کے ذریعے اطاعت کے پیغام بھیجے سوائے والیِ خاندیس راجہ علی خاں کے باقی تین سلطنتوں یعنے احمد نگر۔ بیجاپور اور گولکنڈے نے اطاعت سے انکار کر دیا۔ بیجاپور اور گولکنڈے کی سلطنتیں تو جنوب میں تھیں اور شمالی سلطنت احمد نگر کے ہوتے ہوئے اُن کو ڈرنے کی کوئی وجہ نہیں تھی۔ یہ بات ظاہر تھی کہ جب تک احمد نگر کی سلطنت کا خاتمہ نہ ہو جاتا بیجاپور اور گولکنڈے پر کوئی آنچ نہیں آتی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ والیِ گولکنڈہ محمد قلی قطب شاہ نے اس سیاسی حالت کا صحیح اندازہ لگا لیا تھا۔ گولکنڈے میں جو مغل سفیر آیا تھا وہ

مرزا مسعود یا ابو الفضل کے الفاظ میں "میر منیر" ہے، اس کی آؤ بھگت تو بہت کی گئی، لیکن جب اطاعت کا سوال ہوا تو غالباً اس کو صاف جواب دے دیا گیا۔ چنانچہ ابو الفضل نے "میر منیر" سے متعلق صرف اس قدر لکھا ہے کہ:۔

"میر منیر کہ بہ اندرزگوئی مرزبانِ گولکنڈہ دستوری یافتہ بود بہ ایلچی و پیش کش رسید۔"[1]

یعنے اس کو کوئی اطمینان بخش جواب نہیں ملا۔ بیجا پور، احمد نگر کے درباروں میں بھی مغل سفیر میر محمد رضوی اور فیضی بالکل اسی طرح بے نیل مرام واپس ہو گئے جس طرح گولکنڈے سے آئے تھے تو شہنشاہ اکبر نے پھر دکن پر حملہ کرنے کی تیاری شروع کر دی۔ اگرچہ یہ تیاری بہت جلد بار ور نہیں ہوئی۔ سفیر تو دو سال کے بعد یعنے ۱۰۰۲ھ / ۱۵۹۴ء میں شہنشاہی دربار میں واپس آ گئے اور شہنشاہ کی خدمت میں اپنی رپورٹ پیش کر دی اور رپورٹ پیش ہوتے ہی اعلانِ جنگ کر دیا گیا، لیکن فوج کی واقعی نقل و حرکت اور تین سال کے بعد ہوئی۔ چنانچہ مغلوں کا پہلا حملہ جو احمد نگر پر ہوا وہ ۱۰۰۴ھ / ۱۵۹۶ء میں ہوا۔

چاند بی بی کا زمانہ

جس وقت مغل فوجیں احمد نگر کے سامنے آ گئیں تو اس ملک کی سیاسی حالت بہت حوصلہ شکن ہو گئی تھی۔ برہانِ ثانی کے انتقال کے بعد جو ۱۰۰۳ھ / ۱۵۹۵ء میں ہوا، اس بدبخت سلطنت کا کوئی رہنمائے سیاست ایسا نہیں تھا جو اس کی مدد کرتا۔ چھوٹے بچے تخت نشین کئے گئے یعنے برہان کے مرنے کے بعد اس کے دوسرے بیٹے ابراہیم کو تخت نشین کیا گیا، لیکن بدقسمتی سے اسی سال یہ بیجا پور کی لڑائی میں مارا گیا۔ ایک فریق نے جس کا سرگروہ اخلاص خاں تھا ابراہیم کے چھوٹے بیٹے بہادر کو تخت نشین کرنا چاہا، لیکن اس کے برخلاف دوسرے فریق نے جس کا سرغنہ ابراہیم کا پیشوا میاں منجھو تھا، احمد نامی ایک اور لڑکے کو

---

[1] اکبر نامہ جلد سوم ص ۶۴۸۔ تاریخ قطب شاہی میں اس واقعہ کا کوئی تذکرہ نہیں ہے، معلوم ہوتا ہے کہ اس کو سرسری سمجھ کر نظر انداز کر دیا گیا۔

بادشاہ بنانا چاہا۔ دونوں فریقوں میں خانہ جنگی ہو گئی۔ جب میاں منجھو نے دیکھا کہ اخلاص خاں کے مقابلے میں اس کی ایک نہیں چلتی تو اپنے حریف کو نیچا دکھانے کے لئے شہزادہ مُراد کو حملے کی دعوت دی۔ اس زمانے میں مغل فوجیں شہزادہ مراد، عبدالرحیم خانخاناں اور شاہ رُخ مرزا کے تحت حملے کے لئے جمع ہو رہی تھیں اور یہ احمد نگر کے سامنے پہنچ گئیں جو اس بدبخت مُلک کے لئے بہت افسوسناک واقعہ تھا۔ ان حملہ آوروں کے آنے سے ان باغیوں کی بھی آنکھیں کھُل گئیں جنھوں نے دشمنوں کو بلایا تھا۔ اب ہر طبقہ احمد نگر کو دشمنوں سے بچانے کی کوشش کرنے لگا۔ چونکہ اس وقت ملک میں کوئی ناخدائے سیاست ایسا نہیں تھا جو ملک کی رہنمائی کرتا، اس لئے سب طبقوں نے برہان نظام شاہ ثانی کی بہن چاند بی بی کو جو بیجاپور میں تھی احمد نگر کی امداد کے لئے بلایا۔ اس بیر دُخت نے اپنے وطن مالوف کو دشمنوں سے بچانا اپنا فرض سمجھا اور فوراً بیجاپور سے احمد نگر کو بچانے کے لئے دوڑ آئی۔ بیجاپور اور گولکنڈے کے حکمران بھی اس نازک صورتِ حال کو خوب محسوس کرتے تھے۔ ان کی بقا احمد نگر کی سلامتی پر منحصر تھی۔ جب چاند بی بی نے شہزادہ مراد کے مقابلے میں نظام شاہی فوجوں کی کمان اپنے ہاتھ میں لی تو ابراہیم عادل شاہ ثانی نے اس کی امداد کے لئے اپنی فوج بھیجی تو گولکنڈے کے والی محمد قلی قطب شاہ نے بھی اپنی پوری ذمہ داری محسوس کی اور چاند بی بی کی مدد کے لئے قطب شاہی فوج بھیجی۔[له]

تاریخ کے الفاظ ہیں: "چوں شہزادہ مراد فرزند ارجمند اکبر بادشاہ و خانخاناں بہ جہت تسخیر ولایت احمد نگر با لشکر بیحد و عد توجہ نمود و فتنہ و شور در آں بلاد انداخته عُمر و زماں مهدی قلی سلطان را بہ اُمرا و خوانین و لشکر قراداں بہ جہتِ امداد سلسلۂ نظام شاہیہ نامزد فرمود۔"[که]

[له] تاریخ فرشتہ مقالۂ سوم ص ۱۵۹ و ۱۶۲ برہان مآثر ص ۶۱۸ و ۶۲۴۔

[که] حدیقة العالم مقالۂ اول ص ۲۳۴۔

یعنے مہدی قلی کے تحت جو گولکنڈے کا جنرل تھا چاند بی بی کی امداد کے لئے ایک بڑی فوج آئی جس کی تعداد چھ سات ہزار سوار اور کئی ہزار پیدل بتائی جاتی ہے اور گولکنڈے کا سفیر مولانا محمد اصفہانی اس وقت احمد نگر میں موجود تھا وہ بھی اپنے ہمراہیوں کے ساتھ ملکہ کی مدد کے لئے پہنچ گیا۔ اس طرح ساٹھ ستر ہزار کی فوج ملکہ کے جھنڈے کے نیچے جمع ہوگئی تھی۔ چنانچہ چاند بی بی کی مشہور آفاق دلاوری اور دکن کی متحدہ طاقت کا نتیجہ تھا کہ مغل احمد نگر کی تسخیر میں کامیاب نہیں ہو سکے صرف برار لینے پر اکتفا کر کے صلح کر لی اور بہادر نظام شاہ کی بادشاہی تسلیم کر لی

لیکن یہ صلح دائمی ثابت نہیں ہوئی، کیوں کہ جو مغل حکام برار میں مامور تھے وہ آئے دن دکھنی رعایا کو دق کرنے لگے اس لئے دو سال کے بعد پھر لڑائی ہوگئی۔ سنہ ۱۰۰۶ھ / ۱۵۹۷ء میں پھر شہزادہ مراد اور خانخاناں نے احمد نگر کے علاقے میں دھاوا بول دیا۔ دریائے گوداوری کے کنارے سوپہ کے مقام پر ایک بڑی لڑائی ہوگئی، لیکن اس موقع پر بھی بیجاپور اور گولکنڈے نے دل کھول کر مدد کی۔ بیجاپور کی طرف سے سہیل خاں، عادل شاہی فوج کے ساتھ آیا تھا تو گولکنڈے کی طرف سے اخلاص خاں اور طاہر خاں ایک بڑی فوج کے ساتھ پہنچ گئے۔ چنانچہ اس معرکے میں جب دکنی فوجوں کی صف آرائی ہوئی تو پرانے دستور کے مطابق نظام شاہی فوجوں کو بیچ میں رکھا گیا تھا، اور میمنہ پر بیجاپوری و میسرہ پر قطب شاہی فوجیں تھیں۔ یہ اگرچہ جنوری کو لڑائی شروع ہوئی اور دو روز تک جاری رہی[۱]۔ اگرچہ اس معرکے میں دکنی فوجوں کو پوری شکست ہوئی لیکن مغلوں کا بھی بڑا نقصان ہوا۔ اس میں راجہ علی خاں والی خاندیش جو مغل فوجوں کے ساتھ آیا تھا مارا گیا، لیکن سہیل خاں کے مرنے سے جنگ کا نقشہ بدل گیا اور دکھنی فوج پسپا ہوگئی۔ اب مغل حملہ آوروں کو احمد نگر تک پیش قدمی کرنے کا اچھا موقع تھا۔ لیکن شاہزادہ مراد اور خانخاناں کی ناچاقی کی وجہ سے مغلوں کی طرف سے کوئی پیش قدمی

۱؎ اکبر نامہ جلد سوم ص ۷۱۸ و ۷۱۹۔

نہیں ہوئی اور نظام شاہی سلطنت کئی سال کے لئے محفوظ ہو گئی۔ شہنشاہ اکبر ان واقعات سے ناراض ہوئے اور دونوں جنرلوں کو شمال واپس بلا لیا۔ خانخاں تو فوراً واپس ہو گیا لیکن مراد نہیں گیا۔ اس کو بلانے کے لئے شہنشاہ نے اپنے معتمد خاص ابوالفضل کو دکن بھیجا، لیکن ابوالفضل کے دکن پہنچنے سے پہلے شاہزادہ مراد راہی عدم ہو گیا، اس کی نعش آگرہ گئی۔[1] ان حالات میں دکن کی مہم دو سال رُکی رہی۔ دو سال کے بعد ۱۰۰۸ھ/۱۵۹۹ء میں خود شہنشاہ اکبر نے دکن کی تسخیر کے لئے کوچ کر دیا۔ فوج کے دو حصے کئے ایک حصے کی کمان خود شہنشاہ نے اپنے ہاتھ لی[2] اور قلعۂ اسیر گڈھ کا محاصرہ کر لیا، کیونکہ والیِ خاندیش راجہ علی خاں کے مرنے کے بعد اس کا بیٹا بہادر شاہ مغل سلطنت سے منحرف ہو گیا تھا، اور فوج کا دوسرا حصہ شہزادہ دانیال کے تحت احمد نگر پر وار کرنے کے لئے بھیجا گیا۔ ۱۰۰۸ھ/۱۶۰۰ء میں احمد نگر کا دوسرا محاصرہ ہوا۔ مُلک کی طبقہ داری کش مکش کی وجہ سے چاند بی بی اس قدر بے بس ہو گئی تھی کہ اب وہ مدافعت سے قاصر تھی، لیکن اس کی قومی اور خاندانی خودداری اس بات کو گوارا نہیں کر سکتی تھی کہ اس کے جیتے جی احمد نگر دشمن کے ہاتھ میں چلا جائے۔ اس لئے اس نے قلعہ فتح ہونے سے پہلے خودکشی کر لی[3] اور قلعۂ احمد نگر پر مغل فوجوں نے قبضہ کر لیا، لیکن اسیر گڈھ وہ اس قدر جلد ختم ہونے والا نہ تھا، اس کے محاصرے میں دو سال لگ گئے۔ ۱۰۰۹ھ/۱۶۰۱ء میں برہان پور اور اسیر گڈھ ایک طویل محاصرے کے بعد مغل سلطنت کے قبضے میں آئے۔[4]

---

[1] اکبر نامہ جلد سوم ص ۷۴۶، و ۷۵۳۔

[2] " " " ۷۵۵۔

[3] فرشتہ حصۂ سوم ص ۱۶۴۔ اکبر نامہ جلد سوم ص ۷۷۴، و ۷۷۵۔ دستور العمل قاضی عبدالنبی ضمیمہ ۳۹۔

[4] اکبر نامہ جلد سوم ص ۷۸۱۔

ملک عنبر کا زمانہ

چاند بی بی کے انتقال کے بعد جو ۱۰۰۹ھ/۱۶۰۰ء میں ہوا دکن پر سخت مایوسی چھا گئی تھی لیکن عجیب اتفاق ہے کہ اسی سرزمین دکن سے چاند بی بی کے کئی نام لیوا پیدا ہو گئے جو اسکے مقدس منصوبے کو پورا کر سکے۔ اگرچہ چاند بی بی دنیا سے رخصت ہو گئی تھی لیکن اسکی جیتی جاگتی روح دکن کے ہر گوشے میں گھومتی تھی۔ اسی کے نقشِ قدم پر ملک عنبر کی صورت میں دکن کا ایک اور شفیع پیدا ہو گیا جس نے اپنی زندگی بھر دکن کی آزادی قائم رکھی۔ اس نے نظام شاہی خاندان کے ایک سپوت کو جس کا نام مرتضیٰ نظام شاہ ثانی تھا قلعۂ دولت آباد میں تخت نشیں کر کے نہ صرف احمد نگر کی مردہ سلطنت میں جان ڈال دی، بلکہ احمد نگر کے بل بوتے پر تمام دکن کی آزادی قائم رکھی۔ چاند بی بی کیطرح اس نے نہ صرف احمد نگر بلکہ تمام دکن کی رکھوالی کی۔ اس نے اپنے خاص نظم و نسق سے ملک کو سنوارا، اور شہر و قصبات آباد کئے۔ اس کے علاوہ مرہٹوں کی نئی فوجیں مرتب کر کے رہے سہے نظام شاہی علاقوں کی نگہداشت کی اور کھوئے ہوئے علاقوں کی بازیافت شروع کر دی، اور اس کے سامنے مغلوں کی شہنشاہی قوت کا مقابلہ تھا۔ شہنشاہ اکبر کے انتقال کے بعد جو ۱۰۱۴ھ/۱۶۰۵ء میں ہوا اس کے جانشین جہانگیر نے اپنے نامور افسروں کے تحت ملک عنبر کے مقابلے کے لئے کئی فوجیں بھیجیں۔ شہزادہ پرویز۔ آصف خاں۔ خانِ جہاں لودی۔ عبداللہ خاں اور مہابت خاں جیسے بڑے بڑے جرنیل یکے بعد دیگرے دکن آئے، لیکن ملک عنبر نے سب کو ایسی شکستیں دیں کہ سب ہار مان گئے۔ اگرچہ یہ تمام لڑائیاں براہ راست احمد نگر سے تھیں لیکن بیجاپور اور گولکنڈے کی سلطنتیں اس دار و گیر سے کیسے الگ رہ سکتی تھیں، کیوں کہ ان کی بقا احمد نگر اور ملک عنبر کی ذات سے وابستہ تھی اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان سلطنتوں نے ہر وقت چپکے چپکے ملک عنبر کی مدد کی تھی۔

---

۱ اکبر نامہ جلد سوم ص ۷۸۲۔

۲ ؍؍ ؍؍ ۸۳۸۔

بیجاپور کی امداد تو صاف معلوم ہوتی ہے لیکن گولکنڈہ بھی خاموش نہیں رہا۔ جب تک محمد قلی قطب شاہ زندہ تھا اس نے پوری مدد کی۔ اس کے مرنے کے بعد اس کا بھتیجا اور جانشین محمد قطب شاہ جو ۱۰۲۰ھ/۱۶۱۲ء میں تخت نشین ہوا تھا ان حالات سے بے خبر نہیں رہا۔ اس نے بھی اپنے چچا کی طرح سیاستِ دکن کی کامیاب رہنمائی کی اور ملک عنبر کی مدد کے لئے روپیہ اور فوجیں بھیجیں۔ غالباً یہ سید کمال الدین کے تحت گئی تھیں جو اس زمانے میں گولکنڈے کا سر لشکر تھا۔

ملک عنبر کے دار و گیر میں دو موقعے ایسے آئے تھے جب کہ اس کو ہتھیار ڈالنے پڑے۔ کیوں کہ تمام مغل جنرلوں سے مایوس ہو کر شہنشاہ جہانگیر نے بالآخر اپنے بیٹے شہزادہ خرم (شاہجہاں) کو دکن بھیجا تھا تاکہ دکنی طاقتوں کا پر زور مقابلہ کرے۔ یہ ۱۰۲۶ھ/۱۶۱۷ء اور ۱۰۳۱ھ/۱۶۲۱ء کے واقعات ہیں۔ ملک عنبر کو ان مقابلوں کی تاب نہ تھی۔ جب وہ صلح کرنے پر مجبور ہوا تو گولکنڈہ اور بیجاپور پر بھی اس کا اثر پڑا۔ چنانچہ ان سلطنتوں نے اپنے بچاؤ کے لئے شہزادہ خرم کی خدمت میں کئی تحفے اور نذرانے پیش کئے۔ ۱۰۳۱ھ/۱۶۲۱ء کے صلح نامے کی رو سے دکنی سلطنتوں پر خراج عائد کیا گیا۔ منجملہ اس کے بیس لاکھ روپے گولکنڈے پر عاید کئے گئے جو نسبتاً زیادہ تھے۔ کیوں کہ بیجاپور سے اٹھارہ لاکھ اور احمد نگر سے صرف بارہ لاکھ لئے گئے۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس عہد نامے کی کبھی پابندی نہیں ہوئی کیوں کہ اس کے ایک سال بعد ہی کچھ ایسے واقعات رونما ہوئے کہ مغل شہنشاہت میں خانہ جنگی شروع ہو گئی۔ شہزادہ خرم نے اپنے باپ کے خلاف بغاوت کر دی اور اس کی سرکوبی کے لئے مغل سلطنت کا مشہور جنرل مہابت خاں مامور ہوا۔ جب خرم کو شکست ہو گئی تو وہ بھاگ کر دکن آیا۔ گولکنڈے کے شمالی حدود میں داخل ہو کر سلطان محمد قطب شاہ سے مدد مانگی۔ یہ ۱۰۳۳ھ/۱۶۲۳ء کا واقعہ ہے کہ ایک مغل شہزادہ پہلی مرتبہ گولکنڈے کے حدود میں آیا تھا۔ لیکن عجیب اتفاق ہے کہ وہی خرم جو ایک سال پہلے فاتحانہ شان سے دکن آیا تھا اب ایک بے پناہ مظلوم کی حالت میں تھا۔ اب مشکل یہ تھی کہ خرم کی مدد کرنا تمام مغل سلطنت کو

دشمن بنانا تھا، کیوں کہ جو مغل فوجیں خرم کا پیچھا کر رہی تھیں وہ گولکنڈے پر ٹوٹ پڑتیں۔ اس لئے سلطان محمد قطب شاہ نے بڑی ہوشیاری سے کام لیا۔ بہ ظاہر تو اس نے مدد دینے سے انکار کر دیا مگر خفیہ طور پر کچھ غلّہ اور روپے سے مدد کر کے شہزادے کو رخصت کر دیا۔ یہاں سے خرم بنگالہ چلا گیا لیکن وہاں بھی اس کے قدم نہیں جمے۔ اس کے بعد پھر وہ گولکنڈے کے حدود میں لوٹ آیا اور مدد کا طالب ہوا لیکن سلطان محمد قطب شاہ کی ہوشیاری سے بہت جلد یہ بلا ٹل گئی۔

یہ واقعات قطب شاہی حکمرانوں کے سیاسی بست وکشاد کی رہنمائی کرتے ہیں اور ان سے معلوم ہوتا ہے کہ گولکنڈے کی سلطنت دکن کی مجموعی سیاست سے بے خبر نہ تھی بلکہ ہر نازک موقعے پر اپنے شعورِ سیاست کا ثبوت دیتی تھی اور سلطان محمد قلی قطب شاہ اپنے زمانے کے باخبر سیاس تھا اس کو ملک عنبر کی ہر فوجی نقل وحرکت کی خبر تھی اور وقتاً فوقتاً اس کی مدد کرتا تھا۔

بارھواں باب

سلطنت کی توسیع و ترقی

یہ تو سلطنت کی توسیع اور تنظیم تھی، لیکن محمد قلی قطب شاہ کا عہدِ حکومت جو کم و بیش تینتیس ۳۳ سال پر محیط ہے ارتقائے تمدن کا زرین باب ہے اسی عہد میں قطب شاہوں کا بڑا تمدن پیدا ہوا جس پر آندھرا دیش ہمیشہ فخر کرتا ہے۔ محمد قلی قطب شاہ کی ذہنی صلاحیتوں سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔ تاریخ کے الفاظ ہیں "از برادران بہ جمیع صفات صوری و معنوی ممتاز بود"۔ محمد قلی کی زندگی کا ایک اور پہلو یہ ہے کہ وہ ایک بڑے متلاطم زمانے میں پیدا ہوا تھا جب کہ جنگِ تالیکوٹ ہو رہی تھی، اسی طرح ایک انقلابی زمانے میں تخت نشین ہوا جب کہ دُنیائے اسلام میں ایک ذہنی تلاطم مچ گیا۔ اس وقت تقویم ہجری کا پہلا الف یعنے ایک ہزار سال ختم ہو رہے تھے اور اب دوسرا الف شروع ہونیوالا تھا اور اس انقلاب میں مسلمانانِ عالم ایک ذہنی کش مکش میں مبتلا ہو گئے۔ سب کے دماغوں پر ایک عام عقیدہ مسلط تھا کہ دوسرے الف میں زمانہ ایک نئی کروٹ لیگا، نئے رہبر یا مُجدّدِ اُفقِ عالم پر نمودار ہوں گے اور ان کے جلو میں عظیم الشان سیاسی و سماجی تغیرات رونما ہونے والے ہیں چنانچہ اس تلاطم میں کئی مجدّد پیدا ہوئے اور انھوں نے دُنیا کو اپنا پیغام دیا۔ شمالی ہند میں شہنشاہ اکبر اور دکن میں ابراہیم عادل شاہ ثانی اور محمد قلی قطب شاہ اس دورِ جدید کے قاصد تھے ان حکمرانوں نے نئے زمانے کی پیشوائی کی۔ چنانچہ محمد قلی کی سیاست اور معاشرت میں

نئے خیالات وجذبات کی عکس ریزی صاف دکھائی دیتی ہے سیاست ہو یا معاشرت تعلیم ہو یا تعمیر کاری سب نئے زمانے کا عکس تھے۔ چنانچہ اس عہد میں قرونِ وسطیٰ کا مشہور شہر حیدر آباد آباد ہوا تو اس شہر کی تنظیم اور عمرانی لوازم اس سلیقے کے ساتھ جمع کئے گئے کہ ان کی مثال نہ تھی اس کی وجہ سے تلنگانے کے طول وعرض میں ایک اجتماعی زندگی پیدا ہوگئی۔ داد محل۔ خداداد محل۔ ندی محل، باغِ محمدی۔ بنات گھاٹ اور کوہ طور کی سی متعدد عمارتیں بنا کر معاشرت کو بلند کیا گیا فنونِ لطیفہ کو ترقی دے کر زندگی میں شگفتگی پیدا کی گئی علم وفن کی اس قدر خدمت کی گئی کہ دُور دُور تک دُنیائے معلومات میں اس کے چرچے ہونے تھے اسلامی علوم کے ساتھ مقامی زبان تلنگی کو بھی فروغ دیا گیا۔ نہ صرف تلنگی شعراء کی خاطر خواہ سرپرستی کی گئی، بلکہ خود بادشاہ وقت نے بھی تلنگی میں طبع آزمائی کی تلنگانے کی مقامی روایات و رواجات زندہ کر کے قومی بیداری پیدا کی گئی اس کی تفصیل دیکھنے کا ہمیں آیندہ موقع ملے گا۔

ان تمام ترقیوں کا اصل محرک بادشاہ کی جلیل القدر شخصیت تھی جس کو تمام قطب شاہی خاندان میں خاص امتیاز حاصل ہے اسی کی بیدار مغزی سے گولکنڈے میں ایک نئی سیاست اور تمدن کی تعمیر ہوئی لیکن اس عہد میں کئی لائق اور کارداں لوگ بھی جمع ہوگئے تھے جنھوں نے اپنی قابلیت سے سیاست کی رہبری کی اور مُلک کو اقبالمند بنایا لیکن ان سیاست دانوں میں اہلِ مُلک بہت کم اور غیر مُلکی زیادہ تھے اس میں کوئی شک نہیں کہ ان غیر مُلکی عہدہ داروں نے مُلک کو فائدہ ضرور پہنچایا، سیاست اور تمدن کو درباہ کیا لیکن یہ سب ترقیاں صحتمند نہ تھیں، مُلک کی سیاست ان خطوط سے ہٹ گئی تھی جن پر محمد قلی کے بزرگوں نے اس کو قائم کیا تھا اس کی وجہ سے مذہب وسیاست کے بعض گوشے تاریک ہوگئے۔ بات یہ ہے کہ غیر مُلکی عہدہ داروں نے ہمیشہ باہر والوں کی سرپرستی کی، انھیں سے نظم ونسق کے کھانچے پُر کئے اس کے علاوہ مذہب میں بھی تنگ نظری پیدا ہوگئی اور اس خصوص میں نوجوان بادشاہ کو غلط راستے پر ڈال دیا۔ تمدن میں ترقی تو ہوئی لیکن اس میں وہ ذہنی نہ اخلاقی وسعت نہ پیدا ہوسکی جیسی ہونی چاہئے اور کچھ اس میں مفاد پرستی زیادہ تھی۔ جب ان لوگوں کی مفاد پرستی سامنے آنے لگی تو ان کو ذلت کے ساتھ علحدہ کرنا پڑا۔ بعضے مُلک سے خارج کئے گئے اور بعضے قید کئے گئے۔

میر مومن استر آبادی جن کو ان کے علم وفضل وسیاست دانی کی بدولت "مُرتضائے ممالک اسلام" کہا جاتا ہے، سلطنت کے پیشوا تھے۔ ان کے آبا واجداد استر آباد کے رہنے والے اور صفوی خاندان کے ملازم تھے۔ خود میر مومن نے بھی

صفوی شاہزادے کی اتالیقی کی تھی ۔ ایران میں ان کی عزت تھی ۹۸۹ھ/۱۵۸۱ء میں یہ دکن آئے جب کہ محمد قلی قطب شاہ کو تخت نشین ہوئے صرف آٹھ مہینے ہوئے تھے ۔ یہاں آنے کے بعد ان کے علم و فضل کا بہت چرچا ہوا ۔ ۹۸۹ھ/۱۵۸۱ء میں شاہ میر اصفہانی پیشوا کا انتقال ہوگیا تھا اس لیے بادشاہ نے ۹۹۲ھ/۱۵۸۶ء میں میر مومن کو پیشوا بنا دیا ۔ چنانچہ انھوں نے یہ خدمت محمد قلی قطب شاہ اور اس کے جانشین سلطان محمد قطب شاہ کے عہد میں ۱۰۲۳ھ/۱۶۱۴ء تک انجام دی اور اپنی قابلیت سے ملک کو فائدہ پہنچایا ۔ یہ سیاست میں اس قدر دخیل تھے کہ ان کے مشورے کے بغیر ملک کا کوئی کام ہوتا تھا نہ کوئی عہدہ دار مامور ہوتا تھا ۔ شیخ محمد بن خاتون، مرزا محمد امین اور مولانا اویس جیسے بڑے عہدہ دار ان کے آوردہ تھے ۔ انھیں کی وجہ سے ملک میں جعفری مذہب کی ترویج بھی ہوئی تھی ۔[1]

دوسرا بڑا عہدہ دار امیر شاہ میر طباطبا تھا جو ابراہیم قطب شاہ کے عہد سے میر جملہ کی خدمت پر فائز تھا ۔ یہ اصفہان کا رہنے والا تھا اور ابراہیم کے

---

[1] میر مومن بڑے عالم فاضل اور شاعر تھے ۔ "رسالہ مقداریہ" ان کی تصنیف ہے ۔ فارسی کلام میں ان کے قصیدے بہت مشہور ہیں ۔ حیدرآباد میں ایک روحانی بزرگ سمجھے جاتے ہیں، لیکن ان کا یہ وصف ان کی دنیاداری کے پردے میں چھپ جاتا ہے ۔ ان کی زندگی بالکل ایک دنیادار کی سی تھی ۔ یہ بڑے مال دار تھے اور محلات میں رہتے تھے ۔ انکی کئی جاگیریں تھیں ۔ حیدرآباد کے مشرق میں سید آباد "میر پیٹ" اور "مومن پیٹ" ان کی جاگیریں تھیں ۔ موجودہ پرانی حویلی جو اب شاہی محل کی صورت میں تبدیل ہوگئی ہے وہ انکی ڈیوڑھی تھی ۔ انھوں نے ہمیشہ غیر ملکیوں کو نوازا اور دکھنیوں کی سرپرستی نہ کی ۔ "دائرہ میر مومن" جو حیدرآباد کے جنوب میں واقع ہے انھیں کا بنایا ہوا ہے اور اس میں وہ مدفون ہیں ۔ ڈاکٹر زور مرحوم نے ان کے حالات میں ایک ضخیم کتاب لکھی ہے ۔ دیکھو "حیات میر مومن" ڈاکٹر زور ۔

عہد میں گولکنڈہ آیا۔ اس کے علم و فضل، تدبر اور چرب زبانی کی مورخ بہت تعریف کرتے ہیں :۔ "از مشاہیر فضلائے زماں و معارف عرفائے دوراں بود"[۱]۔ صاحبِ تدبر اور چرب زبان ہونے کی وجہ سے سیاسی گتھیاں خوب سلجھاتا تھا سفارتی کام خوب کرتا تھا۔ میدانی معرکوں میں بھی اس نے حصہ لیا اور بڑے بڑے معرکے سر کیئے تھے ۹۸۱ھ / ۱۵۷۵ء میں نلدرگ کا معرکہ اس کا مشہور ہے، اس وجہ سے ابراہیم قطب شاہ پر اس کا بہت اثر تھا۔ ولیعہد سلطنت شاہزادہ حسین قلی سے اس کی بیٹی منسوب بھی تھی لیکن جب محمد قلی تخت نشین ہو گیا تو اس کو ہموار کرنے کے لئے بادشاہ نے ۹۹۱ھ / ۱۵۸۳ء میں اسی لڑکی سے خود شادی کر لی[۲]۔ لیکن سنجوگ کچھ دیرپا ثابت نہیں ہوا۔ اہلِ دکن اس کے مخالف تھے اور غالباً بادشاہ کو اس کے خلاف سمجھانا شروع کیا اور خود بادشاہ بھی اسکے بڑھتے ہوئے اثر سے ڈرتے تھے، کیوں کہ یہ حسین قلی کے ہوا خواہوں میں تھا۔ یہ بدگمانی بڑھتی گئی اور اس کے علاوہ بیجاپور سے اس کی سازش کا بھی پتہ چل گیا، اس لئے بادشاہ نے اس کو قید کر دیا، گو چند روز کے بعد یہ قید سے رہا کر دیا گیا لیکن اس کے بعد ہی اس کو کشتی میں سوار کر کے اصفہان روانہ کر دیا گیا، کیوں کہ ایسے ذی اثر آدمی کا ملک میں رہنا بادشاہ کی نظر میں خطرے سے خالی نہ تھا، مگر وہ اصفہان نہیں پہنچ سکا بلکہ راستے میں مر گیا[۳]۔

الف خاں ملک امین الملک ایک اور جلیل القدر عہدہ دار ہے جو اس عہد کا بہت مشہور میر جملہ ہے لیکن یہ دکھنی نژاد تھا۔ محمد قلی قطب شاہ نے غالباً امیر شاہ میر کے معزول ہونے کے بعد اس کو میر جملہ کی خدمت پر ترقی دی تھی اس نے آخری عمر تک سلطنت کی وفادارانہ خدمت انجام دی اور تاریخ میں وفاداری کی روشن مثال چھوڑی۔

---

[۱] برہان مآثر ص ۴۷۶ [۲] برہان مآثر ص ۵۲۵ ۔ مآثر الامراء جلد سوم ص ۴۱۴۔

[۳] تاریخ فرشتہ مقالہ سوم ص ۱۷۲ ۔ ابراہیم قطب شاہ کے انتقال کے وقت (باقی صفحہ ۱۵۳ پر)

عام انتظامی اور مالی فرائض کے علاوہ یہ فنِ حرب سے خوب واقف تھا اور بڑی کامیابی کے ساتھ فوجی کمان کرتا تھا۔ اس کی کارکردگی کی وجہ سے بادشاہ کو خود باہر جانے کی ضرورت نہ ہوتی تھی اور اس پر اس قدر اعتماد تھا کہ تمام کام اس پر چھوڑ دیا گیا تھا۔ محمد قلی کے عہد میں اندرونِ سلطنت جس قدر لڑائیاں ہوئیں وہ اکثر اس کے ہاتھ پر سر ہوئی تھیں۔ اس نے باغیوں کی خاطر خواہ سرکوبی کی۔ سرکشوں کے ساتھ بہت سختی سے پیش آتا تھا۔ باغیوں کی ایسی خبر لیتا تھا کہ وہ پھر سر نہیں

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گذشتہ) شاہ میر نلدرگ کے محاصرے میں مصروف تھا۔ جب اس کو محمد قلی کی تخت نشینی کا حال خود نئے بادشاہ کے خط سے معلوم ہوا تو شاہ میر اور اس کے ہوا خواہ سب پریشان ہوئے (برہان مآثر ص ۵۲۸) کیوں کہ وہ حسین قلی کی بادشاہی کے لئے چشم براہ تھے۔ حسین قلی تخت نشین ہوتا تو شاہ میر کا راج ہوتا لیکن شاہ میر بہت قریب آدمی تھا۔ نئے بادشاہ کو ہموار کرنے کے لیے فوراً نلدرگ سے مبارکباد بھیجی اور جب نظام شاہی سفیر میرک معین سبزواری اور خواجہ محمد دونوں نئے بادشاہ کے مبارکباد کے لئے آئے تو ان کے بعد وہ خود بھی گولکنڈہ آیا۔ بادشاہ نے آگے بڑھ کر اس کا استقبال کیا اور میر جملہ کی خدمت بحال کردی اور اس کی بیٹی سے شادی کرلی۔ لیکن دونوں میں بدگمانی تھی اور دکھنی شاہ میر اور اس کے فریق کے دشمن تھے اور ان کے خلاف بادشاہ کے کان بھرتے تھے۔ ایک روز ایک جعلی خط اُمرائے بیجاپور کے نام بادشاہ کے سامنے پیش کردیا اور بتایا کہ شاہ میر سلطنت کے خلاف بیجاپور سے سازش کررہا ہے۔ یہ خط دیکھ کر بادشاہ بہت برہم ہوئے، بہ قولِ فرشتہ چند روز کے لئے اس کو قید کردیا اور پھر رہا کرکے اس کو اصفہان روانہ کردیا۔ اب رہی اس کی بیٹی جو بادشاہ کی ملکہ تھی وہ گمنام ہوگئی اس کے متعلق تاریخیں خاموش ہیں، یا تو وہ محل کے ایک گوشے میں کس مپرسی کی حالت میں پڑی رہی اور مرگئی یا باپ کے ساتھ اصفہان چلی گئی! اس کی اولاد کا بھی کہیں ذکر نہیں۔ ڈاکٹر زور نے شاہ میر کے حالات تفصیل سے لکھے ہیں۔ دیکھو سلطان محمد قلی قطب شاہ۔ ڈاکٹر زور۔

اُٹھا سکتے تھے۔ اسی وجہ سے یہ بہت سخت گیر مشہور تھا۔ شہر حیدر آباد کی تعمیر میں اس کا ہاتھ تھا۔ چنانچہ شہر کی جامع مسجد جو چار مینار کے شمال مشرقی گوشے میں واقع ہے اسی کی نگرانی میں تیار ہوئی تھی۔ انھیں خدمات کے صلے میں اس کو امین الملک کا خطاب ملا تھا۔ غالباً ۱۰۰۸ھ/۱۵۹۹ء میں اس کا انتقال ہوا۔[۱]

اس کے بعد مرزا محمد امین شہرستانی کا نام آتا ہے جس کو ۱۰۱۱ھ/۱۶۰۲ء میں میر جملہ کی خدمت تفویض ہوئی تھی۔ یہ شہرستان سے آیا تھا اور اپنے علم و فضل اور کاردانی کی بدولت بہت مشہور تھا۔ چنانچہ علی بن طیفور بہت بلند پایہ الفاظ میں اسکی مدح سرائی کرتا ہے:۔ "در فن استیفا و لیاقت بہ مرتبہ مہارت داشت[۲] کہ ہیچ کس از دنیائے روزگار بادۂ خیالِ مساوات بر لوح ضمیر نمی توانست نگاشت"۔ چونکہ ملک امین الملک کے انتقال کے بعد میر جملہ کی خدمت دو تین سال تک خالی رہی اور بادشاہ کو اس خدمت کے لئے لائق شخص کی تلاش تھی، اس لئے میر مومن صاحب نے اس خدمت کے لئے نو وارد مرزا محمد امین کی سفارش کی تو بادشاہ نے فوراً منظور کرلی اور محمد امین کو مامور کر دیا۔ اس ماموری میں ایک نئی بات یہ تھی کہ بادشاہ نے جائزہ خدمت کے ساتھ اس کو ایک بیش بہا مرصع قلمدان وزارت دیا تھا جو اب تک کسی وزیر کو نہیں دیا گیا تھا، اس قلمدان پر جواہر نصب تھے اور اس کی تنخواہ سالانہ دو لاکھ ہون یعنے آٹھ لاکھ روپے مقرر تھی۔ شاہی سرفرازیاں اس کے علاوہ تھیں[۳]۔ یہ بڑا فرض شناس آدمی تھا اور دل لگا کر کام کرتا تھا۔ اس کی تنقیح حسابات سے بڑے ذی اثر لوگ بھی نہیں بچ سکے۔

---

[۱] جامع مسجد کے دروازے پر جو کتبہ نصب ہے اس میں یہ اشعار لکھے ہیں۔ اس کتبے سے الف خاں امین الملک کی یاد تازہ ہوتی ہے:۔

"کسے پرسد اگر تاریخ او را۔ زہے عالی بہائے خیر گوئی۔ تمام گشت بسعی امین الملک" (مآثر دکن، بلگرامی اُردو ص ۱۶ –

[۲] حدائق السلاطین علی بن طیفور۔ ورق ۱۸۳۔

[۳] تاریخ قطب شاہی (قلمی)   حدیقۃ العالم ص ۲۴۴ و ۲۴۵۔

چنانچہ اس کی گرفت سے سوری راؤ برہمن کو جو بادشاہ کا مُنہ چڑھا تھا ہزاروں روپے اُگلنے پڑے۔ موسیٰ ندی کے کنارے اس نے ایک بہت ہی پُر فضا باغ بنایا تھا جو "اُمین باغ" کے نام سے مشہور تھا، لیکن فوجوں کی سپہ سالاری اس سے خاطر خواہ نہ ہو سکی۔ جب تک محمد قلی قطب شاہ زندہ رہا اس کا طوطی بولتا تھا، لیکن سلطان محمد قطب شاہ سے اس کی اَن بَن ہو گئی اس لئے وہ بادشاہ کے تیور دیکھ کر بہت جلد خدمت سے کنارہ کش ہو گیا اور ملک سے باہر چلا گیا۔[1]

---

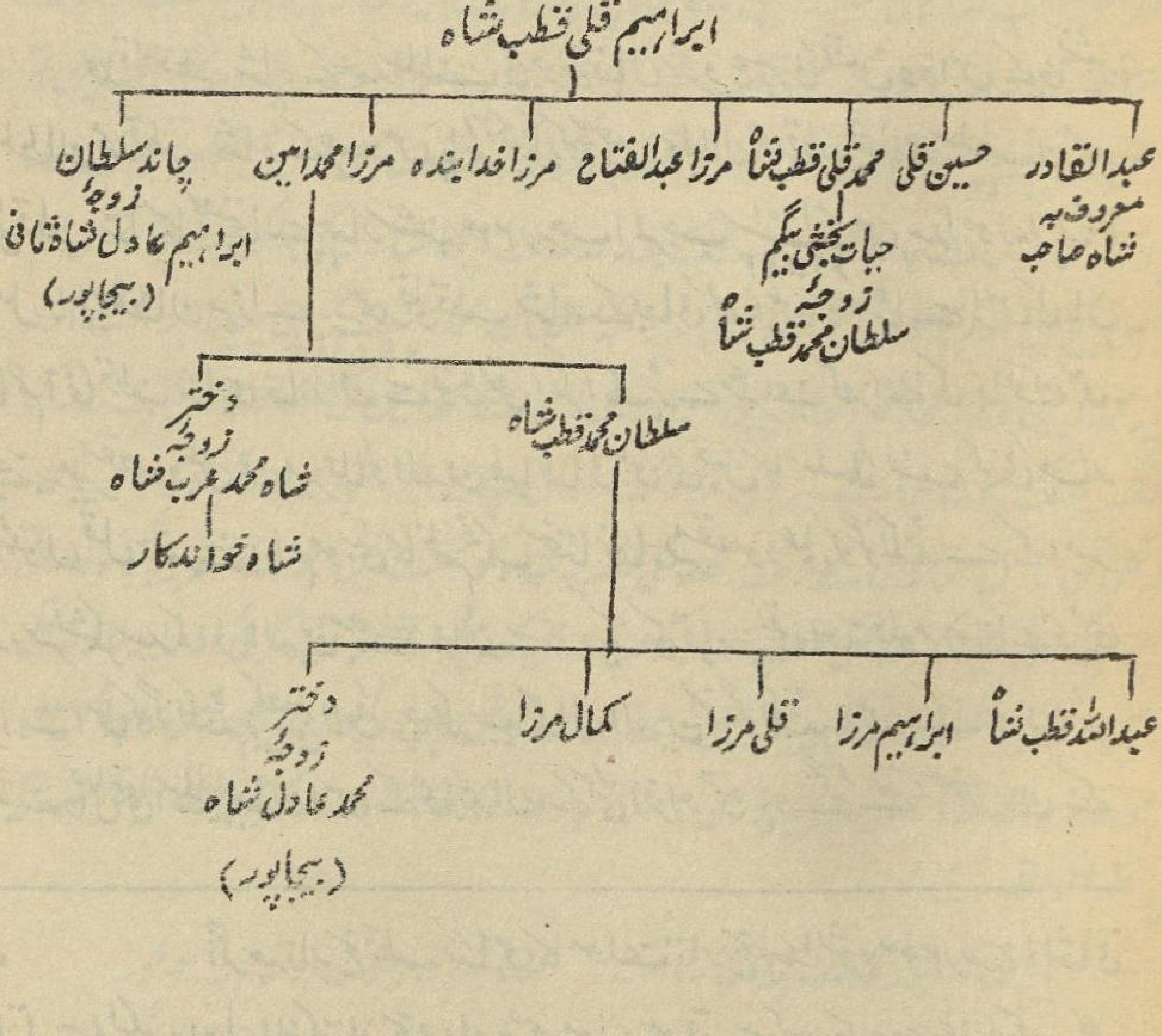
[1] مرزا محمد امین بہت ذی علم آدمی تھا اور شاعر بھی تھا اور "رُوح الامین" تخلص کرتا تھا۔ خمسہ نظامی کے جواب میں اس نے پانچ مثنویاں لکھی تھیں جن میں سے بعض اب دستیاب ہو جاتی ہیں۔ اس نے حیدرآباد میں موسیٰ ندی کے کنارے ایک بہت عالیشان باغ بھی لگایا تھا جو "اُمین باغ" کے نام سے مشہور تھا۔ اسی جگہ اب زنانہ ہسپتال قائم ہے جو "زچگی خانہ" کہلاتا ہے۔ یہ باغ اس قدر پُر فضا اور آراستہ و پیراستہ تھا کہ اس کو نظام الدین صاعدیؒ "باغ مرزا محمد امین میر جملہ ما فی قطعہ البست از بہشت بریں" لکھتا ہے (حدیقۃ السلاطین ص ۴۷) عبداللہ قطب شاہ کے عہد میں بھی اس باغ کی رونق وہی رہی۔ چنانچہ شاہجہاں کے سفیر شیخ محی الدین پیرزادہ اجین ۱۰۲۷ھ اور شاہ ایران کے سفیر امام قلی بیگ ۱۰۴۴ھ اسی باغ میں ٹھیرائے گئے تھے۔ محمد امین کی شاہی ضیافت بھی تاریخ کا بہت بڑا دلچسپ واقعہ ہے، اس نے محمد قلی قطب شاہ کو اپنے گھر میں دعوت دی تھی جس شان سے ضیافت کا اہتمام ہوا تھا اس سے تاریخ کے صفحات بھرے ہوئے ہیں، لیکن محمد قلی کے بعد سلطان محمد قطب شاہ سے اس کی نباہ نہ ہو سکی۔ شائد اس کی وجہ یہ تھی کہ دستر کی فوج کشی میں یہ ناکام ہوا تھا، یا سلطان محمد کی تخت نشینی سے اس کو اتفاق نہ تھا، یا بادشاہ کے تیور دیکھ کر وہ فوراً مستعفی ہو گیا اور بہت جلد باہر چلا گیا (حدیقۃ السلاطین) لیکن رحم دل بادشاہ نے اس کو یہ اجازت دے دی تھی کہ وہ اپنا روپیہ پیسہ اپنے ساتھ لے جائے۔ پہلے یہ بیجاپور گیا (باقی بر صفحہ ۱۵۶)

ان کے علاوہ علی آقا کوتوال - زین العابدین سرلشکر اور میر ابو طالب ناظر بھی اسی عہد کے قابلِ ذکر عہدہ دار تھے، اور یہ سب سیّد گھرانے کے لوگ تھے اور غالباً تقرر میں خاندانی شرافت کا لحاظ رکھا جاتا تھا۔ ہندو بھی فوجی اور غیر فوجی بڑی خدمات پر مامور تھے۔ ساماجی اور بھالے راؤ، دھرماراؤ فوج کے افسر تھے۔ اسیر راؤ اور جگپت راؤ میسلورگ اور نندیال کے قلعہ دار تھے۔ یہ ہندو افسر سلطنت کی طرف سے ہندو طاقتوں کی سرکوبی کرنے میں دریغ نہیں کرتے تھے اس واقعے سے سلطنت کی ساکھ اور رواداری ظاہر ہوتی ہے۔

ایک طویل حکومت کے بعد جو تینتیس (۳۳) برس پر مشتمل ہے، ۱۷ ذیقعدہ سنہ ۱۰۲۰ھ (۱۶۱۲ء) کو محمد قلی قطب شاہ کا انتقال ہوا۔ انتقال کے وقت اس کی عمر اڑتالیس سال سے زیادہ نہ تھی اور غالباً اس کی وجہ یہ تھی کہ اس کی تمام زندگی عیاشی میں گزری تھی۔ لیکن اس کمزوری کے قطع نظر وہ بہت بڑا عملی آدمی تھا اس نے اپنی تنظیم و تعمیر سے تلنگانے کو جس قدر فائدہ پہنچایا تھا اس کی مشکل سے مثال ملتی ہے۔ اگرچہ وہ بہت رحم دل تھا۔ اور تاریخ کہتی ہے کہ اس نے اپنے تمام عہدِ حکومت میں کبھی کسی کو قتل نہیں کیا۔ فرشتہ اس کو "حلیم الرؤف" لکھتا ہے، لیکن اس کی رحم دلی کی وجہ سے سلطنت میں کبھی بدامنی اور خونریزی نہیں ہوئی۔ دارالقضاء سے تمام مقدمات کے منصفانہ فیصلے ہوتے تھے۔ اس نے اجناس کا محصول جو پچھلے زمانے میں لیا جاتا تھا

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۵۵) جب وہاں اس کے قدم نہیں جمے تو ایران چلا گیا، لیکن یہاں بھی اس کی خاطر خواہ قدر و منزلت نہیں ہوئی تو پھر ہندوستان لوٹ آیا اور شہنشاہ جہانگیر کے دربار میں پیش ہوا اور نذرانے پیش کئے۔ یہاں قدم جم گئے اور شہنشاہ نے اس کو پنجہزاری امراء کی فہرست میں شامل کر لیا۔ سنہ ۱۰۴۶ھ میں یہ مرض فالج سے فوت ہوا۔ دیکھو مآثر الامراء جلد سوم ص ۴۸۱ - حدیقۃ السلاطین ص ۳۵۳ - سلطان محمد قلی قطب شاہ - ڈاکٹر زور، ص ۳۴۷ — ۳۵۴ -

معاف کر دیا۔ خیرات و مبرّات کا یہ حال تھا کہ مذہبی تقریبوں میں لاکھوں روپے غرباء و مستحقین کو دیئے جاتے تھے۔ ہر سال بارہ اماموں کے نام سے ساٹھ ہزار ہون خیرات ہوتے تھے۔ محرم میں بارہ ہزار ہون اور ربیع الاول میں ایک لاکھ ہون خرچ کئے جاتے تھے۔ محرم میں خاص اہتمام کیا جاتا تھا۔ تمام سلطنت میں عزا داری ہوتی تھی۔ حکومت کی طرف سے سب لوگوں کو سیاہ کپڑے تقسیم ہوتے تھے تاکہ وہ سیاہ کپڑے پہنیں۔ غرباء کو کھانا کھلایا جاتا تھا، اور ایک بہت بڑی رقم مقدس مقامات کے لئے بھیجی جاتی تھی۔ رعایا کی دوسرے طریقوں سے بھی مدد کی جاتی تھی، یعنے شادی بیاہ اور دوسری تقریبوں میں ہزار ہا روپے خزانے سے دیئے جاتے تھے۔



تیرھواں باب

عہدِ ارتقاء

محمد قلی قطب شاہ کے عہدِ سلطنت کی جو ترقیاں شروع ہوئی تھیں وہ اس کے جانشین سلطان محمد قطب شاہ کے عہد میں پایۂ تکمیل کو پہنچیں۔ سلطان محمد قطب شاہ جو سلطان محمد قلی قطب شاہ کا بھتیجا ہے چہارشنبہ ۲۳ رجب المرجب ۱۰۰۱ھ ۱۵۹۲ء میں پیدا ہوا[1]۔ اس کا اصل نام سلطان مرزا ہے۔ یہ محمد قلی قطب شاہ کے بھائی محمد امین کا بیٹا ہے۔ اس کی ماں خانم آغا قطب شاہی خاندان سے تو نہ تھی، مگر ایک بڑے شریف گھرانے کی خاتون تھی۔ یعنے یہ میر مقصود علی بن میر علاؤ الدین طبا طبا کی بیٹی تھی جس کا سلسلۂ نسب کوئی چار پشتوں قبل حضرت امام موسیٰ کاظمؑ تک پہنچتا تھا۔ میر مقصود علی کو گولکنڈے کے امیر اور سر لشکر سید کمال الدین مصطفےٰ خاں سے نزدیک کی قرابت تھی اور معلوم ہوتا ہے کہ یہی قرابت اس کو گولکنڈہ کھینچ لائی۔ چونکہ سید کمال الدین کو گولکنڈے میں ایک ذی اثر حیثیت حاصل تھی اسلئے یہاں اس کے خاندان کے کئی افراد جمع ہو گئے تھے، منجملہ ان کے

---

[1] اگرچہ تاریخ قطب شاہی کا مولف تاریخ پیدائش ۲۳ ربیع الثانی بتاتا ہے، لیکن اول الذکر تاریخ زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے کیوں کہ دوسری تاریخیں بھی اس کی تصدیق کرتی ہیں اور سلطان محمد کی قبر کے کتبے میں بھی ماہِ رجب درج ہے۔

میر مقصود علی بھی تھا۔ مقصود علی نے اپنی خاندانی وجاہت اور مصطفےٰ خاں کے سیاسی اثر سے بہت جلد قطب شاہی دربار میں رسوخ پیدا کر لیا۔ گولکنڈے کے سلاطین خود ایسے بلند پایہ خاندانوں کی بڑی قدر و منزلت کرتے تھے اور نہ صرف ان کو دربار میں جگہ دیتے تھے بلکہ ان کے ساتھ ازدواجی تعلقات پیدا کرنے میں بھی دریغ نہیں کرتے تھے۔ مقصود علی کی بھی بہت آؤ بھگت ہوئی اور اس کی بیٹی خانم آغا سے شہزادہ محمد امین کی شادی کی گئی۔ اس طریقے سے سلطان محمد قطب شاہ کا رشتہ خاندانی ایک بڑے سید گھرانے سے جڑا ہوا تھا۔

سلطان محمد کی شادی کی صحیح تاریخ بتانی بہت مشکل ہے۔ لیکن قیاس یہ ہے کہ یہ شادی محمد قلی قطب شاہ کی تخت نشینی کے بعد ہی ہوئی ہوگی، کیوں کہ ابراہیم قطب شاہ کے انتقال کے وقت خود محمد قلی قطب شاہ کی عمر پندرہ سال سے زیادہ نہ تھی، محمد امین تو اس سے بہت چھوٹا تھا۔ خود محمد قلی قطب شاہ کی شادی بھی اس کی تخت نشینی کے بعد ہوئی تھی۔ اس نے بادشاہ ہونے کے بعد نہ صرف اپنی شادی کی بلکہ اپنے تمام بھائیوں اور بہنوں کی شادی کی۔ چونکہ سلطان محمد ۱۰۰۱ھ (۱۵۹۲ء) میں پیدا ہوا ہے اور یہ محمد امین اور خانم آغا کی پہلی اولاد تھی اس لئے محمد امین کی شادی ۱۰۰۰ھ (۱۵۹۱ء) کے لگ بھگ ہوئی چاہئے۔ یہ وہی مبارک سال ہے جس میں شہر حیدرآباد کی بنیاد رکھی گئی۔ اس شادی کے وقت محمد قلی قطب شاہ کو تخت نشین ہوئے تقریباً بارہ سال ہو چکے تھے۔ چونکہ محمد قلی قطب شاہ کو صرف ایک بیٹی کے سوائے کوئی اور اولاد نہ تھی اس لئے یہ سلطان محمد کی پیدائش سے بہت خوش ہوا، کیوں کہ یہی اس کا جانشین ہونے والا تھا۔ حضرت میر مومن استرآبادی نے جو سلطنت کے پیشوا تھے اظہار مسرت میں یہ نظم لکھی تھی:۔

بازعالم ابتدائے کامرانی کردہ است	صد بشیر کامرانی می بردہ ہر سو خبر
دودمان ترکمانش خوش چراغے برفروخت	پر تو شاہزادۂ یہ چرخ مینا بد دگر
رونق عز و شرف سلطان محمد آنکہ ہست	ہر دو عالم یک صدف از بہر آن عالی گہر

خواستم تاریخ آن فرخندہ گوہر عقل گفت | اول کام است و فیروزی و اقبال و ظفر
چون دعا زین بہ نمی دانم از آن میگویمش | سرورِ عالم شوی در ظلِ اقبالِ پدر ۱۰۰۹ھ

لیکن یہ واقعہ دلچسپی سے خالی نہیں ہے کہ محمد قلی قطب شاہ نے اس بچے کو اپنا متبنےٰ بنانے کی خواہش کی اور محمد امین سے اس بچے کو تبنیت کے لئے طلب کیا کہ: "تم کو خدا اور بچے دے دیگا یہ بچہ مجھے دے دو" محمد امین نے بچے کو دینے میں بہت تامل کیا، اور بیان کیا جاتا ہے کہ وہ اپنے انتقال تک بہت لیت ولعل کرتا رہا۔ جب چار سال کے بعد محمد امین کا ۱۰۰۴ھ ۱۵۹۵ء میں انتقال ہو گیا تو سلطان مرزا خود بہ خود اپنے چچا کے آغوش میں آ گیا۔[1] یوں بھی محمد قلی قطب شاہ اس بچے کا سرپرست تھا لیکن بیان کیا جاتا ہے کہ محمد قلی قطب شاہ اس بچے کو لینے کے لئے خود محمد امین کے گھر گیا تھا اور بچے کو اپنے ساتھ لایا اور خود اس کی پرورش کی:۔

"از آوان طفولیت کہ پدر بزرگوار جہانِ فانی را وداع نمودہ بود
در کنف لطف و مرحمت خاقانِ زمان نشو و نما یافتہ بود"[2]

شہزادے کی تعلیم و تربیت کا قطب شاہوں کی بلند روایات کے مطابق انتظام کیا گیا، اسی اعلیٰ تعلیم کا نتیجہ تھا کہ گولکنڈے کے تمام سلاطین سب کے سب پڑھے لکھے علم و فن کے قدر دان ہوئے ہیں۔ علمی تعلیم کے لئے قاضی سمعانی اور فوجی تربیت کے لئے حضرت شاہ یوسف صاحب جن کو تاریخ قطب شاہی میں چاند میاں یوسف لکھا گیا ہے مقرر کئے گئے تھے، یہ دونوں حضرات اپنے زمانے کے فاضل تھے ان بزرگوں کے فیضِ تربیت سے سلطان محمد کو بہت فائدہ پہنچا، یہ ذی علم اور ذی اخلاق بادشاہ ثابت ہوا، علم و فن کی اس نے بہت قدر کی۔

یہ تو تعلیم و تربیت کا انتظام تھا، اور جب سلطان محمد کی عمر کم و بیش پندرہ سال کی ہوئی تو اس کی شادی کا انتظام کیا گیا۔ محمد قلی قطب شاہ نے اپنی اکلوتی بیٹی

[1,2] تاریخ قطب شاہی ص ۲۸۵ و ۲۸۶ و ۱۶۵۔

حیات بخشی بیگم سے اس کی شادی کر دی جو سنہ ۱۰۱۵-۱۶ھ / ۱۶۰۷ء میں ہوئی تھی۔ چونکہ سلطان مرزا محمد قلی قطب شاہ کا جانشین اور گولکنڈے کا تاجدار ہونے والا تھا اور حیات بخشی بیگم جیسی لایق شہزادی سے اس کی شادی ہو رہی تھی اس لئے بڑی مسرتوں کے ساتھ شادی رچائی گئی۔ غالباً شادی کی اصل تقریب خود گولکنڈے میں ہوئی تھی جو تاریخی جگہ تھی۔ لیکن شہرِ حیدر آباد میں بھی اس شادی کی خوشیاں منائی گئیں، کیونکہ یہ نو خیز شہر بھی جو اس وقت آباد ہو گیا تھا ان مسرتوں کا مستحق تھا، اس شہر میں بھی روشنی کا انتظام کیا گیا اور مہمانوں کو کھانا کھلایا گیا۔ تمام افرادِ مملکت کو درجہ بدرجہ جاندار خانۂ عامرہ سے خلعتِ خاص تقسیم ہوئے۔ ان خلعتوں کی تعداد تقریباً تیس ہزار بتائی جاتی ہے! اس سے شادی کے دوسرے اخراجات کا اندازہ ہو سکتا ہے[۱]۔ آیندہ واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مسرتیں بے معنے نہیں تھیں۔ یہ ایسا سنجوگ تھا جس کی شمیم انگیزیاں برسوں تک گولکنڈے کو یاد رہیں۔ سلطان محمد تو جلد مر گئے اور چونتیس سال سے زیادہ زندہ نہیں رہے لیکن حیات بخشی بیگم نے طویل عمر پائی اور بڑی عمر تک گولکنڈے کی سیاسی رہنمائی کرتی رہی۔ اپنے بیٹے عبد اللہ قطب شاہ کے عہد میں اس نے چالیس سال سلطنت کے کار و بار سنبھالے اور اپنے کارناموں کا ایک بڑا سرمایہ چھوڑا ہے۔ اس وجہ سے گولکنڈے کے اکثر شاعروں نے اس شادی میں مسرت کے گیت گائے تھے۔

جب محمد قلی قطب شاہ کا انتقال ہوا تو مرحوم کی وصیت کے مطابق سلطان محمد کو اس کی جگہ تخت نشین کیا گیا۔ سلطان محمد مرحوم کا ہر طرح جانشین تھا، اسی امید میں اس کی تربیت کی گئی تھی اور بادشاہ کی لایق اور اکلوتی بیٹی حیات بخشی بیگم اسکو دی گئی تھی۔ نیز مرحوم بادشاہ نے اپنے عمائدِ سلطنت سے تاکیدی وصیت کی تھی کہ اسکی جگہ سلطان محمد کو تخت نشیں کریں، کیونکہ اس کو اور دعویدارانِ سلطنت کا ڈر تھا۔ چنانچہ تاریخ کہتی ہے کہ:-

"کہ ہم در زمانِ صحت و ہم در وقت اشتداد مرض مکرر فرمودند و تہ ہر کسے عہد و بیعت گرفتند"[۲]

---

[۱] و [۲]- تاریخ قطب شاہی ص ۲۶۵ و ۲۸۷۔

محمد قلی قطب شاہ نے حالتِ مرض میں میر مومن استر آبادی کو بار بار وصیت کی تھی کہ سلطان محمد کی تخت نشینی کا انتظام کریں، بلکہ خود اپنی زندگی میں بیعت لے لی تھی۔ حضرت میر مومنؒ نے سلطان محمد کی تخت نشینی کا انتظام کیا تھا تخت نشینی کی صحیح تاریخ ۱۷ ذیقعدہ سنہ ۱۰۲۰ھ ۱۶۱۲ء ہے۔ چونکہ سلطان محمد قطب شاہ اپنے علم و فضل اور پاکیزہ زندگی کی وجہ سے ملک میں بہت مقبول تھا، اور لوگ اس کو محمد قلی قطب شاہ کا صحیح جانشین سمجھتے تھے۔ اس کی تخت نشینی کے موقعے پر جو مسرت کا اظہار کیا گیا وہ بے موقع نہ تھا۔ خود میر مومن صاحبؒ نے جو اپنے عہد کے علامہ تھے ارسمِ تخت نشینی کے موقعے پر دو بڑے قصیدہ ہائے تہنیت پڑھے تھے:۔

قصیدہ نمبر (۱)

با محبت باز بستم عہد و پیمانِ نوے   کہنہ جامے می فشانم پیشِ جانانِ نوے

. . . .

سرمہ شد خاکِ تلنگانہ زفرخ پاکے تو   اے فدائے خاکِ پایت ہر زماں جانِ نوے

. . . .

گر صفاہاں نو شد از شاہ جہاں عباس شاہ   حیدر آباد از تو شد شاہا صفاہانِ نوے

. . . .

خواستم تاریخ فرخندہ جلوست عقل گفت   جملہ عالم نو بہارے شد زسلطانِ نوے (۱۰۲۰ھ)

از دعا گوے چو مومن ہم دعا بہتر کہ است

او کہن داعی و لو شاہا جہاں بانِ نوے الخ

قصیدہ نمبر (۲)

خلعتِ شاہی چو در بر کردہ شاہِ دیں پناہ   دہر بر گردوں رساند از خرمی طرف کلاہ

. . . .

خسروِ روئے زمیں شایستہ صاحبقراں   شاہِ با فتح و ظفر سلطان محمد قطب شاہ

. . . .

روزگارِ خلقتش را خالقِ عالم ضماں   آفتابِ دولتش را خلقِ عالم در پناہ الخ

گولکنڈے کی تمام تاریخ میں سلطان محمد قطب شاہ کا اکیلا عہد ایسا ہے جو پورے سکون اور خاموشی سے گزرا۔ نہ گھر میں کوئی سیاسی بے چینی محسوس ہوئی نہ حدودِ سلطنت پر کوئی جنگ ہوئی۔ سچ تو یہ ہے کہ ایسا خوشگوار زمانہ اس کے پہلے گزرا تھا نہ اسکے بعد، کیوں کہ اس عہد کے سوا ہر زمانے میں سلطنت کچھ نہ کچھ جنگ وجدل کے لپیٹ میں آئی۔ صرف سلطان محمد کا عہد ایسا ہے جس میں تمام حدودِ سلطنت ہر قسم کے سیاسی خلفشار سے محفوظ تھے۔ ملک کا ہر شخص آرام کی نیند سوتا تھا اس کی وجہ یہ تھی کہ سلطان محمد نے چچا نے اپنی انتھک کوششوں سے سلطنت کی فضا خوشگوار اور حدودِ سلطنت ایسے محفوظ کر دیئے تھے کہ ملک میں ہر جگہ اطمینان تھا۔ تمام ہمسایہ طاقتیں ایسی مغلوب ہو چکی تھیں کہ اب ان کو سر اٹھانے کا کوئی موقع نہیں تھا چنانچہ سلطان محمد کو ان طاقتوں کے خلاف کبھی جنگ وجدل کرنے کی کوئی ضرورت داعی نہیں ہوئی اس میں کوئی شک نہیں کہ شمالی دکن میں مغلوں کے ساتھ خونخوار معرکے ہو رہے تھے جن میں ملک عنبر سینہ سپر تھا۔ گولکنڈے کی سلطنت بھی بالواسطہ ان لڑائیوں میں شریک تھی۔ لیکن یہ جنگ وجدل حدودِ سلطنت سے اس قدر دور تھے کہ ان سے سلطنت کے امن و اطمینان میں کوئی خلل نہیں پڑا، بلکہ مرکزی حکومت کے سوا غالباً اہلِ ملک کو ان لڑائیوں کی مطلق خبر نہ ہوئی۔

دوسری طرف سے دیکھا جائے تو سلطان محمد کے پاکیزہ اخلاق اور مذہب پرستی کی بدولت ملک میں بڑی رونق اور سنجیدگی پائی جاتی تھی۔ سلطان محمد ایک پیکرِ اخلاق اور اور مذہب کا شیدائی تھا۔ ان بلند اوصاف کی بدولت اہلِ ملک اس کو دل سے چاہتے تھے۔ یہ واقعہ ہے کہ اس نے دائرۂ اخلاق سے سرمو تجاوز نہیں کیا۔ بچپن سے وہ صوم وصلوٰۃ کا سختی سے پابند تھا، اور ہر روز صبح کو نماز کے بعد قرآن شریف کی تلاوت کرتا تھا۔ اس کے تقوے کی صحیح آزمائش اس وقت ہوئی جب کہ مکہ مسجد کا سنگِ بنیاد رکھا گیا۔ جس وقت مکہ مسجد کی تعمیر کا ارادہ ہوا تو اس کے سنگِ بنیاد کے متعلق بڑا اہتمام کیا گیا۔ ملک کے تمام علماء و فضلاء جمع کئے گئے اور ان سے کہا گیا کہ اس مسجد کی تاسیس کے لئے

زاہد کی ضرورت ہے جس کی بارہ سال کی عمر سے نمازِ تہجد قضا نہ ہوئی ہو۔ اس مطالبے پر تمام علماء اور فضلاء ساکت ہو گئے کیوں کہ اس مجمع میں کوئی شخص ایسا پابند صلوٰۃ نہ تھا جب کوئی تیار نہ ہوا تو خود بادشاہ ان الفاظ کے ساتھ آگے بڑھے کہ: "بارہ سال کی عمر سے میری نمازِ تہجد کبھی قضا نہیں ہوئی ہے" اور تاسیس کی مقدس رسم انجام دی۔ مذہبی عقاید میں اپنے دادا ابراہیم قطب شاہ کا پیرو اور وسیع مشرب رکھتا تھا۔

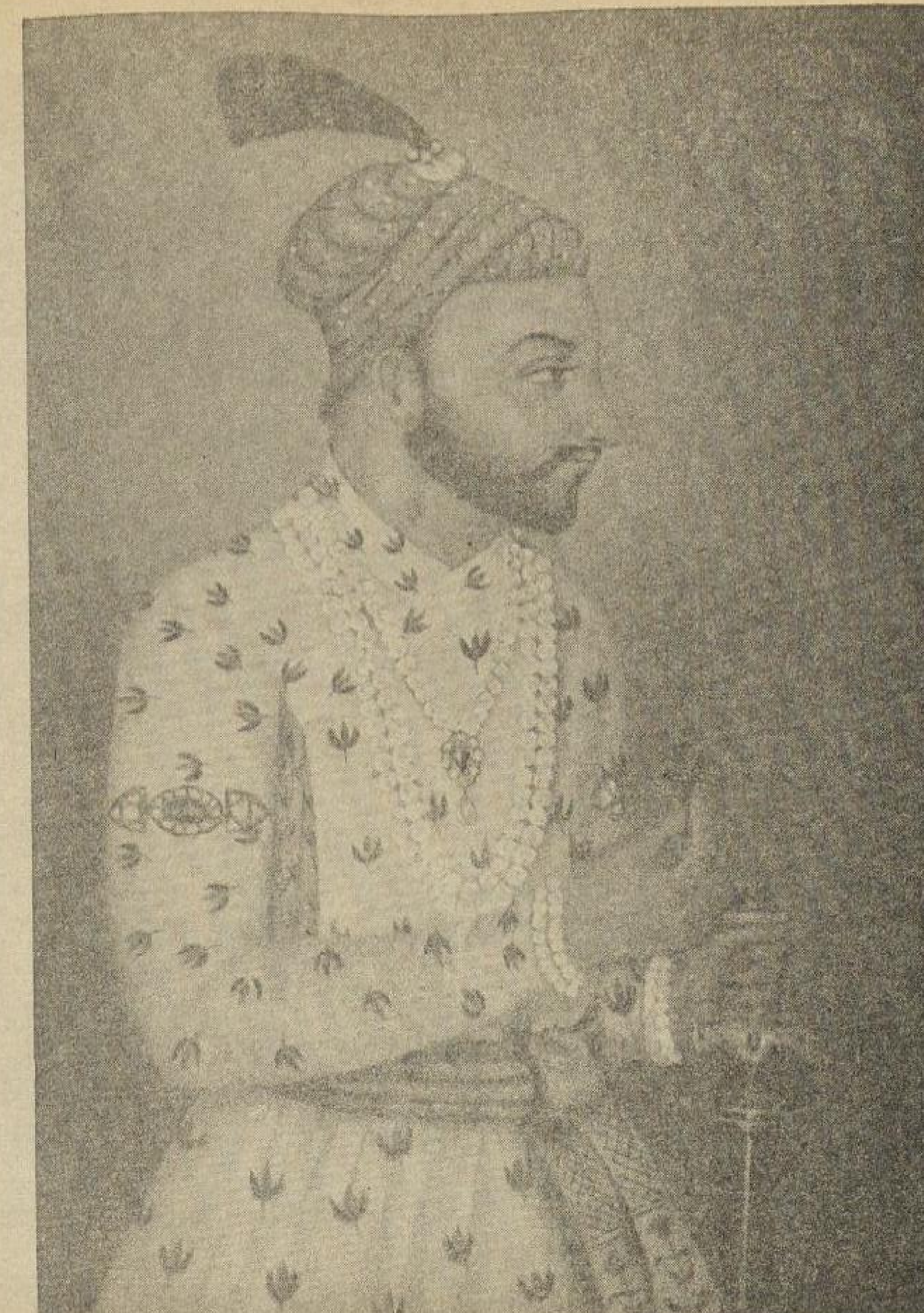
اگرچہ سلطان محمد کے کردار اس سلطنت کو زندہ رکھنے کے لئے کافی تھے، لیکن اس نے اپنے مختصر عہد میں جو چودہ سال سے زیادہ نہیں ہے اپنی سلطنت کی علمی اور عمرانی خدمت بھی کی۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اس پُر سکون عہد میں جب کہ سلطنت جنگ و جدل سے بے نیاز ہو، علمی اور تمدنی کام ہونا ضروری ہے سلطان محمد نے اپنے چچا کے نقشِ خدمت پر سلطنت کی اس طرح عمرانی خدمت کی جس طرح ہونی چاہئے، اور اپنے چچا کے پاکیزہ منصوبے کو پورا کر دیا۔ دفاعی انتظام اور تعمیری شوق کے مدِ نظر سلطان محمد نے حیدر آباد کے مشرق میں ایک اور شہر "سلطان نگر" کے نام سے آباد کرنے کی کوشش کی تھی شہر کا نقشہ تیار ہو چکا تھا اس کی فصیل اور قلعے کی افتاد ڈال دی گئی تھی اور اس کے مغرب میں عید گاہ بنا دی گئی جو عید گاہ قدیم کے نام سے موسوم ہے۔ لیکن سلطان محمد کی بے وقت موت کی وجہ سے شہر سلطان نگر ادھورا رہ گیا۔ مگر ان قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر سلطان نگر سلطان محمد کی آرزو کے مطابق آباد ہو جاتا تو وہ بھاگ نگر کا جواب ہو جاتا، اور یہ نہ صرف حیدر آباد کی بڑھتی ہوئی آبادی کی ضرورتیں پوری کرتا بلکہ اس سے سلطنتِ گولکنڈہ کا دفاعی انتظام بھی ہو سکتا تھا، کیوں کہ اس کی سطح حیدر آباد سے بہت بلند ہے اور دفاعی انتظام کے لئے بہت موزوں ہے۔ چنانچہ اسی کے مدِ نظر سلطان محمد نے سلطان نگر میں پہلے قلعے کی بنیاد رکھی تا کہ بھاگ نگر اور سلطان نگر کی تمام آبادی قلعۂ گولکنڈہ اور جدید قلعے کے درمیان آجائے اور دار السلطنت کی خاطر خواہ حفاظت ہو سکے ورنہ خود حیدر آباد ایسا کھُلا شہر تھا کہ اس میں حملہ آور آسانی سے داخل ہو سکتے تھے۔ چنانچہ عبد اللہ قطب شاہ اور ابو الحسن قطب شاہ کے عہد میں مغل فوجیں آسانی سے شہر میں داخل ہو گئیں اور اس کو بہت نقصان پہنچایا۔

عمارتوں میں مکہ مسجد کی تاسیس سلطان محمد کا بڑا کارنامہ ہے۔ اگرچہ یہ مسجد کئی پشتوں کے بعد جا کر تیار ہوئی، لیکن اس کا نقشہ اور سنگِ بنیاد سلطان محمد کی یادگار ہے۔ اس نے کئی محل بھی بنائے تھے۔ اس کا "امان محل" بہت مشہور ہے جو اپنی آرائش و زیبائش کے اعتبار سے بڑا اچھا محل تھا، یہ چار منزل بنایا گیا تھا، غالباً یہ بھی "داد محل" کی طرح عدل گستری کے لئے مخصوص تھا۔ محمد قلی قطب شاہ کے بنائے ہوئے الٰہی محل۔ محمدی محل اور حیدر محل کی اس نے مرمت کی تھی اور اس میں اضافے کئے تھے۔ امان محل کے ساتھ ایک پُرفضا باغ لگایا گیا جو "نبی باغ" کے نام سے موسوم تھا۔ سلطان محمد کے علمی شغف اور سرپرستی کا کیا کہنا، اس میدان میں وہ یکتائے خاندان تھا۔ اس نے خود اپنے علم و فن کا بڑا سرمایہ چھوڑا ہے۔ بادشاہ کی اس حوصلہ افزائی کی وجہ سے اس کے زمانے کے علماء و شعراء نے بھی علم و فن میں بہت اضافے کئے تھے۔

یہ گولکنڈے کی بڑی بدقسمتی تھی کہ سلطان محمد بے وقت موت کا شکار ہو گیا۔ ۱۳ر جمادی الاول ۱۰۳۵ھ/۱۶۲۶ء کو اس کا انتقال ہوا، اس وقت اس کی عمر چونتیس سال سے زیادہ نہ تھی اور پندرہ سال سے زیادہ یہ حکومت نہیں کر سکا۔ موت کے اسباب یہ بیان کئے جاتے ہیں کہ یہ ایک ایسے سخت بخار میں مبتلا ہوا کہ اس کا علاج بہت دشوار تھا۔ دو قسم کے طبیب معالجے کے لئے مامور تھے، یونانی حکماء اس بخار کا علاج سرد دواؤں سے کرنا چاہتے تھے اور ہندوستانی طبیب گرم دواؤں سے۔ بادشاہ کی خانم آغا سے رائے لی گئی تو اس نے ہندوستانی اطباء کی رائے سے اتفاق کیا، چنانچہ گرم دوائیں دی گئیں اور ان سے بخار کی حدت اور بڑھ گئی اور وہ اس علالت سے جانبر نہ ہو سکا۔ لنگر فیض اثر کے مدفن میں جہاں اس کا مقبرہ پہلے سے تیار تھا، دفن کیا گیا۔

حصۂ چہارم

سلطنت کا زوال



سلطان محمد قطب شاہ



سلطان عبداللہ قطب شاہ



سلطان ابوالحسن تانا شاہ



حضرت شاہ راجو

چودھواں باب

حکومت کی کمزوری

سلطان محمد کے انتقال کے بعد قطب شاہی تخت پر اس کا بیٹا عبداللہ قطب شاہ تخت نشیں کیا گیا۔ یہ مرحوم کا بڑا بیٹا تھا[1]۔ سلطان محمد قطب شاہ کی پانچ اولادیں تھیں۔ بڑا بیٹا عبداللہ قطب شاہ جس کا نام عبداللہ مرزا تھا جو اپنے باپ کا جانشین ہوا۔ دوسری اولاد بیٹی تھی جس کا نام خدیجہ سلطانہ تھا جو عبداللہ قطب شاہ کے عہد میں محمد عادل شاہ والیِ بیجاپور سے بیاہی گئی۔ تیسرا بیٹا ابراہیم مرزا تھا جو عبداللہ کی تخت نشینی کے دوسرے سال مرگیا۔ یہ ابراہیم عادل شاہ اول کی بیٹی کے بطن سے پیدا ہوا تھا۔ خورشید بی بی نامی ایک اور بیوی کے بطن سے دو بیٹے ہوئے تھے جن کے نام قلی مرزا اور کمال مرزا بتائے جاتے ہیں[2]۔ ۲۸ر شوال ۱۰۲۳ھ/۱۶۱۴ء کو عبداللہ کی پیدائش ہوئی تھی جس کی مسرت میں

---

[1] فرانسیسی سیاح تھیونو کہتا ہے کہ عبداللہ قطب شاہ کی ماں ایک برہمن عورت تھی۔ یہ بڑا بیٹا نہیں تھا، بلکہ عبداللہ کا ایک علّاتی بھائی اور تھا جو اس سے بڑا تھا۔ عبداللہ کی ماں نے اس کو قید کر کے اپنے بیٹے کو تخت نشین کر دیا، اور مغلوں کے حملے کے زمانے میں جو ۱۰۶۶ھ/۱۶۵۶ء میں ہوا اس کو زہر دے کر مارا گیا (سیاحت نامہ تھیونو) لیکن گولکنڈے کی تاریخوں سے اس کی تصدیق نہیں ہوتی تھیونو ۱۰۶۵ھ/۱۶۵۵ء میں گولکنڈہ آیا تھا۔

[2] حدیقۃ السلاطین مطبوعہ ادارۂ ادبیاتِ اردو ص ۲۵۔

متعدد تاریخیں اور قصیدے لکھے گئے۔ حضرت میر مومنؒ استر آبادی نے "کام بخش جاہنا" سے اس کی تاریخ اخذ کی تھی، اور ان کے فرزند میر محمد الدین نے دو اور تاریخیں نکالی تھیں "قرۃ العین الانسان" "اوّل فتح و ظفر آخر رنج و الم است" اور نظام الدین نے یہ تاریخ کہی تھی:۔ "بہرِ تاریخ عقل دُور اندیش؛ گفت سلطان صورتِ معنے" اور ذیل کا قطعۂ تہنیت لکھا تھا:۔

۱۰۲۳ھ ۱۰۲۳ھ ۱۰۲۳ھ

قطعہ

از آسمانِ قطبشہاں نیّرِ طلوع — کردہ کہ سعد گشتہ از و مہر و مشتری

مہرے طلوع کرد زِ بُرجِ شہنشہی — کز نورِ آں چو آئینہ شد سطحِ عنبری

دُرّے زِ دُرجِ غیبِ عیاں شد کہ پرتوش — شد بر فرازِ قبّۂ ایں سقفِ اخضری

ایں گوہرِ یگانہ چو از بطنِ نہ صدف — آمد بروں بہ شعشعۂ مہرِ خاوری

در داد ایں ندا پئے تاریخ عقلِ کُل — با حُسنِ یوسف آمد و شانِ سکندری[1]

عبد اللہ قطب شاہ کی پرورش عجیب طریقے سے ہوئی تھی، یعنے محل میں ماں باپ کے پاس اس کی پرورش نہیں ہوئی بلکہ قطب الدین نعمت اللہ۔ مرزا شریف شہرستانی اور خواجہ منظفر علی جیسے بزرگوں نے اپنے گھر میں شہزادے کی پرورش کی اور بارہ سال کی عمر تک بہ محل میں نہیں بلایا گیا،[1] لیکن یہ عجیب اتفاق ہے کہ اس کے محل میں آنے کے چند روز بعد ہی

---

[1] حدیقۃ السلاطین صفحہ ۸ و ۹۔ ایک عجیب روایت یہ مشہور ہے کہ عبداللہ مرزا کی پیدائش کے وقت نجومیوں نے پیشن گوئی کی تھی کہ یہ بچہ باپ کے لئے بدشگون ہے، بارہ سال سے پہلے بادشاہ کو اسکی صورت دیکھنی نہیں چاہئے ورنہ بادشاہ مرجائیں گے اس لئے اس کی پرورش محل کے باہر کی گئی تھی۔ پہلے شہزادہ میر قطب الدین نعمت اللہ کے سپرد کیا گیا جن کو قطب شاہی خاندان سے دُور کی قرابت ہوتی تھی، لیکن دو سال کے بعد قطب الدین کا انتقال ہو گیا تو ان کی جگہ ان کے داماد مرزا شہرستانی مقرر ہوئے۔ جب بچے کی عمر آٹھ سال ہوئی تو شہرستانی کا بھی انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد حضرت میر مومنؒ کی رائے سے خواجہ منظفر علی بچے کی پرورش کے لئے مقرر ہوئے۔ دو سال کے بعد یہ بھی مرگئے تو اس کی جگہ مولانا حسین شیرازی مقرر ہوئے (باقی صفحہ ۱۷۱ پر)

سلطان محمد کا انتقال ہو گیا، چونکہ اس وقت عبد اللہ کی عمر صرف بارہ سال کی تھی اور اس کی کم سنی کی وجہ سے مُلک میں بدامنی کا اندیشہ تھا اس لئے اس کی ماں حیات بخشی بیگم اور اس کی دادی خانم آغا نے عنانِ حکومت اپنے ہاتھ میں لی۔ منصور خاں حبشی وزیر، ملک الماس اور ملک یوسف کے ساتھ اس کام کے لئے مقرر ہوا تھا کہ تمام شہر کی نگرانی کرے اور شورش نہ ہونے دے۔ قاسم بیگ کو توال چاوڑی میں اور اس کا نائب حسن بیگ چار مینار میں متعین تھے تاکہ چاروں طرف اپنی نظر رکھیں اور شورش و فساد نہ ہونے دیں[1] خصوصاً باہر کے لوگ تُرک و ایرانی خواہ سرکاری ملازم ہوں یا تجارت پیشہ وہ لُوٹ مار کے خوف سے بہت پریشان تھے۔ ۱۴ر جمادی الاول ۱۰۳۵ھ ۱۶۲۶ء میں عبد اللہ قطب شاہ کو محمدی محل میں تخت نشیں کیا گیا۔ پُرانے دستور کے مطابق مُلک کے تمام چھوٹے بڑے عہدہ داروں کو خلعتیں دی گئیں۔ سادات، علماء اور طلباء کو وظائف و انعامات دیئے گئے ہاتھیوں اور رتھ گاڑیوں میں شکر بھر کر تمام راستوں اور بازاروں میں تقسیم کی گئی اور تمام مُلک میں اس تخت نشینی کا اعلان کیا گیا اور نئے بادشاہ کے نام کا سکہ ڈھالا گیا۔ مولانا رونقی نے ع "مزین شد جہاں از جلوس شاہ عبد اللہ" اور فقیر سراج نے جو دربار کا شاعر تھا ع "شد شاہ دکن قطبِ زماں عبد اللہ" سے تاریخ تخت نشینی اخذ کی تھی[2]

حیات بخشی بیگم عبد اللہ کی کم سنی کے زمانے میں اکابرِ مُلک کی ایک مجلس تولیت امورِ سلطنت انجام دیتی تھی، لیکن اس مجلس کی روحِ رواں دراصل عبد اللہ کی ماں حیات بخشی بیگم تھی۔ اگرچہ بعض اوقات عبد اللہ کی دادی خانم آغا بھی

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۷۰) یہ اپنے زمانے کے بڑے عالم تھے، عبد اللہ کی انھیں کے ہاتھوں تعلیم ہوئی تھی۔ جب عبد اللہ کی عمر بارہ سال کی ہوئی تو حسب قرارداد بادشاہ نے بچے کو محل میں بلا لیا اور دیکھا، لیکن اسکے بعد بادشاہ کا بھی بہت جلد انتقال ہو گیا (حدیقۃ السلاطین ص ۹ و ۱۳۔ تاریخ قطب شاہی ص ۱۱)۔

[1] حدیقۃ السلاطین ص ۲۳۔

[2] ؍؍ ؍؍ ؍؍ ۳۱۔

مشورے میں شریک ہوتی تھی مگر تمام امورِ سلطنت حیات بخشی بیگم کی رائے سے انجام پاتے تھے۔ یہ خاتون غالباً سنہ ۱۰۰۰ھ میں پیدا ہوئی تھی اور اس وقت پیدا ہوئی تھی جبکہ گولکنڈے کی سلطنت اپنے پورے عروج پر پہنچ رہی تھی اور حیدر آباد کا شہر آباد ہو رہا تھا، یہ نقوش اس کے دل و دماغ پر ضرور ثبت ہوں گے۔ نیز اس کی تعلیم و تربیت اچھے پیمانے پر ہوئی تھی جس کی بدولت وہ بڑی مدبر ہو گئی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس نے اپنے شوہر کے عہد میں بھی حکومت میں حصہ لیا تھا اور خافی خاں کے اس فقرے سے کہ "والدۂ عبداللہ قطب شاہ کہ در کل امورِ ملکی و مالی دخیلِ مستقل گردیدہ بود"[۱] اس حقیقتِ حال سے روشنی پڑتی ہے، کیوں کہ جب ۱۰۲۵ھ/۱۶۱۶ء میں میر مومن کا انتقال ہو گیا تو سلطان محمد نے کسی دوسرے شخص کو پیشوا نہیں بنایا بلکہ خود پیشوائی کی۔ محمد رضا کو صرف دبیر بنایا گیا تھا۔ محمد رضا اور مظفر علی بادشاہ کو مشورہ دیتے تھے! اس طرح کہا جا سکتا ہے کہ حیات بخشی بیگم ہی مشورہ دیتی ہوگی اور سلطان محمد کا پُر امن اور اقبال مند عہد اس بات کو ثابت کرتا ہے کہ اس میں دو قابلیتوں کا ضرور اتصال ہوگا۔ اپنے شوہر کے مرنے کے بعد تو اس خاتون نے ملک کی تنہا رہنمائی کی۔ کم سن بیٹے کا انتظام کیا، ملک کو شورش سے بچایا اور لائق عہدہ دار مقرر کئے چنانچہ تاریخ کے الفاظ سے اس واقعے کی تصدیق ہوتی ہے:۔ "حیات بخشی بیگم کہ عورت غضبناک تیز ہوش و رسا بود احدے را در مقدمات سلطنت دخل نداد۔ خود بہ نفسِ نفیس بہ انتظام مقدماتِ مملکت می پرداخت"[۲]

نظم و نسق کے لئے جو لائق عہدہ دار مقرر کئے گئے تو ان میں شاہ محمد عرب شاہ بھی تھا جو عبداللہ قطب شاہ کا پھوپا ہوتا تھا، یہ پیشوا بنایا گیا۔ شاہ محمد میں اس جلیل القدر عہدے کی قابلیت بہت کم تھی، چونکہ یہ خاتم آغا کا داماد تھا اور اسی کے زور دینے سے پیشوا بنایا گیا تھا، اس لئے چند روز کے بعد جب علامی شیخ محمد جو ابنِ خاتون کے نام سے مشہور تھا ایران کی سفارت سے واپس آیا تو اس کو نائب پیشوا بنایا گیا تاکہ اس کی

۱؎ منتخب اللغات جلد سوم ص ۳۹۲ ۔ ۲؎ ماہ نامہ ص ۳۱۴ ۔

قابلیت سے ملک کی صحیح رہنمائی ہو سکے! اس کے علاوہ شیخ محمد کو دبیر کی خدمت پر تفویض کی گئی جس پر اب تک محمد رضا فائز تھا۔ شیخ محمد جن کے باپ کا نام علی ہے طوس کا رہنے والا اور بڑا ذی علم آدمی تھا! اس نے علماء اور شعراء کی بڑی سرپرستی کی تھی اور اس کا گھر علماء سے بھرا رہتا تھا۔ غالباً اس کی علمیت اور تدبیر سلطنت کا لحاظ کرتے قطب شاہی تاریخ میں حضرت میر مومنؒ کے بعد اسی کا درجہ ہے، مگر اس نے سلطنت کی ایسی وفاداری نہیں کی جیسے میر مومنؒ نے کی تھی۔ یہ اہلِ ملک کے مقابلے میں غیر ملکیوں کی سرپرستی کرتا تھا۔ شاہ محمد عرب شاہ کو خدمت سے علٰحدہ کرنے میں اس کا بڑا حصہ ہے۔ غالباً یہ سلطان محمد قطب شاہ کے عہد میں گولکنڈہ آیا اور قطب شاہی خدمت میں داخل ہوا۔ بادشاہ نے اس کو ۱۰۲۴ھ/۱۶۱۵ء میں شاہ عباس صفوی کے پاس سفیر بنا کر بھیجا تھا اور یہ خواہش ظاہر کی تھی کہ سفارت سے واپس آنے کے بعد اس کو پیشوا بنایا جائے گا۔ لیکن شیخ محمد، سلطان محمد قطب شاہ کے بعد گولکنڈہ آیا اور عبداللہ قطب شاہ نے مرحوم بادشاہ کی وصیت کے مطابق اس کی عزت کی اور جلیل القدر عہدے پر پہنچایا۔[1] دوسرے عہدہ داروں میں منصور خاں حبشی ہے جو میر جملہ بنایا گیا۔ یہ ایک زمانے میں حوالدار اور بعد کو عین الملک کی خدمت پر فائز تھا۔ قاسم بیگ کوتوال اور حسن بیگ نائبِ کوتوال کی خدمت پر مامور تھے۔ میر قاسم ناظر الممالک تھا۔ خواجہ احمد ترک سرخیل کی خدمت انجام دیتا تھا۔ اعتماد راؤ ہندی فرامین کے لئے مقرر تھا۔ نارائن راؤ مجموعہ دار تھا اور سرور راؤ شروع نویسی کا کام کرتا تھا! اس کے علاوہ محل کے دوسرے عہدہ داروں کا بھی ردوبدل ہوا۔

لیکن یہ انتظام ہمیشہ قائم نہیں رہا۔ نئے عہدہ دار خودغرض اور نااہل ثابت ہوئے اور آپس میں لڑنے لگے۔ پہلے تو منصور خاں حبشی کی وجہ سے جو میر جملہ کی خدمت پر مامور کیا گیا تھا، کام خراب ہوا، کیونکہ یہ ان پڑھ آدمی تھا، حساب کتاب کا تمام کام برہمنوں سے

---

[1] حدیقۃ السلاطین ص ۸ و ۹۔

لیتا تھا، اس کی کمزوری سے فائدہ اُٹھا کر تمام برہمن حملۃ الملکی کے محکمے پر قابض ہو گئے۔
یہ بہت جلد بادشاہ کا مقرب ہو گیا، اور اس اعزاز سے فائدہ اُٹھا کر تمام اکابرِ ملک کے ساتھ بیجا سلوک کرنے لگا، اور بادشاہ کی طبیعت پر اس قدر حاوی تھا کہ اس کے خلاف کوئی شنوائی نہیں ہوتی تھی، اکثر عہدہ دار اس کے مخالف ہو گئے خود شاہ محمد پیشوا سے اس کی ان بن ہو گئی، اس کو نیچا دکھانے کے لئے منصور خاں نے میر محمد اسفرائینی[1] کو ہندوستان سے بلانے کی کوشش کی تا کہ وہ شاہ محمد کی جگہ پیشوا ہو جائے۔ میر محمد اسفرائینی سلطان محمد کے عہد میں گولکنڈے کا ملازم تھا، لیکن بعض اسباب کی بنا پر گولکنڈے کی نوکری چھوڑ دی اور مغل سلطنت کا ملازم ہو گیا تھا[2]۔
دوسری طرف قاسم بیگ کوتوال سے مخالفت ہوئی تو اس کو معزول کرنے کی کوشش کی اور اس کی جگہ پر مچھلی بندر کے حوالدار ملا محمد تقی کو گولکنڈہ بلایا جو اس کا دوست تھا۔ قاسم بیگ کو علیحدہ کرنے کی یہ صورت نکالی کہ اس کے ساتھ بعض حبشیوں کی جھڑپ کرا دی۔ حبشیوں کی کھلی گستاخی تو تھی لیکن ان کو کوئی سزا نہیں دے سکتا تھا۔ قاسم بیگ یہ گستاخی برداشت نہیں کر سکا، بالآخر اپنی خدمت سے مستعفی ہو گیا۔ لیکن جب منصور خاں کے منصوبے کے خلاف بادشاہ نے قاسم بیگ کے نائب حسن بیگ کو مستقل کوتوال کر دیا تو اس نے اپنے دوست کی اس طرح تلافی کی کہ اس کو اپنا نائب بنا دیا اور میر جملہ کے تمام فرائض اس کے سپرد کر دیئے۔ مگر ۱۰۳۸ھ/۱۶۲۸ء میں خود منصور خاں کا انتقال ہو گیا تو بادشاہ نے اس کی جگہ محمد تقی کو میر جملہ بنا دیا جو بہت اہل ثابت ہوا۔ اس نے چند ہی روز میں سرکاری آمد و خرچ کی تنقیح کی، جن لوگوں نے سرکاری رقم غبن کی تھی اس کا محاسبہ کیا، چنانچہ اس جرم میں بہت سے چودھری قتل کئے گئے، خود نارائن راؤ مجموعہ دار سے ایک لاکھ تیس ہزار ہون وصول کئے گئے۔ اس صلے میں محمد تقی کو

---

[1] حدیقۃ السلاطین مطبوعۂ ادارۂ ادبیاتِ اُردو ص ۳۴۔

[2] 〃 〃 〃 〃 〃 〃

شریف الملک کا خطاب ملا تھا[1] چند روز کے بعد پیشوائی کی خدمت بھی معرض بحث میں آگئی۔ شاہ محمد نہ صرف نظم ونسق سلطنت میں نا اہل ثابت ہوگیا بلکہ اپنی سلطنت کے خلاف اس کی غداری بھی بتائی گئی کہ وہ والی بیجاپور سے ساز باز کررہا ہے۔ اس کے بہت سے خطوط جو محمد عادل شاہ کے نام لکھے تھے پکڑے گئے[2] اور خارجی معاملات میں جو اس زمانے میں مغل سلطنت کے ساتھ بہت پیچیدہ ہوگئے یہ ناقص ثابت ہوا، چنانچہ جب شاہجہاں کی طرف سے مغل سفیر شیخ محی الدین آیا تو اسکے ساتھ خاطر خواہ گفتگو نہ ہوسکی، بلکہ ایک الجھن پیدا ہوگئی۔ ان حالات کے مدنظر عبداللہ قطب شاہ نے شاہ محمد کو پیشوائی سے معزول کر کے شیخ محمد کو مستقل پیشوا بنادیا اور اس کو اس قدر عزت دی کہ وہ پالکی میں بیٹھ کر محل میں آتا تھا اور اس کو دربار میں بیٹھنے کی اجازت تھی۔ اس تقرر سے شیخ محمد کے حاشئے کے لوگ اور غیر ملکی بہت خوش ہوئے[3] اور ان لوگوں کو جو اکثر

---

[1] حدیقۃ السلاطین ص ۷۷۔ [2] تاریخ سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ ان خطوط میں کیا لکھا گیا تھا اور ان میں کیا غداری تھی۔ قیاس یہ ہے کہ یہ تمام خطوط شیخ محمد کے بنائے ہوئے جعلی تھے، کیوں کہ شیخ خود پیشوائی چاہتا تھا اور شاہ محمد کا نائب ہونے کی وجہ سے دونوں میں پہلے سے ان بن بھی تھی۔ یہ خطوط شاہ محمد کے نوشتہ نہ تھے بلکہ شاہ قاضی کے ہاتھ کے لکھے ہوئے تھے اور بادشاہ کے سامنے پیش کئے گئے، اور نظام الدین اس کی توجیہ یہ کرتا ہے کہ شاہ محمد کا خط اچھا نہیں تھا، اس لئے یہ خط شاہ قاضی سے لکھائے گئے تھے۔ لیکن یہ یاد رہے کہ نظام الدین شیخ محمد کا متوسل اور ہمدرد تھا۔ وہ شاہ محمد کے مقابلے میں شیخ محمد کی تائید کرتا ہے۔ کوئی خط شاہ محمد کے ہاتھ لکھا نہ تھا، اس میں شیخ محمد ابن خاتون اور تمام غیر ملکی طبقے کی کھلی سازش تھی کہ اس کے ذریعہ سے بادشاہ کو شاہ محمد سے بدظن کریں اور معزول کریں (حدیقۃ السلاطین ص ۸۱) [3] مولانا عرب خوشنویس شیرازی نے "محمد ابن علی پیشوائے سلطان شد" کے مصرع سے اس تقرر کی تاریخ اخذ کی تھی اور حدیقۃ السلاطین کے مولف نظام الدین نے حسب ذیل قطعے لکھے تھے۔ نظام الدین، شیخ محمد کا بہت مداح ہے اور اپنے کو "این صف نعال نشین آن مجلس بہشت آئین" کہتا ہے۔ غالباً اس کی ترقی (باقی صفحہ ۱۷۶ پر)

باہر سے آئے تھے شیخ محمد نے بڑی ترقی دی، چنانچہ پیشوائی کے انتظام کے بعد دبیر کی خدمت شیخ محمد سے واپس لے لی گئی تو اس کے مشورے سے مولانا ادیس اس عہدے پر فائز کیا گیا۔ یہ شیخ محمد کا آوردہ تھا اس کے علاوہ مرزا قاسم۔ حکیم نظام الدین احمد۔ حکیم جبرئیل اور اخلاص خاں وغیرہ کئی لوگ شیخ محمد کے توسط سے گولکنڈہ آئے اور مختلف خدمات پر فائز ہوئے۔

خود غرض وزراء کی بے اعتمادی کے علاوہ بادشاہِ وقت بھی اپنے مشیروں کے خلاف بہت تن آسان اور سہل انگار ثابت ہوا۔ اگرچہ تخت نشینی کے بعد پانچ چھ سال تو اس کی کم سنی کے گزرے جب کہ سلطنت میں ایک مجلس تولیت کام کرتی تھی لیکن اسکے بعد جب وہ سنِ شعور کو پہنچا اور عنانِ حکومت خود اپنے ہاتھ میں لی تو اس سے وہ قابلیت ظاہر نہیں ہوئی جو اس کے پیشرو سلاطین میں تھی۔ عبداللہ سنِ شعور کو پہنچنے تک اپنی ماں حیات بخشی بیگم کی سخت نگرانی میں رہا تھا۔ تاریخ کے الفاظ میں: "فرزند را دمے از حضوری جدا نمی گرد"[1]۔ اس کے بعد بھی جب تک حیات بخشی بیگم زندہ رہی اس کا ضرور اثر پڑتا رہا، لیکن یہ محل کا درپردہ اثر تھا، اس کے خاطر خواہ نتائج برآمد نہیں ہوئے۔ نیز عبداللہ میں فطرتاً سیاسی تدبر اور بیدار مغزی کے وہ جوہر نہ تھے جو

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۷۵) شیخ محمد کے توسط سے ہوئی تھی:-

قطعہ (۱)
شہے یوسف رُخِ جمشید حشمت — کہ حاتم می کند از وے گدائی
زِ فرطِ مرحمت کردہ تمکن — محمد را بہ صدرِ پیشوائی
بہ ساماں شد مہامِ مُلک و ملت — کہ بود ابتر زِ آفاتِ سمائی
متاعِ فضل و دانش بود کاسد — کنون نگرفت در عہدش روائی
جہان معمور گردیدہ بدان سان — کہ شد محو از خلائق بے نوائی
بہ الہام آمد این مصراعِ تاریخ — محمد یافت از حق پیشوائی

قطعہ (۲)
چو نور وزاست این عہدِ ترقی — کہ گیتی شد بہ عیش و عشق دمساز
محمد پیشوائے شاہ چون شد — جہان را خرمی گردیدہ آغاز

(۱) حدیقۃ السلاطین ص ۹۱ (۲) حدیقۃ السلاطین ص ۹۰

[1] ماہ نامہ ص ۳۱۳۔

ایک سلطنت کے تاجدار سیاست میں ہونے چاہئیں اس نے کبھی سیاسی اُمور پر سنجیدگی سے غور نہیں کیا بلکہ پیچیدہ صورتِ حال سے ہمیشہ دامن چھڑانے کی کوشش کی۔ جنگ کے نام سے وہ دُور بھاگتا تھا، اس کا نتیجہ یہ تھا کہ ملک کی حقیقی رہنمائی تمام وزراء کے ہاتھ میں تھی جو اکثر قابلِ اعتماد نہ تھے اور خود غرضی سے فیصلے کرتے تھے۔ ہمیشہ جنگ سے گریز کیا گیا، اڑے وقت میں احمد نگر کی کوئی مدد نہیں کی گئی حالانکہ نظام شاہی سلطنت کی امداد گولکنڈے کا پُرانا مسلک تھا۔ ان کمزوریوں سے مغل سلطنت کو گولکنڈے میں قدم جمانے کا موقعہ مل گیا۔

عبد اللہ کی تمام عمر عیش و عشرت اور سیر و تفریح میں گزری۔ ہر برسات کے موسم میں یہ تفریح کے لئے دار السلطنت سے باہر جاتا تھا۔ تخت نشینی کے پہلے سال باغ لنگم پلی اور بنات گھاٹ کی سیر ہوئی اور وہاں عیش و عشرت کے تمام سامان مہیا کئے گئے تھے۔ اس میں کئی مہینے صرف ہوئے۔ دوسرے سال سالگرہ کی رسم اس تزک و احتشام سے منائی گئی کہ اس میں ہزاروں روپے صرف ہوئے اور رقص و سرود اور آرائش و زیبائش کا پورا انتظام ہوا۔ تمام عمارات اور باغات میں روشنی کی گئی۔ دو سال کے بعد ۱۰۳۷ھ ۱۶۲۷ء میں کوہ طور کی سیر ہوئی اور اس میں بھی کئی مہینے صرف ہوئے۔ ۱۰۴۰ھ ۱۶۳۰ء میں ایک اور بہت بڑی رسم مُوتراشی وغیرہ کی رچائی گئی جس کا انتظام اور خرچ حیات بخشی بیگم نے برداشت کیا تھا، اس کا انتظام حیدرآباد میں ہوا۔ حیدرآباد سے حیات آباد کو جلوس گیا اور یہاں کئی مہینے دربار، جلوس، رقص اور سرود کی محفلیں منعقد ہوئیں اور اہلِ مُلک کو نہایت فراخ دلی کے ساتھ انعامات دئیے گئے، چنانچہ اس قطعہ سے اس عظیم الشان رسم کی یاد تازہ ہوتی ہے۔

چو نور درآست این عیدِ طرف خیز — شدہ در بزم عشرت جام لبریز
شگفتہ غنچۂ شادی زِ ہر دل — نوائے نغمہ چو لحنِ عندلیب
گلستانِ ارم گردیدہ عالم — گلِ بے خار گشتہ عیشِ بے غم[۱]

۱۔ دیکھو حدیقۃ السلاطین مطبوعہ ادارۂ ادبیاتِ اُردو صفحات ۳۶ و ۳۷ و ۶۷ و ۶۸ و ۱۲۳ و ۱۲۴ و ۱۲۵ و ۱۲۶۔

غرض اسی قسم کے عیش و طرب سے یہ عہد بھرا ہوا ہے۔ اس سے فارغ ہوتے تھے تو مذہبی رسوم میں دلچسپی لی جاتی تھی اور مذہبی رسوم میں بھی بے حد مبالغہ کیا جاتا تھا۔ محرم اور ربیع الاول کے مقدس ایام میں غیر معمولی اہتمام کیا جاتا تھا اور خود بادشاہ ان تمام رسوم میں حصہ لیتے تھے، مجلسیں منعقد ہوتی تھیں اور تمام شہر و عمارات میں روشنی کی جاتی تھی اور غربا، و مستحقین کی امداد کی جاتی تھی۔

پندرھواں باب

احمد نگر کا خاتمہ اور گولکنڈے کی حکم برداری

سلطان محمد قطب شاہ کی وفات جو ۱۰۳۵ھ/۱۶۲۶ء میں واقع ہوئی گولکنڈے کے لئے پیامِ موت تھی یہ عجیب اتفاق ہے کہ سلطان محمد کے ساتھ دکن کے دوسرے رہنمایانِ سیاست یعنے ملک عنبر اور ابراہیم عادل شاہ بھی راہیِ عدم ہو گئے[1] اور ان سب کا ایک ساتھ مرنا دکن کی تاریخ کے لئے ایک عجیب دلخراش سانحہ تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ تینوں ناخدایانِ سیاست آزادیِ دکن کے رکھوال تھے۔ جب تک یہ زندہ رہے انھوں نے مقدور بھر دکن کا اقتدار قائم رکھا۔ ملک عنبر نے دکن کی تینوں طاقتوں کو ملا کر ایک ایسا متحدہ محاذ بنایا تھا کہ اپنی عظیم الشان طاقت کے باوجود مغل سلطنت اس کو نہیں توڑ سکی۔ لیکن جونہی یہ علمبردار دُنیا سے رخصت ہو گئے تو دکن کی آزادی متزلزل ہو گئی۔ احمد نگر کا تو ہمیشہ کے لئے خاتمہ ہو گیا۔ اب رہی گولکنڈے اور بیجاپور کی سلطنتیں تو یہ مغل سلطنت کی سیادت تسلیم کرنے کے لئے مجبور ہو گئیں کیوں کہ شمال میں احمد نگر کی سلطنت ان کے لئے فصیل کا کام دیتی تھی۔ جب احمد نگر کا خاتمہ ہو گیا تو یہ بالکل بے پناہ ہو گئیں اور مغل سلطنت کے

---

[1] سلطان محمد قطب شاہ ۳؍جمادی الاول ۱۰۳۵ھ/۱۶۲۶ء میں اور ملک عنبر ۲۴؍شعبان ۱۰۳۵ھ/۱۶۲۶ء میں راہیِ عدم ہوئے۔ ابراہیم عادل شاہ ثانی تقریباً ڈیڑھ دو سال کے بعد، ۷؍محرم ۱۰۳۷ھ/۱۶۲۷ء کو فوت ہوا۔

سیلاب کو نہیں روک سکیں جواب بغیر مزاحمت کے سیدھے گولکنڈے اور بیجا پور پر اُمنڈ آتا تھا۔ گولکنڈے میں سلطان محمد کا جانشین ایک کم سن بچہ تھا جو سنِ شعور کو پہنچنے کے بعد بھی حکومت کے بارِ گراں کا اہل ثابت نہیں ہوا! اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ گولکنڈے کو بھی دکن کی تمام رفتارِ سیاست کا ساتھ دینا پڑا! اس طریقے سے ۱۰۳۵ھ/۱۶۲۶ء کو تاریخِ دکن کی ایک حدِ فاصل سمجھنا چاہیے جہاں دکن کا پچھلا خوشگوار اور اقبال مند زمانہ ختم ہو جاتا ہے جب کہ یہ سلطنتیں نہ صرف مقتدر تھیں بلکہ اپنے اقتدار کے زور سے اپنے تمدن کو آگے بڑھا رہی تھیں اور اب ایسا زمانہ آیا کہ نہ صرف یہ حلقہ بگوش ہو گئیں بلکہ شمالی طاقت کے ساتھ الجھ کر زوال کے گڑھے میں گرنے لگیں۔

احمد نگر کی سلطنت میں فوری زوال کے اسباب پیدا ہو گئے۔ احمد نگر تو گویا پورے دکن میں ملک عنبر کا کوئی صحیح جانشین نہیں پیدا ہوا، گو اس کا بیٹا فتح خاں تھا جو باپ کی جگہ اس بدنصیب سلطنت کا پیشوا بنا مگر اس میں سیاسی اہلیت تھی نہ وفاداری۔ اس پر طرّہ یہ کہ مرتضےٰ نظام شاہ ثانی سے اس کے تعلقات کبھی خوشگوار نہیں ہو سکے اور کشیدگی یہاں تک پہنچی کہ چند روز کے بعد ہی مرتضےٰ نے اس کو گرفتار کر لیا، گو یہ بہت جلد قید سے فرار ہو گیا اور احمد نگر کے مغل قلعہ دار سپہ دار خاں سے مل کر مرتضےٰ سے لڑنے کے لئے آیا لیکن احمد نگر کی فوجوں نے اس کو زیر کر کے گرفتار کر لیا اور یہ پھر دولت آباد کے قلعے میں مقید کر دیا گیا۔ مقرب خاں سلطنت کے سرلشکر اور اخلاص خاں پیشوا مقرر ہوئے۔ ایک اتفاق یہ ہوا کہ احمد نگر کی خوش قسمتی سے دکن کے مغل گورنر خانِ جہاں خاں نے مرتضےٰ نظام شاہ سے ساز باز کر لی اور اس کی بے وفائی کی وجہ سے جو مغل سلطنت کے خلاف تھی مرتضےٰ کو بالا گھاٹ کے بہت سے مغل مقبوضات حاصل ہو گئے! اسی دوران میں شہنشاہ جہانگیر کا بھی انتقال ہو گیا، اور کچھ وقفے کے بعد ۱۰۳۸ھ/۱۶۲۸ء میں شاہجہاں شہنشاہ ہو گئے۔ نئے شہنشاہ، خانِ جہاں لودی کی چھپی بے وفائی سے واقف نہیں تھے، انھوں نے خانِ جہاں کی گورنری بحال رکھی۔ لیکن یہ احکام تھے کہ کھوئے ہوئے مغل علاقے حاصل کئے جائیں۔ جب ان احکام کی پابندی نہیں ہوئی تو شہنشاہ نے خانِ جہاں کو گورنری سے

معزول کر کے مہابت خاں کے بیٹے زماں خاں کو دکن کا جائزہ دے دیا۔ لیکن خانِ جہاں نے شہنشاہ کے خلاف کھلی بغاوت کر دی۔ گو معزولی کے بعد خانِ جہاں شمالی ہند گیا اور دربار میں آمد و رفت کی، لیکن شہنشاہ کے دل میں اس کی طرف سے بے اعتمادی برابر بڑھتی گئی، بالآخر آگرے سے بھاگ گیا! ادھر دکن میں اس نے مرتضےٰ نظام شاہ کے پاس پناہ لی۔ مرتضےٰ نے اس کی بڑی آؤ بھگت کی جو مغل سلطنت کے خلاف اعلانِ جنگ تھا۔ احمد نگر کے اس مخالفانہ طرزِ عمل سے جنگ کے فوری اسباب پیدا ہو گئے۔

احمد نگر پر مغل حملے اس سے پہلے احمد نگر نے بالا گھاٹ کے اکثر مغل علاقے دبا لئے تھے اور اس پر طرہ یہ کہ اس وقت خانِ جہاں کو اپنے ہاں پناہ دی جو مغل سلطنت کا باغی تھا۔ اس سے نہ صرف شہنشاہیت کو دکھنی سلطنتوں سے ڈر لگنے لگا بلکہ مغل سلطنت کے وقار کو بھی دھکا لگ گیا۔ اب شاہجہاں کو دکن میں اپنا شہنشاہی رُعب و داب بھی قائم کرنا ضروری تھا کیوں کہ تخت نشینی سے پہلے اس نے اپنے باپ کے خلاف کھلی بغاوت کی تھی اس طرح دکن میں اس کی بہت کچھ رُسوائی ہو چکی تھی۔ یعنے شہنشاہی افواج سے لڑنے کے لئے اس کو سلاطینِ دکن سے دریوزہ گری کرنی پڑی تھی، اس کی تلافی کے لئے خود شہنشاہ برہان پور آگئے اور دکن کے تین طرف فوجیں بھیج دیں۔ ایک اعظم خاں کے تحت بالا گھاٹ پر حملہ کرنے اور خانِ جہاں کو گرفتار کرنے کے لئے۔ دوسرے خواجہ ابوالحسن کے تحت ناسک اور سنگم کے لئے، اور تیسری ناصری خاں کے تحت مشرق میں تلنگانے کے لئے۔ یہ سب فوجیں کامیاب ہوئیں۔ باوجود بیجاپور کی امداد[۱] کے اعظم خاں نے خانِ جہاں کو شکستِ فاش دی۔ اعظم خاں نے قلعۂ دھارور اور قندھار پر قبضہ کر لیا۔ دوسری طرف خواجہ ابوالحسن نے ناسک اور سنگم مسخر کر لئے[۲]۔ اس اثناء میں ایک اور الجھن پیدا ہو گئی، یعنے

۱؎ اس آڑے وقت میں بیجاپور نے احمد نگر کی مدد کی تھی، کیونکہ احمد نگر کے خاتمے سے دوسری دکنی سلطنتوں کو بھی ڈر لگتا تھا۔ بیجاپور سے رندولہ خاں ایک بڑی فوج کے ساتھ مقرب خاں کی امداد کیلئے بھیجا گیا تھا، لیکن اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ ۲؎ بادشاہ نامہ۔ عبدالحمید لاہوری جلد اول حصۂ اول ص ۲۹۴ و ۳۰۶ و ۳۱۸ و ۳۵۷ و ۳۵۸۔

خود احمد نگر کی مرکزی حکومت میں ایک نیا سیاسی انتشار پیدا ہو گیا، اور وہ یوں ہوا کہ مرتضیٰ نے بے وقوفی سے فتح خاں کو قلعے سے رہا کر دیا۔ اس کا سبب یہ تھا کہ مرتضیٰ کی بیوی جو فتح خاں کی بہن تھی بادشاہ کو مجبور کرتی تھی کہ اس کے بھائی کو قید سے رہا کرے۔ یہ رہائی بالکل بے محل تھی۔ فتح خاں پھر پیشوا بنا دیا گیا جس کی وجہ سے مقرب خاں ناراض ہو کر مغلوں سے مل گیا اور وہاں اس کو مغل امارت مل گئی اور رستم خاں کے خطاب سے سرفراز ہوا،[1] اور ادھر فتح خاں نے بادشاہ سے اپنا پرانا انتقام لے لیا۔ احسان ماننا تو درکنار خود بادشاہ کو قتل کر دیا،[2] اور مقتول کے بیٹے حسین نظام شاہ سوم کو جس کی عمر صرف دس سال سے زیادہ نہ تھی تخت نشیں کر دیا۔ فتح خاں کی اس غداری سے ملک میں ایسی سخت برہمی اور بے چینی پیدا ہو گئی[3] کہ اس کا ملک میں ٹھیرنا مشکل ہو گیا اور اس کا بچاؤ صرف اسی بات میں تھا کہ شاہجہاں کی اطاعت اختیار کر لے۔ لیکن شاہجہاں نے بھی اس وقت اس سے بڑے مطالبات کئے۔ یعنے نظام شاہی خاندان کے تمام ہاتھی اور جواہر طلب کئے۔ فتح خاں نے کچھ لیت و لعل کیا تو وزیر خاں اور رستم خاں دولت آباد کی تسخیر کے لئے بھیجے گئے۔[4] فتح خاں بہت ڈر گیا اور مجبوراً ملک میں شہنشاہ کے نام کا خطبہ پڑھا دیا اور سکے ڈھلوائے (۱۰۴۲ھ دسمبر ۱۶۳۲ء)

دولت آباد کا خاتمہ

یہ واقعات ایک حد تک مغل سلطنت کے لئے اطمینان بخش تو تھے لیکن ان سے پوری یکسوئی نہیں ہو سکی، کیوں کہ فتح خاں کی اطاعت مغل سلطنت کے لئے قابلِ اعتماد نہیں تھی۔ دوسرے بیجاپور نظام شاہی

---

[1] بادشاہ نامہ۔ عبدالحمید لاہوری جلد اول حصۂ اول ص ۲۹۴ و ۳۰۲ و ۳۱۸ و ۳۵۷ و ۳۵۸۔

[2] بادشاہ نامہ۔ عبدالحمید لاہوری جلد اول حصۂ اول ص ۴۰۲۔

[3] ” ” ص ۴۴۲۔ زبیری۔ بساتین ص ۲۹۶۔

[4] ” ” ” ۴۱۰۔

سلطنت کی امداد کے لئے تیار تھا۔ ایک اور دقّت یہ تھی کہ شاہ جی[1] جو اس وقت مغلوں کی ملازمت میں جُنیر اور آس پاس کے اضلاع پر قابض تھا مغلوں کا مخالف ہوگیا اور بیجاپور سے اتحاد کرکے مغل سلطنت کے خلاف پیش قدمی شروع کردی۔ پہلے فتح خاں اور شاہ جی میں ان بن تھی لیکن بیجاپور کے سپہ سالار رندولہ خاں کے بیچ بچاؤ سے تینوں طاقتیں متحد ہوگئیں۔ جب شاہجہاں کو یہ حالات معلوم ہوئے تو اس نے مہابت خاں کو دکن کی کمان دی۔ پہلی مارچ ۱۶۳۳ء کو مہابت خاں کی فوجوں نے قلعۂ دولت آباد کا محاصرہ کیا۔ شاہ جی۔ رندولہ خاں اور مراری راؤ باہر سے مغل فوجوں کو پریشان کرنے کے لئے بہت کوشش کرتے رہے لیکن سب بے سود ہوا۔ مہابت خاں نے قلعۂ مہاکوٹ کی فصیل اُڑادی تو فتح خاں نے ڈر کر ہتھیار ڈال دیئے اور اپنے بیٹے عبدالرسول کو مہابت خاں کے پاس بھیج دیا۔ اس طریقے سے مغل فوجیں قلعۂ دولت آباد پر قابض ہوگئیں۔ فتح خاں اور حسین نظام شاہ سوم شاہجہاں کے ہاں آگرہ بھیجے گئے (۱۲ر ستمبر ۱۰۴۲ھ/۱۶۳۳ء)[2]۔

اگرچہ دولت آباد کی تسخیر سے سلطنت احمد نگر کے تمام دست و بازو جھڑ گئے اور اس کے تمام اعضائے سیاسی کا خاتمہ ہوچکا تھا لیکن یہ سلطنت کچھ ایسی سخت جان تھی کہ اس کے باوجود اس کا کچھ نہ کچھ تسمہ لگا رہا۔ جُنیر۔ پونا اور چاکن وغیرہ کے اقطاع ابھی نظام شاہی افسروں کے ہاتھ میں تھے اور پرینڈہ جو اب نظام شاہی طاقت کا

---

[1] شاہ جی، سیواجی کا باپ ہے، یہ اور اس کے باپ دادا احمد نگر کے ملازم اور جاگیردار تھے۔ جس زمانے میں شاہجہاں برہان پور آئے تھے یہ مرتضےٰ نظام شاہ سے ناراض ہوکر شہنشاہ کے پاس چلا گیا اور پنجہزاری منصب پایا (بادشاہ نامہ عبدالحمید لاہوری جلد اول حصۂ اول ص ۳۲۸)۔ مرتضےٰ سے ناراضی کی وجہ یہ تھی کہ مرتضےٰ نے اس کے خُسر لکھوجی جادو رائے کو قتل کردیا تھا لیکن چند روز کے بعد وہ شاہجہاں سے بھی ناراض ہوگیا، کیونکہ شاہجہاں نے احمد نگر کے چند موضع جو فتح خاں کی جاگیر میں شامل تھے شاہ جی کو دیئے تھے لیکن جب فتح خاں نے شاہجہاں کی اطاعت اختیار کرلی تو پھر اس کی جاگیریں بحال کرنا پڑا، اس طرح شاہ جی ان موضعوں سے محروم ہوگیا۔

[2] بادشاہ نامہ۔ عبدالحمید لاہوری۔

مرکز بن گیا تھا مغلوں کا مقابلہ کرنے کے لئے موجود تھا۔ شاہ جی نے نظام شاہی خاندان کے ایک اور لڑکے کو بادشاہ بنا کر پریندہ میں قدم جما لیا اور مغل علاقوں میں تاخت و تاراج شروع کردی[1]۔ اس وقت دکن کے حالات بھی اس کے لئے بڑے خوشگوار ثابت ہوئے۔ شاہجہاں دکن میں نہیں تھے اور مغل سپہ سالار مہابت خاں جس نے دولت آباد کی تسخیر کی تھی راہیِ عدم ہو چکا تھا۔ اس صورتِ حال کے مقابلے کے لئے مغل سلطنت نے پھر جنبش کرنا ضروری سمجھا، چنانچہ شاہجہاں پھر ۱۰۴۵ھ/۱۶۳۵ء میں دکن آ گئے۔ پہلے برہان پور آئے اور اس کے بعد دولت آباد میں آ کر قیام کیا۔ چونکہ بیجاپور اور گولکنڈے کی سلطنتیں درپردہ احمد نگر کی مدد کرتی تھیں اس لئے پہلے ان سلطنتوں کو حاجبوں کے ذریعے تنبیہ کردی گئی کہ وہ اس طرزِ عمل سے باز آئیں اور دولت آباد میں آنے کے بعد شاہجہاں نے اپنی فوج کے تین حصے کرکے ایک حصہ خانِ دوراں کے تحت قندھار اور ناندیڑ بھیجا کہ بیجاپور اور گولکنڈے کی پیش قدمی روکے۔ دوسرا حصہ خانِ زماں کے تحت احمد نگر بھیجا گیا کہ آشٹی اور کوکن پر وار کرے، اور تیسرا حصہ شائستہ خاں کے تحت جُنیر اور ناسک کی تسخیر کے لئے بھیجا گیا۔ اگرچہ مغلوں کی فوجیں بہت کافی تھیں اور اس اثناء میں محمد عادل شاہ والیِ بیجاپور نے بھی مغلوں کی اطاعت کرلی تھی اور بیجاپور کا مشہور جنرل رندولہ خاں مغلوں کے ساتھ لڑ رہا تھا، تاہم جنگ کا فیصلہ آسانی سے نہیں ہو سکا۔ کئی مہینوں کی لڑائیوں کے بعد شاہ جی نے ہتھیار ڈالے اور اس کو بیجاپور میں ملازمت کرنے کی اجازت دی گئی۔ اس طریقے سے ۱۰۴۵ھ/۱۶۳۵ء میں نظام شاہی سلطنت کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ ہوگیا جس کے لئے مغل سلطنت کو چالیس سال لڑنا پڑا تھا[2]۔

احمد نگر کے خاتمے کے بعد بیجاپور اور گولکنڈے پر اثر پڑنا ضروری تھا اس لئے بیجاپور اور گولکنڈے کی آزادی بھی سلب ہوگئی اور ان کو مغلوں کا حکم بردار بننا پڑا۔

---

[1] زبیری۔ بساتین ص ۳۰۴ و ۳۰۲۔ لڑکے کا نام مرتضیٰ ہے جس کو شاہ جی نے بھیم گڈھ میں تخت نشیں کیا تھا۔ [2] زبیری۔ بساتین ص ۳۱۵ و ۳۱۶۔ بادشاہ نامہ جلد اول حصۂ دوم ص ۳۵ و ۳۶۔

شہنشاہ ہونے سے پہلے شاہجہاں نے قطب شاہی سلطنت سے خوشگوار تعلقات قائم رکھنے کی کوشش کی۔ گولکنڈے کے نئے بادشاہ عبداللہ قطب شاہ کو تخت نشینی کی مبارکباد دی۔ جس طرح ابراہیم عادل شاہ کی طرف سے شاہ ابوالحسن اور مرتضیٰ نظام شاہ کی جانب سے شاہ میر جعفر پُرانے رواج کے مطابق مبارکباد کے لیے آئے تھے اسی طرح شاہزادہ خرم (شاہجہاں) کی طرف سے اخلاص خاں فزدینی آیا تھا۔[1] اس سفارت کا مطلب شکر گزاری کے سوا کچھ نہ تھا۔ شاہجہاں نے اپنی بغاوت کے زمانے میں سلطان محمد قطب شاہ سے بہت مدد لی تھی اور اس کے بعد بھی وہ حصولِ تخت و تاج کے لیے گولکنڈے کی مدد کا محتاج تھا، اس لیے کہا جاتا ہے کہ شاہجہاں کی طرف سے ہر مہینے سفارت آتی تھی۔[2] لیکن جب وہ ۱۰۳۷ھ ۱۶۲۸ع میں شہنشاہ ہو گیا تو اس نے اپنے پُرانے رشتے توڑ دیئے اور حاکمانہ مطالبات شروع کر دیئے، اور ادھر عبداللہ کی کمزور حکومت جو ہمیشہ جنگ و جدل سے گریز کرتی تھی، سرِ تسلیم خم کرنے پر مجبور تھی۔ چنانچہ گولکنڈے کی کمزوری سے مغل شہنشاہت نے بہت فائدہ اُٹھایا۔

تخت نشین ہونے کے بعد شاہجہاں نے شیخ محی الدین پیرزادہ اجین کو سفیر بنا کر گولکنڈہ بھیجا۔[3] گو یہ سفارت دوستانہ تھی لیکن اس کا رنگ بالکل وہ نہیں تھا جو اس سے پہلے اخلاص خاں فزدینی کی سفارت میں جھلکتا تھا۔ یہ سفارت ایک سیاسی غرض کی تکمیل کے لیے آئی تھی۔ بات یہ تھی کہ اس وقت خانِ جہاں نے شہنشاہ کے خلاف بغاوت کر دی تھی، اسلئے شاہجہاں کو اس بغاوت کا سدباب کرنے کے لیے بیجاپور اور گولکنڈے سے اتحادِ عمل کی ضرورت داعی ہوئی، یعنے یہ سلطنتیں احمدنگر کی مدد نہ کریں اور باغی کو اپنے ہاں پناہ نہ دیں۔ اس طریقے سے قطب شاہی سلطنت

---

[1] حدیقۃ السلاطین (مطبوعہ) ادارہ ادبیات اردو ص ۳۲۔

[2] " " " ص ۴۷ — [3] حدودِ سلطنت میں داخل ہونے سے پہلے سید عبداللہ خاں نے سفیر کا استقبال کیا، اور جب سفیر حدود کے اندر (باقی صفحہ ۱۸۶ پر)

مغل شہنشاہت کے بالکل سامنے آگئی، اور یہ پہلا سامنا تھا اور اس میں قطب شاہی حکومت نے بڑی کمزوری دکھائی اور وقار کھو دیا۔ یہ مغلوں سے ایسی ڈر گئی اور سفیر کی ایسی عاجزانہ آؤ بھگت کرنے لگی کہ سلطنت کا وقار جاتا رہا۔ دوسرے خود حاجب شہنشاہی رُعب سے کام لے کر ناجائز فائدے حاصل کرنے لگا اور بہتیرے مطالبات پیش کر دیئے۔ بادشاہ اور اسکے پیشوا شاہ محمد ایسے کمزور تھے کہ سفیر کا ترکی بہ ترکی جواب نہیں دے سکتے تھے۔ غالباً اسی لیئے عبداللہ قطب شاہ نے شاہ محمد کو خدمت سے علٰحدہ کر کے شیخ محمد ابن خاتون کو جو اب تک صرف نائب پیشوا کے فرائض انجام دیتا تھا پیشوا بنا دیا۔ شیخ محمد کی علمی و سیاسی قابلیت مسلمہ تھی۔ مختلف سیاسی درباروں میں سفارت کے فرائض انجام دے چکا تھا اور سیاسی جوڑ توڑ سے خوب واقف تھا۔[۱] شیخ نے پوری قوت سے مغل سفیر کے جواب دیئے اور گولکنڈے کے آدابِ شاہی کی پابندی کروائی اور جب سفیر نے مزاحمت کی تو آصف خاں سے جو اس زمانے میں مغل افواجِ دکن کا سپہ سالار تھا، سفیر کی سخت شکایت کی گئی اور یہ شکایت بے اثر نہ رہی، یعنے مغل حکومت نے اپنے سفیر کی پوری گوشمالی کی اور ۱۰۴۲ھ/۱۶۳۲ء میں جب کہ شاہجہاں برہان پور آگئے تھے شیخ محی الدین کو واپس کر دیا گیا، جاتے ہوئے اس کو چند گھوڑے۔ ہاتھی اور بیس ہزار ہون دیئے گئے اور اس کے ساتھ گولکنڈے کی طرف سے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۸۵) آیا تو میر قاسم ناظر نے خیر مقدم کیا اور قلعۂ درگ تک لایا اور ہر منزل پر اس کی شاہی ضیافتیں ہوتی رہیں۔ حوض درگ میں خود بادشاہ آکر ملے پھر شہر میں اس کو مرزا محمد امین کے باغ میں ٹھیرایا گیا۔ اس کے بعد محل میں بلا کر بادشاہ نے ایک ہاتھی، دو گھوڑے اور خلعت و انعام وغیرہ دیئے۔ اس کے ساتھیوں کو بہت رقم دی گئی اور اس کے بعد جب کبھی سفیر بادشاہ سے ملنے کے لئے آتا تھا تو ایک ہاتھی اور دو گھوڑے دیئے جاتے تھے چنانچہ اسی طرح اپنے قیام کے زمانے میں اس حاجب نے ایک لاکھ پچاس ہزار نقد، دس ہاتھی، پچاس گھوڑے اور بے شمار خلعتیں حاصل کر لیں۔ [۱] حدیقۃ السلاطین مطبوعہ ادارۂ ادبیات اُردو ص ۷۴۔۷۵۔ [۲] حدیقۃ السلاطین مطبوعہ ادارہ ادبیات اُردو ص ۷۸۔۷۹۔

وفا خاں کو جس کا اصل نام یوسف تھا، گرانبہا تحفوں کے ساتھ جن میں ہاتھی۔ گھوڑے۔ خالص سونا اور مرصع آلات شامل تھے شاہجہاں کے پاس بھیجا گیا۔ شاہجہاں ان تحفوں سے بہت خوش ہوئے۔ وفا خاں کو خلعت وغیرہ دی اور شیخ محی الدین کی سرزنش کی۔[1]

اس زمانے میں شاہجہانی افواج احمد نگر کے خلاف سرگرم کار تھیں۔ بالاگھاٹ کے مختلف اقطاع میں پیش قدمی ہو رہی تھی، اسی اثناء میں مغل افسر نصیری خاں قندھار پہنچ گیا جو گولکنڈے کی سرحد سے قریب واقع تھا۔ یہ دیکھ کر قطب شاہی حکومت نے مدافعت کا انتظام کیا۔ چنانچہ آدم خاں حبشی کو جو عین الملکی خدمت پر مامور تھا اللہ قلی بیگ اور دوسرے سپہ سالاروں کے ساتھ کولاس بھیجا گیا اور ضروری فوج جمع کی گئی تاکہ اگر مغل آگے بڑھیں تو ان کی مزاحمت ہو سکے لیکن یہاں کوئی لڑائی نہیں ہوئی۔[2] مغلوں نے قندھار تو فتح کر لیا لیکن گولکنڈے کی سرحد میں مداخلت نہیں کی، البتہ سلطنت کے شمال مشرقی سرحدیں جو اڑیسہ کے ہمکنار تھیں مغلوں کی پیش قدمی کی وجہ سے مخدوش ہو گئیں، کیوں کہ باقر خاں نجم ثانی جو اڑیسہ کا مغل گورنر تھا قاسم کوٹہ میں گھس آیا اور کالا پہاڑ (کھیرا پارہ) میں لوٹ مار شروع کر دی اور اس سے آگے بڑھ کر راج مندری میں پیش قدمی کرنا چاہتا تھا۔ سید محمد مصطفےٰ خاں جو امیر زنبیل کا بیٹا تھا اور قاسم کوٹہ میں قطب شاہی افواج کا سپہ سالار تھا مرکزی حکومت کو اس پیش قدمی کی خبر کر دی۔ مرکز سے سید عبداللہ خاں اور شاہ علی مدافعت کے واسطے بھیجے گئے۔ ان دونوں نے قطب شاہی حدود میں اپنے قدم جمائے، لیکن اسی اثنا میں سید محمد مصطفےٰ فوت ہو گیا اور اس کی جگہ سید عبداللہ خاں کو سرلشکری دی گئی۔ جب شمال سے باقر خاں نے حملہ کیا تو قطب شاہی فوج تاب نہیں لا سکی۔ شاہ علی کھیت ہو گیا اور قطب شاہی فوج شکست کھا گئی۔ عبداللہ قطب شاہ نے خواجہ افضل ترکہ کو جو اس زمانے میں مرتضےٰ نگر میں

---

[1] حدیقۃ السلاطین ص ۷۹۔

[2] حدیقۃ السلاطین۔ صاف ۹۲ و ۹۳۔ بادشاہ نامہ عبدالحمید لاہوری حصۂ اول ص ۳۸۴ و ۳۸۵۔

متعین تھا مغلوں کے مقابلے کے لئے بھیج دیا۔ اس نے قاسم کوٹھ جیں باقر خاں کا مقابلہ کیا، لیکن یہ لڑائی آگے نہیں بڑھی، بلکہ مغل حکومت نے یہ لڑائی بند کرادی کیوں کہ اول تو اس لڑائی میں مغل حکومت کا کوئی خاص منصوبہ نہ تھا اور دوسرے ابھی شاہجہاں قطب شاہی سلطنت سے بگاڑ کرنا نہیں چاہتے تھے۔ جب شہنشاہی احکام پہنچے تو باقر خاں نے قطب شاہی حدود سے اپنی فوجیں ہٹا لیں۔[1]

لیکن رفتارِ سیاست کے بعض پہلو اور بھی تھے۔ فتح خاں کی چند روزہ اطاعت سے جو ۱۰۴۲ھ (۱۶۳۲ء) میں ہوئی شاہجہاں کو اس قدر اطمینان ہو گیا کہ اب وہ دکن کی دوسری سلطنتوں کو زیر کرنا آسان سمجھنے لگا، چنانچہ جب قطب شاہی سفیر دتا خاں شاہجہانی دربار میں پہنچا تو اس کی عزت افزائی تو کی گئی لیکن اسکے ساتھ مغل سفیر شاہ علی بیگ کو اس غرض سے گولکنڈہ بھیجا گیا کہ گولکنڈے کی سلطنت پر اپنا اثر ڈالے اور قطب شاہی دربار سے کثیر رقم اور جواہر طلب کرے۔ حالانکہ یہ مطالبہ گزشتہ مراسم کے منافی تھا۔ عبداللہ قطب شاہ اور شیخ محمد ان مطالبات کے پورا کرنے کے لئے بالکل تیار نہ تھے، کیوں کہ دکن کے نئے حالات میں جو اس وقت مغلوں کے خلاف پیدا ہو گئے تھے انھیں اپنے پہلو بچانے کا ایک اچھا موقع نکل آیا، لیکن اس سے انھوں نے پورا فائدہ نہیں اُٹھایا۔ برخلاف اس کے بیجاپور کی سلطنت مغلوں کے خلاف کھڑی ہو گئی،[2] اپنے پرانے تعلقات توڑ دیئے اور احمد نگر کی تائید میں مغلوں سے لڑتی رہی۔ چنانچہ اس وقت مغل جرنیل آصف خاں اور عادل شاہی فوجوں کے درمیان لڑائی ٹھنی ہوئی تھی۔ اب قطب شاہی حکومت کا یہی فرض تھا کہ اپنی پرانی روایت کے مطابق احمد نگر اور بیجاپور کا اس آڑے وقت میں جب کہ احمد نگر کا محاصرہ ہوا تھا ساتھ دیتی۔ حالانکہ محمد عادل شاہ نے گولکنڈے کو مدد کے لئے بلایا تھا، لیکن اس سلطنت نے سوائے ایک مخالفانہ سکوت کے

---

[1] حدیقۃ السلاطین صاعدی ص ۹۴ تا ۹۶۔ بادشاہ نامہ عبدالحمید لاہوری حصۂ اول ص ۲۳۲ و ۳۳۴۔

[2] ″ ″ ″ ۱۲۲ ″ ″ ″ ۲۱۶۔

کچھ نہیں کہا[1]، بلکہ موقعے کی منتظر تھی کہ شاید مغل سلطنت کا ستارہ ڈوب جائے۔ اس خاموشی میں صرف اتنا ہوا کہ شیخ محمد نے مغل سفیر کو بہت روز تک دھوکے میں رکھا۔ اس کی ضیافتیں تو بہت کی گئیں لیکن شاہجہاں کے مطالبات پورے نہیں کئے۔ بالآخر مغل سفیر کو بے نیل ومرام واپس کردیا گیا[2]۔ شاہجہاں اس زمانے میں برہان پور میں نہیں تھے بلکہ شمال میں تھے۔

لیکن جب ۱۰۴۲ھ/۱۶۳۲ء میں مہابت خاں نے دولت آباد پر قبضہ کرلیا تو دکن کے حالات پھر بدل گئے۔ شاہجہاں ۱۰۴۳ھ/۱۶۳۳ء میں پھر دکن آگئے اور وہ اس وجہ سے آئے کہ دکن کی بعض اُلجھنیں ابھی باقی تھیں۔ شاہ جی کی مزاحمت کی وجہ سے ابھی دکن کا مطلع صاف نہیں ہوا تھا، لیکن اب گولکنڈہ اور بیجاپور کے لئے مزاحمت کا کوئی موقعہ باقی نہیں رہا تھا۔ وہ دن دُور نہیں تھے کہ یہ سلطنتیں مغل شہنشاہت کی حاشیہ بردار بن جائیں۔ تاہم ان دو سلطنتوں میں بیجاپور نے زیادہ زندگی کا ثبوت دیا، چنانچہ یہ سلطنت مغل شہنشاہت کے مقابل آخر وقت تک اڑی رہی اور کسی قیمت پر اپنے اقتدار سے دست بردار ہونا گوارا نہیں کیا۔ اس نے نہ صرف نظام شاہیوں کی گرتی ہوئی عمارت کو سنبھالنے کی جان توڑ کوشش کی بلکہ خود اپنی آزادی کی حفاظت کے ساتھ اپنی ہمسر سلطنتِ گولکنڈہ کو بھی سہارا دیتی رہی۔ نہ صرف آصف خاں اور شاہجہاں کا پُرزور مقابلہ کیا بلکہ خود گولکنڈے کی ہمت بندھانے کیلئے اپنی پوری قوت لگادی، چنانچہ اپنے سفیر شیخ دبیر کے ہاتھ گولکنڈے کو پیغام بھیجا کہ مغل سیلاب کی روک تھام کے لئے بیجاپور کا ہاتھ بٹائے اور بیجاپور کے ساتھ ایک متحدہ محاذ بنائے۔ نیز گولکنڈے کو یہ سمجھایا کہ بیجاپور سے مشورہ کئے بغیر کبھی مغلوں کے سامنے سر نہ جھکائے[3]، اور یہ اس زمانے کی بات ہے جب کہ

---

[1] حدیقۃ السلاطین۔ صاعدی مطبوعہ ادارۂ ادبیات اُردو ص ۱۵۲۔ بساطین السلاطین ص ۲۹۴۔

[2] 〃 〃 〃 〃 〃

[3] 〃 〃 〃 〃 〃

دولت آباد کا خاتمہ ہو چکا تھا اور دکن پر اندھیرا چھا گیا تھا لیکن گولکنڈے کی فرسودہ حکومت میں اتنا دم خم کہاں تھا کہ وہ بیجا پور کے قدم بہ قدم چلتی۔ چند روز دکھانے کو تو وہ بیجاپور کی ہمدم بنی رہی[1]، لیکن جب مغل شہنشاہت کا دباؤ بڑھنے لگا تو فوراً بیجاپور کے اتحاد کو خیرباد کہہ دیا۔ یہ یاد رکھنے کی بات ہے کہ جب مہابت خاں نے دولت آباد کا محاصرہ کیا تھا تو محمد عادل شاہ نے نظام شاہی پائے تخت کو بچانے کے لئے گولکنڈے سے بھی مدد مانگی تھی، مگر قطب شاہی حکومت مغلوں سے ایسی سہمی ہوئی تھی کہ ان کی ایک نہ سُنی، بلکہ اُلٹے خواص کے فریق کو جو بیجاپور میں مغلوں کے خلاف اڑا ہوا تھا، نیچا دکھانے کی کوشش کی، اور اس پر طرہ یہ کہ جب مغل سفیر شیخ معین الدین بیدر میں گرفتار ہو گیا تو گولکنڈے سے اس کو مدد دی گئی[2]۔ اسکے علاوہ جھجار سنگھ بندیلہ اور اس کا بیٹا اور بھان سنگھ جو مغل شہنشاہت سے بغاوت کرکے گولکنڈے میں پناہ گزیں ہوئے تھے گرفتار کر کے فوراً مغل حکومت کے حوالے کر دیا گیا۔ اسکے علاوہ اس نے آخری ذلت گوارا کرلی، یعنے مغلوں کے سامنے سر جُھکا دیا اور ان کی سیادت مان لی۔

گولکنڈے کی اس پست ہمتی سے بیجاپور کی حکومت کو دُکھ ہوا سو ہوا آزادیٔ دکن کے بھی پرخچے اڑ گئے۔ گولکنڈہ تو کجا خود پورے دکن کو نقصان پہنچا۔ ایک اور لطف یہ تھا کہ قطب شاہی حُکمران خود بیجاپور کے خلاف شہنشاہت سے فوجی امداد کے بھی طالب ہوئے[3]، چونکہ عادل شاہی حکومت گولکنڈے پر حملہ کرکے ان کی بے وفائی کی سزا دینا چاہتی تھی اور حملہ کرنا جائز ہوتا۔ کیوں کہ ان کی بیوفائی سے تمام دکن کا وقار خاک میں مل گیا اور خود بیجاپور کو بھی وہی پھندا گلے میں پہننا پڑا جو گولکنڈے کے گلے میں پڑ چکا تھا۔ اگر بیجاپور کی طرح گولکنڈے کے حکمران بھی ہمت سے کام لیتے اور بیجاپور کے ساتھ متحدہ محاذ بنا لیتے تو دکن کی سالمیت باقی رہ جاتی۔ اب بیجاپور کی اکیلی سلطنت مغل شہنشاہت کا کیا بگاڑ سکتی تھی۔

اس کمزوری سے مغل شہنشاہت کے تیور بدل گئے اور اب وہ آئے دن دکھنی سلاطین پر

---

[1] بادشاہ نامہ۔ عبدالحمید لاہوری۔ جلد اول حصۂ دوم ص ۱۲۵۔

[2] حصۂ اول ص ۲۷۹۔ حدیقۃ السلاطین ص ۱۱۸۔

[3] حدیقۃ السلاطین۔ صاعدی ص ۱۲۰۔ بادشاہ نامہ جلد اول حصۂ دوم ص ۱۳۹۔

برسنے لگی۔ اسی زمانے سے جب شہنشاہ ہند یا پہنچ گئے جو دریائے نربدا پر واقع ہے۔ سلاطینِ دکن کے نام شاہی فرمان پہنچا کہ یہ اپنی مخالفانہ روش سے باز آجائیں اور اپنے کو فوراً مغل شہنشاہت کے ساتھ وابستہ کردیں۔ یہ حکم بیجاپور کو مکرمت خاں، اور گولکنڈے کو عبداللطیف گجراتی نے لاکر پہنچایا۔[1] یہ فرامین اس قدر تحکمانہ انداز میں لکھے گئے تھے کہ گویا آسمانی ہیں۔

فرمان میں یہ ہدایت تھی کہ مغل فوجوں کی مزاحمت نہ کریں بلکہ دکن کے امن امان کے لئے مغل سلطنت کے ساتھ اتحادِ عمل کریں۔ گولکنڈے کو عبداللطیف گجراتی بھیجا گیا۔ اس سفارت کا انداز اور شاہی فرمان کا لہجہ بالکل تحکمانہ تھا اور اس میں مندرجۂ ذیل مطالبات کئے گئے تھے جن کی تکمیل عین حکم برداری تھی۔ اس میں تین قسم کی تہدیدیں تھیں:۔

(۱) ایک یہ کہ اصحابِ کبارؓ پر تبرا نہ پڑھا جائے:۔

"از روئے ارشاد حکم می فرمایم کہ از ملکِ خویش این امر قبیح و فعلِ شنیع برطرف گرداند، ورنہ . . . . برما لازم است کہ درمقامِ تسخیر آں ملک شویم"۔

(۲) دوسرے شاہِ ایران کا نام خطبے میں نہ پڑھا جائے بلکہ:۔

"در آں ملک خطبہ بہ نامِ نامی و القابِ سامی ما مزین باشد"۔

(۳) تیسرے شہنشاہ کی خدمت میں گرانبہا پیش کش ارسال کرے جس میں ہاتھی، آلات و جواہر ہوں اور اس میں وضاحت کردی گئی تھی کہ یہ سب چیزیں اچھی قسم کی ہوں اور مقررہ اوقات پر پہنچنی چاہئیں ورنہ:۔

"افواجِ قاہرہ و عساکرِ منصورہ بہ آں ملک خواہند آمد"۔

---

[1] بادشاہ نامہ۔ عبدالحمید لاہوری۔ جلد اول حصۂ دوم ص ۱۲۵ تا ۱۳۰۔

اس فرمان میں سلطان محمد قطب شاہ کی تعریف بھی تھی اور اس صلے میں کہ "قدامت کہ از آن مرحوم وقوع آمدہ" یہ سلطنت مرحوم کے بیٹے پر بحال کی جا رہی تھی۔[1]

شاہجہاں کے دوبارہ دکن آنے سے عبداللہ اس قدر سہم گیا کہ عبداللطیف گجراتی کے گولکنڈہ پہنچنے سے قبل ہی اس نے اپنے سفیر مُلّا تقیا کو بیش بہا تحفوں کے ساتھ جن میں ہاتھی اور جواہر تھے شہنشاہ کے پاس بھیج دیا۔[2] اس وقت شاہجہاں دولت آباد آگئے۔ مُلّا تقیا یہیں باریاب ہوا۔ اب شہنشاہ کے احکام کے محلات چون وچرا ناممکن تھا۔ عبداللطیف کا بڑا استقبال ہوا اور جگہ جگہ پر اس کی ضیافتیں ہوئیں۔ جب سفیر حدودِ سلطنت میں داخل ہوا تو کریم خاں اور اس کے بعد معزالدین مشرف نے استقبال کیا اور حیدرآباد کے قریب شیخ محمد طاہر نے خیر مقدم کیا اور اس کو میر جملہ ماضی کی حویلی میں ٹھیرایا گیا، اور جب بادشاہ سے ملاقات ہوئی تو اس کو بے شمار انعامات دیئے گئے۔ لیکن غالباً شہنشاہ کو اس خیر مقدم کی خبر نہ تھی اور وہ یہ سمجھ رہے تھے کہ اس کی شرطیں تسلیم نہیں کی گئیں اس لئے شہنشاہ نے مزید دباؤ ڈالنے کے لئے خانِ دوراں کو گولکنڈے کے لئے اور خانِ زماں کو بیجاپور کے لئے روانہ کر دیا کہ یہ سلاطین کوئی جنبش نہ کرسکیں۔ خانِ دوراں کی فوج ناندیڑ تک پہنچ گئی جو گولکنڈے کی سرحد سے بہت قریب تھا۔ سرحد کے لوگ سخت پریشان ہوئے۔ عبداللہ قطب شاہ نے نصیر الملک۔ عین الملک۔ یولچی بیگ اور شجاع الملک کو مدافعت کے لئے بھیجا اور خود مرکز میں قلعۂ گولکنڈے کی مرمت کروائی اور قلعے میں ہتھیار، توپیں اور ضروری غلّہ جمع کر دیا۔ اس مدافعتی انتظام سے عبداللطیف بہت گھبرایا اور اس نے شاہجہاں کو سمجھایا کہ عبداللہ قطب شاہ نے جو تحفے دیئے ہیں ان کو قبول کر لیا جائے۔[3]

---

[1] بادشاہ نامہ۔ عبدالحمید لاہوری جلد اول حصۂ دوم ص ۱۳۲۔

[2] ؍؍ ؍؍ ؍؍ ؍؍ ؍؍ ۱۶۹۔

[3] حدیقۃ السلاطین ص ۱۷۲۔

لیکن یہ تمام مدافعتی تدبیریں بے کار ثابت ہوئیں، کیوں کہ شہنشاہ نے جو مطالبات پیش کئے تھے ان کو تسلیم کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ شیخ محمد پیشوا نے عبداللطیف کی اپنے گھر میں پُرتکلف ضیافت کی اور گفت و شنید کے بعد ۱۰۴۵ھ (۳۶-۱۶۳۵ء) میں ایک صلحنامہ یا "انقیاد نامہ" لکھا گیا جس میں شہنشاہ کی تمام شرطیں تسلیم کی گئیں۔ یعنے خطبے میں چار خلفائے راشدین کے بعد شاہجہاں کا نام لیا جائے گا[1] اور سکّے پر شاہجہاں کا نام ضرب کیا جائے گا۔ نیز شاہجہاں کے نویں جلوس سے دو لاکھ ہون جن کی مالیت آٹھ لاکھ روپے ہوتی ہے ہر سال شہنشاہ کے پاس یا صوبہ دارِ دکن کے پاس بھیجے جائیں گے، اور یہ وعدہ ہوا کہ تیس لاکھ روپے جو گزشتہ بقایا ہے وہ بہ اقساط ادا کئے جائیں گے۔ چنانچہ اس وقت ایک لاکھ روپے کی ایک قسط ادا کر دی گئی۔ نیز ہون اور مغل سکّے کی قدر میں جو فرق پڑے گا اس کی بھی تکمیل کی جائے گی۔[2] اگر کبھی بیجاپور کی سلطنت گولکنڈے پر دست درازی کر بیٹھے تو مغل حکومت گولکنڈے کی مدد کرے گی، اور آخر میں عبداللہ قطب شاہ نے لکھا کہ:—

"در حضور . . . . مولانا عبداللطیف بر قرآنِ مجید دست گذاشتہ قسم یاد کردم کہ خلاف آنچہ بعہد کردم از من سر زند و اگر خدا نخواستہ باشد مصدر خلاف آن گردم اولیائے دولت قاہرہ در انتزاعِ ملکِ من محق خواہند بود۔"[3]

---

[1] خطبے سے متعلق عبداللہ قطب شاہ نے اپنے مُلک کے علماء سے رائے لی تھی کہ آیا یہ شرط تسلیم کرنی چاہیے علماء نے خونریزی سے بچنے کے لئے اس معاملے میں اپنی رضامندی ظاہر کر دی (حدیقۃ السلاطین ص ۱۷۲)۔

[2] بادشاہ نامہ۔ عبدالحمید لاہوری جلد اول حصۂ دوم ص ۱۸۰ و ۱۸۱۔ یہی دو لاکھ ہون گولکنڈے کی طرف سے نظام شاہی سلطنت کو بطورِ امداد دیئے جاتے تھے (بادشاہ نامہ جلد اول حصۂ اول ص ۱۷۱) شاہی مکتوب میں سالانہ خراج و بقایا سے متعلق کوئی وضاحت نہیں تھی بلکہ حاجب نے زبانی کہا تھا کہ اسکی پابجائی ہونی چاہیئے۔ [3] بادشاہ نامہ عبدالحمید لاہوری ص ۱۸۰ تا ۱۹۱۔

اس انقیاد نامے کی تکمیل کے بعد عبداللطیف حیدرآباد میں کئی مہینے ٹھیرا رہا اور اپنے سامنے معاہدے کی تکمیل کروائی۔ آخر میں حیات آباد میں اس کی پُر تکلف ضیافت ہوئی اور ۱۰۴۶ھ ۱۶۳۶ء میں یہ قیمتی تحفوں کے ساتھ شہنشاہ کی خدمت میں واپس ہوا۔ ان تحفوں میں جواہر، کئی ہزار اشرفی۔ ایک سو ہاتھی اور پچاس گھوڑے تھے، جن کی جملہ مالیت چھ لاکھ روپے ہوتی تھی اسکے ساتھ قطب شاہی سفیر شیخ محمد طاہر بھی بھیجا گیا۔ جب یہ لوگ دولت آباد کے قریب پہنچے تو شاہ علی بیگ۔ مرزا قلی خاں اور افضل خاں نے ان کا خیر مقدم کیا اور یہ شہنشاہ کے سامنے پیش ہوئے تو ان کی غیر معمولی عزت ہوئی، اور جب قطب شاہی سفیر گولکنڈہ واپس کیا گیا تو شہنشاہی سفیر خواجہ طاہر اسکے ساتھ رکھا گیا اور شہنشاہ نے ان کے ہمراہ اپنی ایک تصویر بھیجی جو طلائی فریم میں نصب تھی۔ نیز ہاتھی اور قیمتی کپڑوں کے کئی تھان عنایت کئے اور انقیاد نامے کے جواب میں اپنی طرف سے ایک عہد نامہ لکھ دیا جو طلائی تختی پر کندہ تھا اور ماہ ربیع الثانی ۱۰۴۶ھ ۱۶۳۶ء اس کی تاریخ ہے اس کا خلاصہ یہ ہے :-

"چونکہ قطب الملک نے ہماری شرطیں تسلیم کرلی ہیں، یعنے خطبے میں خلفائے راشدین رضہ اور ہمارا نام لیا جارہا ہے اور سکے پر ہمارا نام مضروب ہو چکا ہے اور مقررہ پیش کش بھیج دی ہے اس لئے "تقصیراتِ گزشتہ او را عفو فرمودیم و ملکے کہ در تصرف آن عمدہ ارباب دول است برو مقرر و مسلم داشتیم" اور جب تک ان شرطوں کی پابندی ہوگی ہم بھی اپنے وعدے کی پابندی کریں گے اور گولکنڈے کو کوئی ضرر نہیں پہنچے گا۔"[1]

جب یہ شہنشاہی عطیات گولکنڈہ پہنچے تو عبداللہ قطب شاہ نے بڑے انکسار کے ساتھ شکریہ ادا کیا جس میں انتہائی خوشامد تھی۔ جن ذلت آمیز الفاظ میں عبداللہ نے سپاسنامہ لکھا تھا ان سے اس کی پست ذہنیت معلوم ہوتی ہے۔ وہ اتنا نیچے

---

[1] بادشاہ نامہ۔ عبدالحمید لاہوری۔ جلد اول حصۂ دوم ص ۲۱۰ و ۲۱۱۔

گرگیا کہ اس پست ہمتی سے اس کے بزرگوں کی تمام خود داری خاک میں مل گئی، اور شکرانے کے طور پر ایک قیمتی ہاتھی جس کا نام "گجموتی" تھا، اور ایک قیمتی الماس شہنشاہ کے پاس روانہ کئے۔[1]

اس معاہدے سے جو ۱۰۴۶ھ/۱۶۳۶ء میں طے پایا، قطب شاہی سلطنت کی ہمیشہ کے لئے آزادی سلب ہوگئی اور اب یہ مغل سلطنت کے زیرِ حمایت ایک ریاست یا محمیت ہو کر رہ گئی جس کا سلطان محمد قطب شاہ کے انتقال کے بعد سے برابر ڈر لگ رہا تھا، لیکن اس کے ساتھ یہ بات بھی غور طلب ہے کہ سلطنتِ بیجاپور پر یہ شرطیں عائد نہیں کی گئیں، حالانکہ اسی زمانے میں بیجاپور کی قسمت کا بھی یہی فیصلہ ہوا، اور گولکنڈے کی طرح اس کو بھی ریاست بنا دیا گیا، لیکن اس پر کوئی مذہبی شرط لگائی گئی نہ خراج عائد کیا گیا، بلکہ اُلٹے اس کو نظام شاہی سلطنت کے اکثر اضلاع حاصل ہوگئے۔ غالباً اس کی وجہ یہ تھی کہ بیجاپور کی حکومت گولکنڈے کی طرح کمزور نہ تھی۔

---

[1] بادشاہ نامہ۔ عبدالحمید لاہوری، جلد اول حصۂ دوم ص ۲۱۴ ــ ۲۱۵۔

سولھواں باب

کرناٹک کی فتوحات اور ان کا بندوبست

جنگ تالیکوٹ سے بیجاپور اور گولکنڈے کو بہت فائدے پہنچے، یعنے ان کو کرناٹک میں کئی فتوحات حاصل ہوئیں جن کی بدولت یہ سلطنتیں جنوب میں بہت پھیل گئیں اور ان کی دولت میں بھی اضافہ ہوا جو ان سلطنتوں کی تاریخ کا بڑا باب ہے لیکن ان فتوحات کو سب کچھ جنگِ تالیکوٹ کا نتیجہ سمجھنا صحیح نہیں ہے، کیونکہ تالیکوٹ کی ایک جنگ سے وجیانگر کی تمام طاقتوں کا یک لخت خاتمہ نہیں ہو سکا بلکہ اس سلطنت کے کئی اجزا باقی رہ گئے اور ان کو مغلوب کرنے کے لئے اور بے شمار لڑائیوں کی ضرورت تھی۔ رام راج کے خاتمے کے بعد اس کے بھائی تلنم راج اور وینکٹ پتی کئی علاقوں پر قابض رہے۔ انھی کے جانشین جو رائل کہلاتے ہیں مشرقی کرناٹک کے حکمران تھے۔ ان لوگوں نے سنہ ۹۷۵ھ (۱۵۶۷ء) میں پنگنڈے کو اپنا پایہ تخت بنا لیا تھا جو وجیانگر سے ایک سو چالیس میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ لیکن جب سلطنت بیجاپور اور گولکنڈے نے یہاں حملے شروع کر دیئے تو سنہ ۹۸۳ھ (۱۵۷۵ء) میں تمّا راجہ جو غالباً وینکٹ پتی کا جانشین تھا پنگنڈے کو چھوڑ کر چندرگری میں آ بسا اور اس کو اپنا پایۂ تخت بنا لیا۔[1] لیکن اس کے آس پاس وجیانگر کے جتنے صوبہ دار

---

[1] تاریخ جنوب ہند۔ جلد اول، ویکس ص ۶۱۔

اور زمیندار تھے وہ بھی خود مختار ہو گئے اور ان لوگوں نے اپنی راجدھانیاں قائم کر لیں۔ یہ پنگنڈے کے رائل۔ تنجور۔ مدورا۔ چناپٹم کے نائک اور سری رنگ پٹن کے وڈیار تھے جو برائے نام چندرگری کے ماتحت تھے لیکن دراصل خود مختارانہ حیثیت رکھتے تھے۔ پنگنڈے کے رائل راجہ چندرگری کے رشتہ دار تھے۔ چونکہ انھوں نے بیجاپور کے حملے کا خاطر خواہ مقابلہ کیا تھا، اس کے صلے میں پنگنڈہ ان کو دے دیا گیا تھا۔ نہ صرف یہ آپس میں لڑتے جھگڑتے رہتے تھے بلکہ خود چندرگری کے راجہ سے دست بہ گریباں ہو جاتے تھے۔ چنانچہ مدورا کے نائکوں نے بارہا چندرگری پر حملہ کیا اور اپنے فائدے کے لئے دکن کے مسلمان حملہ آوروں کو دعوت دی۔ اسی وجہ سے بیجاپور اور گولکنڈے کے حملہ آوروں کے لئے خوشگوار مواقع ہاتھ آ گئے۔

جنگِ تالیکوٹ کے بعد احمد نگر اور بیجاپور کی سلطنتوں نے یہ طے کر لیا تھا کہ اول الذکر سلطنت شمال میں پیش قدمی کرے۔ چنانچہ اس قرارداد کے مطابق اس نے سنہ ۹۷۵ھ میں برار پر قبضہ کر لیا[1]۔ اس کو جنوب میں حملہ کرنے کے مواقع نہ تھے۔ لیکن بیجاپور اور گولکنڈے کی سلطنتوں نے جن کی حدود کرناٹک سے ملتی تھیں جنوب میں پیش قدمی کرنے لگیں۔ چونکہ مغلوں کے تسلط کی وجہ سے شمال کے راستے بند ہو گئے تھے اس وجہ سے بھی یہ سلطنتیں کرناٹک میں نفوذ کرنے کے لئے مجبور تھیں۔ بیجاپور کے مشہور جنرل رندولہ خاں نے سنہ ۱۰۴۶ھ میں کرناٹک کے بہت سے علاقے مثلاً بنکاپور۔ ہری ہر۔ بسواپٹن فتح کر لئے اور بیدنور تک بڑھ آیا۔ سنہ ۱۰۵۴ھ میں سیرا مسخر ہوا، اور اس کے بعد ویلور اور جنجی فتح ہو گئے۔ رندولہ خاں کے بعد بیجاپور کے دوسرے جنرل شاہ جی نے فتوحات جاری رکھیں۔ بنگلور اور جنجی مسخر کر لئے۔ گولکنڈے کی فتوحات ابراہیم قطب شاہ کے عہد سے شروع ہو چکی تھیں۔ جنگِ تالیکوٹ کے بعد اس سلطنت نے اپنے بہت سے

---

[1] تاریخ جنوب ہند۔ ولکس ص ۱۶۔

کھوئے ہوئے علاقے جن پر رام راج قابض ہو گیا تھا حاصل کر لئے۔ ابراہیم کے جانشین محمد قلی قطب شاہ نے نہ صرف بلیتم راج اور وینکٹ پٹی کے حملوں کو منتشر کر دیا بلکہ کرناٹک کے مشہور قلعے نندیال، کلکور اور موسلمورگ فتح کر لئے۔ اسکے بعد کندی کوٹہ اور پنگنڈے پر جہاں وینکٹ پٹی نے اپنا پایۂ تخت بنا رکھا تھا، حملہ کر کے مسخر کر لئے۔ ان حملوں اور فتوحات کا مقصد یہ تھا کہ بیرونی حدود مستحکم ہو جائیں تاکہ وجیانگر کی کوئی طاقت سر نہ اُٹھا سکے۔ چنانچہ اس انتظام سے جنوب مشرقی حدود اس قدر قابلِ اطمینان ہو گئے کہ سلطان محمد قطب شاہ کے عہد میں ان علاقوں میں کوئی فوجی نقل و حرکت کی ضرورت داعی نہیں ہوئی۔

جب عبد اللہ قطب شاہ کا عہد آیا تو اس میں اس زمانے کے حالات کے مدنظر قطب شاہی سلطنت نے پھر کرناٹک کی طرف توجہ کی اور یہ پیش قدمی یوں ہوئی تھی کہ بیجاپور کی طرف سے رندولہ خاں اور شاہ جی کرناٹک میں آگے قدم بڑھا رہے تھے اور فتوحات سے ہر روز عادل شاہی سلطنت وسیع ہو رہی تھی۔ قطب شاہوں کو بھی توسیع سلطنت کا شوق ہونا قدرتی بات تھی، لیکن جب تک مغل شہنشاہت سے معاملات کی یکسوئی نہیں ہوئی کرناٹک کی طرف توجہ کرنا ممکن نہیں تھا، اس لئے سنہ ۱۰۴۵ھ (۱۶۳۶ء) والے معاہدے تک پیش قدمی ملتوی رہی۔ جب اس معاہدے سے اطمینان ہو گیا تو پھر فوجی نقل و حرکت شروع ہو گئی۔ ظاہر ہے کہ اس سلطنت کے لئے صرف کرناٹک ہی ایک ایسا میدان تھا جہاں یہ اپنی جولانیاں دکھا سکتی تھی، کیونکہ مغلوں کے تسلط کی وجہ سے شمالی راستے مسدود تھے، البتہ شمال مشرق میں جہاں تسخیر کی ضرورت تھی حملے ہو سکتے تھے، چنانچہ سنہ ۱۰۶۲ھ (۱۶۵۲ء) میں وزیگاپٹم پر قبضہ کیا گیا اور قطب شاہی سلطنت تلنگانے کے آخری حدود تک پہنچ گئی۔ سکاکول کو شمالی فوج کی چھاؤنی بنایا گیا۔ اتفاق سے عبد اللہ قطب شاہ کے لئے محمد سعید جو اردستان ایک تاجر کی حیثیت میں آیا تھا کرناٹک کی فتوحات کے لئے بہت موزوں ثابت ہوا، یہ پہلے سلطنت میں میر جملہ بنایا گیا اور اس کے بعد اس کو کرناٹک کی طرفداری دی گئی۔

کرناٹک کی تسخیر اسی کے سپرد ہوئی۔ اس زمانے میں جب کہ محمد سعید طرفدار بنایا گیا تھا کرناٹک میں قطب شاہی حدود دکمبم سے جو کڑپہ کے شمال مشرق میں واقع ہے، آگے نہیں تھے۔ اس سے آگے کرناٹک کی سطح مرتفع کو مسخر کرنے کی کوششیں ہوئی تھیں، لیکن وہ سب ناکام ہو چکی تھیں، کیوں کہ چندرگری کا راجہ سری رنگ رائل یہاں کافی طاقتور تھا۔ کرناٹک کا طرفدار ہونے کے بعد میر جملہ نے یہاں اپنی طاقت بہت بڑھائی، یعنے اس کی فوج پانچ ہزار سوار اور بیس ہزار پیدل، تین سو ہاتھی، چار پانچ سو اونٹ پر مشتمل تھی، "اور ان کے علاوہ بیس ہزار بیل تھے جو سامانِ حرب لے جایا کرتے" تھے[۱]۔ ان فوجوں میں اس نے باقاعدگی پیدا کی اور مغربی فوجوں سے بھی کام لیا چنانچہ اس کی فوج میں فرانسیسی سپاہی۔ انگریزی۔ ولندیزی اور اطالوی بندوقچی اور توپچی بھی تھے جن سے اس کو بہت مدد ملتی تھی۔ سنہ ۱۰۵۶ھ/۱۶۴۵ء سے میر جملہ کے حملے شروع ہو گئے اور بہت جلد اس نے کڑپا۔ سدھوٹ فتح کر لئے لیکن اس کی سب سے بڑی فتح کندی کوٹ کی تسخیر تھی جو سنہ ۱۰۵۶ھ/۱۶۴۶ء میں عمل میں آئی۔ کندی کوٹ، کڑپہ کے قریب یرملائی پہاڑوں میں واقع ہے۔ فرانسیسی سیاح ٹیورنیر کے الفاظ میں "یہ بڑا قلعہ تھا" اور ٹیورنیر یہ بھی کہتا ہے کہ[۲] "اگر یورپی سپاہی اس کی فوج میں نہ ہوتے تو محمد سعید کندی کوٹہ فتح نہیں کر سکتا تھا"۔ اس کی تسخیر سے مشرقی کرناٹک کے بڑے اور اہم حصے پر قطب شاہی قبضہ ہو گیا چنانچہ اس سے ڈر کر راجہ چندرگری سری رنگ رائل نے مغلوں سے مدد کی درخواست کی تھی۔ لیکن قطب شاہی سلطنت کی پیش قدمی میں کوئی فرق نہیں آیا، وہ برابر ساحل تک بڑھتی گئی اور سنہ ۱۰۵۷ھ/۱۶۴۷ء تک تمام مشرقی کرناٹک ساحل سمندر تک قطب شاہی

---

[۱] مدراس کے اوراقِ پارینہ۔ جلد اول ص ۹۹—۱۰۰۔ ویس ٹیچیس آف اولڈ مدراس۔

رر رر ص ۱۰۰۔ رقعات عالمگیر۔ مرتبہ نجیب اشرف۔ جلد اول ص ۱۶۰۔

[۳] سیاحت نامہ ٹیورنیر۔ جلد اول ص ۲۲۷۔ کندی کوٹہ ضلع کڑپہ میں یرملائی پہاڑی سلسلے میں واقع ہے اور سطح سمندر سے ۱۶۷۰ فیٹ بلند ہے۔ یہ قلعہ سنہ ۱۵۸۹ء میں تعمیر ہوا تھا۔

عملداری میں آگیا۔ سری رنگ رائل میسور کی طرف بھاگ گیا۔ ان جدید فتوحات کی وسعت کوئی تین سو میل سے زیادہ تھی۔ کرناٹک کے یہ علاقے جو عبداللہ قطب شاہ کے عہد میں مسخر ہوئے تھے وہ اصطلاح میں "قبلہ پیٹی" کہلاتے ہیں، ان کا محصول چالیس لاکھ ہون وصول ہوتا تھا۔

انگریزوں سے تعلقات

ان جدید فتوحات سے قطب شاہی سلطنت میں اضافہ تو ہوا لیکن ان سے بعض نئی الجھنیں پیدا ہو گئیں کیوں کہ اس وسعت سے قطب شاہی حدود ساحلِ کارومنڈل تک پہنچ گئیں اور اس طرح مغربی اقوام سے جو ان ساحلوں پر قابض تھیں قریب تر ہو گئیں اور ان سے تعلق پیدا ہو گیا۔ پرتگالی تو بہت زمانے سے ساحلِ کارومنڈل پر قدم جمائے ہوئے تھے، چنانچہ یہ سان تھوم (سینٹ طامس)[1] پر جو مدراس سے سات میل کے فاصلے پر جنوب میں واقع ہے قابض تھے۔ لیکن جب ان کے پیچھے یورپ کی دوسری قومیں، یعنی انگریز اور ولندیزی ہندوستان آئے تو پرتگالیوں سے ان کی کش مکش شروع ہو گئی۔ آخرالذکر دونوں قوموں نے ۱۰۰۹ھ/۱۶۰۰ء میں ہندوستانی ساحلوں پر اپنا قدم جما لیا۔ ولندیزی پلی کٹ پر، انگریز مسولی پٹم پر اپنی تجارتی منڈیاں قائم کر کے تجارت کرنے لگے۔ انگریزوں کا توطن مسولی پٹم میں قطب شاہی سلطنت کی منظوری سے ہوا تھا، کیوں کہ یہ قطب شاہی بندرگاہ تھی۔ یہ لوگ اپنا اثر بڑھانے کے لئے پرتگالیوں کو ساحلِ کارومنڈل سے خارج کرنا چاہتے تھے۔ اس غرض کے لئے انگریزوں نے قطب شاہی اثر سے پہلے راجہ چندرگری سری رنگ رائل سے ۱۶۴۳ء میں ایک "قول" کی تکمیل کر کے مدراس حاصل کر لیا تھا۔ مدراس کو اس زمانے میں چناپٹم کہتے تھے۔ اس قول کی رو سے انگریزوں کو قلعۂ سینٹ جارج کی تعمیر کی اجازت اور محصول درآمد و برآمد سے

---

[1] مدراس کا یہ جنوبی حصہ عیسائی حواری سینٹ طامس کے نام سے مشہور ہے جہاں ان کا گرجا اور قبر ہے۔ عوام اس کو بگاڑ کر "سان تھوم" کہتے ہیں۔

استشاد حاصل ہو گیا اور مدراس کے آس پاس کی تمام زمین مل گئی جس میں ان کو عدالتی اختیارات حاصل ہو گئے۔ اس قول کی تاریخ ۵ ار نومبر ۱۶۴۳ء ہے[1] اور رجب ۱۰۵۶ھ (۱۶۴۶ء) میں یہاں قطب شاہی عملداری قائم ہو گئی اور میر جملہ بڑھتے بڑھتے سان تھوم تک پہنچ گیا تو انگریزوں نے پرتگالیوں کی مخالفت میں اس کا پُر جوش خیر مقدم کیا اور پرتگالیوں کی لڑائی میں اس کی مدد کی اور اپنے توپچی اور سپاہی دیئے۔

چونکہ اب کرناٹک میں قطب شاہی عملداری قائم ہو گئی تھی، اس لئے سری رنگ رائل کا پُرانا "قول" جو مدراس کے بابت دیا گیا تھا فسخ ہو گیا تھا، اس لئے انگریز کمپنی کے صدر "اُیوی" نے میر جملہ سے تجدیدِ قول کی درخواست کی۔ میر جملہ نے اپنی چند شرطیں منواکر، اور انگریزوں سے ضروری توپیں حاصل کر کے ۱۰۵۷ھ (۱۶۴۷ء) میں پُرانے قول کی توثیق کر دی۔ چنانچہ اس توثیق کی رُو سے انگریزوں کو وہی حقوق مل گئے جو ان کو سری رنگ رائل کے تحت حاصل تھے۔

تمام ساحلِ کارومنڈل کی تسخیر اور قول نامے کی تجدید دونوں خوش آیند ثابت ہوئے اور آیندہ دس سال اطمینان سے گزرے۔ لیکن ۱۰۶۷ھ (۱۶۵۶ء) میں یہ مشکل آن پڑی کہ محمد سعید میر جملہ اپنے مُربّیِ سلطنت سے سرتابی کر بیٹھا اور مغلوں سے مل گیا۔ اس بغاوت سے قطب شاہی کرناٹک میں افراتفری پیدا ہو گئی، اور ممکن ہے کہ اس میں خود میر جملہ کا بھی ہاتھ ہو۔ سری رنگ رائل جو میسور بھاگ گیا تھا وہ پھر پلی کٹ اور پناملی پر حملہ آور ہو گیا اور قطب شاہی حکومت کو پھر اس طرف توجہ کرنی پڑی لیکن مشکل یہ تھی کہ اسی زمانے میں میر جملہ کی بغاوت کی وجہ سے مغل سلطنت سے ایک لڑائی ٹھن گئی۔ جب اس لڑائی سے فراغت ہوئی تو عبد اللہ قطب شاہ نے

۱؎ مدراس کے اوراقِ پارینہ۔ جلد اول ص ۵۹۲۔ وِسِن ٹیچیس آف اولڈ مدراس۔

۲؎ 〃 〃 ۱۶۶۔

نیک نام خاں[1] کو جو میر جملہ کے تحت کرناٹک میں کام کر چکا تھا، اس صوبے کا سرلشکر اور طرفدار مقرر کر دیا۔ غالباً ۱۰۶۷ھ ۱۶۵۶ء میں نیک نام خاں کرناٹک آیا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس وقت کرناٹک کے بندوبست کیلئے نیکنام خاں سے زیادہ موزوں کوئی دوسرا آدمی نہیں تھا۔ پہلے تو اس نے ہندو طاقتوں کا مقابلہ کیا اور ان کو شکستیں دیں اور

---

[1] اس کا اصل نام رضا قلی ہے۔ یہ پہلے ایران میں شاہ عباس صفوی کا ملازم تھا۔ غالباً عبداللہ قطب شاہ کے عہد میں گولکنڈہ آیا، اور محمد سعید میر جملہ کے تحت کرناٹک میں مامور کیا گیا۔ پہلے اس کو رضا خاں کا خطاب ملا، اور جب میر جملہ کی بغاوت کے بعد کرناٹک میں اس سے اہم کام انجام پاگئے تو اس کو نیک نام خاں خطاب دیا گیا اس نے محمد سعید سے زیادہ وفاداری اور قابلیت کے ساتھ کرناٹک کا بندوبست کیا تھا۔ اس کے وفادارانہ کام سے خوش ہو کر بادشاہ نے اس کو ۱۰۸۱ھ ۱۶۷۰ء میں سلطنت کا دیوان بنا دیا، اور اس سے سلطنت کے دوسرے اہم کام لئے۔ سچ تو یہ ہے کہ نیک نام خاں نے قطب شاہی سلطنت کیساتھ پوری وفاداری کی۔ فوجی اور غیر فوجی بڑی بڑی خدمات انجام دیں۔ وزارت کے فرائض اس خوبی سے انجام دیئے کہ اس کا نام اب تک زبان زد ہے۔ یہ عالم و شاعر تھا، علماء کی سرپرستی کرتا تھا۔ محمد ابراہیم خادم نے جو نیک نام خاں سے بہت وابستہ تھا اس کی تعریف میں ایک طویل مثنوی لکھی ہے جس کا پہلا شعر ہے:۔

رضا خانِ جم فور خورشید رائے　　زسر تا بہ پا محض لطفِ خدائے

خود اس کا کلام بھی بہت دستیاب ہوتا ہے۔ عبداللہ قطب شاہ کی وفات (۱۰۸۳ھ ۲۱ر اپریل ۱۶۷۲ء) کے چند دنوں کے بعد ۱۲ر مئی ۱۰۸۳ھ ۱۶۷۲ء کو نیک نام خاں کا انتقال ہوا اس کی وفاداری کی وجہ سے عبداللہ کے جانشین نے اس کی قدر افزائی کی کہ اس کو قطب شاہی مقبروں کے قریب دفن کیا اور اس کے ایصالِ ثواب کے لئے ایک موضع وقف کر دیا۔ قبر کے کتبے میں اس کو "مغفرت پناہ جنت مکان" لکھا گیا ہے۔ دیکھو مآثر دکن، بلگرامی ص ۱۱۸۔ حدیقۃ السلاطین علی بن طیفور بسطامی کتب خانہ سالار جنگ ص ۲۰۱ – ۲۰۵۔ سفر نامہ منوچی جلد سوم ص ۲۷۶۔

چند ہی روز میں تمام قطب شاہی مقبوضات حاصل کر لئے۔ ۱۰۷۰ھ (۱۶۵۹ء) میں اس کی فوجیں مدراس کے قریب پہنچ گئیں۔ سان تھوم پر، جہاں پرتگالیوں کو خارج کر کے قطب شاہی عملداری قائم کی گئی تھی ولندیزی قدم بڑھا رہے تھے۔ ۱۰۷۳ھ (۱۶۶۲ء) میں نیک نام خاں نے سان تھوم کا محاصرہ کر لیا اور یہاں قطب شاہی قبضہ ہو گیا۔ اس طریقے سے میر جملہ کی غداری کے باعث ساحلِ کارومنڈل میں جو سیاسی تلاطم برپا ہو گیا تھا اس کا سد باب ہو گیا۔ نیک نام خاں نے کوئی چالیس ہزار فوج کے ساتھ پیش قدمی کی تھی اور یہ پیش قدمی ایڈورڈ ونٹر کے ایک خط سے معلوم ہوتی ہے جو اس زمانے میں انگریزی کمپنی کا صدر تھا۔ اس خط میں جو ۱۰؍ دسمبر ۱۰۷۴ھ (۱۶۶۳ء) کا لکھا ہوا ہے، کہتا ہے کہ نیک نام خاں چالیس ہزار فوج کے ساتھ مدراس کے قریب پڑا ہوا ہے[1]۔ لیکن اس ضروری بند و بست کے ساتھ اس نے مزید فتوحات بھی حاصل کر لیں۔ یعنے حدیقۃ السلاطین کے الفاظ میں "تمام آں مملکت تسخیر نمودہ" یعنے کرناٹک کے زرخیز اقطاع جو ابھی فتح نہیں ہوئے تھے ایک مستقل سلطنت ہو گئی تھی، اس کو نیک نام خاں کا بڑا کارنامہ سمجھنا چاہئے۔

نیک نام خاں کی اس پیش قدمی سے انگریز کمپنی پر بہت اثر پڑا۔ ایک تو اس وجہ سے کہ یہ چالیس ہزار کی فوج کے ساتھ سینٹ طامس پر قبضہ کر بیٹھا تھا جو مدراس کے قلعۂ سینٹ جارج سے بہت قریب ہے۔ نیز نیک نام خاں انگریز کمپنی کا بہت مخالف تھا، اس کو ۱۰۵۷ھ (۱۶۴۷ء) کے "قول" سے جو میر جملہ نے انگریز کمپنی کو عطا کیا تھا اتفاق نہیں تھا، یہ انگریزوں سے جدید قول چاہتا تھا، تاکہ ان سے زیادہ رقم وصول ہو۔ کیوں کہ ۱۰۵۷ھ (۱۶۴۷ء) کے قول کے مطابق یہ طے ہوا تھا کہ انگریز کمپنی کروڑ گیری کی آدھی رقم گولکنڈے کی حکومت کو دیا کرے گی۔ اگر قول کے مطابق اس کی پابجائی ہوتی تو کوئی مضائقہ نہیں تھا، لیکن ۱۰۶۹ھ (۱۶۵۸ء) میں گرین ہل نے ایک اور شکل اختیار کر لی تھی، یعنے بجائے آدھی کروڑ گیری ادا کرنے کے صرف تین سو اسی ہون سالانہ

---

[1] مدراس کے اوراقِ پارینہ، جلد اول ص ۲۱۳۔

ادا کرتا تھا، اور اس کو "شہر کا کرایہ" کہا جاتا تھا۔ یعنے یہ رقم کمپنی مدراس کی سکونت کے معاوضے میں قطب شاہی سلطنت کو ادا کرتی تھی۔ لیکن انگریز کمپنی کے بیان کے مطابق جب نیک نام خاں ۱۰۷۴ھ / ۱۶۶۳ء میں کرناٹک کا گورنر ہو کر آیا تو اس نے یہ رقم لینے سے انکار کر دیا۔ اس نے نہ صرف کروڑ گیری کی تمام رقم طلب کی بلکہ یہ بھی کہا کہ "میں مدراس میں ایک حوالدار رکھوں گا جو سختی کے ساتھ تمام رسائد کی تنقیح کیا کرے گا۔"

انگریز کمپنی اس سے بہت ڈر گئی۔ ونٹر نے رعایت چاہی، لیکن نیک نام خاں نے ایک نہ سنی، کمپنی کو اس کی شرائط ماننی پڑیں، لیکن بد قسمتی سے اس زمانے میں کرناٹک کے نائکوں کی طرف سے پھر ایک نئی شورش برپا ہو گئی اور اس کا نتیجہ یہ ہو کہ نیکنام خاں کو اپنی تمام فوجوں کے ساتھ اس شورش کے سد باب کے لئے کرناٹک جانا پڑا اور کمپنی کو چند روز کے لئے دم لینے کا موقع مل گیا، اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نیکنام خاں کو کئی سال یعنے ۱۰۸۱ھ / ۱۶۷۰ء تک اس طرف توجہ کرنے کا موقع نہیں ملا۔ جب نائکوں کی شورش فرو ہو گئی تو پھر آہستہ انگریزوں کی طرف توجہ کی۔ اس زمانے میں ونٹر کی جگہ فاکس کرافٹ کمپنی کا صدر ہو کر آیا تھا۔ نیک نام خاں نے اس سے مطالبات کئے، کرافٹ نے لیت و لعل کیا تو مدراس کے راستے بند کر دیئے گئے اور ٹرپلی کین پر قبضہ کر لیا جس سے اہلِ مدراس اور کمپنی کو بہت تکلیف ہوئی اور کمپنی ایسی مجبور ہوئی کہ بالآخر ۱۰۸۲ھ / ۱۶۷۱ء میں نیک نام خاں کے تمام مطالبات منظور کر لئے۔ گزشتہ بقائے میں گیارہ ہزار ہون ادا کر دیئے اور آئندہ شہرِ مدراس کا کرایہ سالانہ ایک ہزار دو سو ہون اور چار ہزار دو سو روپے کروڑ گیری ادا کرنے کا وعدہ کیا۔ یہ قول فاکس کرافٹ کے جانشین لینگ ہارن سے طے ہوا۔ قول کا پورا متن جس میں نیکنام خاں نے ۲۳ فروری ۱۶۷۲ء کو دستخط کئے تھے یہ ہے :-

"میں بذریعۂ ہذا اس بات کو منظور کرتا ہوں کہ آج کے دن سے انگریز ان تمام

لہ مدراس کے اوراقِ پارینہ، جلد اول ص ۲۲۸ ۔ ۲۶۷ ۔ ۲۶۸ ۔

قدیم حقوق سے اور ان اراضی سے استفادہ کرسکیں گے جو مدراس پٹم سے متعلق ہیں اور دوسرے حقوق جو شہر چیناپٹن سے متعلق ہیں اسکے علاوہ میں اس بات کو منظور کرتا ہوں کہ جو پارچہ اور سامانِ تجارت انگریزوں کی ضروریات کے لئے جہازوں کے ذریعہ شہرِ چیناپٹن میں آتا ہے اس پر محصول نہ ہوگا۔ نیز میں نے گورنر مذکور الصدر کے ساتھ اس بات پر اتفاق کرلیا ہے کہ شہرِ چیناپٹن کا آدھا محصول ماہ مئی اور سنہ جاریہ سنہ ۱۶۷۲ء کی بابت گیارہ ہزار ہون ہوتے ہیں یہ رقم محصول مجھے وصول ہو چکی ہے۔ ایام گزشتہ کی ادائی کی بابت انگریز کمپنی بری کردی گئی ہے اور وہ آیندہ کسی حوالدار کو محصول دینے کے لئے مجبور نہیں ہے اور یہ شہر تاقیامِ شمس و قمر انگریزوں کے قبضہ و تصرف میں رہے گا۔

اور میں یہ بھی منظور کرتا ہوں کہ جو اشیاء انگریزوں کے استعمال کے لئے ہمارے علاقوں میں آئیں محصول سے مستثنیٰ رہیں گے۔ کوئی حوالدار اس کا مطالبہ نہ کرے گا۔ نیز دہان اور دیگر اجناس پارچہ اور دیگر اشیائے تجارت قلعہ چیناپٹن کی میراث ہوگی۔ نیز کوئی حوالدار یا عہدہ دار شہرِ چیناپٹن میں متعین نہیں کیا جائے گا۔ انگریز اس بات کے مجاز ہونگے کہ ہر طرح اس شہر کے نظم و نسق، انتظام اور انصاف کے فرائض ادا کریں۔

ہر گاہ انگریز ایک با امن قوم ہے اور اب تک اس قوم نے انصاف اور صداقت اور دیانت داری سے کام کیا ہے اس لئے میں نے ان کو وہ تمام حقوق عطا کردیئے ہیں جو انھیں اب تک حاصل تھے اور میں اس بات کا وعدہ کرتا ہوں کہ جو کوئی شخص انگریزوں کو برا بھلا کہے اور نقصان پہنچائے اس کو سزا دیجائے گی۔ میں یہ قول اس طرح عطا کررہا ہوں کہ موجودہ انگریز اور ان کے جانشین اس قول کے متن سے پورا فائدہ اٹھائیں گے ۔ ۲۳ فروری سنہ ۱۶۷۲ء"

---

[۱] مدراس کے اوراقِ پارینہ۔ ویسٹیجیس آف اولڈ مدرس۔ جلد اول ص ۳۴۳ — ۳۴۵۔

۱۰۸۳ھ / ۱۶۷۲ء میں قطب شاہی سلطنت میں بڑی تبدیلی ہو گئی، یعنے اسی سنہ میں عبداللہ قطب شاہ کا انتقال ہو گیا اور اس کی جگہ اس کے داماد ابو الحسن قطب شاہ کی تخت نشینی عمل میں آئی، لیکن اس تغیر سے حکومتِ کرناٹک کے مسلک میں کوئی فرق نہیں آیا۔ عبداللہ قطب شاہ کی وفات کے چند دنوں بعد ہی نیک نام خاں کا بھی انتقال ہو گیا اور اس کی جگہ نئے بادشاہ نے موسیٰ خاں کو کرناٹک کا طرفدار مقرر کر دیا۔ اس نئے طرفدار نے ۱۰۸۳ھ / ۱۶۷۲ء میں نیک نام خاں کے "قول" کی توثیق کر دی اور اسی سال بادشاہ نے رچرڈ موہن کو جو مسولی پٹم کا صدر تھا، بلا محصول تجارت کرنے کی اجازت دے دی۔[1] لیکن ایک سیاسی دشواری یہ پیدا ہوئی کہ عبداللہ قطب شاہ اور نیک نام خاں کے مرنے کی وجہ سے فرانسیسیوں کو جو مدراس کے جنوبی ساحلوں پر قابض تھے، پھر جرأت ہو گئی اور انھوں نے میدان خالی دیکھ کر سان تھوم پر دھاوا بول دیا۔ فرانسیسی قطب شاہی سلطنت پر پہلے سے خار کھائے ہوئے تھے، کیوں کہ اس سلطنت نے مسولی پٹم میں انگریزوں کے مقابلے میں ان کی ایک نہیں چلنے دی تھی۔ اس وقت فرانسیسی مقبوضات کے گورنر ڈی لاہے نے سید مظفر کو جو اس زمانے میں میر جملہ تھا، اپنے ساتھ ہموار کر لیا۔ سید مظفر اور موسیٰ خاں میں عداوت تھی، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مرکزی حکومت سے موسیٰ خاں کی کوئی مدد نہیں کی گئی اور اس کو پسپا ہونا پڑا۔ فرانسیسی سان تھوم پر قابض ہو گئے اور مسلمانوں کی کشتیوں اور جہازوں کو نقصان پہنچانے لگے۔ سید مظفر کی طرفداری کی وجہ سے نہ صرف حکومت ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکی بلکہ اس کے اشارے سے بادشاہ ان کو ایک لاکھ کراون کے معاوضے میں سان تھوم تفویض کرنے کے لئے تیار ہو گیا لیکن موسیٰ خاں خاموش نہیں رہا، بلکہ اس نے بابا صاحب کو فوج کی کمان دی اور اس کے بعد چناپلی مرزا کو فرانسیسیوں کے مقابلے میں بھیجا، اور اس نئے حملے سے سان تھوم کی بازیافت آسان ہو گئی اور یہ صرف چند دنوں کی بات رہ گئی تھی۔[2] لیکن سید مظفر نے پھر بے وفائی کی، اس خیال سے کہ

---

[1] مدراس کے اوراقِ پارینہ۔ جلد اول ص ۵۹۲۔
[2] " " " " ۳۲۷-۳۳۴۔

مبادا موسیٰ خاں کا وقار بڑھ جائے گا، اس کو مرکز میں واپس بلا لیا اور اسکی جگہ نامدار خاں کو مامور کر دیا۔ لیکن اس تبدیلی سے لڑائی میں کوئی فرق نہیں آیا بلکہ چنا پلی مرزا فرانسیسیوں کے مقابلے میں ڈٹا رہا۔ چونکہ ولندیزی اور انگریز بھی ان کے مخالف تھے اسلئے ۱۰۸۵ھ (۱۶۷۴ء) میں فرانسیسیوں نے ہتھیار ڈال دیئے اور قطب شاہی فوجیں سان تھوم پر قابض ہو گئیں۔[۱] اور اسی زمانے میں بادشاہ نے سید مظفر کو خدمت سے علٰحدہ کر کے مادنّا کو وزیر بنا دیا تھا جو نیک نام خاں کے مسلک کا پابند تھا۔

قطب شاہی فوجوں کی اس کامیابی سے انگریزوں پر خاطر خواہ رُعب بیٹھ گیا، چنانچہ انھوں نے حکومت کو خوش کرنے کے لئے مرکزی اور مقامی عہدہ داروں کو بے شمار نذرانے اور تحفے دیئے۔ مرکزی حکومت میں بادشاہ اور اس کے دیوان مادنّا و پیشکار اکنّا تھے اور کرناٹک میں نامدار خاں کے بعد مسکی میاں اور اس کے بعد محمد ابراہیم خلیل اللہ کرناٹک کے طرفدار مقرر ہوئے تھے۔ ان سب کو انگریز کمپنی نے بے شمار نذرانے اور تحفے دیئے جن میں کپڑے، آلات، ہتھیار وغیرہ شامل تھے۔ جو تحفے ابوالحسن قطب شاہ کو دیئے گئے تھے ان کی مالیت چار سو پچہانوے (۴۹۵) ہون تھی۔ اس کے علاوہ مادنّا کو ایک سو چوریاسی ہون اور نواب مسکی میاں کو ساڑھے اٹھیانوے (۹۸) ہون اور اکنّا کو ساڑھے باون ہون کی مالیت کے تحفے دیئے گئے۔ اس کے علاوہ جب کرناٹک کے طرفدار محمد ابراہیم کے بیٹے سکندر (جس کا خطاب سنجر خاں تھا) کی شادی مدراس میں ہوئی تو اس موقعے پر بھی انگریزوں نے اس کو چار سو ہون نذرانہ دیا تھا۔ جب کبھی بادشاہ نے مُلک کا دورہ کیا اور مسولی پٹم کے معائنے کے لئے گیا تو تمام کمپنیوں نے اس کی خدمت میں گراں قدر نذرانے پیش کئے۔ چنانچہ ۱۰۸۷ھ (۱۶۷۶ء) کے دورے میں کافی نذرانے ملے، اور رجب ۱۰۸۹ھ (۱۶۷۸ء) کا دورہ ہوا تو ولندیزوں نے بادشاہ کو دس ہزار ہون اور انگریزوں نے تین ہزار ہون نذرانہ دیئے۔

---

[۱] مدراس کے اوراقِ پارینہ۔ جلد اول ص ۱۴۳۔

اسی سنہ میں جب اکنّا اور مادنّا کے بیٹوں کی شادی قرار پائی تو ان وزراء کو ستو ہون نذرانہ دیا تھا۔ اس زمانے میں انگریز کمپنی کا صدر ریلنگ ہارن کی جگہ اسٹر نہام ماسٹر تھا جو ۱۰۸۸ھ/۱۶۷۷ء میں صدر مقرر ہوا تھا۔

ابو الحسن قطب شاہ کا عہدِ حکومت جس میں مادنّا وزیر تھا، انگریز کمپنی کے لئے سازگار نہیں تھا۔ یہ باضابطہ حکومت تھی اور اس میں قاعدے اور قانون کی سختی کیساتھ پابندی کی جاتی تھی۔ انگریز کمپنی کو اپنے عرائض بادشاہ تک پہنچانے کے لئے مرکزی حکومت میں اپنا ایک سفیر رکھنا پڑتا تھا۔ مادنّا کی ابتدائے وزارت میں انگریز کمپنی نے چند اور موضع کرایے پر لینے کی کوشش کی اور اجازت چاہی لیکن مادنّا دیوان نے یہ درخواستیں اس وجہ سے رد کردیں کہ اس سے سلطنت کا بہت نقصان تھا۔ ۱۰۹۶ھ/۱۶۸۴ء میں جب اسٹر نہام ماسٹر کی جگہ فورڈ صدر ہو کر آیا اور اس نے نہایت انکسار سے سکّہ سازی کی درخواست کی تو بڑی مشکل اور غور و خوض کے بعد اس کو مدراس میں صرف چاندی کے سکّے بنانے کی اجازت دی گئی۔ لیکن شرط یہ تھی کہ وہ قطب شاہی سکّے کے ہم وزن اور ہم قدر ہوں۔ تانبے کے سکّوں کی اجازت نہیں ملی۔ مغربی اقوام کے مقابلے میں دیسی تاجروں کی زیادہ حوصلہ افزائی کی جاتی تھی تاکہ یہ لوگ پیچھے نہ رہیں۔ مقامی عہدہ دار بھی انگریزوں سے سختی کے ساتھ سلطنت کے وقار کی خاطر قاعدوں کی پوری پابندی کرواتے تھے۔ چنانچہ پودلی لنگیا جو تقریباً ۱۰۸۶ھ/۱۶۷۵ء میں پوناملی کا طرفدار مقرر ہوا تھا اور بعد کو مسولی پٹم کی نگرانی بھی اس کے سپرد ہوئی تھی بہت سخت گیر آدمی تھا اس نے انگریزوں سے قانونِ مُلک کی پوری پابندی کروائی۔ چنانچہ ۱۰۸۶ھ/۱۶۷۵ء کا واقعہ ہے کہ لنگیا نے ان علاقوں کا دَورہ کیا جہاں انگریز کمپنی متمکن تھی، اہلِ کمپنی نے اس کا استقبال نہیں کیا اور بادشاہ کی طرف سے جو خلعتیں آئی تھیں وہ قبول نہیں کیں۔ اس کے علاوہ لنگیا کو یہ بھی شکایت تھی کہ کمپنی دیسی تاجروں کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کرتی تھی، یعنے انگریزوں کو تو بلا محصول درآمد برآمد کی

اجازت تھی لیکن جب دیسی تاجر اپنا سامان مدراس میں لاتے تھے تو انگریز کمپنی محصول لگاتی تھی۔ چنانچہ اس کی پاداش میں لنگپا نے مدراس کو محصور کر لیا اور درآمد و برآمد بند کر دی۔ کمپنی بالآخر مجبور ہو گئی اور لنگپا کے شرائط تسلیم کر لئے۔ ۱۰۸۸ھ/۱۶۷۷ء میں جب کہ اسٹرینہام ماسٹر کمپنی کا صدر مقرر ہوا تو لنگپا سے ایک اور آویزش ہو گئی، یعنی کمپنی قلعہ سینٹ جارج کی مرمت کے لئے دیسی تاجروں پر محصول عائد کرنے لگی، اور دوسرے مدراس کا کرایہ براہِ راست مرکزی حکومت کو بھیجنے لگی جس پر لنگپا کو اعتراض تھا۔ جب کمپنی مخالفت پر اڑ گئی تو لنگپا نے ۱۰۸۹ھ/۱۶۷۸ء میں مدراس کا محاصرہ کر لیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کمپنی نے نذرانہ دے کر معافی مانگی۔ کمپنی نے لنگپا کو نیچا دکھانے کے لئے بہتیری کوششیں کیں کہ ان کا مرکز سے راست تعلق ہو جائے لیکن مرکزی حکومت نے منظور نہیں کیا۔ برخلاف اس کے لنگپا کا وقار بڑھتا گیا، یہاں تک کہ وہ ۱۰۹۳ھ/۱۶۸۲ء میں پورے کرناٹک کا گورنر ہو گیا اور کمپنی کی کوئی کارروائی لنگپا کے توسط کے بغیر مرکز میں نہیں آسکتی تھی۔ جب ۱۰۹۳ھ/۱۶۸۲ء میں لنگپا اپنی خدمت سے علیحدہ ہوا اور اس کی جگہ عبدالنبی خاں مقرر ہوا تو اس نے بھی لنگپا کے مسلک کی پابندی کی۔ چنانچہ اس کے زمانے میں بھی انگریز اور ولندیزی قانون شکنی کی جرأت نہیں کر سکے۔ جب ۱۰۹۵ھ/۱۶۸۵ء میں جنگِ ملکھیڑ ہوئی اور قطب شاہی سلطنت مغلوں کے مقابلے میں شکست کھا گئی تو اس سے فائدہ اٹھا کر انگریز اور ولندیزی کمپنیوں نے مسولی پٹم پر قبضہ کرنا چاہا اور ادائی کرایہ سے پہلوتہی کرنے لگیں لیکن اس میں ان کی ایک نہیں چلی۔ سلطنت نے ان سے سختی سے کرایہ وصول کر لیا، البتہ ۱۰۹۸ھ/۱۶۸۷ء میں جب گولکنڈے کا بالکل خاتمہ ہو گیا تو انگریز کمپنی کی بالآخر مرادیں بر آئیں اور یہ ایسی مقتدر ہو گئی کہ پورے دکن پر مسلط ہو گئی۔ اگر مغل شہنشاہت قطب شاہی سلطنت کا خاتمہ نہ کرتی تو قرائن یہ ہیں کہ انگریز کمپنی کو یہ ترقی کبھی نصیب نہ ہوتی۔

ل مدراس کے اوراقِ پارینہ۔ جلد اول ص ۳۵۶۔

سیواجی سے تعلقات لیکن کرناٹک کی یہ تاریخ مرہٹہ رہنما سیواجی کے ذکر کے بغیر پوری نہیں ہو گی۔ ہم جانتے ہیں کہ شاہ جی نے بیجاپور کی طرف سے جنجی تک کرناٹک کے بہت سے علاقے فتح کئے تھے اِس کے مرنے کے بعد اس کا بیٹا یکوجی جو سیواجی کا بھائی تھا، ان علاقوں کا طرفدار تھا اس زمانے میں یہ تنجور اور مدورا کے نائکوں کی باہمی کشمکش سے فائدہ اُٹھا کر تنجور پر قبضہ کر بیٹھا تھا۔ یکوجی کی یہ ترقی سیواجی کو پسند نہ تھی، وہ یکوجی کو ہٹا کر خود قبضہ کرنا چاہتا تھا۔ جب ۱۰۸۷ھ ۱۶۷۶ء میں سیواجی نے اپنی پیش قدمی شروع کی تھی تو اس وقت سب حالات اس کے سازگار تھے۔ اس وقت اس نے مغل سلطنت سے صُلح کر لی تھی اور وہ اس صُلح کی رو سے اب شمال میں حملہ کر سکتا تھا، اسکے سامنے صرف جنوب کا راستہ کُھلا ہوا تھا۔ اس کے علاوہ اس وقت بیجاپور اور صوبہ دار دکن بہادر خاں کوکلتاش" میں لڑائی ہو رہی تھی۔ اس طرح سیواجی کرناٹک میں اپنے پاؤں پھیلا سکتا تھا لیکن کرناٹک کی یہ فتوحات قطب شاہی امداد کے بغیر ممکن نہ تھیں، اس لئے سیواجی ۱۰۸۷ھ ۱۶۷۷ء میں حیدر آباد آیا اور قطب شاہی سلطنت سے ایک قرار داد کر لی۔ گولکنڈے کے ارباب سیاست جن میں بادشاہ اور اس کا وزیر مادنّا دونوں شامل ہیں، سیواجی کے اتحاد کو اس وجہ سے ضروری سمجھتے تھے کہ مغلوں کے ڈر سے وہ خود کرناٹک میں پیش قدمی نہیں کر سکتے تھے، کیوں کہ مغل سلطنت محمد سعید میر جملہ کی غداری کی وجہ سے کرناٹک پر آنکھ لگائے ہوئے تھی اور میر جملہ کے مفتوحہ علاقے طلب کر رہی تھی۔ سیواجی سے معاہدہ یہ ہوا کہ دونوں طاقتیں مغلوں کے مقابلے میں ایک دوسرے کی مدد کریں، دوسرے سیواجی کی فوجی خدمات کے معاوضے میں جو کرناٹک میں ہونے والی تھیں، قطب شاہی سلطنت کی طرف سے ایک لاکھ ہون سیواجی کو دیئے جائیں گے اور جب تک وہ کرناٹک میں ٹھیرا رہے گا فوجی اخراجات کے لئے تین ہزار روپے ہر روز دیئے جائیں گے اور کرناٹک میں جو فتوحات حاصل ہوں گی ان میں سے شاہ جی کے مقبوضات کو چھوڑ کر باقی قطب شاہی سلطنت کو ملیں گی۔

بہ ظاہر یہ معاہدہ خوشگوار معلوم ہوتا تھا، کیوں کہ اس سے یہ توقع تھی کہ قطب شاہی سلطنت کے تمام منصوبے سیواجی کے توسط سے حاصل ہو جائیں گے، لیکن سیواجی نے اس معاہدے کی ذرّہ برابر پابندی نہیں کی! اس نے گولکنڈے کو سبز باغ دکھاکر تمام فائدے تو حاصل کر لئے لیکن کرناٹک کی فتوحات میں سے اس سلطنت کو کچھ نہیں دیا جو کھلی بدعہدی تھی۔ اس نے ایک طرف قلعۂ جنجی فتح کر لیا، کیوں کہ یہاں عادل شاہی عہدہ دار نذر محمد اور شمشیر خاں آپس میں لڑ رہے تھے اور ابوالحسن قطب شاہ سے مدد مانگی تھی، دوسری طرف اس نے سطح مرتفع میسور کے بے شمار علاقے اور قلعے فتح کر لئے۔ مفتوحہ قلعوں کی تعداد سو بتائی جاتی ہے اور ان کی آمدنی چالیس لاکھ ہون تھی، کیوں کہ یہاں سونے اور جواہر کے معدن بھی تھے، لیکن سیواجی نے ان فتوحات میں سے گولکنڈے کو کچھ نہیں دیا، بلکہ یہاں سے سیدھے بیجاپور چلا گیا۔ قطب شاہی حکومت سیواجی کے اس غلط طرزِ عمل سے بہت برافروختہ ہوگئی۔ مادنّا نے محمد ابراہیم سرلشکر کو جنجی اور ویلور کے قلعوں پر وار کرنے کے لئے بھیجا اور ادھر لنگپا کو حکم ہوا کہ میسور کے مفتوحہ علاقوں پر دھاوا کر کے مرہٹہ اقتدار سے سلب کر لیں۔ لیکن اس کے خاطر خواہ نتائج برآمد نہیں ہوئے[1]۔

---

[1] اس باب میں کرناٹک اور مغربی اقوام سے متعلق جو معلومات درج کئے گئے ہیں ان میں اکثر مدراس کے انگریزی وثائق سے حاصل ہوئے ہیں، اور مجھے میرے دوست اور شاگرد بھوپال راؤ ایم۔ اے کے توسط سے ملے، جس کے لئے میں موصوف کا بہت ممنون ہوں۔

سترھواں باب

مغل سلطنت سے پرخاش

نظام شاہی سلطنت کا خاتمہ اور گولکنڈہ و بیجاپور کی حکم برداری دونوں لازم و ملزوم تھے۔ اس واقعے کے بعد دکن کی فضا ایسی خاموش ہو گئی کہ آیندہ بیس سال تک کوئی تلاطم نہیں ہوا، اور مغل سلطنت کو اس طرف کوئی توجہ کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ ۱۰۴۶ھ (۱۶۳۶ء) میں جب شاہجہاں نے دکن کے معاملات سے فراغت پائی تو شہزادہ اورنگ زیب کو دکن کا صوبہ دار بنایا اور خود شمال چلے گئے۔ یہ اورنگ زیب کی پہلی گورنری ہے جو ۱۰۴۶ھ (۱۶۳۶ء) سے ۱۰۵۴ھ (۱۶۴۴ء) تک جاری رہی۔ اس دوران میں مغل علاقوں کی خاطر خواہ نگہداشت ہوئی اور گولکنڈہ و بیجاپور کی ریاستوں نے اپنے معاہدوں کی پوری پابندی کی اور شکایت کی کوئی وجہ نہیں پیدا ہوئی۔ لیکن جب شمال کے ناگزیر حالات میں اورنگ زیب کو اس نظامت سے برخاست کیا گیا تو دکن کے حالات پھر خراب ہو گئے۔ کیوں کہ اورنگ زیب کے جانے کے بعد جو لوگ دکن کی نظامت پر مامور رہے تھے وہ اس کام کے اہل ثابت نہیں ہوئے۔ خانِ دوراں، جے سنگھ، اسلام خاں مشہدی، شاہ نواز خاں، مُراد بخش اور شائستہ خاں سب ناکام ہوئے۔ ان لوگوں کی نااہلی کی وجہ سے نہ صرف دکن کے چاروں صوبوں کی حالت خراب ہو گئی جو راست مغلوں کی عملداری میں تھے اور مالگزاری میں بے حد خسارہ پڑ گیا، بلکہ گولکنڈہ اور بیجاپور کی

ریاستوں سے بھی مغل سلطنت کے تعلقات کشیدہ ہو گئے، کیوں کہ مغل صوبہ داروں کی کمزوری سے فائدہ اُٹھا کر ان سلطنتوں نے ۱۰۴۶ھ ۱۶۳۶ء کے معاہدے سے گریز کرنا شروع کر دیا۔ اتفاق یہ ہے کہ اسی زمانے میں مغلوں کو قندھار کے محاصرے میں شکست ہو گئی اور اسکا نفسیاتی اثر مُلک کے دُور دراز گوشوں میں پڑنے لگا اور دکنی سلاطین بھی اس سے بہت خوش ہوئے۔ یہ اپنے موجودہ خراج و پیش کش کی ادائی اور سیاسی و مذہبی بندشوں کی پابندی میں ہر روز لیت و لعل کرنے لگے۔ ان حالات میں شہنشاہ نے پھر (۱۰۶۳ھ ۱۶۵۲ء) اورنگ زیب کو دکن کی نظامت سپرد کی۔ شہزادہ اورنگ زیب ۱۰۶۳ھ ۱۶۵۲ء میں جب دوسری مرتبہ دکن کا ناظم بن کر آیا تو اس کو سخت مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا، کیوں کہ اب دکن کے سیاسی اور معاشی حالات بے حد پیچیدہ ہو گئے تھے۔ شہزادے کو نہ صرف مغل صوبوں میں از سر نو اصلاحات اور نظم و نسق کر کے نقصانات کی تلافی کرنی پڑی، بلکہ معاہدوں کی روشنی میں بیجاپور اور گولکنڈے کے سیاسی تعلقات کو پھر روبراہ کرنا پڑا، جیسے ۱۰۴۶ھ ۱۶۳۶ء میں تھے۔

اورنگ زیب کو قطب شاہی سلطنت سے سخت شکایتیں تھیں۔ پہلی شکایت یہ تھی کہ اس سلطنت نے ۱۰۴۶ھ ۱۶۳۶ء کے معاہدے کو بالکل پسِ پُشت ڈال دیا تھا، یعنے اول تو یہ سلطنت اپنا سالانہ خراج جس کی مقدار دو لاکھ ہون تھی ادا نہیں کر رہی تھی، حالانکہ مغلوں کے نقطۂ نظر سے یہ سلطنت ایسی سیر حاصل تھی کہ اس کو خراج کی ادائی میں کوئی عذر نہ ہونا چاہیئے۔ اورنگ زیب نے صوبہ داری کا جائزہ لیتے ہی فوراً خراج اور پیش کش طلب کئے جو سلطنت کے ذمے کئی سال سے باقی تھے۔ نیز ہون کی قدر میں جو اضافہ ہو گیا تھا، یعنے اس کی قدر بجائے چار کے پانچ روپے تک پہنچ گئی تھی وہ بھی طلب کیا گیا۔ چنانچہ اورنگ زیب نے لکھا تھا کہ:-

"تتمہ پیش کش سابق بزودی روبراہ گشتہ۔۔۔ بہ حضور پُر نور برسد و وصول وجوہ پیشکش حال از میعاد در نہ گزشتہ امہالے در آن نہ رود"[1]

---

[1] رقعات عالمگیری مولفہ نجیب اشرف صاحب ندوی۔ جلد اول ص ۱۸۶۔۱۸۷۔

گولکنڈے کی دوسری عہد شکنی یہ تھی کہ پھر یہاں سب صحابۂ کبار رضی کی مذموم رسم شروع ہو گئی تھی اور ایران سے وہی سیاسی تعلقات پیدا ہو گئے تھے جو معاہدے سے پہلے تھے، چنانچہ اورنگ زیب کے الفاظ ہیں :-

"ترکِ سُنت و اظہارِ بدعت شعار خود ساختہ ...... وخود را به فتراکِ والیِ ایران بستہ ہمہ وقت پیش کش ہائے گراں بہ اومی فرستند"۔

اس کے علاوہ ایک اور تازہ شکایت یہ تھی کہ راجہ چندر گیری سری رنگ رائل نے گولکنڈے کی دست درازیوں سے بچنے کے لئے مغل سلطنت کا سہارا ڈھونڈنا چاہا، چنانچہ اس نے شہزادہ اورنگ زیب اور شہنشاہ کے پاس اپنے آدمی روانہ کئے اور امداد کے بدلے شہنشاہ کی خدمت میں پچاس لاکھ ہون، دوسو ہاتھی، قیمتی جواہر اور سالانہ پیش کش و نذرانہ دینے کا وعدہ کیا، اور یہ بھی لالچ دی کہ شہنشاہ چاہیں تو میں مسلمان ہونے کے لئے تیار ہوں۔ اس لالچ میں اورنگ زیب اور شاہجہاں دونوں بیجاپور اور گولکنڈے کے مقابلے میں کرناٹک کے راجہ کی مدد کے لئے تیار ہو گئے۔ چنانچہ اورنگ زیب نے پُر زور الفاظ میں شہنشاہ کو راجہ کی امداد کے لئے توجہ دلائی تھی۔

میر جملہ کی غداری

یہ تمام شکایتیں آسانی سے حل ہو جاتیں اور معاملات انتہائی حد کو نہیں پہنچتے، چنانچہ سری رنگ رائل کے معاملے میں سلاطینِ دکن نے بالا بالا شاہجہاں کی خدمت میں نذرانے پیش کر کے شہنشاہ کو راضی کر لیا کہ وہ اس معاملے میں دخل نہ دیں اور شہنشاہ نے خاموشی اختیار کر لی، اور اب رہا عہد شکنی تو اس کی بھی انھوں نے تلافی شروع کر دی تھی۔ یعنے عبد اللہ قطب شاہ نے اپنے بقائے میں اٹھائیس لاکھ روپے ادا کر دیئے اور ظاہر ہے کہ اس کے بعد تو کوئی شکایت نہ ہونی چاہیئے تھی لیکن قطب شاہی سلطنت کی بدقسمتی سے محمد سعید میر جملہ کا ایک نیا شاخسانہ پیدا ہو گیا جس کا سُلجھانا قطب شاہی سلطنت کے بس کی بات نہ تھی۔ محمد سعید وہ شخص ہے جو ۱۰۴۳ھ (۱۶۳۳ء) میں بہت خستہ حالت میں

گولکنڈہ آیا تھا،[۱] لیکن اپنے سیاسی ہتھکنڈوں سے کام لے کر جلد ترقی کر گیا اور ۱۰۴۹ھ/۱۶۳۹ء میں میر جملہ ہو گیا جو قطب شاہی سلطنت کا جلیل القدر عہدہ تھا۔ چونکہ اس زمانے میں تسخیر کرناٹک کی بہت روا روی تھی، بادشاہ نے محمد سعید ہی کو اس کام کے لئے موزوں سمجھا۔ غالباً محمد سعید نے خود اس کی خواہش کی تھی کہ یہ کام اس کے سپرد کیا جائے۔ ظاہر ہے کہ کرناٹک کے کمزور رائلوں اور نائکوں کو مغلوب کرنا کچھ مشکل

---

[۱] محمد سعید کا ابتدائی خاندانی تعلق اردستان سے تھا، لیکن اس کی پیدائش اصفہان میں ہوئی تھی، کیوں کہ اس کا باپ اصفہان میں آباد تھا اور تیل بیچتا تھا، اس لئے اس کو "از سادات اردستان" در اصفہان کہا گیا ہے (مآثر الامراء جلد سوم ص ۵۰۰) چونکہ گولکنڈے کی سلطنت اپنے جواہر کی وجہ سے بہت مشہور تھی اس لئے محمد سعید اپنی قسمت آزمائی کے لئے ۱۰۴۰ھ/۱۶۳۰ء میں گولکنڈہ آیا۔ غالباً اس کا ورود گولکنڈے میں کسی بڑے تاجر کے ساتھ ہوا تھا جو یہاں جواہر کی تجارت کرتا تھا، اور محمد سعید اس تاجر کے کاروبار میں معمولی نوکر کی حیثیت میں شریک تھا (مدراس کے اوراق پارینہ جلد اول ص ۳۷)۔ منوچی کہتا ہے کہ محمد سعید ایران کے ایک بڑے تاجر کا نوکر تھا، اور یہ تاجر گھوڑوں کی تجارت کے لئے گولکنڈہ آیا تھا۔ محمد سعید ان گھوڑوں کی نگرانی کیا کرتا تھا، لیکن جب یہ گولکنڈہ آیا ہے تو اس کی حالت یہ تھی کہ وہ راستوں میں جوتے بیچتا پھرتا تھا، لیکن چند ہی روز میں چھوٹے کاروبار سے بڑھ کر جواہر کی تجارت شروع کر دی اور ایک بڑی دولت جمع کر لی اور درباریوں کو فراہم کر کے بادشاہ کے پاس رسوخ پیدا کر لیا۔ جب بادشاہ کے پاس پیش ہوا تو گھوڑ عمدہ ہاتھی، یورپ اور چین کے نایاب کپڑے پیش کئے جن سے بادشاہ بہت خوش ہوا اور اس کو نوکری دی۔ غالباً اس کو درجہ بدرجہ ترقی دی گئی تھی، اور جب وہ اپنے کام میں اہل ثابت ہوا تو بالآخر بادشاہ نے اس کو کرناٹک کا طرفدار بنا دیا (منوچی۔ جلد اول ص ۲۳۲)۔

نہیں تھا، چنانچہ پچھلے باب میں ہم یہ دیکھ آئے ہیں کہ ۵۵ء۱۰ھ / ۴۵–۱۶۴۶ء میں میر جملہ نے کرناٹک کے ایک بڑے حصے پر جس کے حدود ساحلِ مدراس سے ملتے تھے، مسخر کرلیا ان فتوحات کی وسعت جن میں کڑپا، سدھوٹ اور گندی کوٹہ شامل تھے، تین سو میل طویل اور پچاس میل عرض بتائی جاتی ہے اور چالیس لاکھ ان کا محاصل تھا۔ خود گندی کوٹہ ایک چھوٹی راجدھانی تھی۔ زراعت اور جواہر کے معدنوں کی وجہ سے یہ خطہ اس قدر زرخیز تھا کہ میر جملہ نے یہاں اپنی جاگیریں پیدا کرلیں اور ہزاروں کی دولت جمع کرلی۔ اس کے علاوہ نئے معدن دریافت کر کے لاکھوں روپے کے جواہر حاصل کر لئے۔ سمندر میں اس کے جہاز چلتے تھے۔ قطب شاہی فوج کے علاوہ جو اس کی سرکردگی میں تھی اپنے ذاتی خرچ سے ایک اور مستقل فوج جمع کرلی تھی جس میں فرانسیسی توپیں تھیں اور توپچی نوکر تھے۔ اس فوج کی تعداد کوئی پانچ ہزار سوار اور بیس ہزار پیدل بتائی جاتی ہے[۱] میر جملہ کے اس شاہانہ انداز سے آس پاس کے لوگ بہت ڈرتے تھے، چنانچہ مغربی تاجر یعنے پرتگالی اور فرانسیسی اس کے پاس تحفے اور نذرانے بھیجتے تھے[۲]۔ مدراس کے "قول" کے سلسلے میں اس نے انگریزوں سے توپیں وصول کی تھیں۔

ان حالات میں محمد سعید کرناٹک کا ایک مقتدر رئیس بن بیٹھا تھا اور اس غیر معمولی اقتدار کے گھمنڈ میں وہ اپنے کو قطب شاہی سلطنت سے بے نیاز سمجھنے لگا اور ایک خود مختار سلطنت کی ٹھان لی۔ ادھر بادشاہ اور اس کے درباری بھی اس کی بڑھتی ہوئی طاقت سے بدگمان ہونے لگے اور بادشاہ کو سمجھایا کہ وہ ایک روز باغی ہو جائے گا۔ یہ بدگمانی بے معنے نہیں تھی، کیوں کہ کرناٹک کی فوج کشیوں میں میر جملہ کو جو مالِ غنیمت دستیاب ہوا تھا وہ مرکزی حکومت کے حوالے نہیں کیا گیا، اور

---

[۱] منوچی، جلد اول ص ۲۳۲۔ ٹیورنیر، جلد اول ص ۲۲۷۔

[۲] " " عملِ صالح، جلد سوم ص ۲۱۳۔ پرتگالی مقبوضات کا گورنر دام فلیپ مسکرینہاس نے گو اسے میر جملہ کے پاس بہت سے نایاب تحفے بھیجے تھے۔

جس وقت اس مالِ غنیمت کا مطالبہ ہوا تو اس کی پابجائی سے صاف انکار ہونے لگا اور اس کی یہ وجہ بتائی کہ کرناٹک کی تمام فتوحات اور ان کا مالِ غنیمت اسی کی کوششوں کا پھل ہے، اس سے سلطنت کو کوئی سروکار نہیں۔ حالانکہ یہ دعویٰ غلط تھا۔ میر جملہ آخر گولکنڈے کا ملازم تھا، یہ سب اس کے فرائض تھے۔ مرکزی حکومت کو ہر روز یہ خوف محسوس ہونے لگا کہ کہیں یہ اس کے پنجے سے باہر نہ نکل جائے، کیوں کہ کرناٹک کے ایک دُور دراز خطے میں جہاں مرکزی حکومت کی کوئی گرفت نہیں تھی وہ ایسا مستحکم تھا کہ بادشاہ اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے تھے۔ اب بادشاہ کے پاس صرف ایک ہی چارۂ کار تھا کہ اس کو گولکنڈہ طلب کر کے پھانس لے۔ چنانچہ درباریوں کے کہنے سے بادشاہ نے اس کو بار بار گولکنڈہ طلب کیا۔ پہلے تو اس نے بادشاہ کے ہاں آنے سے انکار کر دیا، لیکن جب مرکزی حکومت سے اصرار ہوا تو چند روز کے لئے گولکنڈہ آیا، اور غالباً دربار میں بھی باریاب ہوا تھا، لیکن جب اہلِ دربار کے اشارے سے بادشاہ نے اس کو پھانسنا چاہا[1] اور محمد سعید کو اس کی خبر لگی تو وہ پھر راتوں رات کرناٹک بھاگ گیا اور قطب شاہی حکومت سے آزاد ہونے کی کوشش شروع کر دی۔ قطب شاہی نمک کا تو اسے کوئی پاس و لحاظ تھا نہیں کہ وہ عبداللہ کی اطاعت کر لیتا، لیکن اس کے ہاں اتنی طاقت بھی نہ تھی کہ سلطنت سے کھلی لڑائی مول لیتا۔ اپنی فوجی طاقت کے باوجود جس میں اہلِ یورپ بھی نوکر تھے اس کا کامیاب ہونا مشکل تھا اس لئے وہ ایران، بیجاپور اور مغل سلطنت کی حمایت ڈھونڈنے لگا کہ ان میں سے کوئی طاقت اس کو پناہ دیدے۔ اس غرض کے لئے اس نے ایک طرف شاہِ ایران اور والیِ بیجاپور کو خطوط لکھے تو دوسری طرف مغل سفیر کو اپنے ارادے کی اطلاع دی جو گولکنڈے میں متعین تھا۔ اول الذکر دو سلطنتوں نے اس کی درخواست فوراً منظور کر لی

---

[1] ایک روایت یہ ہے کہ بادشاہ محمد سعید کو گرفتار کر کے اندھا کرنا چاہتا تھا۔ یا ٹیورنیر کے الفاظ میں "اس کو زہر دینا چاہتا تھا" (سیاحت نامہ ٹیورنیر، جلد اول ص ۱۲۷)۔

اور ادھر جب گولکنڈے کے حاجب عبداللطیف کی رپورٹ اورنگ زیب کے ہاں پہنچی تو یہ محمد سعید کی مدد کے لئے تیار ہوگیا اور شاہجہاں کے پاس سفارش کر دی:-

"محمد سعید میر جملہ ہموارہ اظہارِ عقیدت و ارادت نسبت درگاہ سلاطین پناہ می نماید۔ دریں وقت اورا بہ انواع نوازشات پادشاہی مستمال ساختہ بہ بندگی درگاہ والا جاہ رہنمون گرداند"

اور شہنشاہ نے یہ سفارش منظور کر لی اور محمد مومن کو جو سرہی رنگ رائل کے لئے مقرر ہوا تھا محمد سعید میر جملہ کے پاس اظہارِ ہمدردی کرنے کے لئے کرناٹک بھیجا گیا۔ حالانکہ یہ طرزِ عمل بین الاقوامی اور سیاسی اصول کے منافی تھا۔ بیجاپور سے جو معاہدہ ہوا تھا اس میں اس بات کی صراحت تھی کہ جانبین ایک دوسرے کے باغیوں کی سرپرستی نہیں کریں گے۔[۵]

جب گولکنڈہ اور بیجاپور کی حکومتوں کو یہ معلوم ہوا کہ مغل سلطنت محمد سعید کی تائید کرنا چاہتی ہے تو یہ دونوں بہت پریشان ہوئیں اور ان کو یہ خیال ہوا کہ اگر محمد سعید سچ مچ شاہجہاں کے پاس چلا جائے تو اس کے ذریعے سے ان سلطنتوں کے تمام راز فاش ہو جائیں گے، اس لئے ان دونوں سلطنتوں نے اس کی خوشامد شروع کر دی۔ چنانچہ اورنگ زیب کے الفاظ سے کہ "قطب الملک نیز در مقام استمالت اوست" اس کی تصدیق ہوتی ہے۔ دوسری طرف خود میر جملہ بھی مغل سلطنت کو دھوکا دینے لگا۔ یہ دراصل دل سے مغلوں کی ملازمت نہیں چاہتا تھا، بلکہ اس کا منصوبہ یہ تھا کہ مغلوں کے اثر سے کام لے کر قطب شاہی سلطنت کو مرعوب کرے اور اس طریقے سے کرناٹک میں اپنی خود مختارانہ ہستی قائم رکھے، چنانچہ محمد مومن کے بیان سے جو کرناٹک سے واپس آیا تھا اس کی تصدیق ہو گئی، اور جب اورنگ زیب نے شہنشاہ کے اصرار پر

---

[۵] عملِ صالح۔ جلد سوم ص ۲۱۳۔

[۶] بادشاہ نامہ۔ عبدالحمید لاہوری، حصۂ دوم ص ۱۷۲: قطب شاہی سلطنت پر بھی اس کا اطلاق ہوتا تھا۔

میر جملہ کو مغل حکومت نے بار بار ترغیب دی تو اس نے جواب دیا کہ :-

"بہ انقضائے مدتِ دو سال یا پدیدنِ قطب الملک بیاید یا ترکِ نوکری کردہ عزیمتِ حرمین شریفین نماید"[1]

اگرچہ اس کے بیٹے محمد امین نے، جو گولکنڈے میں تھا باپ کی طرف سے صفائی کی اور مغل حاجب محمد امین کو یقین دلایا کہ اس کے باپ کا بیان صرف ایک وقتی مصلحت پر مبنی ہے، دراصل ہم لوگ مغل ملازمت میں آنا چاہتے ہیں لیکن اسکے دل کی بات وہی تھی جو اس کے طرزِ عمل و بیان سے ظاہر ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اگر میر جملہ دکنی طاقتوں سے نہ ڈرتا تو وہ غالباً کبھی مغلوں کی پناہ نہیں ڈھونڈتا لیکن اس کے لئے ایک خطرہ یہ تھا کہ اس کے دھوکے اور فریب سے گولکنڈہ و بیجاپور کی سلطنتیں اس کی تباہی کے درپے ہو گئیں، کیوں کہ اس نے بیجاپور کو بھی دھوکے میں رکھا تھا۔ ادھر گورنر بنگال شجاع کو بھی اس نے ترغیب دی تھی کہ گولکنڈے پر حملہ کرلے اور اپنی مدد کا وعدہ بھی کیا تھا[2] اور اورنگ زیب سے بھی درخواست کی تھی کہ گولکنڈے پر حملہ کر دے اور چالیس ہزار سواروں سے مدد کا وعدہ کیا تھا[3]۔ ان خوفناک حالات سے مجبور ہو کر میر جملہ نے بالآخر مغل سلطنت کا دامن پکڑ لیا، کیوں کہ اس کے سوا اب اس کے پاس بچاؤ کی کوئی اور صورت نہ تھی۔ چنانچہ اس کی درخواست پر شہنشاہ نے ۱۴ر صفر ۱۰۶۶ھ مطابق ۳ر دسمبر ۱۶۵۵ء کو محمد عارف کشمیری کے ساتھ خلعتِ فاخرہ با منشورِ نوازش متضمن عنایت منصب پنجہزاری پنجہزار سوار بہ دو ہزاری دو ہزار سوار بہ محمد امین پسرش بھیج دیئے[4]۔ اس کے ساتھ عبد اللہ قطب شاہ کو بھی دھمکی دی گئی کہ "محمد سعید کے

---

[1] مقدمۂ رقعات عالمگیری، مولفہ نجیب اشرف صاحب، حصۂ اول ص ۱۶۰۔

[2] ٹیورنیر، جلد اول ص ۱۴۵۔

[3] منوچی، جلد اول، ص ۲۳۳۔

[4] مآثر الامراء، جلد سوم ص ۵۳۱۔ عمل صالح، جلد سوم ص ۲۱۴۔

متعلقین پر کوئی دست درازی نہ کرے۔" کیوں کہ محمد سعید کا بیٹا اور دوسرے متعلقین گولکنڈے میں مقیم تھے۔

لیکن ابھی شہنشاہی فرمان جو میر جملہ (محمد سعید) اور عبداللہ قطب شاہ کے نام موسوم تھے گولکنڈہ نہیں پہنچے تھے کہ میر جملہ کے بیٹے محمد امین نے اپنی احمقانہ حرکات کی وجہ سے سیاسی فضا اور بھی مکدّر کردی۔ یہ پہلے سے "بہ نشہ دوبالائے جوانی و دولت سرشار رعونتے در سر داشت" اب اپنے باپ کی روز افزوں طاقت اور مغل سلطنت کی حمایت سے اور بھی مغرور ہوگیا، یعنے "پا از حد خود فروتر گذاشت"۔ ایک روز نشہ میں چُور دربار میں آکر شاہی مسند پر سوگیا اور قئے کردی[۱]۔ یہ ایسی گستاخانہ حرکت تھی کہ بادشاہ اس سے چشم پوشی نہیں کرسکتا تھا، بلکہ حکومت کا وقار قائم رکھنے کے لئے اس کا تدارک کرنا ضروری سمجھتا تھا۔ چنانچہ بادشاہ نے اس کو گرفتار کرکے اس کا مال و جائداد ضبط کرلی۔ گو اس دوران میں محمد امین کے لئے شہنشاہی احکام بھی پہنچ گئے تھے اور یہ عبداللہ کو دکھلائے گئے لیکن بادشاہ نے ایک نہیں سُنی اور برابر تدارک کیا[۲]۔ چونکہ یہ گولکنڈے کی طرف سے شہنشاہی احکام کی خلاف ورزی تھی اس لئے مغل حکومت شہنشاہی وقار کی حفاظت کے لئے عبداللہ قطب شاہ کی سرکوبی پر تُل گئی۔ پہلے تو عبداللہ کے نام احکام پہنچے کہ "بایدکہ پسرش (محمد امین) را روانہ این جانب نماید والا لشکر ظفر اثر را بہ گولکنڈہ رسیدہ داند"۔ اور اس اثناء میں ہادی داد خاں نامی ایک مغل جنرل کو جو دیوگڈھ میں تھا، قندھار پر کوچ کرنے کا حکم دے دیا گیا، اور ۸ ربیع الاول ۱۰۶۶ھ مطابق ۲۶ دسمبر ۱۶۵۵ء کو اورنگ زیب کے بڑے بیٹے محمد سلطان کو ناندیڑ روانہ کردیا گیا، اور اس شہزادے کو یہ حکم تھا کہ "اگر قطب الملک پسر میر جملہ و متعلقان را خلاص نہ سازد بے توقف بہ حیدرآباد درآمدہ بہ موجب حکم اقدس کام و ناکام

---

[۱] مآثر الاُمراء۔ جلد سوم ص ۵۳۳۔ عمل صالح۔ جلد سوم ص ۲۲۲۔

[۲] رقعات عالمگیر۔ مولفہٗ نجیب اشرف صاحب ندوی۔ جلد اول ص ۱۰۷۔

مجبوساں را از قید بر آورد" محمد سلطان ۲۰ ربیع الاول ۱۰۶۶ھ مطابق ۷ جنوری ۱۶۵۶ء کو ناندیڑ پہنچ گیا اور عبداللہ قطب شاہ کو شہنشاہی حکم کی اطلاع کردی۔[1]

گولکنڈے پر حملہ

یہاں گولکنڈے میں قطب شاہی حکومت عجیب کش مکش میں پڑ گئی۔ اگر شہنشاہی تہدید سے محمد امین اور اس کے متعلقین رہا کردیئے جاتے تو اس سے نہ صرف سلطنت کا وقار غائب ہو جاتا بلکہ اس کا شیرازہ بکھر جانے کا اندیشہ تھا، اور اگر شہنشاہی احکام سے بے اعتنائی کی جاتی تو مغل فوج گولکنڈے پر دھاوا بولنے کے لئے تیار تھی۔ عبداللہ نے خلاف توقع بہت دنوں تک شہنشاہی احکام سے بے اعتنائی کی اور وہ اس میں بہت کچھ حق بجانب تھا۔ ٹیورنیر کہتا ہے کہ عبداللہ تو پہلے سے ہتھیار ڈالنے اور قلعہ مغلوں کے سپرد کرنے تیار ہو گیا، اس کا داماد سید احمد اس کو روکتا رہا اور دھمکی دی کہ "اگر وہ ایسا کرے گا تو مار ڈالا جائے گا"[2] یہ بات واقع میں غور طلب ہے کہ مغل سلطنت اس وقت صرف اپنے وقار کی پچ کرتی تھی اور قطب شاہی وقار کو بالائے طاق کر رہی تھی۔ حالانکہ یہ سلطنت مغلوں کی حمایت میں تھی۔ اس عدول حکمی کا نتیجہ ظاہر تھا۔ محمد سلطان کی فوج ۲۳ ربیع الاول مطابق ۱۰ جنوری کو ناندیڑ سے روانہ ہوئی اور حیدر آباد میں داخل ہو گئی۔ اس کے پیچھے اورنگ زیب نے بھی گولکنڈے کی طرف کوچ کردیا۔ عبداللہ جیسے ڈرپوک آدمی سے زیادہ استقامت کرنا ناممکن تھا۔ اب تک جو کچھ استقامت ہوئی تھی وہ اس کے حوصلوں سے زیادہ تھی۔ اس نوبت پر اس نے مغل حملے سے ڈر کر فوراً محمد امین اور اس کے متعلقین کو رہا کردیا۔ چنانچہ یہ باغی حیدر آباد سے چوبیس میل کے فاصلے پر محمد سلطان سے آکر ملے۔ اگرچہ اب پیش قدمی کی ضرورت بالکل نہ تھی لیکن ابھی محمد امین کا مال و جائداد ضبط تھے اور محمد سعید کو بھی جو کرناٹک سے آرہا تھا، پناہ میں لینا تھا، اس لئے محمد سلطان کو

---

[1] رقعات عالمگیر، مولفہ نجیب اشرف ندوی، جلد اول ص ۱۷۰، ۱۷۲، عمل صالح جلد سوم ص ۲۲۲۔

[2] سیاحت نامہ ٹیورنیر، جلد اول ص ۱۳۲۔

یہ حکم ہوا کہ آگے بڑھ کر حیدر آباد میں کسی مناسب جگہ قیام کرے اور میر جملہ کا منتظر رہے۔ چنانچہ محمد سلطان کی فوجیں ۶ ربیع الثانی مطابق ۲۳ جنوری کو تالاب حسین ساگر پر جاگزیں ہوگئیں۔ چنانچہ محمد سلطان نے اپنے باپ کو حیدر آباد پہنچنے کی ان الفاظ میں اطلاع کی تھی کہ "خانہ زاد اعلحضرت بر تالاب حسین ساغر کہ از شہر یک و نیم کروہ است فرود آمدہ" اور دو روز کے بعد حیدر آباد میں داخل ہوگئیں۔ کیوں کہ فوجی نقطۂ نظر سے اول الذکر جگہ اچھی نہیں تھی مغل فوج کے حسین ساگر پہنچنے کے ایک روز پہلے ہی عبد اللہ حیدر آباد چھوڑ کر قلعے میں محصور ہو گیا۔ چونکہ شہر میں کوئی حفاظت کا سامان نہیں تھا اس لیے یہاں لوٹ مار شروع ہو گئی اور شرفا و رؤسا کے مکان اور محلات تاخت و تاراج کی نذر ہو گئے۔ اس طریقے سے شہر کے تمدن کو بہت نقصان پہنچا۔ اگرچہ محمد سلطان نے اس تاخت و تاراج کو روکنے کی کوشش کی اور محمد بیگ کو اس کام کے لئے مقرر کیا، لیکن اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ ممکن ہے کہ اس لوٹ مار میں مغل سپاہی بھی شریک ہوں[۱]۔ قلعے سے عبد اللہ نے محمد سلطان سے مدد کی درخواست کی کہ "چالیس لاکھ روپے نقد دینے کے لئے تیار ہوں اور اپنی بیٹی شہزادے کے عقد میں دیتا ہوں" لیکن محمد سلطان کو صلح کرنیکا کوئی اختیار نہ تھا، اس لئے صلح نہیں ہوئی۔ عبد اللہ پر یہ اعتراض ہے کہ وہ صلح کی درخواست بھی کر رہا تھا اور حملہ بھی کر رہا تھا۔ غالباً اس کا مطلب یہ تھا کہ اگر احیاناً صلح نہ ہو تو مدافعت کا ہتھیار ہاتھ سے نہ جائے، اور عادل شاہی کمک کا انتظار بھی تھا کیوں کہ بیجاپور سے ایک فوج آرہی تھی۔

اگرچہ محمد سلطان کے حسین ساگر آنے کے بعد قطب شاہی فوجوں سے کچھ چھیڑ چھاڑ ضرور ہوئی تھی لیکن باضابطہ مقابلہ اورنگ زیب کے آنے کے بعد ہوا۔ ۶ فروری مطابق ۲۰ ربیع الثانی کو اورنگ زیب حیدر آباد پہنچا اور قلعے کا محاصرہ کر لیا جو ۷ فروری

---

[۱] مآثر الامرا، جلد سوم ص ۵۳۳۔ رقعات عالمگیر، جلد اول ص ۱۸۱ تا ۱۸۵۔

مطابق ۱۲ ربیع الثانی سے ۳۰ مارچ مطابق ۱۴ جمادی الثانی تک جاری رہا اور ۱۴ جمادی الثانی مطابق ۳۰ مارچ کو میر جملہ بھی کرناٹک سے آکر مغل فوج کے ساتھ محاصرے میں شریک ہو گیا۔ کیوں کہ وہ عبد اللہ قطب شاہ سے انتقام لینا چاہتا تھا۔[1] محاصرے کا حال یہ تھا کہ قدرتی طور پر مغلوں کو قلعے پر وار کرنے کے لئے اچھے مواقع تھے۔ قلعے کے باہر شمال مشرقی سمت ایک اچھی پہاڑی تھی جس پر مغل فوجوں نے اپنے مورچے باندھ کر قلعے پر زد کر دی اور اس وجہ سے قطب شاہی فوجوں کو قدم جما کر لڑنے کا موقع نہیں ملا۔ یہ فوجیں قلعے سے باہر نکل کر حملہ کرتی تھیں اور شکست کھا کر واپس ہو جاتی تھیں۔ قلعے کے مشہور برج سے جو بعد کو "موسیٰ برج" کے نام سے موسوم ہوا، بڑی مدافعت کی گئی۔ اس برج میں گولکنڈے کا مشہور جنرل میر میراں مر گیا اور اس کے بعد موسیٰ خاں متعین ہوا تھا۔[2] یہ کہنا مشکل ہے کہ اگر یہ لڑائی برابر

---

[1] منوچی جلد اول ص ۲۳۵۔

[2] "موسیٰ برج" جس کو "دُھرما چار" مستری نے بنایا تھا اس محاصرے کی مشہور یادگار ہے۔ چونکہ یہ برج موسیٰ خاں کی نگرانی میں بنا تھا اس لئے آج تک اس کا نام "موسیٰ برج" ہے اور اس پر یہ کتبہ کندہ ہے:-

"بہ میرِ میران حکمِ عالی صادر گردید کہ شما قایم بودہ مورچہ و نقب نزدیک این برج تا بہ خندق رسانید چون درین جا برجِ کوچک بود امّا حکم جہان مطاع عالم مطیع خسرو زمان شہنشاہِ دوران السلطان العادل ظل اللہ ابو المظفر ابو المنصور ابو الغازی سلطان عبد اللہ قطب شاہ بہ دستور الوزراء فی الزمان مقرب الحضرت السلطانیہ معتمد الدولہ الخاقانیہ خانِ ذی شان سپہ سالاری موسیٰ خان چنان شرف صدور یافت کہ خود درین جا بودہ بہ دفع غنیم مشغول باشد بر آن خانِ عالیشان شب و روز بہ ہشیاریِ تمام در دفع غنیم بودن (باقی صفحہ ۲۲۴ پر)

جاری رہتی تو اس کا فیصلہ کس فریق کے حق میں ہوتا لیکن عبداللہ اپنی فطری کمزوری سے مجبور ہو کر صُلح کی درخواست کی۔ قلعے میں سے اورنگ زیب کے پاس کئی آدمی اور تحفے آئے۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اورنگ زیب اس قلعے کو مسخر کر کے اسی وقت قطب شاہی سلطنت کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ کرنا چاہتا تھا، اس لئے اس نے شرائطِ صُلح ماننے سے انکار کر دیا۔ اس اثناء میں شاہجہاں کی طرف سے بھی احکام آئے کہ عبداللہ کے شرائط پہ صُلح کر لی جائے۔ چونکہ دارا شکوہ اور اورنگ زیب میں مخالفت تھی اس لئے قطب شاہی حکومت نے اس مخالفت سے فائدہ اُٹھایا۔ یعنے اپنے ایک سفیر مُلّا عبدالصمد کو آگرے میں بٹھایا تھا جو دارا شکوہ کو سمجھایا کرتا تھا اور دارا کے ایما سے احکام آیا کرتے تھے۔ لیکن ٹیورنیر کا بیان ہے کہ شاہجہاں اپنے پُرانے تعلقات کی بنا پر کہ قطب شاہی سلطنت نے انھیں آڑے وقت میں پناہ دی تھی گولکنڈے کیساتھ رعایت کرنا چاہتے تھے لیکن اورنگ زیب نے یہ احکام چُھپا دیئے اور لڑائی جاری رکھی۔ پھر عبداللہ قطب شاہ نے ناچار شہزادہ محمد سلطان کی خوشامد کی۔ میر فصیح اور اپنے داماد سید احمد کو شہزادے کے پاس بھیجا اور اورنگ زیب کی

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۲۳) از فضاء ربانی غلولۂ توپ بر وجود میر میران چنان خورد که در ہمان مورچہ ہلاک گشت و بعد از فوت او بہ سہ روز صُلح شد و بعد از گذاشتن محاصرہ بہ عمالِ مشارٌ الیہ حُکم عالی شد کہ بُرجِ عظیم درین جا بنا باید کرد تا غنیم را فرصت نقبِ مورچہ کندن مجال نباشد بنا بر حُکمِ ہمایونِ اعلیٰ بہ اندک زمانی این بُرج عظیم بہ سعیٔ خان موسیٰ الیہ در سال سنہ ہزار و ہفتاد و ہفت (۱۰۷۷ھ) بہ اتمام رسید و اسم عمارہ "دُھرماچار" (مآثر دکن۔ علی اصغر صاحب بلگرامی ص ۱۰۷)۔

لہ سیاحت نامہ ٹیورنیر، جلد اول ص۔ ۱۳۰)۔

منظوری سے عبداللہ کی ماں حیات بخشی بیگم بھی درخواست صلح کیلئے قلعے سے باہر آئی، چنانچہ حیات بخشی بیگم، میر فصیح کے ساتھ اورنگ زیب کے کیمپ میں آگئی اور اس کا باقاعدہ احترام کیا گیا۔ یعنے ایک مورخ کے الفاظ میں "پس از وصول استمالت نامہ بہ امید حصول مرام والدہ را فرستاد۔حسب الامر عالی جمعے بہ استقبال شتافتہ بہ عزت و احترام در منزل شایستہ خان فرود آوردند" اس اثناء میں شاہجہاں کے تہدیدی احکام بھی پہنچ گئے کہ موعودہ شرائط کے ساتھ صلح کر کے محاصرہ اٹھا لیا جائے اور نیز حیات بخشی بیگم کی شخصیت کی وجہ سے اورنگ زیب نے بالآخر شرائط صلح تسلیم کر لئے اور لڑائی موقوف کر دی۔ شرطیں یہ پیش کی گئی تھیں کہ عبداللہ کی بیٹی محمد سلطان کے عقد میں دی جائے گی اور ایک کروڑ مالیت کے نقد جواہرا اور ہاتھی تاوانِ جنگ دیا جائیگا[1] لیکن حیات بخشی بیگم کی درخواست پر خود اورنگ زیب نے اور بعد کو شاہجہاں نے تاوان میں بہت تخفیف کر دی۔ یعنے صرف ستر لاکھ روپے دینے پڑے[2]، اور شاہجہاں کے تہدیدی احکام کی وجہ سے، جس میں داراشکوہ کا مخالفانہ ہاتھ تھا، ۴ ارجمادی الثانی کو فوراً قلعے سے فوج ہٹالی گئی اور اس کے پانچ دن بعد محمد سلطان کا قطب شاہی شہزادی سے جس کا نام گرانٹ ڈف نے "بادشاہ بی بی" لکھا ہے عقد عمل میں آیا[3]۔ شہزادی کے جہیز میں

---

[1] عملِ صالح، جلد سوم ص ۲۲۸۔

[2] لیکن عبداللہ قطب شاہ نے جو معاہدہ لکھ دیا تھا اس سے کوئی تخفیف نہیں معلوم ہوتی۔ "مبلغ بست لک ہون را بہ طریق تدرو نیاز از نقد و جواہر نفیسہ و از فیلان کہ بہتر از آن پیش مرید مورو ثی نباشد برساند" اس کے علاوہ یہ بھی وعدہ تھا کہ پانچ ہزار سوار مغل سلطنت کی امداد کے لئے دیئے جائیں گے، اور مغل سلطنت سے یہ درخواست تھی کہ ہر آڑے وقت میں وہ قطب شاہی سلطنت کی مدد کرے (تاریخ ظفرہ مصنفہ گردھاری لال احقر ص ۲۱)۔

[3] تاریخ مرہٹہ، گرانٹ ڈف، جلد اول ص ۲۰۹۔

رام گیر کے علاقے دیئے گئے[۱] اور اس میں یہ قرار داد ہوئی تھی کہ عبد اللہ کے انتقال کے بعد محمد سلطان اس کا جانشین ہوگا۔ غالباً اس ضمیمے کی شہنشاہ کو اطلاع نہیں تھی[۲]، لیکن عبد اللہ قطب شاہ نے جو عہد نامہ لکھ دیا تھا اس میں اس کی کافی صراحت تھی۔ معاہدے کے الفاظ یہ ہیں:۔ "اول این کہ ...... صبیہ صلبیہ خویش را بہ حبالہ ازدواج تازہ نہال.... محمد سلطان ..... در آوردہ کہ بعد از مرید موروثی ایالت این مملکت بہ آن بیدار بخت متعلق باشد و دیگر آن کہ سوائے پیش کش مقرر سے مبادلہ دو لک و پنجاہ ہزار ہون قلعۂ رام گیر را با ولایات متعلقہ سابق آن حوالہ وکلائے سرکار فیض آثار نماید[۳]"۔ جب شہنشاہی فوجیں قلعے سے ہٹ گئیں اور قطب شاہی حکومت کو سانس لینے کا موقعہ ملا تو عبد اللہ قطب شاہ نے اس واقعے کی یادگار میں ایک خاص مُہر بنوائی تھی جس پر "ختم بالخیر والسعادۃ" کندہ تھا۔ اس فقرے کے معنے یہ ہیں کہ قطب شاہی سلطنت اس قومی حادثے سے بچ گئی جس میں اس کا خاتمہ ہونے والا تھا اور حملہ آور یہی چاہتے تھے۔ اس مُہر کے تیار ہونے کے بعد تمام فرامین اور احکام اسی مُہر سے جاری کئے جاتے تھے اور

---

[۱] عملِ صالح، جلد سوم ص ۲۲۹۔ برنیر ص ۲۱-۲۲۔

[۲] تاریخ ظفرہ۔ مصنفہ گردھاری لال احقر ص ۱۳۱۔ برنیر، ٹیورنیر اور منوچی، سبھوں نے اس کی صراحت کی ہے کہ عبد اللہ قطب شاہ کے بعد محمد سلطان کی جانشینی کا فقرہ معاہدے میں شریک تھا (ٹیورنیر۔ جلد اول ص ۱۳۷) منوچی، جلد اول ص ۲۳۵) برنیر نے اس میں دو شرطیں اور اضافہ کی ہیں۔ (۱) میر جملہ کو یہ اجازت ہوگی کہ وہ اپنے اہل و عیال اور جائداد گولکنڈے سے باہر لے جا سکے گا (۲) قطب شاہی نقرئی سکے پر شاہجہاں کا نام مضروب ہوگا (سیاحت نامہ برنیر ص ۲۱)۔

[۳] تاریخ ظفرہ۔ گردھاری لال احقر ص ۱۳۱۔ رام گیر حیدر آباد سے شمال مشرق جانب (۱۲۳) میل کے فاصلے پر واقع ہے۔

یہ مُہر ابوالحسن تانا شاہ کے عہد تک برابر جاری رہی۔[1]

میر جملہ کی غداری سے، جس کا کوئی پہلو بھی حق بجانب نہیں تھا، قطب شاہی سلطنت کو بہت بُرے دن دیکھنے پڑے اس ڈیڑھ سو سال کے دوران میں جب سے یہ سلطنت قائم ہوئی تھی، غداری کی پہلی مثال تھی۔ جمشید قطب شاہ کے مرنے کے بعد سیف خاں عین الملک اور جگدیو راؤ نے اور محمد قلی قطب شاہ کے عہد میں علی خاں لُر نے بغاوت کی تھی لیکن اس سے کوئی زیادہ نقصان نہیں پہنچا جس قدر نقصان محمد سعید کی بے وفائی سے سلطنت کو نقصان پہنچا اس کی پھر تلافی نہیں ہو سکی اور اس گرتے ہوئے زمانے میں کہاں تلافی ہو سکتی تھی۔ چونکہ قطب شاہی سلطنت کو دب کر صلح کرنی پڑی تھی اس لئے شہنشاہت کو جابرانہ مداخلت کا موقع ملا۔ اب یہ نوبت پہنچ گئی تھی کہ قطب شاہی سلطنت نہ صرف شہنشاہ اور صوبہ دار دکن کو لاکھوں روپیوں کا نذرانہ دیتی تھی بلکہ مغل حاجبوں پر جو گولکنڈے میں رہتے تھے زرو جواہر کی بوچھار کرتی تھی، اور اس وقت سلطنت کے بقا کی یہی ایک سبیل رہ گئی تھی، اور اگر فرانسیسی سیاح برنیر کا بیان صحیح سمجھا جائے تو گولکنڈے کی اصل حکومت مغل حاجب کے ہاتھ میں تھی اور گولکنڈے کا حکمران بالکل بے دست و پا تھا۔ برنیر کہتا ہے کہ:۔ "۱۶۶۷ء میں میں گولکنڈے میں تھا تو اس وقت اورنگ زیب کی جانب سے ایک سفیر آیا اور یہ کہا کہ بیجاپور سے لڑنے کے لئے دس ہزار سوارہ فوج بھیجی جائے ورنہ گولکنڈے پر حملہ کیا جائے گا۔ یہ فوج تو نہیں بھیجی گئی، لیکن اورنگ زیب کے ہاں قیمتی تحفے ارسال کئے گئے جو سوارہ فوج سے کہیں بہتر تھے۔ اس کے علاوہ ایک بہت بڑی رقم دی گئی جو مطلوبہ سوارہ فوج کی تیاری کے لئے بہت کافی تھی۔ بادشاہ نے اس سفیر کی بہت عزت کی اور گرانبہا تحفے دیئے، منجملہ ان کے بعض تحفے خود شہنشاہ کے واسطے تھے۔" اور برنیر یہ بھی کہتا ہے کہ

---

[1] مآثر دکن، علی اصغر بلگرامی ضمیمہ ص ۲۔ اس وقت حیدر آباد میں عبد اللہ اور ابو الحسن کے عہد کے بے شمار فرامین دستیاب ہوتے ہیں جن پر "ختم بالخیر والسعادۃ" والی مہر ثبت ہے۔

گولکنڈے میں اورنگ زیب کا سفیر احکام جاری کرتا، پروانے دیتا، عوام کے ساتھ بدسلوکی کرتا اور دھمکیاں دیتا ہے۔ مختصر یہ کہ اس کے افعال اور اقوال ایسے خود مختارانہ ہوتے ہیں جیسے ایک مطلق العنان حکمران کے"[1] نیز اس باغی (محمد سعید) کی حمایت سے جو مغل سلطنت کی طرف سے ہوئی تھی نہ صرف گولکنڈے کے وقار کو زبردست دھکا لگا بلکہ سلطنت کا رعب داب غائب ہو گیا اور رامی و رعایا کے تعلقات جو ضبط و تنظیم میں جکڑے ہوئے تھے ٹوٹ گئے۔ اکابرِ سلطنت بادشاہ کی کوئی وقعت نہیں کرتے اور من مانے ظلم و زبردستی کرتے تھے اور عوام اس سلطنت کا جوا اُتار کر مغل سلطنت میں شامل ہونے کے لئے تیار بیٹھے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ خود عبد اللہ قطب شاہ نے شہرِ حیدر آباد کو چھوڑ کر گولکنڈے میں گوشہ نشینی اختیار کر لی تھی، اور برنیر کا بیان صحیح سمجھا جائے تو عُبداللہ نے دربار کی نشست بھی چھوڑ دی تھی"[2]

مرہٹوں کا احیا قسمت کے اس فیصلے میں گولکنڈے کے ساتھ بیجا پور کی سلطنت بھی اسی طرح شریک تھی جس طرح ۱۰۴۵ھ/۱۶۳۶ء کے معاہدے میں تھی۔ گولکنڈے سے فراغت پا کر مغل فوجوں نے بیجا پور کا رُخ کیا۔ بیجا پور کے ساتھ مغلوں کو بہت سی شکایتیں پیدا ہو گئی تھیں، لیکن قریبی شکایت یہ تھی کہ ابھی چند روز پہلے جب کہ مغل فوج گولکنڈے پر حملہ آور ہو رہی تھی محمد عادل شاہ نے قطب شاہی سلطنت کی مدد کے لئے ایک فوج بھیجی تھی، چنانچہ ان شکایتوں کی بنا پر مغلوں نے بیدر و کلیانی فتح کر کے ۱۰۶۷ھ/۱۶۵۷ء میں اس سلطنت سے بھی کچھ اسی قسم کی شرطیں منوالیں جو قطب شاہی سلطنت سے ہوئی تھیں لیکن مغل سلطنت کو اس کی مطلق خبر نہ تھی کہ عین اسی زمانے میں دکن میں ایک نئی طاقت پیدا ہو رہی تھی جو آگے چل کر

---

[1] سفرنامہ برنیر ص ۱۹۵۔
[2] " " " ۱۹۴—۱۹۵۔

بہت خطرناک ہوگئی، اور یہ مرہٹوں کی طاقت تھی جو سیواجی بھونسلہ[1] کی رہنمائی میں آہستہ آہستہ تمام دکن پر چھاگئی اور مغل سلطنت کے لئے یہ ایک نیا مسئلہ پیدا ہوگیا جو بہت صبر آزما ثابت ہوا۔ دکن کی مسلمان سلطنتوں کو نیچا دکھانا تو ہر وقت آسان تھا لیکن مرہٹوں کو مغلوب کرنا بے حد مشکل ثابت ہوا۔ سیواجی کی جولانیاں ۱۰۵۶ھ/۱۶۴۶ء سے شروع ہوئیں۔ اس کے پہلے دس سال تو بیجاپوری علاقوں کی تاخت و تاراج میں گزرے جس کا ناخدائے سیاست محمد عادل شاہ جیسا کمزور بادشاہ تھا۔ جب تک محمد عادل شاہ زندہ رہا سیواجی کی کوئی مزاحمت نہ ہوسکی، جب بیجاپور پر اس کے داؤ چل گئے اور اس کی طاقت بڑھ گئی تو مغل علاقوں پر حملے شروع کردیئے اور یہاں بھی اس کے لئے میدان کھلا ہوا تھا۔ کیوں کہ ادھر ۱۰۶۹ھ/۱۶۵۸ء سے مغل سلطنت میں اورنگ زیب اور اس کے بھائیوں کے مابین ایک سخت خانہ جنگی شروع ہوگئی جو اورنگ زیب کی شہنشاہت پر ختم ہوئی۔ لیکن نئے شہنشاہ بہت زمانے تک دکن کی طرف توجہ کرنے کے قابل نہ تھے، اور اس کی وجہ سے سیواجی کو دکن میں اچھی طرح اُدھم مچانے کا موقعہ مل گیا۔ چنانچہ عادل شاہی علاقوں پر قبضہ کر کے سیواجی نے ۱۰۷۰ھ/۱۶۶۰ء سے مغل علاقوں پر وار کرنے شروع کردیئے اور سوائے جے سنگھ کے تمام

۱؎ سیواجی بھونسلہ جس کی ننہال اور ددھیال نظام شاہی سلطنت کے ملازم و جاگیردار تھی جنیر میں (۱۰۳۷ھ/۱۶۲۷ء) پیدا ہوا اور یہیں اس کی تعلیم و تربیت ہوئی۔ ۱۰۵۶ھ/۱۶۴۶ء سے اس نے نظام شاہی سلطنت کے لئے بے روزگار سپاہیوں کو جو "موالی" کہلاتے ہیں، جمع کر کے بیجاپور کے قلعوں پر وار کرنا شروع کردیا۔ اس سنہ میں اس نے پہلے "قلعۂ تورنا" پر حملہ کیا۔ اس کے بعد "سین گڈھ"، "پورن دھر" وغیرہ کے قلعے حاصل کرلئے جو بیجاپور کے مقبوضات تھے اور اس طرح آہستہ آہستہ ۱۰۶۶ھ/۱۶۵۶ء تک دس سال میں بیجاپور کی کمزوری سے فائدہ اُٹھا کر ایک طاقت فراہم کرلی۔ حالانکہ یہ لوگ ایک زمانے میں اسی بیجاپوری سلطنت کے نمک خوار تھے۔

مغل جنرلوں کو ایسا ہرایا کہ وہ اپنی جگہ سے جنبش نہ کرسکے۔[1]

لیکن محمد عادل شاہ کے مرنے کے بعد جب اس کا جانشین علی عادل شاہ دوم ۱۰۶۷ھ/۱۶۵۶ء میں تخت پر بیٹھا تو پھر عادل شاہی سلطنت میں جان آگئی۔ اس نوجوان بادشاہ نے جس کو دکن کا آخری سورما کہنا چاہیئے، عادل شاہی سلطنت کو بچانے کی کامیاب کوششیں کیں اور سیواجی کی جولانیوں کا پورا جواب دیا۔ پہلے اس نے مرہٹوں سے مقابلہ کرنے کے لئے افضل خاں کو ۱۰۷۰ھ/۱۶۵۹ء میں بھیجا جو بدقسمتی سے سیواجی کے مکروفریب کا شکار ہو گیا۔ اس کے بعد جب سدی جوہر صلابت خاں گیا اور یہ بھی بہت جلد اس کے دامِ فریب میں آگیا تو علی نے خود ۱۰۷۱ھ/۱۶۶۰ء میں بڑھ کر "پنالہ" کے قلعے میں سیواجی کو شکست دی اور اس کو بھگا دیا۔ چنانچہ بیجاپور کے ملک الشعراء مُلّا نصرتی نے اس واقعے کی تعریف میں کہا تھا[2]

"علی نے پل میں پنالہ لیا صلابت سوں"[3]

اور ادھر شمال سے شائستہ خاں اور جسونت سنگھ کی شکست کے بعد شہنشاہ نے اپنے مشہور جنرل جے سنگھ کے تحت ایک بڑی فوج دی اور عادل شاہی سلطنت سے اتحادِ عمل کی درخواست کی گئی تو علی عادل شاہ نے اس صدا پر لبیک کہا اور جے سنگھ کے آنے کے پیشتر ہی بیجاپور کے مشہور جنرل خواص خاں کو سیواجی کے مقابلے کے لئے بھیج دیا۔ خواص خاں نے ۱۰۷۶ھ/۱۶۶۵ء میں سیواجی کو ایسا ٹھکا دیا کہ مغل فوجوں کے لئے راستہ صاف ہو گیا۔[4] چنانچہ جب جے سنگھ دکن آیا اور اپنے حملے

---

[1] جے سنگھ سے پہلے شائستہ خاں اور جسونت سنگھ مقابلے کے لئے آئے تھے، یہ دونوں شکست کھا گئے، بالآخر ۱۰۷۶ھ/۱۶۶۵ء میں جے سنگھ آیا تھا۔

[2] بساتین السلاطین ص ۳۷۶۔

[3] علی نامہ مُلّا نصرتی، مرتبہ صدیقی۔

[4] بساتین السلاطین ص ۳۹۸ - ۳۹۹۔

شروع کئے ہی تھے کہ سیواجی نے ہتھیار ڈال دیئے اور مغل سلطنت کی اطاعت قبول کرلی۔

لیکن اس واقعے کا ایک تاریک رُخ یہ تھا کہ سیواجی نے مغل سلطنت کی چند روزہ اطاعت کرکے جے سنگھ کو اپنے دیرینہ منصوبوں میں شریک کرلیا۔ یعنے عادل شاہی سلطنت کا خاتمہ اور مرہٹہ طاقت کا احیا اس کا اصل مقصد تھا۔ اول تو سیواجی کی اطاعت بھروسے کے قابل نہ تھی اور یہ ایک دھوکا تھا۔ دوسرے بیجاپور کے خلاف جے سنگھ کو آمادہ کرنا بھی فریب سے خالی نہ تھا۔ جے سنگھ اتحادِ عمل کے معاہدے کو بالائے طاق کرکے جو شہنشاہ اورنگ زیب نے علی عادل شاہ کے ساتھ کیا تھا، سیواجی کے منصوبے میں شریک ہوگیا اور عادل شاہی سلطنت پر اُمنڈ آیا، اور اس کی یہ حرکت کھلی بدعہدی تھی۔ اب اُلٹا یہ ہوا کہ جو فوجیں سیواجی کے مقابلے کے لئے آئی تھیں وہ بیجاپور پر پلٹ پڑیں[1] جس سے عادل شاہی سلطنت سخت پریشان ہوئی، کیوں کہ اب اس کو دو دشمنوں کا سامنا تھا۔ لیکن علی عادل شاہ ثانی جو اچھا مُدبّر اور سپاہی تھا، پوری تیاری کے ساتھ جے سنگھ کے مقابلے کے لئے آگیا اور بیجاپور کی دیواروں کے سامنے اس کو ایسی شکستیں دیں کہ مغلوں کے چھکّے چھوٹ گئے۔ ۱۶۶۶ء میں بیجاپور سے جے سنگھ کی پانچ لڑائیاں ہوئیں جن میں بیجاپور کے نامور سپہ سالار خواص خاں اور سید الیاس شرزہ خاں نے جان توڑ کوشش کی اس کے علاوہ اس دار و گیر میں قطب شاہی سلطنت نے بھی اپنی پُرانی روایت کے مطابق حصہ لیا۔ عبداللہ قطب شاہ نے خود اپنے طور پر گولکنڈے سے مدد بھیج دی[2]۔ کیوں کہ اب

---

[1] بساتین السلاطین ص ۴۰۴—۴۰۵۔

[2] ۱۰۴۳ھ/۱۶۳۳ء میں جب کہ مہابت خاں نے قلعۂ دولت آباد کا محاصرہ کیا تھا عبداللہ قطب شاہ نے اس موقع پر کوئی مدد نہیں کی، حالانکہ محمد عادل شاہ نے مقدور بھر اس امداد میں حصہ لیا اور گولکنڈے کو بھی اشارہ کیا تھا، اور غالباً اسی اتحادِ عمل کو مضبوط کرنے کے لئے ۱۰۴۳ھ/۱۶۳۳ء میں محمد عادل شاہ نے عبداللہ کی بہن خدیجہ سلطانہ سے شادی کی تھی، لیکن (باقی صفحہ ۲۳۲ پر)

نظام شاہی سلطنت کے خاتمے کے بعد بیجاپور ہی دکن کا آخری سہارا رہ گیا تھا۔ پہلے قطب شاہی جنرل شرزہ خاں روانہ ہوا اور اس کے بعد بارہ ہزار سوار اور چالیس ہزار پیدل کے ساتھ نیکنام خاں، جو اس زمانے میں قطب شاہی سلطنت کا میر جملہ ہو گیا تھا، موقعۂ جنگ پر پہنچ گیا،[1] اور اس نے عادل شاہی فوج کے ساتھ پورا اتحادِ عمل کیا۔ غالباً اسی اتحادِ عمل کا نتیجہ تھا کہ مغل سپہ سالار جے سنگھ کو بیجاپور کی دیواروں کے سامنے پانچ مرتبہ ایسی فاش شکستیں ہوئیں کہ وہ اسی رسوائی میں راہیِ عدم ہو گیا۔ شہنشاہ اس پر بہت خفا ہوئے اسی شرم کے مارے یہ ۱۰۷۸ھ ۱۶۶۷ء میں برہانپور میں مر گیا اور شمال نہیں جا سکا۔ زبیری کہتا ہے کہ جے سنگھ دکن میں ۱۰۷۵ھ ۱۶۶۵ء میں آیا تھا اور ۱۰۷۷ھ ۱۶۶۷ء میں انتہائی مایوسی میں واپس گیا،[2] اور اس طریقے سے ۱۰۷۷ھ ۱۶۶۷ء میں دکن میں چاند بی بی اور ملک عنبر کی پھر یاد تازہ ہو گئی اور بیجاپور آئندہ اور بیس سال کے لئے محفوظ ہو گیا ورنہ جے سنگھ اس کا خاتمہ کرنے کے لئے آیا تھا۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۳۱) اس وقت عبداللہ مغلوں سے ایسا سہما ہوا تھا کہ مدد کی ہمت نہیں کی لیکن اس زمانے میں جب کہ مغلوں سے بیجاپور کی لڑائی ٹھنی ہوئی تھی، مرہٹوں کی وجہ سے دکن کے حالات بالکل بدل گئے تھے، یعنے مغل سلطنت مرہٹہ طاقت سے اُلجھی ہوئی تھی اس لئے اب قطب شاہی سلطنت کو مغلوں سے ڈرنے کی کوئی وجہ نہ تھی! اس کے علاوہ عبداللہ کی بہن خدیجہ سلطانہ جو "حاجی بڑے صاحب" کے نام سے مشہور تھی، بیجاپور میں بہت ذی اثر تھی۔ اسی نے علی عادل شاہ ثانی کی اپنے آغوش میں پرورش کی تھی جو بڑے نتائج کا باعث ہوئی۔ علی کی عظمت جس کا نصرتی گیت گاتا ہے، اسی خاتون کی فیضِ صحبت کا نتیجہ تھا، اور اس وقت گولکنڈے سے جو بیجاپور کی امداد ہوئی تھی اس میں بھی غالباً اسی کا ہاتھ تھا۔

[1] بساتین السلاطین ص ۴۱۳۔ زبیری نے نیکنام خاں کو ان الفاظ میں یاد کرتا ہے: "نیکنام خان کہ در شجاعت و بسالت و کفایت و درایت ممتاز اقران و سرآمد اعیان بود۔"

[2] بساتین السلاطین۔ زبیری صفحات ۴۰۹-۴۲۸۔



خیرات خاں



موسی خاں

سپہ سالاران گولکنڈہ



شیخ محمد ابن خاتون



نیک نام خاں

اٹھارھواں باب

ابوالحسن قطب شاہ کی تخت نشینی

عبداللہ قطب شاہ کا عہد جو چھیالیس[46] سال طویل ہے، ناکامیوں کی ایک دلخراش داستان ہے۔ یہ ۳ر محرم ۱۰۸۳ھ / ۱۶۷۲ء پر ختم ہوا۔ عبداللہ قطب شاہ میں بعض ذاتی اور اخلاقی خوبیاں بھی تھیں۔ اگرچہ یہ بہت ڈرپوک آدمی تھا اور لڑائی سے گریز کرتا تھا جس کی وجہ سے سلطنت کو سخت نقصان پہنچا لیکن اس کے بعض محاسن سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اول تو یہ بہت متین اور خوب صورت آدمی تھا، چنانچہ نظام الدین نے اس کو ہر جگہ "خاقانِ یوسف جمال" لکھا ہے۔ اس کے علاوہ اس کی طبیعت نیک اور خدا ترس واقع ہوئی تھی، اس نے کسی پر سختی نہیں کی اپنے نانا محمد قلی قطب شاہ کی طرح یہ بہت مذہب پرست بھی تھا، چنانچہ محرم اور ربیع الاول میں بڑے اہتمام سے مذہبی رسوم ادا کیے جاتے تھے۔ محرم میں تمام خوشی کی تقریبیں موقوف کر دی جاتی تھیں، اور نہ صرف مسکرات کی دکانیں، بلکہ پان کی دکانیں بھی بند کی جاتی تھیں تاکہ کوئی پان نہ کھائے۔ سب کو سیاہ کپڑے پہننے کا حکم تھا۔ سرکاری ملازمین کو جامہ دار خانے سے سیاہ کپڑے دیئے جاتے تھے، اور دولت خانۂ عالی میں روشنی کی جاتی تھی اور مرثیے بھی پڑھے جاتے تھے۔ ہر روز عصر کے وقت بادشاہ سیاہ لباس پہن کر سنگاسن میں آتے اور اپنے ہاتھ سے

الاوے میں روشنی کرتے تھے۔ آدھی رات تک تعزیہ ہوتا تھا۔ "داد محل" میں بھی یہ انتظام تھا، اور یہاں بھی بادشاہ آتے تھے، اور اس انتظام میں بہت روپیہ صرف ہوتا تھا۔ ربیع الاول کی تقریب جو محمد قلی قطب شاہ کے عہد میں جاری ہوئی تھی، بڑے اہتمام سے کی جاتی تھی۔ یہ تقریب سلطان محمد قطب شاہ کے عہد میں مسدود ہوگئی تھی، لیکن عبداللہ نے اس کو پھر جاری کر دیا، اس میں بارہ ہزار ہون صرف ہوتے تھے اور مختلف محلات میں روشنی کی جاتی تھی۔ غربا اور مستحقین کو کھانا کھلایا جاتا تھا، مولود خوانی بھی ہوتی تھی۔ اب رہی ملک کی بدنصیبی جو پچھلے ابواب میں ہم دیکھ آئے ہیں، صرف بادشاہ کی تخت نشینی سے نہیں بلکہ اس کی پیدائش سے شروع ہو چکی تھی، لیکن یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں ہے کہ ان پیہم ناکامیوں کے باوجود جن سے سلطنت کی سیاست کو بڑا دھکا لگا، ملک کی رفتار ترقی میں کوئی فرق نہیں آیا، بلکہ ۱۰۶۶ھ (۱۶۵۶ء) کی شکست کے پانچ چھ سال کے بعد حکومت پھر اپنے پرانے ڈھیر پر آگئی، چنانچہ حکومت نے ضرورت کے مطابق دفاعی انتظامات بھی کئے اور جہاں ضرورت ہوئی فوجی مزاحمت سے کام لیا۔ جب مغلوں نے محاصرہ اٹھا لیا تو اس پہاڑی کو جو قلعے سے باہر شمال مشرقی سمت واقع تھی اور جہاں سے مغلوں نے قلعے پر زد کی تھی، فصیل اور ضروری برجوں کے ذریعے سے محصور کر کے قلعے میں شامل کیا گیا۔ "موسیٰ برج" کی ازسر نو تعمیر ہوئی جو اس کے کتبے سے ظاہر ہے۔ کرناٹک کے قطب شاہی مقبوضات پر پورا قابو رکھا گیا۔ ۱۰۷۳ھ (۱۶۶۲ء) میں قطب شاہی فوج سان تھوم پر قابض ہوگئی اور انگریزی کمپنی سے قطب شاہی آئین کی پوری پابندی کروائی۔ سلطنت کے شمال سمت ۱۰۷۷ھ (۱۶۶۶ء) میں مغلوں کے خلاف بیجاپور کی مدد کی گئی، پھر ملک کی خوش حالی میں کبھی کوئی فرق نہیں آیا، اور خوشگوار نظم و نسق کی وجہ سے ملک میں پورا امن رہا۔ زراعت و

تجارت میں ترقی نہیں تو تنزل بھی نہیں ہوا، اور ملک کی دولت میں برابر اضافہ ہو رہا تھا۔ اس کے علاوہ اس عہد میں شاندار علمی اور تعمیری کام بھی ہوئے۔ نہ صرف شاعروں اور عالموں کی سرپرستی ہوئی، بلکہ خود بادشاہ کو بھی شعر و سخن سے دلچسپی تھی۔ عبداللہ قطب شاہ نے حیدرآباد میں کئی عمارتیں بنوائیں جو اپنے تعمیری حُسن کی وجہ سے بہت مشہور ہیں۔ بادشاہ کی ماں حیات بخشی بیگم نے جس طرح سیاست کی مدد کی تھی اسی طرح قطب شاہی تمدن میں بھی اضافہ کیا۔ اگر کچھ نہیں تو اس خاتون کا تعمیر کیا ہوا "حیات آباد" جس میں ایک بڑی کاروان سرائے، مسجد و مدرسہ ہے ہمیشہ یادگار رہے گا، اور یہ چیزیں ہمیں اگلے ابواب میں تفصیل کے ساتھ ملیں گی۔ ان ترقیوں کی وجہ غالباً یہ تھی کہ اس سلطنت کی تعمیر ایسے سیاسی مسالے سے ہوئی تھی جو زمانے کے ہر خشک و تر کا مقابلہ کر سکتا تھا۔ نیز بادشاہ کی ماں حیات بخشی بیگم کا اخلاقی اثر بھی اس سلطنت کو آخر دم تک سہارا دیتا رہا۔ "حیات ماں صاحب" آخری عہد تک زندہ رہیں۔ یعنی ۲۸ر شعبان ۱۰۸۰/۱۶۶۹ء میں اس کا انتقال ہوا۔

عبداللہ قطب شاہ کی اولاد عبداللہ قطب شاہ کے کوئی بیٹا نہ تھا، بلکہ اس کی تین بیٹیاں تھیں۔ سب سے بڑی بیٹی حجاز کے ایک شریف زادے کو دی گئی تھی جس کا نام سید احمد تھا۔ بعض لوگ اس کا نام سید نظام الدین احمد بتاتے ہیں۔

ٹیونیر اس کو عرب کا ایک شہزادہ لکھتا ہے[1]، وہ شہزادہ تو نہیں تھا، لیکن حجاز کے ایک شریف اور علمی گھرانے کا سپوت تھا۔ اس کے باپ دادا حجاز میں بڑے پائے کے عالم گزرے ہیں۔ سید احمد کی خاندانی وجاہت شریف مکہ شریف بن محسن کے خط سے معلوم ہوتی ہے جو اس نے عبد اللہ قطب شاہ کو لکھا تھا، اور خط سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ عبد اللہ ہی نے سید احمد کو گولکنڈہ طلب کیا تھا اور سید احمد شریف مکہ کے تعارف کے ساتھ ۱۰۵۵ھ/۱۶۴۵ء میں گولکنڈہ آیا[2] اور اپنی شرافت و قابلیت کے زور سے قطب شاہی دربار میں داخل ہو گیا۔ اس کا رسوخ اتنا بڑھا کہ عبد اللہ قطب شاہ کی شرفا نوازی نے اس کو اپنی دامادی کے لئے منتخب کر لیا، چنانچہ بادشاہ نے اپنی بڑی بیٹی سے شادی کر دی اور اس بیٹی کے کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ دوسری بیٹی اورنگ زیب کے بڑے بیٹے محمد سلطان کو دی گئی تھی، یہ سیاسی شادی تھی جو ۱۹ رجمادی الثانی ۱۰۶۶ھ/۱۶۵۶ء کو عمل میں آئی۔ شادی کے بعد یہ بیٹی شمال چلی گئی[3]۔ یہ نہیں معلوم ہوتا کہ شادی کے بعد اس کی بیٹی کا کیا حشر ہوا، اور آیا اس کے کوئی اولاد ہوئی تھی یا نہیں چونکہ بعد کو شہنشاہ اورنگ زیب محمد سلطان سے ناراض ہو گئے تھے اور اس کو قید کر دیا تھا اس لئے قیاس یہ ہے کہ یہ بھی اپنے شوہر کے ساتھ قید میں مر گئی۔ تیسری بیٹی جس کا نام بعض لوگ بادشاہ بی بی بتاتے ہیں ابو الحسن کو دی گئی جو حالات کے زور سے عبد اللہ قطب شاہ کا جانشین ہو گیا۔

ابو الحسن کا حسب و نسب

اس بات کی وضاحت بہت مشکل ہے کہ شادی سے پہلے ابو الحسن کا قطب شاہی خاندان سے کیا رشتہ تھا۔ ان روایتوں کو چھوڑ کر جو حیدر آباد کے بعض اضلاع میں زبان زد ہیں

---

[1] سفرنامہ ٹیورنیر، جلد اول ص ۱۶۱ و ۱۶۲۔

[2] گولکنڈے کے عربی شعرا، مصنفہ ڈاکٹر عبد المعید خاں باب ۳۔

[3] مآثر عالمگیری ص ۱۶۔

اور ان خیالات سے قطع نظر جو بعض مورخ بلا تحقیق ظاہر کرتے ہیں[1]، قرائن یہ ہیں کہ ابو الحسن عبد اللہ قطب شاہ کا داماد ہونے کے علاوہ شاہی خاندان کا راست قرابت دار بھی تھا[2]۔ اب قرابت میں بھی بہت سوں کو اختلاف ہے، اور ہر مورخ اپنا خاص خیال رکھتا ہے۔ مغل مورخ محمد ساقی کہتا ہے کہ ابو الحسن عبد اللہ قطب شاہ کا بھتیجا اور داماد تھا[3]، جو بہت کچھ بحث طلب ہے۔ مقامی تاریخیں اور روایتیں کہتی ہیں کہ

---

[1] سدی پیٹ کی مقامی روایت یہ ہے کہ ابو الحسن موضع اننت گیری (واقع سدی پیٹ) کا رہنے والا اور لداف کا بیٹا تھا اس موضع کے برہمن اکنّا اور مادنّا نے اس کی پرورش کی تھی۔ جب اتفاق سے یہ بادشاہ ہوگیا تو ان برہمنوں کو بہت ترقی دی۔ یہ روایت خلیل اللہ صاحب بی۔ اے ساکن سدی پیٹ سے معلوم ہوئی (مجلہ عثمانیہ جلد ۱۰ شمارہ ۳ و ۴)۔

بعض مورخ اس کو قطب شاہی خاندان سے تو کجا ہندوستانی بھی نہیں کہتے، بلکہ اس کو ایرانی اور عرب شمار کرتے ہیں، اور غالباً انھیں یہ غلط فہمی اس کے ہم زلف سید احمد کی وجہ سے ہوئی ہے۔ لالہ جگ جیون داس کا بیان ہے کہ :۔ "ابو الحسن مردِ بیگانہ کارہا وارستہ از قوم مغل ہمدانی بود بعد مردنِ عبد اللہ قطب الملک دخترش بہ عقد ازدواج درآوردہ بہ حکومت آن ملک رسید" (منتخب التواریخ ص ۵۷)۔ مفتاح التاریخ کے الفاظ یہ ہیں کہ :۔ "والیِ این دیار سلطان ابو الحسن از نجیب زادہائے ایران بود۔ در لباسِ فقیری بہ سیاحت آمدہ۔ چون والیِ حیدر آباد قطب الملک عبد اللہ قطب شاہ را پسرے نہ بود بر فطنت و ذکائے او مفتون شدہ او را بہ دامادی گرفت" (مفتاح التواریخ ص ۲۸۴)۔

[2] برنیر، ٹیورنیر اور منوچی سب ابو الحسن کو عبد اللہ کا رشتہ دار بتاتے ہیں۔ ٹیورنیر تو ابو الحسن کو عبد اللہ کا رشتہ دار بھائی بتاتا ہے (سفرنامہ ٹیورنیر جلد اول ص ۱۳۸) منوچی اور مارٹن اس کو پچھلے قطب شاہوں کی اولاد میں بتاتے ہیں (منوچی جلد چہارم ص ۴۴۴) تھیونو قطب شاہی خاندان سے اس کا خونی رشتہ بتاتا ہے (سیاحت نامہ تھیونو حصہ سوم ص ۱۰۱)۔

[3] مآثر عالمگیری ص ۱۴۳۔

ابوالحسن کا رشتہ عبداللہ قطب شاہ سے براہِ راست نہیں بلکہ بالواسطہ تھا، چنانچہ یہ مقامی مورخ ابوالحسن کا رشتہ بادشاہ کے ساتھ اس کی ماں یعنے حیات بخشی بیگم کیطرف سے ظاہر کرتے ہیں۔ یعنے حدیقۃ العالم کے الفاظ ہیں:۔۔۔۔ "ابوالحسن کہ از طرفِ مادر با بادشاہ قرابتِ قریبہ دارد"[۱] اور خافی خاں کے الفاظ ہیں:۔ "از طرفِ مادر سلسلہ او بہ قطب شاہیہ می رسد"[۲] ان الفاظ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ابوالحسن کا رشتہ خود اس کی ماں کے طرف سے تھا نہ کہ حیات بخشی بیگم کی طرف سے۔ دوسری مقامی تاریخیں اس حقیقت کو اور زیادہ منکشف کر دیتی ہیں۔ ماہ نامے کے مولف کا بیان یہ ہے کہ جب نسبت کے لئے عبداللہ قطب شاہ نے ابوالحسن کے متعلق دریافت کیا کہ وہ کون ہے تو محل کی ذمہ دار عورتوں نے جن کے نام ماہ بانو اور سر و ماتھے بیان کیا "جوانے از نبائر عین الملک واز احفاد این دودمان۔۔۔ شایستہ این نسبت است"[۳]۔ اگر ابوالحسن، سیف خاں عین الملک کا پوتا ہے تو اس کا قطب شاہی خاندان کا رشتہ دار ہونا ضروری ہے، کیوں کہ سیف خاں، سلطان قلی قطب شاہ کے چچا زاد بھائی فتحی خاں کا بیٹا تھا[۴]۔ ولندیزی سیاح ہیوبرٹ کے بیان سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے۔ اس کا بیان ہے کہ "ابوالحسن براہِ راست قطب شاہی خاندان کا رشتہ دار ہے"[۵]

---

[۱] حدیقۃ العالم، جلد اول ص ۱۶۱۔

[۲] منتخب اللباب، جلد سوم ص ۲۰۷۔

[۳] "ماہ نامہ" ۱۲۲۹ھ میں لکھی گئی۔ اس کا مولف غلام حسین کہتا ہے کہ اس نے اپنے زمانے میں ابوالحسن کے بھانجے ابو محمد سے، جو اس زمانے میں بہت بڈھا ہو گیا تھا، یہ حالات دریافت کئے تھے، اور غلام حسین سے اس کی قرابت بھی تھی اس لئے اس کا بیان زیادہ مستند ہے (ماہ نامہ ص ۳۱۵ و ۳۱۶)۔

[۴] تاریخ قطب شاہی ص ۳۔

[۵] سفر نامہ ہیوبرٹ جلد سوم ص ۲۵۴۔ یہ سیاح یہاں تک کہتا ہے کہ ابوالحسن، ابراہیم قطب شاہ کی اولاد میں سے ہے۔

اسی وجہ سے دوسری تاریخیں تو اس کو عبداللہ قطب شاہ کا بہت بڑا قرابت دار سمجھتی ہیں اور بعض نے "در قرابتِ قریبہ سرکار است"[۱] لکھا ہے۔ اس طریقے سے اس کو نہ صرف اس بات کا حق تھا کہ عبداللہ قطب شاہ کا داماد بنے بلکہ قطب شاہی تخت کا بھی مالک ہو۔ چنانچہ قدرتی حالات نے خود بخود اس کا انتظام کر دیا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ خاندانی رشتے کی وجہ سے ابوالحسن کی قطب شاہی خاندان میں شادی ہونی چاہیے تھی، لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اپنی ابتدائی زندگی میں ابوالحسن ..... درویشانہ زندگی بسر کرتا تھا، اور غالباً اس بے راہ روزندگی کی وجہ سے عبداللہ قطب شاہ نہ صرف اس سے ناراض تھا بلکہ خافی خاں کے الفاظ میں "عبداللہ قطب شاہ از بعضے اطوارِ او رنجیدہ خاطر گشتہ او را از نظر انداختہ بود"[۲]۔ ٹیویر نے اس میں ایک اور اضافہ یہ کر دیا ہے کہ "جس لڑکی سے ابوالحسن کی شادی ہوئی اس کا پہلے سے بہ رضا و رغبت انتظام ہو سکتا تھا، لیکن مشکل یہ تھی کہ ابوالحسن ایک عیاش آدمی تھا، اور اسی وجہ سے بادشاہ اس کی وقعت و عزت نہیں کرتا تھا۔ شادی کے بعد اس کے اخلاق و عادات درست ہوئے ہیں"[۳]۔ یہ تمام بیانات بے سر وپا معلوم ہوتے ہیں اور ان میں کوئی حقیقت نہیں ہے۔ بات یہ ہے کہ ابوالحسن کے اخلاق و عادات میں کوئی خرابی نہ تھی اور نہ وہ عیاش آدمی تھا۔ اگر "ماہ نامے" سے استناد کیا جائے تو "ابوالحسن شخصِ عالم و متقی بود۔ اصلا بہ منہیات و مسکرات میل نہ داشت" اس سے زیادہ یہ کہ "بہ کمالاتِ صوری و معنوی آراستہ و از مقدماتِ علمی آشنا"[۴] تھا لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاہی خاندان سے اس کی کوئی راہ و رسم نہ تھی، اور چونکہ اس کو شاہی خاندان میں

---

[۱] گلزارِ آصفیہ۔ ص ۴۷۔

[۲] منتخب اللباب۔ جلد سوم ص ۷ ۔ ۸۔

[۳] سیاحت نامہ ٹیورنیر۔ جلد اول ص ۱۳۸۔

[۴] ماہ نامہ۔ ص ۴۱۳ ۔ ۴۱۵ ۔ ۴۱۶۔

شادی کی اُمید نہ تھی، اور حقیقت یہ ہے کہ اگر شاہی محل کے غیر معمولی واقعات اس کے موافق نہ ہوتے تو شاہی خاندان میں ابوالحسن کی شادی نہ ہوتی، اس لئے اس عالمِ مایوسی میں اس نے.... صوفیانہ زندگی اختیار کرلی تھی اور حیدرآباد کے مشہور بزرگ شاہ راجو قتالؒ[1] کا مرید ہوگیا تھا جن کی خانقاہ میں اس کے آٹھوں پہر گزرتے تھے، اور کچھ اسی وجہ سے عبداللہ قطب شاہ اس سے واقف نہ تھا. یہ اس وقت واقف ہوا ہے جب کہ محل کے غیر معمولی واقعات سے وہ مجبور ہوگیا اور اہلِ محل نے اس کو واقف کرایا! اس سے پہلے عبداللہ کو مطلق خیال نہ تھا کہ اس کی بیٹی ابوالحسن کے عقد میں دی جائے گی۔ اتفاق سے کچھ حالات ایسے نمودار ہوئے کہ ایک دم کایا پلٹ ہوگئی اور ابوالحسن کی شاہی خاندان میں شادی ہوگئی۔ یہ روایت مشہور ہے اور تمام مورخ لکھتے ہیں کہ شاہ راجوؒ نے پورے ایقان کے ساتھ پیشین گوئی کردی تھی کہ بادشاہ کی بیٹی سے اس کی شادی ہوگی۔

جن اسباب سے اور جس سُرعت کے ساتھ یہ کایا پلٹ ہوئی ہے وہ بہت حیرت انگیز ہیں۔ بات یہ تھی کہ جس لڑکی سے ابوالحسن کی شادی ہوئی ہے اس کی نسبت بہت پہلے سید سلطان نامی ایک حجازی شریف زادہ سے ہو چکی تھی۔ یہ سید سلطان بھی اسی طرح حیدرآباد میں آیا تھا جس طرح سید احمد کا ورود ہوا تھا چونکہ سید احمد کی طرح اس کا تعلق بھی حجاز کے ایک ذی عزت خاندان سے تھا، اس لئے دربار میں اس کی بہت آؤ بھگت ہونے لگی اور یہ عجیب اتفاق کی بات تھی کہ سید سلطان کے ساتھ سید احمد کے آبائی روابط بھی تھے، چنانچہ جب عبداللہ قطب شاہ نے سید احمد سے سید سلطان کی بابت دریافت کیا تو اس نے پوری صداقت کے ساتھ سید سلطان کے

---

[1] ان کا اصل نام "شاہ رضی الدینؒ" ہے، فتح دروازے سے باہر ان کا مزار ہے، ان کے دادا کا بھی "شاہ رضی الدینؒ" نام تھا جو محمد قلی قطب شاہ کے عہد میں حیدرآباد میں رہتے تھے، لیکن چند سیاسی حالات سے مجبور ہو کر بیجاپور چلے گئے تھے۔

تمام واقعات بتا دیئے، ان کی جان پہچان اس طرح کی تھی کہ دونوں ایک ہی دیار کے رہنے والے تھے، اور اس کے علاوہ سید سلطان، سید احمد کے باپ کا شاگرد بھی تھا اور اس میں سید احمد سے زیادہ خاندانی شرافت تھی، اس لئے عبداللہ قطب شاہ نے اپنی تیسری بیٹی سید سلطان سے منسوب کر دی. ظاہر ہے کہ اس نسبت میں سید احمد کا مشورہ ضرور شامل تھا، چونکہ یہ بڑا داماد تھا اور سلطنت کے حل و عقد میں بھی شریک تھا، اس لئے ازدواجی نسبت کا سرانجام سید احمد کے مشورے کے بغیر کہاں ممکن تھا۔ اس نسبت کے ساتھ شادی کی تیاری شروع ہو گئی، اور اگر اس کے بعد غیر معمولی و ناگوار واقعات ظہور پذیر نہیں ہوتے تو شاہزادی کی سید سلطان سے شادی ہو جاتی اور گولکنڈے کی تاریخ کا انجام کچھ اور ہوتا۔ لیکن اس کے بعد ایک ناگوار واقعے سے سید احمد اور سید سلطان میں غایت درجے کی مخالفت ہو گئی.

بات یہ ہے کہ ایک روز عبداللہ قطب شاہ نے دربار میں سید سلطان سے دریافت کیا کہ "تم سید احمد کے خاندان سے کس حد تک واقف ہو، وہ کس پایہ کا خاندان ہے؟" اس سوال کا جواب اچھا نہیں دیا گیا۔ سید سلطان نے سید احمد اور اس کے خاندان کی مذمت تو نہیں کی، بلکہ ان الفاظ میں تعریف ہی کی کہ: "وہ میرے اُستادزادے ہیں اور ان کو خاندانی فضیلت بھی حاصل ہے"[1]۔ لیکن یہ الفاظ سید احمد کی توقع سے بہت گرے ہوئے تھے، وہ اس سے زیادہ تعریف چاہتا تھا۔ اس کو یہ خیال ہوا کہ

---

[1] منتخب اللباب، جلد سوم ص ۴۰۶۔ حدیقۃ العالم، جلد اول ص ۳۶۱۔ بعض مورخ اسی جواب کو کھینچ تان کر پیش کرتے ہیں کہ سید سلطان نے اپنے خاندان کی بڑائی اور سید احمد کے خاندان کی حقارت کی لیکن قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس منزل پر جب کہ اس کی شادی نہیں ہوئی تھی اور اس تقریب کا سرانجام سب کچھ سید احمد کے ہاتھ میں تھا، سید سلطان اپنے مربی کی نسبت ایسے الفاظ استعمال نہیں کر سکتا تھا جو شائستگی سے گرے ہوئے ہوں.

سید سلطان اپنے کو بڑھانے کے لئے مجھے بادشاہ کی نظروں میں گرانا چاہتا ہے، اس واقعے سے وہ سید سلطان کا دشمن ہو گیا۔

جوں جوں شادی کی تیاری ہو رہی تھی سید احمد کی مخالفت کا پیمانہ لبریز ہو رہا تھا۔ یہ اور اس کی بیوی اس نسبت کو توڑنا چاہتے تھے اور ہر خطرے کے لئے تیار تھے۔ شادی کی تیاریاں ہو گئیں اور بالآخر عقد کا دن آگیا۔ اس کے ایک روز پہلے سید احمد نے بادشاہ کو اطلاع کر دی کہ "ہم اس شادی کے مخالف ہیں، اگر یہ شادی اٹل ہے تو میں گولکنڈے میں نہیں رہوں گا بلکہ یہاں سے کوچ کر کے عالمگیر بادشاہ کی ملازمت اختیار کر لوں گا"[1] چنانچہ اس کوچ کا بندوبست بھی شروع ہو گیا۔ بعض مورخ کہتے ہیں کہ سید احمد اور اس کی بیوی کے اغوا سے خود دلہن اور اس کی ماں خودکشی کرنے کے لئے تیار ہو گئیں کہ جونہی عقد کی تو ہیں مرہوں گی وہ خنجر سے اپنا کام تمام کر لیں گی[2]۔ صورت حال بہت نازک ہو گئی۔ عبداللہ قطب شاہ نے سید احمد کو بہتیرا سمجھایا، اور اس کو راضی کرنے کے لئے متعدد آدمی بھیجے، لیکن یہ سب بے فائدہ ہوا۔ سید احمد کی یہ دھمکی کہ وہ عالمگیر بادشاہ کے پاس بھاگ جانا چاہتا تھا عبداللہ قطب شاہ کو ڈرانے کے لئے بہت کافی تھی۔ اول تو بادشاہ کو اپنی بڑی بیٹی اور داماد کا زیادہ پاس تھا، دوسرے اس میں مغلوں کا آیندہ خطرہ تھا، کیوں کہ مغل تو گولکنڈے پر اپنی آنکھ لگائے بیٹھے تھے، چونکہ اس وقت سلطنت کی عنانِ حکومت سید احمد کے ہاتھ میں تھی اس لئے اس شخص کا مغلوں کے پاس بھاگ جانا سلطنت کے لئے بہت خطرناک ہوتا۔ بادشاہ سخت کشمکش میں پڑ گیا۔ لایق درباریوں نے سمجھایا کہ اب سید سلطان سے شادی کرنا خطرے سے خالی نہیں ہے۔ چونکہ شادی کی پوری تیاری بھی ہو چکی ہے اس لئے بجائے

---

[1] گلزار آصفیہ ص ۱۴۷۔

[2] ” ” ”

سید سلطان کے ابوالحسن سے شادی کردی جائے تو مناسب ہے[1]، اور اس مشکل کا واحد حل یہی تھا۔ بادشاہ نے ناچار اس سے اتفاق کرلیا۔ چنانچہ عین اس روز جب کہ سید سلطان کی شادی ہونے والی تھی ابوالحسن فوراً گولکنڈہ طلب کیا گیا اور ان تمام تیاریوں کے ساتھ جواب تک عمل میں آئی تھیں ابوالحسن کی شادی ہوگئی اور سید سلطان عالمِ وحشت میں گولکنڈے سے فرار ہوگیا۔

ابوالحسن کی تخت نشینی

جس طرح ابوالحسن کی شادی ایک حیرت انگیز طریقے سے ہوئی تھی تقریباً اسی طرح اس کی تخت نشینی بھی ہوئی اور حقیقت یہ ہے کہ سید احمد کے ہوتے ہوئے جو عبداللہ قطب شاہ کا بڑا داماد تھا اور جو بادشاہِ وقت کے ساتھ اُمورِ سلطنت میں دخل رکھتا تھا، ابوالحسن کو تخت ملنے کی کیا توقع ہوسکتی تھی۔ یوں تو اس معاہدے کی رو سے جو ۱۰۶۶ھ/۱۶۵۶ء میں ہوا تھا اورنگ زیب کا بیٹا محمد سلطان وارثِ تخت تھا۔ لیکن یہ بھی اتفاق ہے کہ شاہزادہ محمد سلطان اپنے باغیانہ رویے کی وجہ سے شہنشاہ کی نظروں سے گِر چکا اور نظربند تھا شہنشاہ نے کبھی اس پر زور نہیں دیا کہ عبداللہ کے بعد محمد سلطان گولکنڈے کا بادشاہ ہونا چاہیئے ان حالات میں گولکنڈے کی جانشینی کا مسئلہ زیرِ بحث ہوگیا۔

---

[1] دوسری طرف حضرت شاہ راجوؒ کی خانقاہ کا عجیب منظر تھا۔ یہاں قدم قدم پر شادی کی تیاریوں کی خبر ملتی تھی۔ ابوالحسن تو مایوس ہوجاتا، لیکن حضرت راجوؒ اس کو یقین دلاتے تھے کہ شادی تم سے ہی ہوگی۔ شادی کے ایک روز پہلے ابوالحسن کو معلوم ہوا کہ گولکنڈے میں رسمِ ساچق ہونے والی ہے تو اس نے اپنے مرشدؒ کو اس کی اطلاع کردی اور مرشدؒ نے اپنی خانقاہ میں بھی اس ساچق کا انتظام کردیا۔ یعنے مٹّی کے کوزے جمع کرکے چند ضروری لوازم کے ساتھ ساچق کی شکل پیدا کردی (گلزار آصفیہ) اور یہ اس بات کا یقین تھا کہ گولکنڈے میں جو شادی ہورہی ہے وہ خود ابوالحسن کی ہے، اور عجیب اتفاق ہے کہ یہ پیشین گوئی حرف بہ حرف صحیح ہوئی۔

اس وقت عبداللہ قطب شاہ کے دو داماد تھے، ایک تو سید احمد، دوسرے ابوالحسن۔ ان میں سے ایک کو تخت ملنا چاہیئے تھا۔ سید احمد بڑا داماد تھا، اور اس کے علاوہ وہ امورِ سلطنت میں بادشاہ کا شریک تھا، اور خود عبداللہ قطب شاہ کے آخری زمانے میں حکومت کی باگ تمام تر سید احمد کے ہاتھ میں تھی۔ جب تک بادشاہ کی ماں حیات بخشی بیگم زندہ رہی ہے وہی حکومت کو مشورہ دیا کرتی تھی اور جب سنہ ۱۰۸۰ھ (۱۶۶۹ء) میں اس کا انتقال ہوگیا تو عنانِ حکومت سید احمد کے ہاتھ آگئی نیز اس کی بیوی جو "ماں صاحب" یا "بڑی صاحبنی" کے نام سے مشہور ہے، محل میں ذی اثر تھی اور اپنے شوہر کی جانشینی کے لئے اپنی پوری قوت استعمال کرنے کے لئے تیار تھی۔ اس طریقے سے سید احمد کے بادشاہ ہونے کے بہت سے قرائن تھے۔ برخلاف اس کے ابوالحسن کو نہ تو تخت کا کوئی حق تھا نہ بظاہر اس کے کوئی اسباب تھے۔

قیاس یہ ہے کہ عبداللہ قطب شاہ نے اپنی زندگی میں اپنی جانشینی کا کوئی فیصلہ نہیں کیا تھا۔ اس کی وضاحت کسی تاریخ سے نہیں ہوتی۔ البتہ بادشاہ کی خاموشی سے یہ خیال ہوتا ہے کہ وہ غالباً سید احمد کی جانشینی کو پسند نہیں کرتا تھا۔ اگر وہ اس کی جانشینی کو پسند کرتا تو نہ صرف اس کا کھلا اعلان کر دیتا بلکہ جہاں تک ہو سکتا اس کا قبل از وقت انتظام کر دیتا۔ چونکہ یہ بندوبست نہیں ہوا تھا اس لئے قیاس یہ ہے کہ

۱ؔ فرائر کہتا ہے کہ عبداللہ قطب شاہ نے سید مظفر کے کہنے سے ابوالحسن کو اپنا جانشین بنا دیا تھا (سفرنامہ فرائر۔ جلد اول ص ۸۲ – ۸۴) لیکن یہ بیان بہت کچھ بحث طلب ہے۔ اول تو سید مظفر کا اس زمانے میں اتنا اثر نہ تھا کہ وہ بادشاہ کو سید احمد کے خلاف مشورہ دیتا، کیوں کہ وہ سمجھتا تھا کہ سید احمد کے خلاف بادشاہ کو مشورہ دینا کیا معنے رکھتا ہے! خصوصاً سید سلطان کی شادی کے فسخ ہونے کے بعد تو اہلِ گولکنڈہ سید احمد کے خطرے سے ضرور واقف تھے، لیکن اس قدر صحیح ہے کہ اہلِ گولکنڈہ سید احمد کے مقابلے میں ابوالحسن کی طرف مائل تھے اور سید مظفر ابوالحسن کا ہمدرد تھا۔

غالباً عبداللہ قطب شاہ ابوالحسن کی طرف مائل ہوگا، اور اس کے اسباب بھی ہیں۔ کیوں کہ ابوالحسن نہ صرف لائق اور پاکیزہ اخلاق آدمی تھا بلکہ قطب شاہی خاندان کا رکن بھی تھا۔ اگر ٹیورنیر کا بیان صحیح سمجھا جائے تو شادی ہونے کے بعد ابوالحسن کے اخلاق و عادات بہت اچھے ہوگئے تھے[1] اور ظاہر ہے کہ حضرت راجوؒ کا مرید ہونے کی وجہ سے اس کے اخلاق و عادات کے خلاف کوئی بدگمانی نہیں کی جاسکتی۔ مقدس مرشد کا اس کے اخلاق پر ضرور اثر پڑا ہوگا، اس لئے اب اس سے کوئی بدگمانی اور مخالفت نہ تھی۔ اس طریقے سے اگر یہ قیاس کیا جائے کہ عبداللہ قطب شاہ دل سے ابوالحسن کو اپنا جانشین بنانا چاہتا تھا تو بے معنے نہ ہوگا۔ چنانچہ "ماہ نامہ" کا بیان ہے کہ "شادی کے بعد بادشاہ نے اسکو شاہی خزانوں کی کنجیاں سپرد کردی تھیں جن میں قیاس یہ ہے کہ پچاس کروڑ، پانچ لاکھ ہون تھے اور امورِ سلطنت کی بھی تلقین کی تھی"[2]۔ یہ الفاظ بڑی حقیقت پر دلالت کرتے ہیں۔ بنیر فرائر کے خیال سے اس کی بالواسطہ تائید ہوتی ہے۔ البتہ اس فیصلے کا اعلان کرنا اور اس کا انتظام کرنا عبداللہ کے لئے ناممکن تھا۔

جانشینی کے متعلق عبداللہ قطب شاہ کا یہ خیال ہو یا نہ ہو، حالات تمامتر ابوالحسن کے موافق تھے، اور اس کی وجہ یہ تھی کہ سید احمد کے غرور و تمکنت کے باعث گولکنڈے کے تمام امرا اور عمائدِ سلطنت اس کے مخالف ہوگئے تھے اور دربار میں اس کے خلاف سازشیں ہونے لگی تھیں، چنانچہ سید احمد ایک عربی نظم میں ان مخالفتوں کا اظہار کرتا ہے اور بادشاہ سے شکوہ کرتا ہے[3]۔ شائد وہ کچھ تند مزاج بھی واقع ہوا تھا، دوسرے اس گھمنڈ میں تھا کہ وہ بادشاہ کا بڑا داماد ہے، ایک روز سلطنت کا مالک ہوجائے گا وہ شاہانہ زندگی بسر کرتا تھا۔

---

[1] ٹیورنیر، جلد اول ص ۱۳۸۔ [2] "ماہ نامہ" ص ۳۱۶۔
[3] "گولکنڈے کے عربی شاعر" ازڈاکٹر عبدالمعید خاں ص ۵۰۔

یہ سب اسباب اسکی مخالفت اور ابوالحسن کی تائید میں جمع ہونے لگے، اور یہ عجیب اتفاق ہے کہ عبداللہ قطب شاہ کی زندگی میں ہی ابوالحسن کی بادشاہی کا سامان ہوگیا، اور اس کا باعث یہ تھا کہ "ابوالحسن چون شکنجۂ روزگار کشیدہ پانزدہ سال در لباس فقیری بسر بردہ سخت و سست جہان را تماشا نمودہ بود و با اکثر امرائے قطب الملک بزمان خوش و سلوک برادرانہ زیست می نمودہ بود و بہ تیز ے از امراء بہ او گرویدہ بودند"۔[1] حقیقت یہ ہے کہ ابوالحسن نے اچھے اخلاق و عادات کی وجہ سے اپنے اِرد گرد بہتر فضا پیدا کرلی تھی اور تمام دوست دشمن اس کے ہواخواہ ہوگئے۔ چنانچہ سلطنت کے دوسرے عمائد سید مظفر اور موسیٰ خاں محلدار اس کے بڑے ہمدرد تھے۔ ان کے ساتھ پیشکار اکنّا و مادنّا بھی شریک تھے ان لوگوں نے ابوالحسن کی پوری تائید کی، یعنی ان کی رہنمائی کے بغیر ابوالحسن کی کامیابی ممکن نہ تھی، چنانچہ جب عبداللہ قطب شاہ کی آخری گھڑیاں باقی رہ گئی تھیں سلطنت کے عمائد مستقبل کی سوچ میں پریشان پھرنے لگے اور ہر طرف ایک ہیجان معلوم ہوتا تھا اور یہ خیال ہوا کہ بادشاہ کے مرنے سے پہلے جانشینی کا مسئلہ طے ہو جانا چاہیئے جو لوگ سید احمد کے ہمدرد تھے وہ اس کے لئے کوشش کرنے لگے۔ برخلاف اس کے سید مظفر اور موسیٰ خاں جیسے لوگ ابوالحسن کی تائید میں کھڑے ہوگئے لیکن مرنے والے بادشاہ سے کسی وصیت کی توقع نہ تھی، اس پر ایسی غشی طاری ہوئی کہ اس کے بعد پھر اس نے آنکھیں نہیں کھولیں، جانشینی کا مسئلہ تنازع للبقا کے لئے ملتوی رہا۔ ۱۲؍ اپریل ۱۰۸۳ھ/۱۶۷۲ء کو عبداللہ قطب شاہ کا انتقال ہوا اس کے انتقال سے پہلے ہی خانہ جنگی کے آثار پیدا ہو گئے تھے، کیوں کہ اس وقت جانشینی کے مسئلے کو حل کرنے والے دو فریق تھے جو ایک دوسرے کے حریف تھے اور ہر فریق اپنے امیدوار کو تخت نشین کرنا چاہتا تھا۔ سید احمد کو یہ فائدہ تھا کہ اس کو بادشاہ سے تقرب حاصل تھا اور حکومت کے تمام آلات اس کے ہاتھ میں تھے۔ اس کی بیوی "بڑی صاحبہ" محل کے اندر اپنا پورا اثر

---

[1] منتخب اللباب جلد سوم ص ۳۴۷ ـ ۳۴۸۔

رکھتی تھی اور ہر قسم کے مقابلے کے لئے تیار تھی۔ ابھی بادشاہ غشی کے عالم میں تھا کہ اس کی موت کا واویلا مچنے لگا۔ ابوالحسن اپنے کو بے دست و پا سمجھتا تھا، اس خیال سے کہ خاموش بیٹھنا اچھا نہیں ہے، گھوڑے پر سوار ہو کر محل تک پہنچ گیا تاکہ صورت حال پر قابو حاصل ہو جائے۔ ابوالحسن کے اچانک آجانے سے محل میں ایک سنسنی سی ہو گئی سید احمد کے ہواخواہوں کو ڈر ہوا کہ عین وقت پر یہ اپنے ہواخواہوں کی مدد سے مرکز حکومت پر قبضہ حاصل کرلے گا، یہ کہا گیا کہ ابوالحسن آمادۂ فساد ہے اور اس لئے اس کی پوری مزاحمت کی تاکہ وہ اندر نہ آنے پائے، اس میں ایک چھوٹی سی جھڑپ ہو گئی سید احمد کے ہواخواہوں نے ڈنڈوں کے ذریعے ابوالحسن کا مقابلہ کیا۔ چونکہ ابوالحسن نہتا تھا، اس لئے اس کو پسپا ہونا پڑا۔ یہ خود تو بچ گیا لیکن عبداللہ نامی ایک شخص کے وار سے اس کے گھوڑے کا پٹھا مجروح ہو گیا۔ جب ابوالحسن مجبور ہو کر شاہی محل سے پلٹا تو سیدھے سید مظفر کے گھر گیا، کیونکہ اس کو معلوم تھا کہ اس کے ہمدرد سید مظفر اور موسیٰ خاں تھے، اور روتے ہوئے اس کے سامنے زمین پر پڑ گیا۔[۱] سید مظفر نے کہا کہ "اس گریہ وزاری کی کیا ضرورت ہے، ہمت سے کام لینا چاہیئے، اگر کامیاب ہو جائیں تو تخت ملے گا، ورنہ تختہ"۔[۲] ان الفاظ میں دلجوئی اور نصیحت دونوں چیزیں شامل تھیں تاکہ ابوالحسن ہمت نہ ہارے اور اسی سے سید مظفر کی سیاسی قابلیت بھی معلوم ہوتی ہے کہ وہ ان حالات سے پریشان نہیں ہوا بلکہ ٹھنڈے دل سے اس صورتِ حال کا مقابلہ کیا۔ غالباً وہ اس راز سے واقف تھا کہ فریقِ مخالف میں کس قدر دم خم ہے۔

خانہ جنگی کا تمام سامان جمع ہو گیا۔ سید احمد محل کے باہر اپنے تمام ہواخواہوں

---

[۱] خافی خاں تو کہتا ہے کہ "وہ بے ہوش ہو کر پڑ گیا" لیکن یہ غالباً مبالغہ ہے۔ اتنا صحیح معلوم ہوتا ہے کہ اس دارو گیر میں اس پر بدحواسی ضرور طاری ہوئی ہوگی اور اسی عالم میں وہ سید مظفر کے گھر آیا تھا۔

[۲] منتخب اللباب، جلد سوم ص ۳۰۸۔

اور آلاتِ حکومت کے ساتھ مقابلہ کرنے کے لئے تیار تھا، اور محل کے اندر اس کی بیوی زنانہ فوج کے ساتھ مسلح کھڑی تھی۔ بیان کیا جاتا ہے کہ "ماں صاحب" کے ہاتھ میں ننگی تلوار تھی اور اس کے ساتھ کنیزانِ حبشی اور ترکی مسلح کھڑی تھیں۔ ادھر سید مظفر اور اس کے شرکائے کار ابوالحسن کی تائید کے لئے تیاری کر رہے تھے۔ چونکہ جانشینی کا فیصلہ فریقین کی تلوار پر منحصر تھا اس لئے ایک خانہ جنگی یقینی تھی۔ اس سے پہلے ابوالحسن سے ایک جھڑپ تو ہو چکی تھی، اگر حالات پر ہوشیاری سے قابو حاصل نہیں کیا جاتا تو سخت لڑائی ہو جاتی جو گولکنڈے کے لئے مہلک ثابت ہوتی۔ لیکن اس معاملے میں دو چیزوں نے کام کیا، ایک تو سید احمد کی غیر ہردلعزیزی تھی، صرف معدودے چند آدمی اس کے خیر خواہ رہ گئے تھے۔ اکثر ایسے تھے جو بظاہر اس کے ہمدرد معلوم ہوتے تھے لیکن دل سے اس کے مخالف تھے۔[1] سید احمد کا اعتماد ایسے ہی لوگوں پر تھا، چنانچہ جب کام کا وقت آیا تو یہ سب چپکے سے ابوالحسن کی تائید پر کھڑے ہو گئے اور سید مظفر کی غیر معمولی سیاسی قابلیت بہت جلد تمام حالات پر قابو پا گئی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سید مظفر نے نہایت ٹھنڈے دل کے ساتھ تمام سیاسی ہتھکنڈے پہلے سے سوچ رکھے تھے اور وقت کا منتظر تھا۔ اگر اس موقع پر سید مظفر نہ ہوتا تو ابوالحسن کو کبھی تخت نہیں ملتا، چنانچہ اس نے ابوالحسن کو ہمراہ لے کر پہلے ان مقامات کی گرفت کی جہاں نگرانی کی ضرورت تھی۔ چونکہ فوج اس کے ہاتھ میں تھی اس لئے اس نے آسانی کے ساتھ شاہی محلات کا محاصرہ کر لیا جہاں "ماں صاحب" تھی اور بادشاہ سسکیاں لے رہے تھے اسی جگہ سید احمد بھی تھا۔ اس محاصرے سے سید احمد

---

[1] موسیٰ خاں حوالدار کو بعض مورخ سید احمد کا موید بتاتے ہیں (حدیقۃ العالم جلد اول ص ۳۶۷) اور دوسرے اس کو سید مظفر کے ساتھ لکھتے ہیں۔ اگر اس کا سید احمد کے ساتھ شریک ہونا صحیح بھی ہے تو وہ بہ ظاہر ہوگا، مگر دل سے وہ ابوالحسن کے ساتھ شریک تھا۔

اور اس کی بیوی، جن سے مقابلہ تھا، بے دست و پا ہو گئے اور کوئی حرکت نہ کر سکے۔ پھر سید مظفر نے بعض اہلِ دربار کو جو بادشاہ کے مقرب تھے اشارہ کیا کہ وہ سید احمد سے کنارہ کش ہو جائیں اور ابو الحسن کی تائید کریں۔ اس طریقے سے سید احمد اور ماں صاحب کے حوصلے اور تیاریاں خاک میں مل گئیں، اور جونہی عبداللہ قطب شاہ کی روح پرواز ہوئی ابوالحسن قطب شاہ کی بادشاہی کا اعلان ہو گیا۔

سید احمد اور اس کی بیوی ماں صاحب قید میں رکھی گئی تھی۔ سید احمد دو سال کے بعد ۱۰۸۵ھ/۱۶۷۴ء میں مر گیا اور اس کی بیوی بھی قید ہی میں مر گئی اور یہ دونوں قطب شاہی قبرستان میں دفن ہوئے۔ ان کی کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ لیکن سید احمد کا حجازی بیوی کے بطن سے ایک بیٹا تھا جس کا نام سید علی ہے یہ شخص عربی زبان اور ادب کا بڑا عالم تھا، اور باپ کے مرنے کے بعد پانچ سال تک گولکنڈے میں رہا ہے اور ۱۰۹۲ھ/۱۶۸۱ء میں اس نے بالآخر حیدرآباد کو خیرباد کہہ دیا اور مغل خدمت اختیار کر لی۔ اس کو خان کا خطاب اور ہزار پانچ صدی منصب عطا ہوا تھا پہلے اس کو برہان پور اس کے بعد اورنگ آباد کی خدمت دی گئی اور بالآخر وہ برار میں متعین ہوا، پھر وہ چند سال کے بعد شہنشاہ سے رخصت لے کر .... اپنے اہل و عیال کے ساتھ پہلے حجاز گیا اور اس کے بعد مشہد اور شیراز چلا گیا۔ آخری زمانہ اس کا شیراز میں گزرا، چنانچہ شیراز ہی میں ۱۱۱۷ھ/۱۷۰۵ء میں اس کا انتقال ہوا اور وہیں دفن ہوا۔ اپنے باپ سید احمد کے انتقال پر اس نے ایک مرثیہ لکھا تھا اور "حزنِ عظیم" (۱۰۸۵ھ) سے تاریخ وفات نکالی تھی[1]

اب رہا سید سلطان، تو بہت پہلے فرار ہو گیا اور شہنشاہ اورنگ زیب کی ملازمت اختیار کر لی تھی اور اس کو وہاں خطابات، و مناصب بھی عطا ہوئے لیکن

۱؎ دیکھو "گولکنڈے کے عربی شعرا" مصنفہ ڈاکٹر عبدالمعید خاں ص ۴۳-۱۰۱-۱۰۲۔

اس کا ایک بیٹا سید معصوم علی اس وقت تک گولکنڈے میں تھا، ابوالحسن قطب شاہ کی تخت نشینی کے بعد موقع پاکر یہ شخص بھی گولکنڈے سے بھاگ گیا اور مغل سلطنت کا ملازم ہوگیا۔ ان لوگوں کا بھاگنا اور مغل سلطنت میں شریک ہونا آئندہ گولکنڈے کی سلطنت کے لئے بہت مُضر ثابت ہوا۔

مژدے کہ بتائید حق شہِ دکن است
بجان محبِ علی قطب ابوالحسن است[1]

---

[1] یہ ابوالحسن قطب شاہ کے نام کا سجع ہے جو اس کے بادشاہ ہونے کے بعد لکھا گیا تھا دیکھو مآثر دکن، بلگرامی ضمیمہ ص ۲۔

انیسواں باب

مادنّا کی وزارت

ابوالحسن قطب شاہ دکن میں "تانا شاہ" کے ہر دلعزیز لقب سے مشہور ہے۔ جس طرح اس کی شادی اور تخت نشینی تلاطم خیز تھی، اسی طرح اس کا بتدرہ سالہ عہدِ حکومت بھی بڑا پُر آشوب ثابت ہوا۔ یہ ایسے وقت میں تخت نشین ہوا تھا جب کہ دکن میں چاروں طرف گرم آندھیاں اُٹھ رہی تھیں۔ مرہٹوں کی تاخت و تاراج سے دکن کی تمام سرزمین دہل رہی تھی۔ سیاست و معاشرت کے تمام تار و پود اس طرح بکھر رہے تھے کہ گویا وہ آیندہ یکجا ہونے والے نہ تھے۔ مغلوں کا سیلاب شمال سے اس زور سے آیا کہ اس کے سامنے کی کوئی طاقت ٹھیر نہیں سکتی تھی۔ لیکن واقعات بتاتے ہیں کہ تانا شاہ ان حالات کا اچھا مدِ مقابل تھا، اس میں حکمرانی کی قابلیت تھی اور جہاں بانی کے حوصلے تھے۔ اس کی تعلیم و تربیت شاہی محلوں سے دُور ایسے ویرانوں میں ہوئی تھی جہاں علمی و سیاسی تربیت کے اچھے مواقع تھے۔ اپنی خانگی اور صوفیانہ زندگی میں اس نے "شکنجہ روزگار کشیدہ...... سخت و سست جہان را تماشا نمودہ بود"۔ قطب شاہوں کی تاریخ میں سلطان قلی کے بعد تانا شاہ کا درجہ ہے جس نے غربت سے شاہی حاصل کی تھی اور زندگی کے مختلف مدارج دیکھے تھے۔ اس کی بیدار مغزی میں کلام نہیں، سیاست میں اس نے ایک

وسیع نظر پائی تھی ۔ یہ اپنے پیشروؤں سے زیادہ مستعد و جفاکش تھا۔ دکن کی تمام سیاست سے واقف تھا، جو ہر روز الجھ رہی تھی ۔ یہ دیکھ کر اچنبا ہوتا ہے کہ گو اس کی نشونما شاہی محلوں میں نہیں ہوئی تھی، لیکن اس نے ایسے شاہانہ طور طریق اختیار کئے تھے کہ گویا بادشاہی اس کا حقیقی ورثہ تھا۔ اس کے بلند کردار اور غیر متزلزل خودداری و استقلال جو ہر موقعے پر ظاہر ہوئے ایسے اوصاف تھے کہ ان کی مثال نہیں، اور یہ ایک کامیاب جہانبانی کے ضروری لوازم ہیں۔ اگر شمال سے مغلوں کا زور دار ریلا نہیں آتا جو شہنشاہ اورنگ زیب کے جلو میں آیا، اور دکنی طاقتوں کو بہالے گیا، تو قرائن یہ ہیں کہ ابوالحسن دکن کا اچھا رہنما ہوتا۔

۵ محرم ۱۰۸۳ھ / ۱۶۷۲ء کو ابوالحسن کی بادشاہی کا اعلان ہوا، لیکن غالباً عشرۂ محرم کا لحاظ کرکے تخت نشینی کی اصل رسم آٹھ روز کے بعد یعنے ۱۳ محرم کو منائی گئی۔ اس روز شاہی دربار منعقد ہوا۔ بادشاہ کی تخت نشینی کے ساتھ پرانے دستور کے مطابق امراء و عمائدِ سلطنت نے نذرانے دیئے اور بادشاہ کی طرف سے انھیں خلعتیں ملیں۔ جن لوگوں نے ابوالحسن کی تخت نشینی میں مدد کی تھی وہ سب سے زیادہ شاہی عنایات کے مستحق تھے۔ بادشاہ نے ان کا احسان مانا، اور ان کی محنت کا صلہ دیا۔ چنانچہ اس زمانے کے روحِ رواں سید مظفر کو جو عبداللہ کے آخری زمانے میں سرخیلی کی خدمت پر مامور تھا، امیرالامراء کا خطاب اور میر جملہ کا عہدہ عطا کیا گیا۔ موسیٰ خاں حوالدار کو خانخاناں کے خطاب کے ساتھ سرخیل کے عہدے پر فائز کیا گیا، یہ اب تک محلدار تھا۔ اکنّا و مادنّا کو جو دونوں سگے بھائی تھے اور سید مظفر کے ساتھ تخت نشینی کے معرکے میں شریک تھے خاطر خواہ ترقی دی گئی۔ مادنّا کو سید مظفر کا پیشکار بنایا گیا، اور اکنّا اپنے بھائی کا معتمد مقرر ہوا۔ رضا قلی نیک نام خاں جو کرناٹک کا طرفدار تھا اپنی خدمت پر بحال رہا۔ بادشاہ کے نام کا خطبہ و سکہ جاری کیا گیا، اور ادھر شمال میں مغل سلطنت سے سیاسی تعلقات خوشگوار رکھنے کی کوشش کی گئی۔ چنانچہ شہنشاہ اورنگ زیب کی خدمت میں نذرانہ ارسال کرکے

اطاعت کا وعدہ کیا گیا۔ شہنشاہ نے میر عبدالرحمٰن اور خواجہ عثمان کے ذریعے ایک فرمان بھیجا جس میں ابوالحسن کی بادشاہی تو تسلیم کرلی لیکن یہ ہدایت کی کہ مقررہ پیش کش برابر ادا کیا کرے اور سیواجی کی مدد نہ کرے[1]۔ اور اس کے بعد ۱۰۸۶ھ میں ۱۶۷۵ء میں ابوالحسن نے قوام الدین حاجب کے ہمراہ شہنشاہ کی خدمت میں نو لاکھ روپے

---

[1] شہنشاہ اورنگ زیب کا فرمان ابوالحسن کے نام:۔

"در حضورِ خانہ زاد ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ عبدالرحمٰن کہ حاملِ این فرمان است ۔ ۔ ۔ و خواجہ عثمان ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ دست بر قرآن گذاشتہ باشند قسم واللہ و باللہ یاد کند کہ اصلاً و مطلقاً در ہیچ امرے از امور بہ ظاہر و باطن از طریق اطاعت و انقیاد و خلوص و اعتقاد تخلف و انحراف نہ ورزد و در استیصال سیوائے مقہور ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بہ اولیائے دولت قاہرہ متفق بودہ از امداد و اعانت او اجتناب واجب شناختہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ و مبلغ چہل و لک روپیہ پیش کش حال را با وجہ پیش کش مقررے و بقایائے سال بہ سال ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بہ خزانہ عامرہ صوبۂ دولت آباد ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ارسال پیش کشہائے بائستہ کند" (تاریخ ظفرہ ص ۳۷)۔

ابوالحسن کا انقیاد نامہ:۔ "گلکنڈہ و مضافاتش کہ بہ عبداللہ قطب الملک مرحوم متعلق بود پس از وفات آن مغفور و برورہ باین مرید درست اخلاص بشرطِ اقامت بر جادۂ اطاعت و انقیاد ۔ ۔ عطا فرمودہ فرمان ۔ ۔ ۔ مزین بہ دستخط قدسی ۔ ۔ شرف صدر یافتہ این ارادتمند ظہور نمود کہ در ہیچ حالت سر رشتہ اخلاص و اطاعت نسبت بہ بندگان کہ از استصواب ۔ ۔ ۔ خانِ جہان بہادر کو کلتاش قرار یافتہ سال بہ سال ۔ ۔ ۔ گذرانیدہ باشد ۔ سیوائے مقہور شقاوت پیشہ را ۔ ۔ ۔ بہ دل و جان دشمن دانستہ ۔ ۔ ۔ از امداد و اعانتِ او ۔ ۔ اجتناب لازم ۔ ۔ ۔ در حضور میر عبدالرحمٰن ۔ ۔ ۔ و خواجہ عثمان ۔ ۔ ۔ دست بر قرآن مجید گذاشتہ قسم واللہ و باللہ یاد نمود ۔ ۔ ۔ کہ تا دمِ واپسین ۔ ۔ ہرگز پیرامون خلاف و اختلاف نہ گردد ۔ تحریر ۱۸ صفر سنہ ۱۰۸۶ھ" (تاریخ ظفرہ ص ۳۹)۔

جواہر اور ہاتھی بطور پیش کش بھیجے تھے[1]۔ اگر ان جدید عہدہ داروں کی جن کو ابوالحسن نے ترقی دی تھی بے وفائی سدِ راہ نہ ہوتی تو یہ نظامِ حکومت برسوں تک چلتا اور غالباً مغل شہنشاہت کو اس سلطنت میں دخل دینے کا موقع نہ ملتا۔ مشکل یہ ہوئی کہ ترقی پاتے ہی محمد سعید میر جملہ کی طرح سید مظفر نے بھی سلطنت سے بے وفائی کی۔

چونکہ سید مظفر جواب میر جملہ کی خدمت پر فائز تھا ابوالحسن کی تمام ترقی کا باعث تھا، اس لئے اس کی حیثیت بادشاہ گر کی سی تھی، اور تاریخ بتاتی ہے کہ جہاں ایسے بادشاہ اور "بادشاہ گر" ایک جگہ جمع ہوئے حصولِ اقتدار کی کشمکش شروع ہوگئی۔ سید مظفر یہ سمجھنے لگا کہ شاہی اقتدار اس کا حق ہے کیونکہ اس کی دستگیری کے بغیر ابوالحسن کو یہ درجہ نصیب نہ ہوتا، اس نے بہت جلد تمام سیاہ وسفید اپنے ہاتھ میں کر لئے اور بادشاہ کو بالکل کٹ پتلی بنانے کی کوشش کی، اور جو لوگ ابوالحسن کے ہمدرد تھے ان کا بُری طرح پیچھا کیا۔

چنانچہ موسیٰ خاں سے جو بادشاہ کا ہمدرد تھا، اس کی اَن بَن ہوگئی۔ جس طرح اس نے مرکزی حکومت میں بے وفائی کی اسی طرح سلطنت کے دُور دراز صوبوں میں بھی خود غرضی سے کام لیا اور قطب شاہی مفاد کو نقصان پہنچایا۔ چنانچہ نیکنام خاں کے انتقال تک جو ۲ ارجون ۱۰۸۳ھ/۱۶۷۲ء کو ہوا، کرناٹک کے حالات یہ دستور تھے کیونکہ مغربی تاجر اس سے بہت ڈرتے تھے۔ لیکن اس کے بعد جب موسیٰ خاں یہاں کا طرفدار رہا تو سید مظفر نے اس کو بہت ستایا، اور فرانسیسیوں کے مقابلے میں اس کی ایک نہیں چلنے دی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ فرانسیسی سان تھوم اور پلی کٹ پر قابض ہو گئے اور مسلمان ملاحوں کی کشتیاں تباہ کر دیں جو گولکنڈے کے لئے بہت شرم کی بات تھی اور بادشاہ کو اس کی بالکل اطلاع نہیں دی گئی۔ اگر موسیٰ خاں اپنے طور پر ہمت نہیں کرتا تو یہ مغربی کمپنیاں بے قابو ہو جاتیں اور حکومت کو اپنا اقتدار قائم رکھنا

---

[1] مآثر عالمگیری ص ۱۴۳۔

بہت مشکل ہو جاتا۔ ابوالحسن نے اس خطرے کو دُور کرنے میں بڑی دُور اندیشی سے کام لیا۔ اگر وہ اس معاملے میں جلدی کرتا تو محمد سعید کا سا پھر نیا شاخسانہ پیدا ہو جاتا، اور اس سے سلطنت کو ایک نیا دھکا لگتا۔ پہلے تو ابوالحسن خاموشی کے ساتھ حالات کا مطالعہ کرتا رہا اور اپنی حالت کچھ اس طرح بنائی کہ گویا وہ بہت ہی تن آسان و عیاش آدمی ہے اور اُمورِ سلطنت سے قطعی بے پروا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سید مظفر بادشاہ کی طرف سے بالکل مطمئن ہو گیا کہ گویا دربار سے اس کی کوئی مزاحمت نہ ہوگی۔ اس کو صرف موسیٰ خاں سے ڈر لگتا تھا۔ اسی وجہ سے اس کو راستے سے ہٹانے کی کوشش کی، مرکزی حکومت سے دُور کرنے کے لئے کہ وہ یہاں اپنا جال نہ پھیلائے، پہلے اس کو کرناٹک کا طرفدار بنا دیا، لیکن جب یہ معلوم ہوا کہ کرناٹک میں موسیٰ خاں کا پلّہ بھاری ہو رہا ہے تو اس کو وہاں سے برخاست کر دیا، اور جب یہ مرکز میں واپس آیا تو اس کو غدّار اور خائن ٹھیرانے کے لئے اس کے حساب کی تنقیح شروع کر دی۔ ظاہر ہے کہ میرجملہ کی حیثیت میں سید مظفر کو یہ حق حاصل تھا کہ جمع و خرچ کا حساب دیکھے۔ موسیٰ خاں کے برہمن پیشکار سے تمام مواد حاصل کر کے تنقیح کی گئی اور پھر خیانت ثابت کی گئی اور اس علت میں وہ قید کر دیا گیا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ موسیٰ خاں کے مکان سے پانچ لاکھ ہون نقد اور جواہرات برآمد ہوئے تھے۔

موسیٰ خاں کی گرفتاری سے سید مظفر کے حوصلے اور بڑھ گئے، کیوں کہ وہ سمجھتا تھا کہ موسیٰ خاں تنہا اس کے راستے میں حائل ہے۔ اب اس نے بادشاہ کو بالکل بے دخل کر دیا، اور تمام اُمورِ سلطنت خود فیصل کرنے لگا۔ بادشاہ کے لئے صرف یہ چارہ کار تھا کہ اپنے چند ہمدردوں کو جمع کر کے نہایت خاموشی کے ساتھ سید مظفر کو گرفتار کرائے۔ جب بادشاہ نے اپنے عہدہ داروں کو ٹٹولا تو کئی فوجی افسر اور سید مظفر کے پیشکار اکنا و مادنا اس سازش کے لئے تیار ہو گئے۔ مادنا نے سید مظفر کو بے دست و پا کرنے کا یہ طریقہ اختیار کیا کہ اس کے

ذی اقتدار فوجی عُہدہ داروں کو دُور دراز صوبوں میں بھیج دیا تاکہ اسکا کوئی بس نہ چل سکے۔ چنانچہ جب اس کی تیاری ہو گئی تو پھر ان لوگوں نے بادشاہ کو اشارہ کیا کہ وہ اب سید مظفر کے خلاف کارروائی کرے۔ اکنّا و مادنّا کی اس سازش سے تمام مطلع صاف ہو گیا۔ بعض مورخوں کا خیال ہے کہ مادنّا نے اپنی ترقی کی خاطر بادشاہ کو اس بات پر آمادہ کیا کہ سید مظفر کا خاتمہ کرے، چونکہ یہ سید مظفر کا پیشکار تھا اور اس کے راز سے واقف تھا، اور سید مظفر کے تمام کاروبار اس کے ہاتھ میں تھے، اس لئے سید مظفر کو بے دست و پا کرنا اس کے لئے مشکل نہ تھا[1]۔ سید مظفر کو اس سازش کی مطلق خبر نہ ہوئی۔ ۱۰۸۵ھ / ۱۶۷۴ء میں دربارِ عام منعقد ہوا۔ اس کھلے دربار میں بادشاہ نے پورے اطمینانِ قلب کے ساتھ سید مظفر کی حرص و آز اور غدّاری بیان کی اور کہا کہ اس جُرم کی سوائے موت کے کوئی دوسری سزا نہیں ہو سکتی۔ لیکن اس کی دیرینہ خدمات کا لحاظ کرکے یہ رعایت کی جاتی ہے کہ بخشی الممالک کی پُرانی خدمت اور اس کی جاگیریں بحال رکھی جا رہی ہیں[2]۔ اس کے بعد اسی دربار میں مادنّا کو میر جملہ بنایا گیا۔ عطائے عہدہ کے ساتھ اس کو خلعت اور "سوریا پرکاش راؤ" خطاب ملا۔ اس کا بھائی اکنّا اُس کا پیشکار رہا۔ موسیٰ بیگ خاں نامی ایک اور شخص کو فوج کا سرخیل بنایا گیا۔ لیکن آئندہ کی احتیاط کرکے بادشاہ نے فوج کی تنخواہوں کی تقسیم راست اپنے ہاتھ میں رکھی تھی۔ اس دربار کا انعقاد اور اس کی تمام کارروائی

---

[1] خافی خاں، جلد سوم ص ۲۱۰ - مآثر عالمگیر ص ۲۲۷۔

[2] لیکن اس کی نوبت نہیں آئی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بعد کو سید مظفر نے بادشاہ کے اس فیصلے کے خلاف مزاحمت کی اس لئے وہ قید کر دیا گیا، لیکن مغل حاجب نے قید سے رہا کرکے اس کو اور اس کے بیٹے سید ہاشم کو شہنشاہ اورنگ زیب کے پاس بھیج دیا (مآثر عالمگیری ص ۲۲۷)۔

اس قدر اچانک طریقے سے ہوئی کہ سید مظفر اور اس کے حاشیے کے لوگ ششدر ہوکر رہ گئے۔ ان کو شان و گمان تک نہ تھا کہ اس قدر جلد کایا پلٹ ہو جائے گی، اور جب بادشاہ اپنے احکام کا اعلان کر رہا تھا تو بیان کیا جاتا ہے کہ اس کے ماتھے پر بل تک نہیں پڑے بلکہ ہر موقعے پر اس کا چہرہ شگفتہ رہا جس سے اس کی استقامت کا پتا چلتا ہے۔[1]

مادنا اور اس کا خاندان ٹھیٹ تلنگانے کا رہنے والا تھا اور ہنمکنڈے میں ان کا گھر تھا۔ مادنا کے باپ دادا سب[2] قطب شاہی سلطنت کے پُرانے متوسل اور خدمت گزار تھے۔ مادنا کے باپ کا نام بھانوجی پینٹلو اور ماں کا نام "بھاگیا" بتایا جاتا ہے۔ بھانوجی ہنمکنڈے کے عامل کے تحت مال کی خدمت پر فائز تھا۔ اسکے چار بیٹے تھے، منجملہ ان کے بڑا اکنا اور اس کے بعد مادنا بہت مشہور ہوئے۔ سب بھائیوں کی تعلیم و تربیت اس زمانے کی ضروریات کے مطابق ہوئی تھی۔ یہ فارسی اور تلنگی خوب جانتے تھے اور شاہی فرامین پڑھ سکتے تھے۔ ابوالحسن کے عہد کا ذکر ہے کہ ایک مرتبہ شہنشاہی فرمان آیا جو سفید روشنائی میں لکھا ہوا تھا، صرف مادنا اس کو پڑھ سکا اور سفید روشنائی میں اس کا جواب لکھ دیا۔ اسی قابلیت سے وہ وزیر ہوا تھا اور اس کا وزیر ہونا قطب شاہوں کی دو سو سالہ تاریخ کا غیر معمولی واقعہ تھا، کیوں کہ آج سب سے پہلے تلنگانے کا ایک باشندہ وزارتِ عظمیٰ پر فائز ہوا تھا، جہاں اب تک تُرک و ایرانی فائز ہوتے تھے۔

---

[1] اس دربارہ کے ضروری معلومات مدراس کے انگریزی وثائق سے ماخوذ ہیں اور بھوپال راؤ صاحب کے توسط سے مجھے ملے، میں موصوف کا بہت ممنون ہوں۔ نیز دیکھو "مدراس کے اوراقِ پارینہ"۔

[2] مادنا نے اپنی وزارت کے دَور میں جو اسناد عطا کئے تھے ان میں اپنے کو "مادنا ولد بھانوجی" لکھا ہے۔ ذخیرۂ عطاء اللہ اور پروفیسر سجن لال۔

اور ان لوگوں کو غالباً اس مُلک کی زیادہ واقفیت نہ ہوتی تھی۔ مادنّا کی خواہ کتنی ہی مذمت کی جائے لیکن اتنا تو صحیح ہے کہ یہ قطب شاہی سلطنت سے جہاں اس کی کئی پشتیں گزری تھیں اپنے پیشروؤں سے زیادہ واقف تھا۔ اس کے علاوہ وہ اس عہدے پر اچانک فائز نہیں ہوا تھا بلکہ درجہ بہ درجہ ترقی کرکے تجربے سیکھے تھے۔[1] بادشاہ کو اس پر پورا اعتماد تھا، اور یہ اعتماد آخر وقت تک رہا۔ مُلک کے تمام لوگ اس کے دشمن ہوگئے تھے لیکن ابوالحسن اس سے کبھی بدگمان نہیں ہوا، اور اس کی وجہ یہ تھی کہ جب ابوالحسن اور سید مظفر کی اَن بَن ہوگئی تو اس نے اپنے آقا کی آڑے وقت پر مدد کی، اور جب تک یہ وزیر رہا مُلک و مالک کے ساتھ وفاداری کی اور بادشاہ کو اس طرح بے دخل کرنے کی کوشش نہیں کی جس طرح سید مظفر نے کی تھی۔ نیز اس کا سیاسی مسلک خارجی اور داخلی اُمور میں وہی تھا جو بادشاہ چاہتا تھا اور گزشتہ سلاطین کے پیشِ نظر تھا۔ اس عہد پر عام نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ

---

[1] یہ بتانا بہت مشکل ہے کہ مادنّا اور اس کے بھائی اکنّا کی ملازمت کب سے شروع ہوئی غالباً یہ لوگ عبداللہ قطب شاہ کے عہد میں ملازم ہوئے ہوں گے۔ ۱۰۶۷ھ / ۱۶۵۶ء میں مادنّا نے محکمۂ مال کی خدمت انجام دی اور ۱۰۷۷ھ / ۱۶۶۶ء میں سید مظفر سرخیل کا معتمد مقرر ہوا تھا اور اس کی تمام ترقی سید مظفر کی بدولت ہوئی تھی۔ چنانچہ سب مُورخ اس کو "سید مظفر کا آفریدہ" لکھتے ہیں اور جب ۱۰۸۳ھ / ۱۶۷۲ء میں سید مظفر میر جملہ ہوگیا تو یہ اس کا پیشکار مقرر ہوا، اور اس کے تمام کاروبار اسی کے ہاتھ میں تھے۔ جب ۱۰۸۵ھ / ۱۶۷۴ء میں مادنّا میر جملہ یا دیوان ہوگیا اور غالباً یہ پیشوائی کی خدمت بھی انجام دیتا تھا۔ مادنّا اور اس کے خاندان سے متعلق یہ ضروری معلومات تلنگی ماخذوں سے دستیاب ہوئے ہیں اور مجھے گھوپال راؤ صاحب ... کی مہربانی سے ملے۔ مادنّا کے پسماندگان ہنمکنڈے میں اب تک موجود ہیں اور ان کے ہاں اسناد بھی ہیں۔

سلطنت کا نظم و نسق خاطر خواہ تھا۔ بادشاہ اور وزیر دونوں یہ چاہتے تھے کہ ملک کو خوش حالی اور ترقی نصیب ہو، اور بیرونی حملہ آوروں کا ایسا سدِ باب ہو جس سے نہ صرف قطب شاہی سلطنت بلکہ تمام دکن کی حفاظت ہو سکے۔ ملک کی کارکردگی بڑھائی گئی اور نظم و نسق کا معیار اونچا کیا گیا۔ صوبۂ کرناٹک کا بندوبست ایسا قابلِ اطمینان تھا جیسا نیک نام خاں کے دور میں تھا۔ مغربی تاجروں پر ایسی گرفت تھی کہ وہ آخری دَور تک سلطنت کے آئین کی پوری پابندی کرنے کے لئے مجبور تھے۔ اس عہد میں اس بات کی کوشش کی گئی کہ مرکزی حکومت کی کارکردگی بڑھانے کے ساتھ مرکزی اور مقامی حکومتوں میں خاطر خواہ ربط پیدا ہو تاکہ اس ذریعے سے جو کارکردگی مرکز میں ہو وہی مقامی حکومتوں کو حاصل ہو سکے۔ یہ بات پیشرو حکومتوں میں نہ تھی۔ جس زمانے سے مادنا نے وزارت کا جائزہ لیا تھا بادشاہ اور اس کے وزیر نے کئی مرتبہ سلطنت کا، اور خاص طور پر کرناٹک کا دَورہ کیا، کیوں کہ یہ نو مفتوحہ صوبہ تھا، اور یہاں مغربی تاجروں کی وجہ سے آئے دن بدانتظامی ہوتی تھی۔ چنانچہ پہلا دَورہ سنہ ١٠٨٥ھ/١٦٧٤ء نومبر میں شروع ہوا اور سنہ ١٠٨٦ھ/١٦٧٥ء جنوری میں ختم ہوا۔ اسکے بعد دوسرا دَورہ سنہ ١٠٨٧ھ/١٦٧٦ء میں اور تیسرا سنہ ١٠٨٩ھ/١٦٧٨ء میں ہوا۔ ان دوروں میں سلطنت کے تمام طول و عرض کا بذاتِ خود معائنہ کیا گیا۔[1] مغربی تاجروں کی کمپنیاں جو مسولی پٹم، مدراس اور پلی کٹ میں تھیں ان کی نگرانی کی گئی۔ کونڈپلی[2] کونڈبیر وغیرہ کے اہم قلعوں کی مرمت کروائی گئی اور

---

[1] مغل مورخ لکھتے ہیں کہ "ابوالحسن اس قدر تن آسان تھا کہ کبھی محل کے باہر نہیں نکلا" محمد ساقی کا بیان ہے کہ "از شہرِ حیدرآباد غیر از مسافت یک کروہ از محمد نگر در پانزدہ سالہ حکومت سفر گزین نہ شدہ" (مآثرِ عالمگیری ص ٣٠٨) لیکن واقعات اس کے خلاف ہیں۔

[2] کونڈپلی کے قلعے میں ابوالحسن بہت دنوں تک رہا تھا، یہاں سے اس نے تمام مشرقی تلنگانے اور کرناٹک کی نگہداشت کی تھی۔ یہ قلعہ جو بجواڑے سے دس میل کے فاصلے پر واقع ہے، مشرقی گھاٹ کی ایک بلند چوٹی پر بنا ہوا ہے، اس کا موقع محل مشرقی تلنگانے اور کرناٹک کی نگہداشت کے لئے بہت اچھا ہے، اس میں ابوالحسن کے بنائے ہوئے آثار موجود ہیں۔

فوجوں کا انتظام کیا گیا۔ مغربی تاجروں اور کمپنیوں کے چشم دید معلومات حاصل کرکے ان کے متعلق مستقل ضابطے بنائے گئے اور جب کبھی یہ تاجر آئین شکنی کرتے تھے ان پر بہت سختی کی جاتی تھی اور اس معاملے میں مقامی عہدہ داروں کی پوری تائید کی گئی۔ زراعت کو فروغ دینے کے مختلف طریقے اختیار کئے گئے۔ تمام مُلک میں جدید باؤلیاں، تالاب اور کنٹے بنائے گئے۔ وصول مالگزاری کا قدیم زمانے سے جو بے ڈھنگا طریقہ، یعنی "اجارہ داری" رائج تھی وہ مادنا نے مسدود کر دی، کیوں کہ اس طریقے سے کاشتکاروں پر زبردستیاں ہوتی تھیں اور دیہات ویران ہو رہے تھے، ان کو از سرِ نو بسایا گیا۔ اجارہ داروں کی جگہ مستقل تنخواہ یاب حکام مامور کئے گئے۔ چونکہ مُلک میں "اوقاف" یعنی "اگرہار" بہت تھے اور ان سے سرکاری مالگزاری میں خسارہ ہوتا تھا، اس لئے ان پر بھی محصول عائد کیا گیا۔ جن اوقاف کا انتظام اچھا نہیں تھا وہ شریکِ خالصہ کر لئے گئے۔ اس عہد سے پہلے کان کنی کی صنعت جس کی وجہ سے گولکنڈہ تمام ایشیا میں مشہور تھا خراب ہو گئی تھی اس کو پھر زندہ کیا گیا اور معدنوں میں کام کرنے والوں کی اُجرت بڑھائی گئی۔ اس انتظام سے مُلک کی خوش حالی میں بہت اضافہ ہوا۔[1]

خارجی مسلک اندرونی نظم و نسق کے بہ نسبت دکن کی خارجی سیاست زیادہ پیچیدہ اور جاذبِ توجہ تھی، کیوں کہ اس مُلک کو بالآخر ہندوستان کی بہت بڑی طاقت مغل شہنشاہت کا مقابلہ کرنا تھا جو اس زمانے میں بڑی شدت کے ساتھ اثر انداز تھی، اور اس کی وجہ یہ تھی کہ جس زمانے میں مرزا جے سنگھ کو بیجاپور کی دیواروں کے سامنے شکستیں ہو رہی تھیں سیواجی شمال سے بھاگ کر پھر اپنے کوہستانی مسکنوں میں جا گزیں ہو گیا اور لڑائی کی تیاریاں کرنے لگا۔ خود جے سنگھ کی

---

[1] یہ معلومات مدراس کے مشرقی کتب خانے سے حاصل کئے گئے ہیں، یعنی "کیفیت" ٦١۔ مجھے بھوپال راؤ صاحب ام۔ اے کے توسط سے ملے۔

شکستیں مغل سلطنت کو پریشان کرنے کے لئے کافی تھیں اور شہنشاہیت اس کا انتقام لینا چاہتی تھی کہ مرہٹوں کا پھر خطرہ پیدا ہوگیا۔ اس طریقے سے شہنشاہیت کو دکن کی طرف دُہری توجہ کرنی تھی۔ ادھر دکن کی نئی اور پُرانی طاقتوں کو بھی اپنی مدافعت کا ضروری سامان کرنا پڑا، کیوں کہ یہ مغلوں کی پیش قدمی کا سدِّ باب کر کے اپنی ہستی قائم رکھنا چاہتی تھیں۔ جے سنگھ کے مرنے کے بعد شہنشاہ نے سنہ ۱۰۷۹ھ / ۱۶۶۷ء میں شہزادہ معظم کو دکن کا گورنر بنایا اور جسونت سنگھ کو فوج کی کمان دی۔ اس جدید انتظام سے کوئی فوری خطرہ تو نہیں تھا، لیکن دکن کے لئے مشکل یہ تھی کہ سنہ ۱۰۸۳ھ / ۱۶۷۲ء سے بیجاپور کی سیاست ایسی اُلجھ گئی کہ اس کی وجہ سے تمام دکن کے معاملات سقیم ہو گئے۔ اس اچانک کمزوری سے مغلوں کو جو بیجاپور میں دخل دینے کا موقعہ ملا تو دوسری طاقتیں بھی آسانی سے اس کی زد میں آگئیں اور بالآخر مغل سیلاب میں بہہ گئیں۔

جب تک علی عادل شاہ ثانی زندہ تھا دکن پر کوئی آنچ نہ آئی۔ دکن کے اس آخری سورما نے ایک طرف مرہٹوں کو روکا تو دوسری طرف مغلوں کا راستہ بند کیا، لیکن جب سنہ ۱۰۸۳ھ / ۱۶۷۲ء میں اس کا انتقال ہو گیا تو بیجاپور کی کایا پلٹ ہوگئی۔ اب اس سلطنت کی زندگی محال ہوگئی۔ مرحوم کا بیٹا سکندر عادل شاہ جس کی عمر صرف پانچ سال کی تھی، تخت نشین کیا گیا۔ اس کی کم سنی کی وجہ سے بیجاپور میں طبقہ واری کشمکش کا بازار گرم ہوگیا اور غیر دکنی فریق اور ان کے رہنما آپس میں لڑنے لگے۔ دکنی فریق کے رہنما خواص خاں و میاں عبد المحمد تھے اور غیر دکنی فریق کا رہنما عبد الکریم بہلول خاں تھا۔ ان کی باہمی کشمکش سے سلطنت کو ایسا نقصان پہنچا کہ اس کی تلافی نہ ہوسکی۔ بہلول خاں پٹھانوں کا (جو باہر سے آکر بیجاپور میں آباد ہوئے تھے) سرگردہ تھا۔ یہ دن دھاڑے لوٹنے اور قتل و غارت کرنے لگا۔ حکومت اس کا سدِّ باب نہیں کر سکتی تھی۔ میاں عبد المحمد جس نے علی عادل شاہ کے عہد میں بارہ سال مُلک کی وفادارانہ خدمت کی تھی،[1] بالآخر مایوس ہو کر حکومت سے

---

[1] بساتین السلاطین ص ۴۴۵۔

کنارہ کش ہو گیا اور چند روز کے بعد خواص خاں، بہلول خاں کے حربے کا شکار ہو گیا۔ اب پٹھان بیجاپور کے ہر شریف اور امیر کو ذلیل کرنے لگے۔ باہر سے دلیر خاں، جو مغل افواج کا سپہ سالار تھا، بہلول خاں کی تائید کرتا تھا کیوں کہ یہ بھی پٹھان تھا اس لئے ان کے حوصلے بہت بڑھ گئے اور بیجاپور کو سخت نقصان پہنچنے لگا۔ لیکن ۱۰۸۳ھ/۱۶۷۲ء میں شہنشاہ نے شہزادہ معظم کو ہٹا کر بہادر خاں کوکلتاش کو دکن کا گورنر بنا دیا۔ اگرچہ بہادر خاں پٹھانوں کا ہمدرد نہ تھا اور ایک طرح سے دکنی فریق کی تائید کرتا تھا، مگر اس کے تقرر کی غایت یہ تھی کہ بیجاپور پر پیش قدمی کرے۔ چنانچہ بیجاپور پر حملہ کرنے کے لئے شہنشاہ کے بار بار احکام آتے تھے، مگر مشکل یہ تھی کہ اس زمانے میں سیواجی سے بھی مقابلے ٹھیر گئے جس نے بیجاپور سے مل کر ایک متحدہ محاذ بنانے کی کوشش کی تھی، چنانچہ ۱۰۸۶ھ/۱۶۷۶ء میں سیواجی نے بیجاپور سے اتحاد کر لیا جس کے بدلے عادل شاہی سلطنت نے اس کو ایک لاکھ ہون سالانہ اور تین لاکھ ہون یک مشت ادا کرنے کا وعدہ کیا۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ بہادر خاں اور بیجاپور میں پُرزور جنگ شروع ہو گئی لیکن بہادر خاں کو اکثر شکست ہوئی۔

اس دار و گیر میں قطب شاہی سلطنت خاموش نہیں بیٹھ سکتی تھی۔ اگرچہ عبداللہ قطب شاہ کے عہد میں حکومت کا خارجی مسلک ایسا کمزور تھا کہ اس سے دکن کو بہت نقصان پہنچا، لیکن ابوالحسن قطب شاہ اور مادنا نے اس کی تلافی کرنے کی کوشش کی۔ ان دونوں نے خارجی معاملات میں وہی مسلک اختیار کیا جو پیشرو قطب شاہوں کا تھا۔ چونکہ سکندر عادل شاہ کی کم سنی کے باعث بیجاپور کی حالت بہت سقیم ہو گئی تھی اور اس کی کمزوری سے گولکنڈے کو بھی خطرہ تھا، اس لئے اس سلطنت کو بچانا ضروری سمجھا گیا۔ چنانچہ جب بہادر خاں کی بیجاپور پر یورش شروع ہوئی تو گولکنڈے سے فوجی مدد کی گئی۔ ۱۰۸۶ھ/۱۶۷۶ء میں بہادر خاں کے مقابلے کے لئے مادنا خود ایک بڑی فوج لے کر آیا تھا۔ مادنا نے پندرہ بیس ہزار کی ایک

جرار فوج تیار کی تھی اسکو اپنی کمان میں رکھا تھا، لیکن مشکل یہ ہوئی کہ بہلول خاں کے بے ڈھنگے اصول کی وجہ سے قطب شاہی اور عادل شاہی فوجوں میں ہم آہنگی پیدا نہ ہوسکی، اس سے بہادر خاں نے بہت فائدہ اٹھایا، اور مادنا کو غلط ترغیب دے کر اس کو بیجاپور کے اتحاد سے علٰحدہ کردیا۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ مادنا بیجاپور کو ہتا چھوڑ کر گولکنڈہ واپس چلا آیا جس سے عادل شاہی حکومت کو سخت پریشانی ہوئی اور بہادر خاں نہایت آسانی کے ساتھ نلدرگ، اکل کوٹ اور گلبرگے پر قابض ہوگیا۔ مادنا کا یہ طرزِ عمل قطب شاہی مسلک کے بالکل منافی تھا۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ مادنا نے مغلوں سے رشوت لی تھی[1]۔

لیکن شہنشاہ بہادر خاں کی پچھلی ہزیمتوں سے ناراض تھے اور اس پر طرہ یہ ہوا کہ دلیر خاں نے جو بہادر خاں کا مخالف تھا، اپنے حریف کے خلاف شہنشاہ کے کان بھرنے شروع کئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۰۸۸ھ ۱۶۷۷ء میں بہادر خاں کو دکن کی گورنری سے معزول کردیا گیا اور اس کی جگہ خود دلیر خاں مامور ہوا اس نے اپنی فوجوں کو ایسا پھیلایا کہ یہ گلبرگے سے ملکھیڑ تک پہنچ گئیں جو قطب شاہی سرحد تھی، اور اس پیش قدمی سے اس کے حوصلے ایسے بڑھ گئے کہ اس نے گولکنڈے پر حملہ کرنے کی ٹھان لی۔ چنانچہ شہنشاہ سے درخواست کی کہ "اگر ایک بڑی فوج سے میری مدد کی جائے تو میں گولکنڈہ فتح کرلیتا ہوں"۔ شہنشاہ نے یہ درخواست منظور کرلی۔ اس درخواست میں بہلول خاں بھی شریک تھا۔ اب قطب شاہی سلطنت کو مدافعت کا انتظام کرنا تھا۔ ابو الحسن قطب شاہ نے سرحد کو مضبوط کرکے محمد ابراہیم سرلشکر کو ملکھیڑ روانہ کیا اور ضروری بند و بست کردیئے۔ اس زمانے میں مغل فوجیں گلبرگے کا محاصرہ کر رہی تھیں۔ قطب شاہی فوجوں کو پہلے شہنشاہ کا فرمان ملا کہ وہ کافروں کی

---

[1] تاریخ اورنگ زیب۔ جادوناتھ سرکار۔ جلد ۴ ص ۳۴۱۔

مدد نہ کرے۔ اس کے بعد دلیر خاں نے ابوالحسن کو دھمکی دی کہ "سیواجی سے اتحاد اور شیخ منہاج کو پناہ دینے کی پاداش میں ایک کروڑ روپیہ اور دس ہزار گھوڑے تاوان ادا کرے ورنہ حملہ کیا جائے گا۔"[1] اور اس کے ساتھ ملکھیڑ کے قریب بہلول خاں اور دلیر خاں کی فوجیں جمع ہو گئیں۔ ابوالحسن جنگ کو ٹالنے کے لئے پانچ لاکھ روپیہ تاوان دینے کے لئے تیار ہو گیا، لیکن بہلول خاں اور دلیر خاں جنگ پر تلے ہوئے تھے، انھوں نے ملکھیڑ پر حملہ ہی کر دیا۔ ان کے مقابلے کے لئے قطب شاہی فوج بھی تیار تھی، چنانچہ ایک گھمسان کا معرکہ ہو گیا جو مغلوں کے لئے اچھا ثابت نہ ہوا اس معرکے میں مغلوں کے سات سو سپاہی اور سات ہاتھی ہلاک ہوئے اور چھ سات افسر مارے گئے اور بے شمار سپاہی مجروح ہوئے۔ گولکنڈے سے شیخ منہاج، رستم راؤ اور سنجر خاں کے تحت ایک بڑی کمک آ گئی، دو مہینے تک سخت کشمکش ہوتی رہی اور ہر موقع پر مغلوں کا بہت نقصان ہوا۔ ذرائع رسل و رسائل منقطع ہو گئے اور غلہ پانی بھی نہیں ملا بمشکل بڑی مصیبت سے گلبرگہ واپس ہوئے، یہاں تک کہ بیس میل کی مسافت بارہ دن میں طے کی اور بڑی مشکل سے جان بچائی۔

اس گری ہوئی حالت میں بھی بیجاپور کے ابھی بہت سے ہمدرد باقی تھے۔ سدی جوہر، صلابت خاں کا داماد، مسعود خاں اس سلطنت کا پرانا خدمتگذار تھا، بہلول خاں کی زیادتی اور بیجاپور کی گری ہوئی حالت سے متاثر ہو کر مسعود خاں نے ابوالحسن قطب شاہ سے درخواست کی کہ وہ بیجاپور کے معاملات میں دخل دے کر اس سلطنت کی دستگیری کرے۔ ابوالحسن نے اس درد بھری آواز پر لبیک کہا۔

---

[1] ۱۰۸۸ھ / ۱۶۷۷ء میں گولکنڈے نے سیواجی سے اتحاد کر لیا تھا جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔ شیخ منہاج بیجاپور کا نوکر تھا جو حکومت سے بے وفائی کر کے مغلوں سے مل گیا تھا، اور وہاں سے گولکنڈے کا ملازم ہو گیا۔

اب چارۂ کار یہ تھا کہ بہلول خاں کو جو تمام فتنہ و فساد کا منبع تھا بیجاپور سے ہٹا کر مسعود خاں جیسے وفادار آدمی کو پیشوا بنائے۔ جیسے یہ طے ہوا کہ:- "مادام کہ زمام این دولت خانہ در قبضۂ نمک پروردۂ قدیم و دولت خواہ دیرین مسعود خان سپردہ نشود اصلاحِ این دولت خانہ صورت پذیر نہ خواہد گردید[۱]۔ اسی لئے ابوالحسن نے بہلول خاں کو اپنے پاس بلایا تاکہ اس کو نمک کا پاس یاد دلاکر نصیحت کرے۔ لیکن بہلول خاں ملکھیڑ کی لڑائی کے بعد ایسا بیمار ہوگیا تھا کہ اس کی وجہ سے وہ گولکنڈہ نہیں جا سکا، مگر اپنی طرف سے جمشید خاں کو بھیج دیا۔ ابوالحسن قطب شاہ نے اس کو بیجاپور کی حالتِ زار کا نقشہ کھینچ کر شرم دلائی اور متنبہ کیا کہ اگر یہی حالت رہی تو کل کو مغل بیجاپور پر قابض ہو جائیں گے[۲]۔ ابوالحسن کی اس تقریر سے جمشید بہت متاثر ہوا، اور جب وہ بیجاپور واپس آیا تو "بہ حُسنِ ارشاد و رہنمائی ابوالحسن قطب شاہ" بہلول خاں پیشوائی سے دست بردار ہو گیا اور سدی مسعود

---

[۱] بساتین السلاطین ص ۴۵۳۔

[۲] ابوالحسن قطب شاہ نے بہلول خاں کے نمایندے جمشید خاں کو ان الفاظ میں نصیحت کی تھی جن سے اس کی بیدار مغزی اور وسعتِ نظر معلوم ہوتی ہے:-

"فرمودہ کہ قدویانِ دولت خواہ و نمک پروردگان قدویت انتباہ را لازم است کہ نیک نامیِ دُنیا و سُرخ رُوئیِ عقبیٰ را در ادائے لوازم جان سپاری و تقدیم مراسم جان نثاری منحصر دانستہ ہمگی ہمت مصروف آن دارند کہ دولت خانہ ولی نعمت خود بارونق و جائے خویش بحال و قرار ماند۔ تعصب و تشدد برادری و نفاق و اختلاف خانگی کہ باہم داشتہ باشد یکسو و بہ طرف ساختہ جہد کل الجہد در آن مبذول دارند کہ غنیم بدخواہان بیرونی دستِ تسلط بر آن نیافتہ خائب و خاسر مانند و الا اگر سود و بہبود خود را منظور داشتہ (باقی صفحہ ۲۶۶ پر)

پیشوا ہو گیا۔ بہلول خاں اور مسعود خاں میں یہ شرطیں طے ہوئیں کہ افغانوں کی چڑھی ہوئی تنخواہیں ادا کی جائیں، اور چونکہ اس کے لئے بیجاپور میں روپیہ نہ تھا اس کی پابجائی کے لئے قطب شاہ نے چھ لاکھ روپئے دینے کا وعدہ کیا۔ دوسری شرط یہ تھی کہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲٦۵) از عناد و نفاق خانگی در نگذرند و تعصب برادری و تباغض ہم چشمی برقرار داشتہ در ستیز و جدال یک دیگر کوشند ظاہر است کہ اعدائے خصوم کہ در کمین فرصت نشستہ اند بہ یک بارگی از طرف ہجوم آوردہ متصرف ملک و سلطنت شوند۔ آنگاہ جز حسرت و ندامت بدست ہیچ نخواہد ماند و زبان طعن و تشنیع خاص و عام بسر ہر کدام از نمک خواران دولت عادل شاہی تا ابد الدہر دراز خواہد گردید۔ خلاصہ این تمہید و مقصود از این تطویل آن است کہ از وقوع نزاع و خلاف شما دولت خواہان عادل شاہی تزلزل در ارکان سلطنت واقع گشتہ بلکہ آن کاخ از بنیاد مشرف بر انہدام گردیدہ۔ آنچنان کہ بیک صدمہ از پا در آید۔ اکنون صواب بل اصوب آن است کہ شما فوج خود را رخصت دادہ خود معزول و از چندے در گوشہ کشیدہ و دست از تصرف و اختیار برداشتہ کار ملکی و مدار المہامی بلدہ بیجاپور بہ سدی مسعود خان واگذارند و در تائید و بیعت او کوشیدہ بہ اتفاق ضبط و قیام سلطنت خانہ مخدوم حفظ بہ ظہور آرند۔ این معنی ہر آئینہ موجب استحسان و محمدت عند الخلائق و سبب بہبودی و وقار شما و دولت خواہان و کافہ ناس خواہد گردید۔" (بساتین السلاطین ص ۴۵۳-۴۵۴)۔

افغان سپاہی فوج سے برخاست کردیئے جائیں اور تنخواہ اسی شرط سے دی جائے کہ وہ بیجاپور سے باہر چلے جائیں۔ تیسرے بہلول خاں بیجاپور سے کنارہ کش ہو کر اپنی جاگیر میں سکونت اختیار کرے۔ چوتھے حکومت کی رہنمائی کیلئے گولکنڈے کا ایک حاجب بیجاپور میں مقرر کیا جائے گا جو تمام انتظامی اُمور کی نگرانی کرے گا، اور خارجی مسلک ایسا اختیار کیا جائے گا جو دونوں سلطنتوں کے مفاد کے عین مطابق ہو۔ پانچویں شرط یہ تھی کہ مغلوں سے ایسا عہد نامہ نہ کیا جائے جس سے اس عہد نامے کی خلاف ورزی ہوتی ہو، اور گولکنڈے نے بیجاپور کے تحفظ کی ذمہ داری اپنے سر لے لی، دونوں فریق نے اس عہد نامے پہ دستخط کر دیئے اور بادشاہ نے چھ لاکھ روپیے کا تمسک لکھ دیا۔

جب معاہدے کی تکمیل ہو چکی تو محمد ابراہیم سرلشکر چار ہزار سوار کے ساتھ سدی مسعود کو بیجاپور لایا اور پیشوا بنا دیا اس کے بعد مسعود اور سکندر نے اس عہد نامے کی توثیق کر دی اور حاجب کی خدمت انجام دینے کے لئے گولکنڈے سے اکنّا بھیجا گیا تھا۔ یہ عہد نامہ اور قطب شاہی تائید بالکل مناسبِ حال تھی اور بہت مفید ہوتی، لیکن مشکل یہ ہوئی کہ ابھی اس معاہدے کی روشنائی خشک نہیں ہوئی تھی کہ اس کی خلاف ورزی ہونے لگی۔ جب مسعود خاں بیجاپور آرہا تھا راستے میں گلبرگے کے پاس دلیر خاں سے ایک اور معاہدہ کر لیا جو اس قطب شاہی معاہدے کے منافی تھا۔ بات یہ تھی کہ جب قطب شاہی اتحاد کا حال معلوم ہوا تو دلیر خاں بہت پریشان ہو گیا، کیوں کہ اس طریقے سے مغلوں کا منصوبہ خطرے میں پڑ گیا تھا اس لئے اس نے ایک نیا معاہدہ کیا کہ مسعود خاں سیواجی کے خلاف مغلوں کی مدد کرے، اور مغل شاہزادے سے سکندر عادل شاہ کی بہن بادشاہ بی بی کی شادی کر دے۔ اس عہد شکنی سے دکن کے معاملے کو بہت نقصان پہنچا، اس کی وجہ سے ابوالحسن نے چھ لاکھ روپے کی ادائی روک دی۔ افغانوں نے پھر شور مچایا اور

بیجا پور میں شرفاء کی زندگی محال ہو گئی اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نہ گھر میں مسعود خاں کا وزارتی اقتدار جم سکا نہ باہر، اور حالت روز بروز خراب ہونے لگی، ناچار ۱۰۸۹ھ ۱۶۷۸ء میں اکنّا واپس بلا لیا گیا، لیکن اس سے گولکنڈے اور بیجا پور کے تعلقات منقطع نہیں ہوئے بلکہ اس کے بعد بھی ابو الحسن نے بیجا پور کی مدد کی۔ چنانچہ جس وقت شہنشاہ نے بیجا پور پر حملہ کر دیا، اور بہادر خاں کو کلتاش کو اکل کوٹ میں متعین کیا کہ بیجا پور اور گولکنڈے پر نگرانی رکھے تو سکندر نے ۱۰۹۶ھ ۱۶۸۴ء میں گولکنڈے سے مدد مانگی اور بیجا پور کے حاجب نے یہاں، مادنّا کو سمجھایا کہ اس وقت پرانے عہد نامے کی پابجائی بہت ضروری ہے تو ابو الحسن نے ۱۰۹۷ھ ۱۶۸۵ء میں سکندر کی مدد کیلئے فوج بھیجنے کا ارادہ کر لیا۔ حالانکہ شہنشاہ نے یہ دھمکی دی تھی کہ بیجا پور کی کوئی مدد نہ ہونی چاہئے۔ ۲۸ر اگسٹ کو انباجی راؤ کے تحت ایک فوج روانہ کر دی گئی، لیکن مشکل یہ تھی کہ شہنشاہ نے اس کی روک تھام کے لئے پہلے سے بہرہ مند خاں کو گولکنڈے کی سرحد پر متعین کر دیا تھا، اس لئے اس فوج کو منزلِ مقصود پر پہنچنا بہت دشوار ہو گیا اس کے بعد ابو الحسن قطب شاہ نے اپنے سفیروں کے نام جو شہنشاہ کے پاس تھے، ایک خط لکھا جس میں محمد ابراہیم سر لشکر کی سرکردگی میں چالیس ہزار کی ایک جرّار فوج بھیجنے کا ارادہ ظاہر کیا گیا تھا۔ یہ خط پکڑا گیا اور شہنشاہ کے پاس پیش ہوا اس کا نتیجہ یہ تھا کہ شاہ عالم کے تحت ملکھیڑ پر حملہ کرنے کے لئے ایک فوج بھیج دی گئی اور بیجا پور سے فارغ ہونے کے بعد تمام شہنشاہی طاقت گولکنڈے کی تباہی کیلئے آ گئی۔

مادنّا کی سیاست میں جو تمام ملک پر چھائی ہوئی تھی اور اس کا اثر دکن کے دور دراز گوشوں میں محسوس ہوتا تھا بہت سے تاریک پہلو بھی تھے۔ اول تو مادنّا نے اپنی ملک پرستی کے زعم میں حکومت کے بیرونی عنصر کو خارج کر دیا اور اس کے خلاف ایک ہیجان برپا ہونا ضروری تھا۔ بات یہ ہے کہ جب قطب شاہی سلطنت قائم ہوئی تھی ہزارہا لو وارد ترک، مغل و ایرانی ملک میں آباد ہوئے اور گولکنڈے کی سرکار سے فیض پاتے تھے۔ یوں تو یہ لوگ یہاں تجارت کی غرض سے

آتے تھے کیوں کہ گولکنڈہ تجارت کا مرکز تھا۔ تاہم ان میں اکثر اپنی قابلیت کے زور سے بلند خدمات پر بھی فائز ہوئے، لیکن اہلِ ملک ان کی ترقی کو اچھی نظروں سے نہیں دیکھتے تھے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ملک میں مخالفانہ جذبہ ہر وقت موجود تھا اور جب کبھی ملک میں انقلاب ہوا، ان نو واردوں کو سب سے پہلے اپنی جان و مال کا ڈر ہوتا تھا، اور حکومت کو ان کی خاص طور پر حفاظت کرنی پڑتی تھی۔ مادنا نے اس جذبے کی سب سے زیادہ نمایندگی کی۔ دیوان ہونے کے بعد سب سے پہلے اس نے تمام اجنبیوں کو حکومت سے خارج کر دیا اور ان کی جگہ اہلِ ملک کو مامور کیا۔ چنانچہ ایک مورخ کے الفاظ ہیں:-[1] "مردم ہمہ یارِ خود دکنیان را بنواختہ مغل و غریب زادہا را بر انداختند۔" لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آگے چل کر اس ملک پرستی کے جذبے میں کچھ فرقہ پرستی کا رنگ ضرور پیدا ہو گیا جو مادنا اور اس کے خاندان کے لئے مہلک ثابت ہوا، کیوں کہ اس اصلاحی دست بُرد سے جب کہ پرانے لوگ یک لخت حکومت سے خارج کر دیئے گئے تو ہندوؤں سے زیادہ مسلمانوں کو نقصان پہنچا۔ اب جن نئے لوگوں کو مادنا نے مامور کیا وہ اکثر تلنگے تھے۔ نیز مرکزی حکومت کے جتنے بڑے عہدہ دار تھے ان میں اکثر مادنا کے خاندان کے لوگ تھے۔ چنانچہ مادنا کا بڑا بھائی اکنا اس کا پیشکار ہو گیا اور چند سال کے بعد اس کو مجموعہ دار کا عہدہ دیا گیا۔ اس کا دوسرا بھائی "آستا" ورنگل کا عامل تھا اور اس کا بھانجا ینکنا جس کو "رستم راؤ" کا خطاب ملا تھا، مختلف خدمتوں پر فائز ہوا۔ یہ کبھی کرناٹک کا صوبہ دار رہا، اور کبھی فوج کا سر لشکر مقرر رہا۔ اسی طریقے سے مرکزی حکومت کی باگ تمامتر انھیں لوگوں کے ہاتھ میں آگئی۔ اس کے علاوہ کرناٹک بھی، جہاں لنگپا اور ینکنا کام کرتے تھے، پوری طور پر ان کے زیرِ اثر تھا سوائے محمد ابراہیم کے

---

[1] حدیقۃ العالم، مقالۂ اول ص ۲۶۸۔

کوئی مسلمان مرکزی حکومت کے بڑے عہدے پر فائز نہیں تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ محمد ابراہیم جس کو مادنا کی مہربانی سے "خلیل اللہ خاں" اور "پلنگ حملہ" خطاب عطا ہوا تھا قطب شاہی افواج کا سرلشکر مقرر ہوا تھا[1] اور ایک سال اس کو کرناٹک کی صوبہ داری بھی دی گئی۔ مگر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس[2] ترقی کے لئے محمد ابراہیم نے مادنا اور اس کے خاندان کی بے حد خوشامد کی اور اگر ایک روایت صحیح سمجھی جائے تو ابراہیم نے اس کے لئے ایک لاکھ دس ہزار ہون رشوت بھی دی تھی[3]۔ غالباً مادنا نے اس کو نااہل اور غیر ملکی ہونے کے باوجود ایک اپنا آلۂ کار بنانے کی کوشش کی۔ چنانچہ اس ترقی کے لئے ابراہیم مادنا کا اس قدر احسان مند تھا کہ یہ شعر ؎

ز التفات بادشاہ وپنڈت روشن روان
گشت ابراہیم سرلشکر خلیل اللہ خان[4]

اس نے اپنی انگوٹھی کے نگینے پر کندہ کروایا تھا جس سے اس کی نااہلی اور خوشامد معلوم ہوتی ہے۔

اب رہا یہ سوال کہ ملک کے عام مسلمانوں کے ساتھ مادنا کا اخلاقی اور سیاسی برتاؤ کیا تھا؟ تو، اس خصوص میں اس قدر مخالف مواد ہے کہ اسکے متعلق صحیح رائے قائم کرنا بہت مشکل ہے۔ ہر تاریخ کہتی ہے کہ عام مسلمانوں کے ساتھ مادنا کا برتاؤ سخت جابرانہ تھا اور اس میں بہت تعصب پایا جاتا تھا۔ مسلمانوں کی ذلت کی جاتی تھی، یعنے ایک مورخ کے الفاظ ہیں کہ "[5] اسلام و اسلامیان را وقعے نمی گذاشت۔ مساجد بے رونق بودند و کنائس آباد۔" یہ واقعہ ہر مورخ نے

---

[1] حدیقۃ العالم، مقالۂ اول ص ۳۶۸۔ [2] تاریخ اورنگ زیب، جادو ناتھ سرکار جلد ۴ ص ۳۳۴ [3] مآثر عالمگیر ص ۲۶۷۔ [4] ،، ،، [5] ،، ۲۸۵۔

لکھا ہے کہ ایک روز مادتا کسی متبرک جاترا کے لئے گیا، اس کے ساتھ ایک فوج تھی جس میں سادات و شرفا بھی تھے مادتا نے ان لوگوں کو ان الفاظ میں مخاطب کیا اور مذمت کی کہ "تمہارے بزرگوں نے ہمارے بت توڑے تھے اور اب میں اس پاداش میں تم کو ذلیل کرتا ہوں!" یہ سُن کر سیدوں کے آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔[1] خافی خاں نے ایک واقعہ اور یہ لکھا ہے کہ مادنا نے غبن کا الزام لگا کر ایک سید کے ہاتھ کٹوا دیئے۔[2] منوچی نے ایک واقعہ یہ بیان کیا ہے کہ:- "ایک روز ندی کے کنارے ایک ایرانی اپنا منہ ہاتھ دھو رہا تھا کہ کوئی ہندو آیا اور اس کے قریب کھڑے ہو کر اس بے پروائی سے اپنے کپڑے دھونے لگا کہ پانی کے چھینٹے مسلمان (ایرانی) پر پڑنے لگے، اپنی صفائی کی خاطر اس نے شرافت کے ساتھ اس ہندو سے کہا کہ تم دُور ہٹ کر اپنے کپڑے دھو اس پر وہ توجہ کرنے کی بجائے ایرانی کو گالی دی اور مارنے کے لئے تیار ہو گیا۔ آخر الذکر بہت برافروختہ ہوا اور اس کو ایک تھپڑ رسید کی! اس پر ایک شور ہو گیا اور بہت سے ہندو جمع ہو گئے، ان سب نے بے چارے مسلمان کی مرمت کی اور اس کو گرفتار کر کے مادنا کے پاس لے گئے، اس نے فوراً یہ حکم دیا کہ اس ایرانی کے ہاتھ کاٹ دیئے جائیں، چنانچہ اس کی تعمیل ہو گئی۔ بالآخر اس مظلوم نے دیکھا کہ اس کی کوئی داد نہیں ہوتی، کیوں کہ حکومت اور عدالتیں مسلمانوں کے ہاتھ میں نہ تھیں اس لئے اپنے کٹے ہوئے ہاتھ کو تیل میں سُکھا کر اورنگ زیب کے دربار میں پہنچ گیا۔ شہنشاہ نے اس کو دلاسا دیا اور رقمی امداد کے ساتھ یہ وعدہ کیا کہ اس کا انتقام لیا جائے گا۔"[3] اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ بیانات بہت کچھ مبالغے پر مبنی ہیں، چونکہ مادتا اور اس کی حکومت کا مسلک مغل شہنشاہت کے لئے سنگِ راہ تھا اس لئے یہ قدرتی بات تھی کہ مغل مورخ

---

[1] حدیقۃ العالم، مقالۂ اول ص ۳۶۸ [2] منتخب اللباب خافی خاں، جلد سوم ص ۳۱۱۔
[3] منوچی، جلد سوم ص ۱۳۱-۱۳۲۔

ابو الحسن اور اس کے وزیر مادنّا کے خلاف اپنے دل کا بخار نکالتے[۱]۔ سب سے پہلے مغل شہنشاہیت کو یہ تمام مواد سید مظفر اور اس کے بیٹے سید ہاشم کی وجہ سے ملا تھا جو گولکنڈے سے بھاگ کر مغل سلطنت سے جا ملے تھے، ان سے کسی صداقت کی اُمید رکھنا بے محل تھا۔ اس کے علاوہ مختلف مورخوں نے مادنّا کے بارے میں جو حقارت آمیز الفاظ استعمال کئے ہیں وہ علٰحدہ اُلجھن پیدا کرتے ہیں۔ چنانچہ شہنشاہ نے "کافر، فاجر، ظالم"[۲] اور محمد ساقی نے "ہنود مطرود"[۳] اور خافی خاں نے "ہر دو برادر کافر شدید العداوت۔ بد فرجام" لکھا ہے۔ حدیقتہ العالم کا مولف "ہر دو برادر برہمن شوم ملوم"[۴] اور گردھاری لال احقر "مادنا برہمن تلنگہ در فتنہ و ابلیس خونی بے مثال بود" کہتے ہیں۔ ان الفاظ کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے کہ مادنا نے نظم و نسق میں جو اصلاحیں کی تھیں ان کی وجہ سے بہتیرے مسلمان خدمتوں سے علٰحدہ ہو کر مغل ملازمت میں داخل ہو گئے تھے اور ابو الحسن اور مادنّا کے خلاف مغل حکمرانوں کے کان بھرتے تھے، اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ مغل مورخ ہوں یا دکن کے مورخ ان میں یہی جذبات پائے جاتے ہیں۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ باہر کے سیّاحوں نے بھی جو غیر جانبدارانہ حیثیت رکھتے ہیں مادنّا کی کوئی تعریف نہیں کی بلکہ اُلٹے مذمت کی منوچی نے جو ایرانی کا واقعہ لکھا ہے اس سے مادنا کی صاف فرقہ پرستی معلوم ہوتی ہے۔ مدراس کے انگریزی وثائق میں بھی مذمت پائی جاتی ہے۔ انگریز کمپنی کے حکام لکھتے ہیں کہ:۔ "مادنا ملک میں مقتدر ہے اور لوگوں کو مجبور کرکے روپیہ وصول کرتا ہے۔" کرناٹک کے بارے میں وہ لکھتے ہیں:۔ "حکومت ایسے لوگوں کے ہاتھ میں ہے جو دھوکا فریب اور جبر ستانی سے کام لیتے ہیں۔ معاہدے اور قول کا کوئی پاس و لحاظ نہیں کرتے۔" اس پر طرہ یہ کہ مادنّا اور اس کی حکومت کے خلاف ملک میں

---

۱ و ۲؎ منتخب اللباب جلد سوم ۳۲۸ ۳؎ عالمگیر نامہ ص ۲۸۵

۴؎ " جلد دوم ص ۲۹۲ ۔ جلد سوم ص ۱۷۰ ۵؎ حدیقتہ العالم ص ۳۶۸۔

۶؎ تاریخ ظفرہ، گردھاری لال احقر ص ۳۵۔

اس قدر غیظ و غضب جمع ہو گیا تھا کہ اس کی مثال نہیں ملتی کسی قطب شاہی وزیر کے خلاف کبھی مُلک میں اس قدر ہیجان برپا نہیں ہوا مغل تو اس کے دشمن تھے ہی لیکن گولکنڈے کے رہنے والے بھی اس کے دوست نہ تھے اور منوچی کے الفاظ میں مسلمان تو اس سے سخت نفرت کرتے تھے۔ یہاں تک کہ شاہی محل کی خواتین جن کو سیاست سے بہت دُور کا واسطہ ہوتا ہے اس کی سخت دشمن تھیں اور یہ اس قدر زبردست ہیجان تھا کہ جب ان مخالفوں کا بس چلا تو نہ صرف ان لوگوں نے مادنا کو قتل کیا بلکہ اس کے تمام خاندان کو تباہ کر دیا۔ بات یہ ہے کہ مادنا کا طرزِ حکومت ایسا نہیں تھا کہ مُلک میں اس کی طرف سے خوشنودی پیدا ہوتی۔ حُکمران طبقے کو اس سے ناراض ہونے کے کئی اسباب تھے۔ غالباً اس کا اصلاحی حربہ مسلمانوں پر اُلٹا پڑا۔ جب مادنا کے خارجی مسلک پر نظر دوڑائی جاتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ بھی مُلک کے لئے مفید نہ تھا، اسی وجہ سے یہ کہا جاتا تھا کہ "سختی و ظلم زیادہ بر مسلمانان می گذشت"۔ سیواجی اور اسکے بیٹے سنبھاجی سے جو اتحاد کیا گیا تھا وہ سلطنت کے مفاد کے بالکل منافی ثابت ہوا۔ ان مرہٹہ حُکمرانوں نے کبھی اپنے قول کا پاس نہیں کیا۔ اس کے علاوہ بیجاپور کے بچاؤ کے لئے جو تجویز ہوئی تھی وہ ایسے آڑے وقت ادھوری چھوڑ دی گئی کہ غریب سلطنت کو سخت پریشانی کا سامنا کرنا پڑا، اور اس کا کوئی پہلو بھی حق بجانب نہیں تھا۔ بعض موقعوں پر مادنا نے اپنے دوست، دشمن دونوں سے رشوت لینے میں بھی دریغ نہیں کیا۔ اگر یہ روایت صحیح ہے کہ مادنا نے مغرب میں بہادر خاں کوکلتاش سے اور مشرق میں انگریز کمپنی سے رشوت لی تھی تو یہ طرزِ عمل حد درجہ قابلِ ملامت ہے' اور خود بادشاہ پر بھی حرف آتا ہے کہ اس نے مادنا پر ضرورت سے اعتماد کر رکھا تھا۔

بیسواں باب

جنگِ ملکھیڑ

شہنشاہ اورنگ زیب کی تخت نشینی کے بعد آیندہ بیس سال تک دکن کی رفتارِ سیاست میں کوئی غیر معمولی تغیر نہیں ہوا، کیونکہ آخر تک دکن کا سیاسی نقشہ وہی تھا۔ اس ملک کی نئی اور پرانی جو طاقتیں مغل شہنشاہت کے مقابلے میں کشاکشِ زیست میں مبتلا تھیں، ابھی فنا نہیں ہوئی تھیں۔ مرہٹے تو بہت ترقی کر گئے لیکن بیجاپور اور گولکنڈے کی رُو بہ زوال سلطنتوں نے بھی اپنی ہستی قائم رکھی۔ بیجاپور نے تمام مغل حملہ آوروں کو، جن میں جے سنگھ، دلیر خاں اور بہادر خاں کو شکست دے کر ہرا دیا۔ گولکنڈے نے دلیر خاں اور بہلول خاں کے متحدہ حملے کو جو ملکھیڑ پر ہوا تھا رَد کر دیا، لیکن ۱۰۹۱ھ / ۱۶۸۰ء میں جب سیواجی کا انتقال ہوا تو پھر دکن کے حالات سُرعت سے بدلنے لگے، کیوں کہ اس کا بیٹا سنبھاجی جو باپ کی جگہ گدی نشین ہوا تھا سخت فتنہ انگیز ثابت ہوا۔ یوں تو سیواجی کی تاخت و تاراج بھی کچھ کم تلاطم خیز نہ تھی، تاہم سیواجی میں عزت و ناموس کا کچھ پاس و لحاظ ضرور تھا، مگر سنبھاجی نے اپنی لوٹ کھسوٹ میں تہذیب کی تمام تعینات توڑ دیئے اور ایسا اودھم مچایا کہ زمانہ چیخنے لگا۔ چنانچہ گدی نشین ہوتے ہی اس نے دکن کے چاروں طرف دست درازیاں شروع کر دیں اور بالآخر ۱۰۹۲ھ / ۱۶۸۱ء میں

برہان پور پر جو اس زمانے میں دکن کی تہذیب کا بڑا مرکز تھا، دھاوا بول دیا اور ایسی قتل و غارت کی کہ اہلِ برہان پور کانپنے لگے۔ بہادر خاں کی کمزوری کے باعث جو اس زمانے میں دکن کا گورنر تھا ان علاقوں کو وقت پر امداد نہ پہنچ سکی۔ ناچار ان لوگوں نے عاجزانہ جمعے کی نماز چھوڑ دی اور شہنشاہ کی خدمت میں محضر پیش کیا کہ :۔ "جب تک دکن میں امن قائم نہیں کیا جائے گا ہم جمعے کی نماز نہیں پڑھیں گے، کیوں کہ یہ دارالحرب ہے۔" اس دردانگیز مطالبے پر شہنشاہ[1] نے کہا :۔ "ما خود بدولت برائے فتنۂ کفّارِ دکن متوجہ آں طرف می شویم۔" دوسری دِقّت یہ تھی کہ اسی زمانے میں شہنشاہ کا چھوٹا بیٹا شہزادہ اکبر راجپوتوں کے اغوا سے بغاوت کر بیٹھا اور راجپوتانے میں اپنے باپ کے مقابلے میں ایک مخالفانہ محاذ بنانے کی کوشش کی، لیکن جب یہاں اس کے قدم نہ جم سکے تو راجپوتانے سے بھاگا اور دکن میں پناہ لی اور سنبھاجی سے اتحاد کر لیا۔ شہنشاہت کے لئے ایک نیا خطرہ یہ تھا کہ اس جدید بغاوت سے مرہٹوں اور دوسری دکنی طاقتوں کو غیر معمولی تقویت ہو جاتی اور دکن مغل سلطنت کے ہاتھ سے نکل جاتا، اس لئے اورنگ زیب نے شاہجہاں کی طرح بذاتِ خود دکن کی طرف توجہ کرنا ضروری سمجھا، اور چونکہ اس زمانے میں راجپوتانے کی بغاوت فرو ہو چکی تھی اس لئے ان کا دکن میں قیام کرنا ممکن تھا۔

سنہ ۱۰۹۳ھ/۱۶۸۲ء میں شہنشاہ اورنگ زیب کے ساتھ ہندوستان کی تمام فوجی طاقت سمٹ کر دکن آ گئی۔ اس کا اولین مقصد غالباً یہ تھا کہ شہزادہ اکبر کی سرکوبی کرے اور دکن کو مرہٹوں کی شورش سے نجات دلائے، کیونکہ مرہٹوں کے قتل و غارت کی وجہ سے دکن میں سخت بے چینی پھیلی ہوئی تھی۔ ظاہر ہے کہ ایسی بے چینی اور بدامنی کا سدِ باب کرنا ہر مہذب حکومت کا فرضِ منصبی ہے،

---

[1] خافی خاں، جلد دوم ص ۲۷۵۔

مغل حکومت بھی اس کو اپنا فرض سمجھتی تھی۔ چنانچہ اکبرِ اعظم نے جہاں بھی حملے کئے ان میں ہمیشہ قیامِ امن کا پاکیزہ مقصد بھی مضمر تھا، اور یہی چیز اس وقت اورنگ زیب کے بھی پیشِ نظر تھی، لیکن اس کے ساتھ اس حقیقت کو بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہئے کہ مغل شہنشاہ تمام ہندوستان کی شیرازہ بندی کرکے اپنی ایک اجتماعی قوت پیدا کرنا چاہتے تھے اور اس کے لئے ان کو دکن کی تمام طاقتوں کا راستے سے ہٹانا ضروری تھا، کیوں کہ وہ دکن جیسے بڑے خطۂ ارض کو جو ہندوستان سے علٰحدہ نہیں ہے، اپنی مرکزیت سے جُدا نہیں رکھ سکتے تھے۔ شمالی ہند کی ہر بڑی طاقت، خواہ وہ قدیم ہو، یا وسطی جنوب پر ضرور اثر انداز ہوئی، اور جب کبھی موقع ملا جنوب کو شامل کرکے ایک عظیم تر ہندوستان بنانے کی کوشش کی، گو یہ کوششیں کبھی بار آور نہ ہوئیں۔ مغلوں کے لئے دکن کا مسئلہ ایشیا کے ناگوار اثرات کی وجہ سے زیادہ پیچیدہ ہو گیا تھا، یعنے ایران کے صفوی اور مغل سلاطین میں نہایت درجے کی رقابت تھی اور اس کا نتیجہ یہ تھا کہ دونوں ایک دوسرے کو کمزور دیکھنا چاہتے تھے۔ اس کے لئے صفویوں نے ادھر شمال میں قندھار پر بار بار زد کی اور جنوب میں بیجاپور اور گولکنڈے کی شیعہ سلطنتوں کو اپنا ہمنوا بنا لیا۔ یہ سلطنتیں بھی اپنے بچاؤ کے لئے صفویوں کا دامن پکڑے ہوئے تھیں۔ ظاہر ہے کہ اس سے مغل اقتدار پر ایک کھلی زد پڑتی تھی۔ ان حالات کے تحت مغلوں کو دکن کے لئے ایک مستقل مسلک قرار دینا تھا جو اکبر کے عہد میں کیا گیا۔ اکبرِ اعظم نے دکن سے متعلق ایک بڑا منصوبہ بنا دیا جس کی اس کے جانشینوں نے صداقت کے ساتھ پیروی نہیں کی اور یہ کہا جا سکتا ہے کہ اورنگ زیب نے اس دیرینہ منصوبے کی تکمیل کو کرلی، یعنے تمام دکن کو مسخر کرکے ایک ہمہ گیر وسیع شہنشاہیت قائم کردی۔ لیکن تمام واقعات کی روشنی میں دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس مسلک کی ایسی تکمیل نہیں ہوئی جو اکبر کا صحیح مقصد تھا، اور نشانۂ اس مسلک کی اندھا دھند پیروی ہوئی۔ یہ صحیح ہے کہ ہندوستان کی شیرازہ بندی اکبر کا بہت بڑا

منصوبہ تھا، لیکن اس کی تکمیل ایک ایسے طریقے سے بھی ہو سکتی تھی جو شہنشاہت کے لئے زیادہ مفید ہوتا۔ یعنے دکن کا پورا الحاق نہیں بلکہ یہاں صرف سفارت قائم کیجائے۔ شہنشاہ رمضان شریف کے بعد ۱۰۹۲ھ/۱۶۸۲ء میں برہان پور آئے اور تین چار مہینے یہاں قیام کرکے اورنگ آباد پہنچ گئے۔ اس کی وضاحت مشکل ہے کہ آیا شہنشاہ نے پہلے ہی و ہلے میں مرہٹوں کے استیصال کے ساتھ گولکنڈہ اور بیجاپور کا خاتمہ ضروری سمجھا تھا، اور اس کا تہیہ کرلیا تھا۔ قرائن یہ ہیں کہ غالباً شروع ہی سے شہنشاہ کے ذہن میں یہ منصوبہ تھا کہ دکن کی رہی سہی مسلمان سلطنتوں کا خاتمہ کردینا چاہئے کیوں کہ دکن کے ناظم کی حیثیت میں جب انھوں نے گولکنڈہ اور بیجاپور پر حملہ کیا تھا تو اس وقت ان کا ارادہ یہی تھا، اور اگر اس زمانے کے در پردہ واقعات مانع نہ ہوتے تو آج سے چالیس سال پہلے ہی ان سلطنتوں کا خاتمہ ہو جاتا، لیکن اس وقت واقعات کی رفتار سے معلوم ہوتا ہے کہ اورنگ آباد آتے ہی شہنشاہ نے سب سے پہلے شہزادہ اکبر کے خلاف فوج کشیاں شروع کردیں اور جب یہ ناکام ہوگئیں اور شہزادہ اکبر ہاتھ سے نکل گیا تو اس کے بعد ۱۶۸۳ء میں مرہٹوں کے حلقوں پر وار کئے گئے، چنانچہ شہزادہ اعظم کو قلعۂ سالہیر اور شمال کوکن پر حملہ کرنے کے لئے اور شہزادہ معظم کو رام درہ پر حملہ کرنے کے لئے روانہ کیا، لیکن یہ بے سود ہوا، یہ دونوں مہمیں ناکام ہوئیں اور مغل فوجوں کا بہت نقصان ہوا، مجبوراً ان فوجوں کو واپس بلا لیا گیا۔ اس کے بعد چھوٹی موٹی لڑائیوں کے سوا جو ایک سال تک مرہٹوں کے ساتھ ہوتی رہیں کوئی بڑا معرکہ نہیں ہوا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس دوران میں شہنشاہ نے پچھلی ناکامیوں پر غور کرکے آیندہ کے لئے ایک پرزور لائحۂ عمل مرتب کرنے کی کوشش کی۔ اب تک ان کے لائحۂ عمل میں دکنی سلطنتوں کا کوئی عنصر نہ تھا بلکہ دکن آنے کے بعد شہنشاہ نے مرہٹوں کے استیصال میں دکن کی اسلامی سلطنتوں کو بھی دعوت دی تھی کہ وہ مرہٹوں کے خلاف مغل سلطنت کا ساتھ دیں۔ چنانچہ بیجاپور کے جنرل

سید مخدوم شرزہ خاں کے نام اس مضمون کا ایک فرمان آیا تھا۔[1] مگر دو سال کے وقفے کے بعد شہنشاہ کو یہ معلوم ہوا کہ یہ سلطنتیں اپنے بچاؤ کے لئے مرہٹوں سے اتحاد کرتی رہتی ہیں اور ان کی ایسی مدد کرتی ہیں جیسے نظام شاہی سلطنت کی مدد کرتی تھیں تو شہنشاہ کی نظر میں اس طریقے سے مرہٹوں کا قلع قمع ناممکن تھا کیوں کہ بیجاپور و گولکنڈے سے سنبھاجی کو روپیے اور فوج سے مدد دی جاتی تھی اس لئے شہنشاہ نے سب سے پہلے بیجاپور اور گولکنڈے کی سلطنتوں کا خاتمہ کرنا ضروری سمجھا۔ چنانچہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے مرہٹوں کا تعاقب یک لخت بند کر دیا اور جو فوجیں مرہٹوں کے خلاف مصروف تھیں ان کو سمیٹ کر اسلامی سلطنتوں کی بیخ کنی میں لگا دیں۔ ۱۰۹۶ھ / ۱۶۸۵ء میں ایک فوج شہزادہ اعظم کے تحت بیجاپور پر حملہ کرنے کے لئے روانہ کر دی۔

ان محرکات کے علاوہ جن کا اوپر ذکر ہوا، مغل سلطنت کو قطب شاہی حکومت کے ساتھ معاشی اغراض بھی وابستہ تھیں اور چند شکایتیں بھی تھیں۔ گولکنڈہ ایک مالدار سلطنت تھی جس سے مغل شہنشاہوں کو مقررہ پیش کش کے علاوہ بے حساب سونا چاندی اور جواہر ملتے تھے۔ محمد سعید میر جملہ نے تمام راز سربستہ فاش کر کے مغل شہنشاہوں کو بہت حریص اور لالچی بنایا تھا۔ شاہجہاں نے گولکنڈے سے کھلم کھلا جواہر اور ہاتھی مانگے تھے جنکی مجبوراً سربراہی کرنی پڑتی تھی پرانے دکھڑے کو چھوڑ کر نئی شکایتیں یہ پیدا ہو گئی تھیں کہ ابوالحسن نے ایک طرف "ہردو کافر شدید العداوت" اکنا و مادنا کو ملک میں مقتدر بنا رکھا تھا جن کی وجہ سے "سختی و ظلم زیادہ بر مسلمانان می گذشت" دوسرے "سنبھائے جہنمی دارالحربی" کو امداد دی جاتی تھی۔[2] چنانچہ جب ۱۰۹۶ھ / ۱۶۸۴ء میں بیجاپور کا محاصرہ ہو گیا تو ابوالحسن قطب شاہ کو ہدایت کی گئی کہ وہ سکندر عادل شاہ کی کوئی مدد نہ کرے۔[3]

---

[1] بساتین السلاطین ص ۵۲۰ [2] خافی خاں، جلد دوم ص ۲۹۲ و ۲۹۳۔

[3] " " ص ۳۳۳ ۵۔

جب ۱۰۹۶ھ ۱۶۸۵ء میں شہنشاہ خود بیجاپور کے محاصرے کو موثر بنانے کے لئے شولاپور گئے تو بہرہ مند خاں حیدر آباد کی نگرانی کے لئے مقرر ہوا تاکہ گولکنڈے سے کوئی فوج بیجاپور کی امداد کے لئے نہ آنے پائے۔ لیکن قطب شاہی حکومت اپنے خارجی مسلک سے مجبور تھی۔ اس کو یہ معلوم تھا کہ جب تک بیجاپور قائم ہے گولکنڈے پر کوئی آنچ نہ آئے گی۔ چنانچہ فرائر کہتا ہے کہ "بیجاپور پر گولکنڈے کی زندگی کا انحصار ہے"[۱] اس لئے شہنشاہ نے گولکنڈے سے پہلے بیجاپور پر وار کرنا ضروری سمجھا، اس لئے ابوالحسن نے پہلے مراری راؤ کے تحت بیجاپور کی امداد کے لئے ایک فوج بھیجی جو سرحد کی ناکہ بندی کی وجہ سے منزلِ مقصود پر نہ پہنچ سکی، کیوں کہ بہادر خاں اور بہرہ مند خاں بیچ میں حائل تھے۔ سکندر عادل شاہ نے بھی مدد مانگی تھی۔ اس آخری زمانے میں جب کہ بیجاپور کا محاصرہ سخت ہو گیا تو ابوالحسن نے پھر چالیس ہزار کی ایک فوج محمد ابراہیم خلیل اللہ کے تحت روانہ کرنے کی ہمت کی۔ اگرچہ یہ منصوبہ پورا نہیں ہوا، لیکن جس خط میں ابوالحسن نے یہ ارادہ ظاہر کیا تھا وہ مغلوں کے ہاتھ پکڑا گیا اور شہنشاہ کی خدمت میں پیش کیا گیا۔[۲] اس کا مضمون یہ تھا کہ:-
"اب تک ہم شہنشاہ کو بزرگ سمجھ کر ان کا پاس و لحاظ کرتے تھے، لیکن اب ہم

---

[۱] فرائر، جلد دوم ص ۵۱ [۲] حیدر آباد کے دو حاجب محمد معصوم اور محمد جعفر جن کو ابوالحسن نے شہنشاہ کی خدمت میں بھیجا تھا وہ کوتوال کی نگرانی میں نظر بند تھے اور یہ حکم تھا کہ "اُن کے گولکنڈے سے جو خطوط آئیں وہ اہتمام خاں کوتوال دیکھا کرے" اسی طرح یہ خط پکڑا گیا۔ اس کے الفاظ یہ تھے:-

"ایشان بزرگ اند تا حال پاس مراسم بزرگ داشت نمودیم۔ حالانکہ ایشان سکندر را یتیم و ناتوان دانستہ بیجاپور را محاصرہ نمودہ کار او تنگ آوردہ اند۔ واجب آمد کہ سوائے جمعیت موفور بیجاپور، راجہ سنبھا از طرفے با فشون از شمار افزون جہت (باقی بر صفحہ ۲۸۰)

یہ دیکھ رہے ہیں کہ سکندر جیسے یتیم بچّے کے سر پر مغل لشکر پہنچ گیا ہے اس لئے ہم خاموش نہیں بیٹھ سکتے۔ ادھر سے خلیل اللہ خاں کے تحت چالیس ہزار کی فوج امداد کے لئے جائے گی اور دوسری طرف سے سنبھاجی اپنی فوج لائے گا، پھر دیکھیں گے اورنگ زیب کس کس طرف سے دشمن کا مقابلہ کرتے ہیں۔" اس خط کو دیکھ کر شہنشاہ بہت برافروختہ ہوئے اور کہا کہ:۔ "ما گوشمالی این یک چینی فروش میمون باز بلنگ نواز را موقوف داشتہ بودیم حالانکہ مادہ خروس بہ بانگ آمد جائے توقف نماند۔"[1] باوجود اس کے کہ بیجاپور کے محاصرے میں تمام توجہ منعطف تھی اور گولکنڈے کے لئے فوج بھیجنا بہت مشکل تھا، تاہم اس کو اپنے حال پر چھوڑنا خلافِ مصلحت سمجھا گیا، اس لئے شہزادہ معظم کو ایک بڑی فوج کے ساتھ فوراً حیدرآباد پر حملہ کرنے کے لئے بھیج دیا، اور بہادر خاں کو حکم ہوا کہ اپنے مستقر کو چھوڑ کر شہزادے کی مہم میں شامل ہو جائے! اس فوج میں صفدر خاں، اعتقاد خاں، ملتفت خاں، سید عبداللہ خاں بارہہ اور جاں نثار خاں وغیرہ جیسے نامور جنرل شامل تھے۔[2]

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۷۹) کومک آن بیکس کمر سعی بہ بندند۔ و ما بہ سرداری خلیل اللہ خان پلنگ حملہ چہل ہزار سوار مستعد بیکار تعین نمایم و بہ بینیم کہ ایشان کدام کدام طرف را مقابلت و مقاومت خواہند کرد۔ و آنہا را کہ چیش چبوترہ کوتوالی فرود آوردہ اند ازین معنی خستہ خاطر نشوند نزدیک است کہ تدارک بہ ظہور آید۔" (مآثر عالمگیری ص ۲۶۰)۔

زبیری نے صرف اس قدر لکھا ہے کہ:۔ "نوشتہ جات نہانی کہ در ایام محاصرہ بیجاپور با سکندر عادل شاہ داشت۔" (بساتین السلاطین ص ۵۴۸)۔

[1] "ہم نے چینی بیچنے والے، بندر نچانے والے کی گوشمالی ملتوی کر دی تھی، چونکہ اب مُرغی کڑکڑا رہی ہے اس لئے تاخیر نہیں کرنی چاہئے۔" (حدیقۃ العالم مقالۂ اول ص ۲۶۹)۔

[2] مآثر عالمگیری ص ۲۶۰۔ خافی خاں، جلد دوم ص ۲۹۲۔

ملکھیڑ پر جو گولکنڈے کی سرحد تھی، مغل فوج کا پڑاؤ ڈالا گیا۔

اگرچہ قطب شاہی حکومت نے ہمیشہ مغلوں سے پہلو بچانے کی کوشش کی تاکہ ان کو کوئی شکایت نہ ہو، اور لڑائی کی نوبت نہ آئے۔ چنانچہ جب شہنشاہ دکن آئے تو ابوالحسن نے ان کی خدمت میں سونا، ہاتھی اور جواہر ارسال کئے تھے اور بیجاپور کے محاصرے کے زمانے میں جب کہ شہنشاہ شولاپور میں تھے قطب شاہی حاجب بھی گئے تھے لیکن حکومت اپنے دفاعی انتظام سے غافل نہیں رہی، بلکہ مغل حملوں کے خوف سے اپنے ہاتھ پیر مضبوط کرتی رہی اور بیجاپور کی مقدور بھر مدد کی، مرہٹوں سے اتحاد کر لیا سیواجی کے مرنے کے بعد سنبھاجی کو بھی مقررہ امداد دی۔ شمال اور شمالی مغربی سرحدوں کو محفوظ کیا گیا۔ محمد ابراہیم کو ایک جرار فوج کے ساتھ ملکھیڑ پر متعین کیا گیا جس نے بہلول خاں اور دلیر خاں کے متحدہ حملے کو رد کر دیا اور شکست فاش دی۔ سنہ ۱۰۹۰ھ/۱۶۷۹ء میں ابوالحسن قطب شاہ اور مادنا بجواڑے اور کونڈپلی میں بہت دنوں تک مقیم رہے۔ کونڈپلی کے قلعے کو مستحکم کیا تاکہ اگر مغل حملہ آور ہوں تو مرکزی حکومت اور خزانہ یہاں منتقل کیا جا سکے۔ اسی زمانے میں کونڈبیر کے قلعے کی بھی مرمت کروائی گئی اور یہاں دو ہزار سپاہی متعین کئے گئے، حالانکہ پرانے انتظام میں صرف بارہ سو سپاہی رکھے جاتے تھے۔ غالباً قلعۂ ورنگل کی مرمت بھی اس پیش نامے میں شامل تھی۔ انگریز کمپنی کو لکھا گیا کہ بارہ ہزار ہون کی بارود، پچیس کھنڈی سیسہ بہم پہنچائیں۔ اس کے علاوہ صوبۂ کرناٹک کی بھی خاطر خواہ نگہداشت کی گئی۔ جہاں حملوں کی ضرورت تھی وہاں حملے بھی کئے گئے۔ چنانچہ لنگپانے ۱۰۹۵ھ/۱۶۸۴ء میں چک نائکن پلی ایک قصبے اور اس کے نواح پر حملہ کر کے قبضہ کر لیا۔ اس کے علاوہ وہ علاقے جو محمد ابراہیم کی غفلت کے باعث ہاتھ سے نکل گئے تھے دوبارہ حاصل کئے گئے۔ زمانے کی ضرورت کا لحاظ کر کے مرکزی آلات حکومت میں بھی ضروری تغیر کیا گیا۔

۱۰۹۳ھ/۱۶۸۱ء میں بادشاہ دیوان کے گھر گئے اور اس کو ضروری ہدایتیں دیں۔ محمد ابراہیم کو جو اس زمانے میں مجموعہ دار کی خدمت پر فائز تھا علیحدہ کرکے اکنا کو مقرر کیا[1]۔ محمد ابراہیم صرف سرخیل کی خدمت پر بحال رکھا گیا۔ اکنا نے کرناٹک کا جائزہ لنگپا کو دے کر مجموعہ دار کے فرائض انجام دینے شروع کئے۔ اس طریقے سے اکنا تمام داخلی امور کی نگرانی کرتا تھا۔ یہ سرلشکر اور وزیر داخلہ اور مادنا صرف خارجی امور کی نگہداشت کرتا تھا، کیوں کہ اس آخری زمانے میں مغلوں کے غلبے کی وجہ سے خارجی امور بہت پیچیدہ ہو گئے تھے اور ان کے لئے خاص اہتمام کی ضرورت تھی اور جب ۱۰۹۶ھ/۱۶۸۵ء میں حیدر آباد پر حملہ کرنے کے لئے مغل فوجیں آنے لگیں تو ان کی مدافعت کا بھی خاطر خواہ اہتمام کیا گیا۔ محمد ابراہیم خلیل اللہ خاں، شیخ منہاج اور رستم راؤ کی سرکردگی میں ایک بہت بڑی فوج جس کی تعداد چالیس ہزار سے زیادہ تھی ملکھیڑ پر متعین کر دی گئی جو قطب شاہی سلطنت کی سرحد تھی۔

پہلے خانِ جہاں کوکلتاش اپنی فوج کے ساتھ ملکھیڑ پہنچا، برخلاف اس کے شاہِ عالم دو یا تین میل پیچھے تھا۔ جب مغل فوج کا مقدمہ جس کا ہراول جاں نثار خاں تھا آگے بڑھا تو ملکھیڑ کے مشرق میں آٹھ میل کے فاصلے پر قطب شاہی فوج نے اس کا راستہ روکا۔ یہاں یہ فوج پہلے سے ملکھیڑ پر پڑاؤ ڈالے ہوئے تھی۔ چونکہ دکنی فوج تعداد میں زیادہ تھی اس لئے مغل فوج ایک قریبی قلعے میں محصور ہو گئی اور اپنی مدافعت کرنے لگی۔ پہلی جھڑپ میں جو ملکھیڑ اور سیڑم کے قریب ہوئی مغل فوج کو شکست ہو گئی۔ اس اثنا میں شہزادہ معظم آگیا اور اس نے جنگ سے بچنے کے لئے پہلے چند شرائط پر

---

[1] ۱۰۹۷ھ/۱۶۸۵ء میں محمد ابراہیم سرلشکر کی خدمت پر فائز تھا، لیکن مجموعہ داری سے علیحدگی سے وہ بہت ناراض ہوا اور اسی وجہ سے ملکھیڑ کی لڑائی کے بعد مغلوں سے مل گیا۔

صُلح کرنے کی کوشش کی۔ شرطیں یہ پیش کی گئیں کہ اکنّا اور مادنّا کو حکومت سے خارج کر دیا جائے، اور سیڑم و رام گیر کے پرگنے مغلوں کے حوالے کئے جائیں. نیز بقایا پیش کش ادا کر دیا جائے۔[1] لیکن دکنی فوج کے سرداروں نے ایک نہیں سُنی بلکہ یلغار کر دیا۔ خانِ جہاں، ہمت خاں اور سید عبد اللہ بارہہ چاروں طرف سے گھر گئے اور ان کا باہر نکلنا مشکل ہو گیا، اور قرائن یہ تھے کہ خانِ جہاں کو کلتاش کو شکست ہو جاتی لیکن مغل فوج کے ایک ہاتھی نے جس کے منہ میں چار من کی زنجیر دی گئی تھی ایک تہلکہ ڈال دیا۔ اسکی یورش سے دکنی فوج منتشر ہو کر پیچھے ہٹ گئی، بہت سے ہاتھی اور گھوڑے مغلوں کے ہاتھ آ گئے۔ مغل فوج نے فتح کے شادیانے بجائے۔ اس کے ساتھ ہی جاں نثار خاں نے گڈی سیڑم پر حملہ کر کے فتح کر لیا، اور اس کے بعد گولکنڈے سے ایک بڑی کمک آ گئی۔ یہ مادنّا کی فوج تھی جس کی تعداد دس ہزار بتائی جاتی ہے[2] اور جاں نثار خاں سے اس کا مقابلہ ہوا، طرفین کے بہت سے آدمی مرے اور اس کے چوتھے روز اس قدر سخت مقابلہ ہوا کہ ہمت خاں، سید عبد اللہ خاں اور راجہ مان سنگھ وغیرہ بُری طرح زخمی ہو گئے لیکن آخر میں قطب شاہی فوج کو شکست ہو گئی اور یہ میدان سے بھاگنے لگی۔ سید عبد اللہ نے یہ رائے دی تھی کہ منہزم فوج کا تعاقب ہو تو مناسب ہے، لیکن شہزادہ معظم اور خانِ جہاں نے اس سے اختلاف کیا اور خیمہ لگا کر چُپ چاپ

---

[1] خافی خاں، جلد دوم، دکنی فوج کا ایک مشہور سپاہی باری خاں (جو پتھر پھینکنے میں بہت مشہور تھا) جس کا "ہاٹ بہٹہ" لقب تھا اپنے بھالے کے ساتھ خانِ جہاں کے ہاتھی کے سامنے آ گیا اور پوچھا کہ مغل فوج کا خاص سردار کون ہے؟ یہ حملہ کرنا چاہتا تھا کہ خانِ جہاں نے تیر سے اس کا کام تمام کر دیا.

[2] خافی خاں، جلد دوم ص ۲۹۸)۔

بیٹھ گئے۔ اس کے بعد ویسے بھی بارش کی وجہ سے جنگ موقوف کرنی پڑی، کیوں کہ یہ بارش کا موسم تھا۔ جب شہنشاہ کو اس کی اطلاع ہوئی تو وہ بہت ناراض ہوئے۔ خافی خاں کہتا ہے کہ شہنشاہ کو کچھ پہلے سے شاہزادہ معظم اور خافی خاں سے شکایت تھی، اس تساہل سے اور زیادہ ناراض ہو گئے۔[1] اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ دونوں بہت ملول و بددل ہو گئے اور چار پانچ مہینے مغلوں کی طرف سے کوئی حرکت نہیں ہوئی، حالانکہ دکنی فوج چپکے چپکے حملہ کرتی جاتی تھی۔ اس واقعے سے شہنشاہ اور زیادہ خفا ہوئے اور خود اپنے ہاتھ سے ایک فرمان لکھا جس میں خانِ جہاں کی سخت سرزنش کی گئی تھی اور یہ ہدایت تھی کہ فوراً حملہ ہونا چاہیے۔

اگرچہ شہزادہ دل سے حملہ کرنا نہیں چاہتا تھا لیکن شہنشاہی فرمان کی وجہ سے مجبور ہو کر اس کو اپنے سپہ سالاروں سے جن میں خانِ جہاں بھی تھا، مشورہ کرنا پڑا۔ چونکہ خانِ جہاں شہنشاہ کی طرف سے برداشتہ خاطر تھا اس لیے اس نے حملے کی مخالفت کی، لیکن دوسرے سرداروں نے یہ رائے دی کہ اب شہنشاہی احکام کی خلاف ورزی نہیں کرنی چاہیے۔ چنانچہ سید عبداللہ نے خانِ جہاں کی جگہ اپنے آپ کو ہراول کی خدمت کے لیے پیش کر دیا۔ جب یہ طے ہو گیا کہ لڑائی ہونی چاہیے تو شہزادے نے سب سے پہلے حیدرآباد کے سرلشکر خلیل اللہ خاں کو صلح کا پیغام بھیجا کہ "اگر ابوالحسن سیڑم۔ کوہیر۔ اڑگی اور ملکھیڑ جو مابہ النزاع بن گئے ہیں ہمارے حوالے کر دے تو جنگ ملتوی ہو سکتی ہے اور عفوِ تقصیرات کی سفارش کی جائے گی۔" یہ پیغام ناظرِ محل زمرد کی معرفت بھیجا گیا تھا۔ محمد ابراہیم تو سیڑم اور دوسرے پرگنے دے کر صلح کرنا چاہتا تھا مگر شیخ منہاج اور رستم راؤ نے اس کو منظور نہ کیا، بلکہ

---

[1] خافی خاں، جلد دوم ص ۲۹۹۔

کہا کہ :۔ "قلعہ سرحدِ سیڑم بر سر نوکِ شمشیر و سنان نیزہ ہائے ما وابستہ است"[1] اور دکنی سپاہی فوراً بان پھینکنے لگے۔ چنانچہ بعض بان تو خود شہزادہ معظم کے خیمے میں آپڑے اور کھانے کا خوان گر گیا۔ شہزادے نے بگڑ کر فوراً جنگ کی تیاری کی چنانچہ بہادر خاں کے ساتھ شہزادہ معز الدین کو فوج کا ہراول بنایا گیا اور جعفر خاں وہمت خاں اس کے ہمراہ رکھے گئے۔ مرکزی رسالہ خود شہزادہ معظم کے تحت تھا جس میں مان سنگھ۔ ابوالمکارم اور سمندر بیگ وغیرہ شامل تھے۔ ادھر گولکنڈے سے بھی نئی کمک آگئی اور قطب شاہی افسروں نے اس وقت موقعے کی نزاکت کو ملحوظ رکھ کر جنگ کا ایک نیا نقشہ مرتب کرلیا۔ یعنے پہلے تو ان لوگوں نے یہ کام کیا کہ اپنی بھیر دائیں جانب تین چار میل ہٹا دی اور پھر توپیں گڑھے میں اور بعض توپیں مٹی میں دبا دیں تاکہ دشمن کو نظر نہ آئیں، اس کے بعد فوج کا ایک حصہ مغل ہراول کے سامنے اور دوسرا حصہ جس میں شیخ منہاج اور رستم راؤ وغیرہ کھڑے تھے، سید عبداللہ اور شہزادہ معظم کے مقابلے کے لئے مقرر کیا اور بڑے زور سے یلغار کیا۔[2] لیکن مغل فوج کی یورش کے سامنے پسپا ہوگئے اور گڈی سیڑم کی طرف ہٹ گئے۔ دشمن سے تھوڑی مہلت مانگی پھر دوسرے روز شام تک لڑائی ہوتی رہی لیکن اس کا انجام بھی یہی ہوا جب شکست ہونے لگی تو قطب شاہی فوج نے شہزادہ معظم کو یہ پیغام بھیجا کہ بجائے گھمسان کی لڑائی کے دو بدو مقابلہ کیا جائے تو مناسب ہے۔ یعنے چند آدمی فریقین میں سے میدان میں آئیں اور شمشیر آزمائی کریں، اس بڑی خونریزی سے کیا فائدہ ہے۔ چونکہ شمشیر آزمائی دکن کا خاص فن تھا اس لئے قطب شاہی سپاہیوں کو اپنے فن پر بہت اعتماد تھا لیکن مغل اس کے لئے تیار نہیں ہوئے۔ شہزادے نے جواب دیا کہ ہم صرف

---

[1] خافی خان جلد دوم ص ۳۰۲۔
[2] " " " ص ۳۰۳۔

ہاتھی پر مقابلہ کر سکتے ہیں۔ اس طرح یہ مطالبہ رد ہو گیا۔[1] صبح کو یہ معلوم ہوا کہ قطب شاہی فوج اچانک حیدر آباد کی طرف فرار ہو گئی اور اس کی وجہ یہ تھی کہ اس فوج کے دکنی اور غیر دکنی عناصر میں بے حد اختلاف ہو گیا تھا اور بعض لوگ مغلوں سے لڑنا نہیں چاہتے تھے۔ یہ حال دیکھ کر مغل فوج نے فتح کے نقارے بجائے اور قطب شاہی فوج کا تعاقب شروع کر دیا۔ شاہزادہ معظم پہلے ڈھول پیٹ کے راستے سے گگن پہاڑ آیا اور چند روز کے بعد گوشہ محل میں آکر ٹھیرا۔ جب دکنی فوج حیدر آباد پہنچ گئی تو یہاں یہ حادثہ ہوا کہ گولکنڈے کا سر لشکر محمد ابراہیم خلیل اللہ خاں مغلوں سے مل گیا۔ وہ پہلے سے ناراض تھا کیوں کہ مجموعہ داری کی خدمت اس سے چھین لی گئی تھی اور اس پر طُرّہ یہ ہوا کہ جب قطب شاہی فوج ملکھیڑ سے منہزم ہو کر آئی تو اس فوج نے محمد ابراہیم کو شکست کا ذمہ دار قرار دیا اور بادشاہ کو یہ سمجھایا کہ وہ مغلوں سے لڑنا نہیں چاہتا تھا مادنا نے بھی اس کی تائید کی۔ بادشاہ اس سے بہت ناراض ہوئے اور اس کو قید کرنا چاہا۔ اس سے خائف ہو کر محمد ابراہیم ۸ر اکتوبر ۱۰۹۷ھ ۱۶۸۶ء کو شہزادہ معظم کے پاس پہنچ گیا۔[2] چونکہ مغل ایسے مواقع کو غنیمت سمجھتے تھے اس پر عنایات کی بوچھار کر دی اور ملازمت میں داخل کر لیا۔ اس کو مہابت خاں خطاب ہشت ہزاری منصب اور چار ہزار سوار ملے۔

گولکنڈے کی فوجوں کی شکست اور محمد ابراہیم کی بے وفائی سے قطب شاہی حکومت بہت پریشان ہوئی۔ ابوالحسن پر اس قدر پریشانی طاری ہوئی کہ وہ اب دوسروں سے بھی بے اعتمادی ظاہر کرنے لگا۔ شیخ منہاج نے بادشاہ کو یہ سمجھایا کہ "مادنا بھی ناقابلِ اعتماد ہے، اغلب یہ ہے کہ خلیل اللہ خاں کی

---

[1] منتخب اللباب جلد دوم ص ۳۰۵۔

[2] " خافی خاں " "

غداری میں یہ بھی شریک ہو، کیوں کہ خلیل اللہ خاں آخراسی کا آفریدہ ہے، ممکن ہے کہ یہ بھی کل کو مغلوں سے مل جائے۔" اس کا اثر یہ ہوا کہ وہ فوراً حیدر آباد سے اٹھ کھڑا ہوا اور جہاں تک ممکن تھا اپنے متعلقین اور ضروری زر وجواہر ہمراہ لے کر قلعے میں محصور ہو گیا۔ حالانکہ مادنّا نے یہ مشورہ دیا تھا کہ گولکنڈے کی بجائے ورنگل کے قلعے میں پناہ لینا مناسب ہے، مگر اس کا کوئی لحاظ نہیں ہوا۔ اول تو مادنّا سے بے اعتمادی پیدا ہوگئی، دوسرے مغلوں کی آمد اور خلیل اللہ خاں کی بے وفائی سے ایسی بدحواسی طاری ہوئی کہ اس کو ارباب سیاست سے مشورہ لینے کی بھی مہلت نہیں ملی۔ اس بدحواسی میں اس نے اپنی عزت وناموس کا پاس ولحاظ کیا نہ اہل شہر کی عزت، جان ومال کی حفاظت کی پروا کی[1] بلکہ وہ راتوں رات قلعے میں بھاگ گیا۔ بادشاہ کا اس طریقے سے شہر کو چھوڑ کر قلعے میں محصور ہونا اچھا نہیں تھا، شہر کو لیٹروں کے رحم وکرم پر چھوڑ دیا گیا، شہر کی حفاظت کا تمام انتظام ٹوٹ گیا اور لیٹروں کو جن میں مغل سپاہی بھی شامل ہو گئے تھے، دن دھاڑے تاخت وتاراج کرنے کا موقع مل گیا۔ ان لٹیروں نے شہر کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔ نہ صرف اہل شہر کے زر وجواہر لُٹ گئے بلکہ خود شاہی محلات تاراج ہو گئے۔ ہر طرف آتش زدگی ہونے لگی۔ یہ عجیب دل خراش منظر تھا کہ ہزارہا شرفاء اپنے بیوی بچوں کو لے کر انتہائی وحشت میں بھاگ رہے تھے تاکہ اپنی عزت وناموس کی حفاظت ہوسکے۔ عورتوں کو چادر اور برقعے اوڑھنے کی بھی مہلت نہیں ملی لیکن اس عزت وناموس کی حفاظت میں ہزاروں کی جانیں تلف ہوئیں اور بہت سے گرفتار ہو گئے اور ہزارہا شریف گھرانے آگ کی نذر ہو گئے۔ شرفاء کا تمام سامانِ تمدن راستوں پر بکھرا پڑا تھا اور چونکہ شرفاء کو اپنا سامان اٹھانے کے لیے اس وقت کوئی سواری

---

[1] خافی خاں، جلد دوم ص ۳۰۶۔

میسر نہیں آتی تھی۔ سب سامان وہیں چھوڑ دیا اور اپنے بیوی بچوں کا ہاتھ پکڑ کر قلعے کی طرف آنے لگے اس سامان میں زر وجواہر اور قیمتی کپڑے ہر قسم کی چیزیں تھیں تقریباً پانچ کروڑ روپے کی لوٹ ہوئی۔ بڑے قالینوں کا اٹھانا مشکل تھا اس لئے ان کے ٹکڑے کئے گئے۔ غرض مورخ خافی خاں کے الفاظ میں:۔ "عجیب ہنگامۂ قیامت رستخیز غریب برپا گردید"[1] غالباً شہر حیدر آباد پر ایسی مصیبت کبھی نازل نہیں ہوئی تھی۔ اس شہر کو آراستہ کرنے میں قطب شاہوں نے جس قدر محنت کی تھی وہ سب رائیگاں گئی۔ جب شہزادہ معظم کو اطلاع ہوئی تو اس نے تاخت وتاراج کا سد باب کرنے کی کوشش کی اور سپاہی متعین کئے لیکن اس وقت تک سب کچھ ہو چکا تھا، یہ کوشش وقت پر ہونی چاہئے تھی۔ جو مغل سپاہی آتش فتنہ فرد کرنے کے لئے مقرر کئے گئے تھے وہ بھی لوٹ میں شریک ہوگئے۔ بالآخر خان جہاں شہر کی حفاظت کے لئے مقرر ہوا ، لیکن اس کے باوجود جو لوٹ ہونی تھی وہ ہوتی رہی۔

یہ عجیب ہمت شکن ماحول تھا کہ شہر حیدر آباد کی اینٹ سے اینٹ بج رہی تھی اور ملک کے غدار ہر روز اپنی سلطنت سے منہ موڑ کر مغلوں سے مل رہے تھے محمد تقی اور محمد داؤد بھی مغلوں سے مل گئے! ان بے وفاؤں میں خود بادشاہ کا بہنوئی شریف الملک بھی تھا۔ آخر الذکر کو سہ ہزاری منصب تین سو سوار اور دوسروں کو دو ہزاری منصب اور دو سو سوار عطا ہوئے[2]۔ جب محمد ابراہیم شہنشاہ کی خدمت میں باریاب ہوا تو اس کو اکتالیس گھوڑے چند ہاتھی اور پانچ ہزار ہون انعام میں ملے اور چند روز کے بعد زین العابدین بھی جو بادشاہ کا عزیز تھا مغل ملازمت میں داخل ہوگیا[3]۔

---

[1] خافی خاں، جلد دوم ص ۳۰۶۔

[2] ماثر عالمگیری ص ۲۶۹۔

[3] " " ۲۰۲۔

ان حالات میں ابوالحسن کے لئے عاجزانہ درخواست کے سوا کوئی چارۂ کار نہ تھا۔ چنانچہ اس نے قلعے سے نہایت عاجزی اور انکسار کے ساتھ صُلح و رحم کی درخواست کی اور ہر شرط کے لئے رضامندی ظاہر کی۔ شہزادہ معظم پہلے سے صُلح و آشتی کی طرف مائل تھا اور اس وقت وہ حیدرآباد کی تباہی سے ایسا متاثر ہوا کہ فوراً صُلح کے لئے آمادگی ظاہر کی اور شہنشاہ کے ہاں سفارش کرنے کا وعدہ کیا۔ صُلح کے لئے چار شرطیں طے ہوئیں۔ (۱) پچھلے بقائے کی ادائی میں قطب شاہی سلطنت ایک کروڑ بیس لاکھ روپے (۲) اور ہر سال دو لاکھ ہون خراج ادا کرے (۳) نیز اکنا و مادنا جن سے مغلوں کو سخت شکایت تھی حکومت سے بے دخل کرے (۴) اور ملکھیڑ و سیڑم جن کی مغل سلطنت پہلے سے دعویدار تھی قابضوں کے حوالے کردے۔ شہزادہ معظم نے ان شرائط کے ساتھ صُلح منظور کرلی اور میر ہاشم کی معرفت شہنشاہ کو اس کی اطلاع کردی اور منظوری کی درخواست کی۔ شہنشاہ اس صُلح سے بظاہر خوش ہوئے اور شہزادے اور اس کے رفقائے کار کے منصب میں اضافہ کردیا۔ شہزادہ معظم کے منصب میں دہ ہزاری کا اضافہ کیا گیا۔ مرزا محمد نعمت خان عالی نے اس فتح کی مسرت میں ذیل کا قطعہ لکھ کر شہنشاہ کی خدمت میں پیش کیا تھا اس سے تاریخ بھی اخذ ہوتی ہے۔ قطعہ:-

از نصرتِ بادشاہ غازی | گردید دل جہانیان شاد
آمد بہ قلم حساب تاریخ | شد فتح بجنگ حیدرآباد
۱۰۹۷ھ

شہزادہ معظم چند مہینے حیدرآباد میں ٹھیرا رہا کیوں کہ شرائط کی تکمیل ابھی باقی تھی چونکہ حیدرآباد کی وحشتناک حالت کی وجہ سے روپیہ جمع کرنا اور

لے محمد ساقی مآثر عالمگیری ص ۲۶۸۔

شرائط کے مطابق بقایا اور خراج ادا کرنا بہت مشکل تھا اور مغل فوج کے ہوتے ہوئے یہ کام اور بھی دشوار تھا، اس لئے ابوالحسن قطب شاہ نے شہزادے سے یہ درخواست کی کہ وہ حیدر آباد سے باہر چلا جائے۔ چنانچہ اس درخواست پر شہزادہ کوہیر چلا گیا جو حیدر آباد کے شمال مغرب میں واقع ہے اور وہاں تکمیلِ شرائط کا انتظار کرنے لگا۔ روپیوں کی فراہمی تو کسی طریقے سے ممکن ہو گئی لیکن مادنا اور اکنا کی معزولی کا سوال ابھی باقی تھا۔ بادشاہ ان کی برطرفی کیلئے تیار نہیں تھے، لیکن مشکل یہ تھی کہ مغلوں کی مخالفت کے علاوہ خود گولکنڈے کے مسلمان اور محل کی خواتین اِن وزراء کی سخت دشمن تھیں، کیوں کہ یہ لوگ ان وزراء کو حیدر آباد کی تمام تباہی اور مسلمانوں کی خونریزی کا باعث سمجھتے تھے اور بیزار تھے۔[۱] چنانچہ ان وزراء کی معزولی کا بے چینی سے انتظار ہونے لگا۔ جب بادشاہ ان کو معزول کرنے میں پس و پیش کرنے لگے تو یہ لوگ بے قابو ہو گئے اور ان کو مارنے کا ارادہ کر لیا، چنانچہ ان کے قتل کی خفیہ سازش ہو گئی۔ اس سازش میں بہت سے اُمراء اور ذی اثر لوگ تھے اور محل کے اندر سرو ما اور جانی صاحبہ جو عبداللہ قطب شاہ کی ذی اثر حرم تھیں ساتھ ہو گئیں، اور شیخ منہاج جو ان ہندو وزراء پر پہلے خار کھایا ہوا تھا سب کا سرغنہ بنا۔ جب مادنا اور اکنارات کو بادشاہ کے پاس سے گھر واپس آرہے تھے گولکنڈے کی ایک شاہراہ میں جمشید اور دوسرے غلاموں نے دونوں وزراء پر حملہ کر کے ان کو قتل کر دیا۔[۲] ان کے ساتھ جو محافظ دستہ تھا وہ رشوت کے ذریعے پہلے سے

---

[۱] "نظر بریں تمام خرابی حیدر آباد و لشکر کشی، مسلمان کُشی از نحوست ہر دو برادر دجال سیرت بد سرشت است تنگ آمدہ بودند" (خافی خاں، جلد دوم ص ۳۰۸) لیکن سازش کرنے والوں میں غالباً ایسے لوگ زیادہ تھے جن کو مادنا نے برطرف کیا تھا۔

[۲] مادنا اور اکنا کے قتل کی صحیح تاریخ غرہ جمادی الاول ۱۰۹۷ھ م ۶ ۲ مارچ ۱۶۸۶ء ہے۔

(باقی بر صفحہ ۲۹۱)

فراہم کر لیا گیا تھا اس وقت اتفاق سے رستم راؤ گھر میں تھا سازشیوں نے گھر میں گھس کر اس کا کام تمام کر دیا۔ ان لوگوں کے تمام گھر لوٹ لئے گئے اور اس اشتعال میں دوسرے مندر اور برہمنوں کو بھی نقصان پہنچا، اگر حکومت اس وقت روک تھام نہ کرتی تو شاید بہت سے ہندوؤں کا خاتمہ ہو جاتا۔ محل کی بیگموں اور دوسرے اُمراء نے ان مقتول وزراء کے سر شاہ عالم شہزادہ معظم کے پاس بھیج دیئے اور شہزادے نے یہ سر بہادر علی خاں کے ہمراہ شہنشاہ کے پاس بھیجنے کا انتظام کیا اور خود ابوالحسن کو آخر وقت تک اس کی اطلاع نہیں ہوئی۔ گو شہنشاہ دل سے خوش تو نہیں تھے لیکن اتنا اطمینان تو تھا کہ اب گولکنڈے میں مغل مفاد کی کوئی مخالفت نہ ہوگی۔ غالباً اسی وجہ سے شاہ عالم کو اپنے پاس شولاپور بلا لیا اور

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۹۰) ولندیزی سیاح ہیورٹ کا بیان ہے کہ یہ دونوں وزراء سڑک پر گھسیٹے گئے، مادنا کا سر کاٹ کر شہنشاہ اورنگ زیب کے پاس بھیجا گیا۔ برخلاف اس کے اکنا کا سر ہاتھی کے پیر کے نیچے کچلا گیا (تاریخ اورنگ زیب جادو ناتھ سرکار)۔ فرائر کہتا ہے کہ ان کے قتل سے ملک میں کوئی شورش نہیں ہوئی اور کسی نے انتقام لینے کی کوشش نہیں کی، اس سے ان کی غیر ہر دل عزیزی معلوم ہوتی ہے۔

لہ محمد ساقی کہتا ہے کہ: "سر مادنا برہمن فتنہ زا ابوالحسن بوانمود اطاعت و انقیاد بریدہ نزد شاہ عالم فرستاد" (مآثر عالمگیری ص ۲۷۲)۔ منوچی کہتا ہے کہ جب شاہ عالم نے حیدر آباد پر قبضہ کر لیا تو ابوالحسن نے صلح کی درخواست کی۔ شاہ عالم نے اپنے باپ کے پاس سفارش کی کہ صلح کر لینی چاہیئے کیوں کہ پہلے تو قلعے کی تسخیر میں بہت دیر لگے گی اور پھر جو کچھ قصور ہیں وہ ہندو وزراء کے ہیں ابوالحسن پر کوئی ذمہ داری نہیں ہے، اور میں اس بات کا ذمہ لیتا ہوں کہ ابوالحسن شہنشاہ کے حسب خواہش شرائط کی تکمیل کر دے گا۔ اس کے جواب میں شہنشاہ نے (باقی بر صفحہ ۲۹۲)

قطب شاہی علاقوں سے تمام فوجیں ہٹالیں۔ شہزادہ معہ فوج کے ۷، رجون ۱۶۸۶ء کو شولاپور پہنچ گیا۔ اس کے پانچ روز کے بعد قطب شاہی حاجب شہنشاہ کی خدمت میں باریاب ہوا اور سو ہاتھی نذرانے کے طور پر پیش کئے۔

ان دلخراش واقعات کی ذمہ داری خود بادشاہ پر بھی عائد ہوتی ہے۔ جس بادشاہ کی بیدار مغزی اس درجے کی ہو کہ وہ تمام دکن کی رفتارِ سیاست پر نظر رکھتا تھا اور اپنی سلطنت کے ساتھ عادل شاہی سلطنت کے بچاؤ کی تدبیریں کرتا تھا خود اپنے گھر کے حالات سے اس کی بے خبری حیرت سے خالی نہیں ہے۔ یہ بات باور کرنا مشکل ہے کہ تانا شاہ اس غیظ وغضب سے بالکل بے خبر تھا جو مادنّا اور اس کے خاندان کے خلاف مُلک اور پائے تخت میں پایا جا رہا تھا، یہاں تک کہ خود شاہی محل کی عورتیں بھی ان کی دشمن تھیں۔ اس کے علاوہ شیخ منہاج نے بادشاہ کو مادنّا کے رویئے سے متعلق واقف کرادیا تھا، اس کی بے خبری تو کسی طرح صحیح نہیں ہو سکتی۔ اب یہ کہنا کہ اس نے جان بوجھ کر اس طرف سے آنکھیں بند کرلی تھیں اور بھی زیادہ اتہام کا

(بقیہ حاشیہ صفحۂ ۲۹۱) اپنے بیٹے کو لکھا کہ ایک بڑی رقم، جواہر، ہاتھی اور آلاتِ حرب چاہتا ہوں اور یہ وعدہ لیا جائے کہ بیجاپور کی کوئی مدد نہیں کی جائے گی۔ جواب وصول ہونے پر شاہ عالم نے ابوالحسن سے جو اب تک قلعے میں محصور تھا گفت و شنید کی۔ وہ ان شرائط کے لئے تیار ہو گیا، اور پہلا کام یہ کیا کہ اکنّا اور مادنّا کے سر کاٹ کر قلعے کی فصیل کے نیچے پھینک دیئے (منوچی جلد دوم ص ۲۹۳-۲۹۴) لیکن محمد ساقی اور منوچی کا یہ بیان صحیح نہیں ہے۔ ان کو قتل کرنا تو کجا ابوالحسن ان کو حکومت سے بے دخل کرنا بھی نہیں چاہتا تھا۔ خافی خاں کے بیان کے مطابق بادشاہ کو اس کی مطلق اطلاع نہ تھی (خافی خاں جلد دوم ص ۳۰۸) اکنّا اور مادنّا کے سر یکم جمادی الاول ۱۰۹۷ھ مطابق ۲۶ مارچ ۱۶۸۶ء کو شہنشاہ کے پاس بھیجے گئے۔

باعث ہوتا ہے۔ ایسا ہوتا ہے کہ ایک طرف بادشاہ مادنّا اور اس کے خاندان کا زیربارِ احسان تھا کیوں کہ اسی خاندان نے اس کو سید مظفر کے چنگل سے چھڑایا تھا اور اس کے علاوہ اس نازک وقت میں جب کہ مغلوں کے سیلاب سے گولکنڈے پر سیاہ بادل منڈلا رہے تھے مادنّا کے خلاف تادیبی کاروائی مصلحت کے خلاف تھی۔

اکیسواں باب

گولکنڈے کا محاصرہ اور اس کا خاتمہ

یہ بے بنیاد صُلح نامہ جو شہزادہ معظم سے طے ہوا تھا مغلوں کی تاریخ کا ایک تاریک باب ہے۔ اس کی بنیاد اخلاقی نہ تھی بلکہ اس سے قطب شاہی سلطنت کو صریح دھوکا دینا مقصود تھا۔ مغل سلطنت نے اس سے بے حد فائدے حاصل کرلئے یعنے اپنی من مانی شرطیں منوالیں اور مطالبات پورے کروالئے۔ بقایا پیش کش اور تاوانِ جنگ وصول کیا۔ ملکھیڑ اور سیڑم کے شاداب پر گنے جن کی مغل سلطنت زمانے سے دعویدار تھی چھین لئے اور اس کے علاوہ سلطنت کے ہندو وزراء اکنا و مادنا کا جن سے مغلوں کو بہت ڈر تھا ہمیشہ کے لئے خاتمہ ہوگیا۔ اور ظاہر ہے کہ ان ہندو وزراء کے مرنے سے اب قطب شاہی سلطنت میں کوئی چیز مغل مفاد کے سدِّ راہ نہ تھی۔ ان واقعات سے شہنشاہ کو اس قدر اطمینان تھا کہ اس نے تمام مغل فوجیں جو گولکنڈے پر حملہ کرنے کے لئے روانہ کی گئی تھیں واپس بلالیں۔ اس کے علاوہ ایک بہت بڑا فائدہ یہ بھی تھا کہ گولکنڈے سے اطمینان حاصل کر کے مغل حکومت نے بیجاپور کے خلاف اپنی تمام طاقت لگادی ورنہ گولکنڈے کی وجہ سے فوجی طاقت اس قدر منتشر تھی کہ اس کے ہوتے ہوئے بیجاپور کی تسخیر بہت مشکل ہو رہی تھی لیکن

ان فائدوں کے باوجود مغل سلطنت نے اس معاہدے کا کوئی پاس نہیں کیا بلکہ چند روز کے بعد ہی جب کہ وہ بیجاپور کی مہم سے فارغ ہوگئی تو اس معاہدے کے پرخچے اڑا دیئے۔ معاہدے کی خلاف ورزی سے قطب شاہی سلطنت کو بہت نقصان پہنچا، کیوں کہ وہ مغلوں کے دلی ارادے سے بالکل واقف نہ تھی اور آخر وقت تک یہ سمجھتی تھی کہ معاہدہ ایک اخلاقی بنیاد پر مبنی ہے جس طرح قطب شاہی حکومت کی جانب سے اس کی پابندی ہو رہی تھی اسی طرح مغلوں سے بھی پابندی کی جائز توقع تھی، اور غالباً اس معاہدے کو زیادہ خوشگوار و مستقل بنانے کے لئے محل کی بیگموں نے جو اکنّا و مادنّا کے قتل کی ذمہ دار تھیں ان ہندو وزراء کے سر شہنشاہ کے پاس بھیجے تھے تاکہ یہ خوش ہوں اور پھر گولکنڈے پر حملہ نہ کریں۔

واقعہ یہ ہے کہ شہنشاہ اس معاہدے کے لئے دل سے تیار نہ تھے، اس کو رسمی طور پر منظور تو کر لیا جو نظم و نسق کا اقتضا تھا لیکن دل سے خوش نہیں ہوئے بلکہ در پردہ شہزادہ معظم اور بہادر خاں کی ملامت کی کہ انھوں نے کیوں یہ معاہدہ منظور کر لیا[۱]۔ کیوں کہ اس مہم سے شہنشاہ کی اصل غایت گولکنڈے کی تسخیر تھی جو پوری نہیں ہوئی۔ لیکن اس معاہدے سے شہنشاہ کو بیجاپور کی فتح تک سانس لینے کا موقع مل گیا اور اس وجہ سے اس نے چند روز جب کہ بیجاپور کا محاصرہ جاری تھا سکوت اختیار کیا اور قطب شاہی سلطنت کو دھوکے میں رکھا۔ پہلے تو سعادت خاں کو حاجب کی خدمت پر مامور کرکے گولکنڈہ بھیج دیا تاکہ معاہدے کے مطابق تاوان اور پیش کش وصول کرے اور اس کے بعد سعادت خاں کے بھائی مرزا محمد کو جو نعمت خانِ عالی کے خطاب سے مشہور ہے اس غرض کے لئے علیحدہ بھیجا کہ وہ بہ ظاہر ابو الحسن سے ذوالماس مرصع خوش قطع

---

[۱] منتخب اللباب جلد دوم ص ۳۱۳۔

شفاف" بہ طور پیش کش وصول کرلے لیکن اس کو درپردہ یہ ہدایت کی گئی کہ ابوالحسن کے ساتھ سخت کلامی کرکے اس کو گستاخی اور لڑائی پر آمادہ کرے تاکہ: "برائے ما حجتے و دست آویزی بہ جہت تنبیہ و استیصالِ او باشد۔" لیکن شہنشاہ کا یہ حربہ بے کار ثابت ہوا۔ ابوالحسن نعمت خاں سے کم لائق نہ تھا، اس نے ہر اعتراض کا جواب دیا اور نعمت خاں کو ہار ماننی پڑی اور وہ ابوالحسن کا قائل ہوگیا۔[1]

۱۲ر ستمبر ۱۶۸۶ء میں بیجاپور فتح ہوا۔ اس فتح کے بعد مغل فوج گولکنڈے کی تسخیر کے لئے فارغ ہوگئی۔ چنانچہ شہنشاہ اورنگ زیب ۲۹ر محرم ۱۰۹۶ھ م ۵ر دسمبر ۱۶۸۶ء کو حیدرآباد کے ارادے سے روانہ ہوئے اور آہستہ سفر کرتے ہوئے پہلے گلبرگہ پہنچے اور وہاں درگاہ حضرت بندہ نواز صاحبؒ کی زیارت کی اور اس کے کئی روز کے بعد بیدر آئے اور حیدرآباد آنے سے پہلے سعادت خاں حاجب گولکنڈہ کو حکم ہوا کہ ابوالحسن سے زرِ پیش کش وصول کرے۔ فرمان میں تخویف کے ساتھ تسلی کے الفاظ بھی تھے۔[2] ظاہر ہے کہ پچھلے معاہدے کے مطابق بقایا وصول طلب تھا لیکن اس وقت اس فرمان سے بقایا پیش کش وصول کرنے سے زیادہ ابوالحسن کو صریح دھوکا دینا مقصود تھا کہ گویا گولکنڈے سے کوئی پرخاش نہیں ہے اور وہ مقابلے کی تیاری نہ کرے اور اس کا اندازہ اس فرمان سے بھی ہوتا ہے جو سعادت خاں کے نام درپردہ آیا تھا اور اس کو راز میں شہنشاہ کی نقل و حرکت کی اطلاع کردی گئی اور وہ گولکنڈے کی حکومت صریح دھوکے میں تھی۔ اس نے صلح کی امید میں پیش کش بھیجنے کا انتظام کرلیا۔ چونکہ ابوالحسن کے پاس نقد روپیہ نہیں تھا اس لئے

---

[1] منتخب اللباب جلد دوم ص ۲۹۴ و ۲۹۵۔

[2] خافی خاں جلد دوم ص ۳۲۳۔

اس نے زر و جواہر سے اس کی فوری پابجائی کی۔ یعنے اس نے زر و جواہر سے بھرے ہوئے نو خوانچے سعادت خاں کے پاس بھیجے تاکہ یہ نقد روپیہ وصول ہونے تک بہ طور امانت رکھے جائیں۔ گو ان کی قیمت کا تعین بھی نہیں ہوا تھا، لیکن تخمینہ یہ ہے کہ یہ زر و جواہر وصول طلب نقد سے کہیں زیادہ ہوں گے۔ ابو الحسن کو اس انتظام سے اس قدر اطمینان تھا کہ وہ مدافعت کی باضابطہ تیاری بھی نہ کر سکا۔ اس کے علاوہ ہزار ہا روپے کے زر و جواہر چپکے سے دشمن کے ہاتھ چلے گئے جو آڑے وقت خود گولکنڈے میں کام آتے۔ ظاہر ہے کہ اس ارسالِ پیش کش سے شہنشاہ کی نقل و حرکت میں کوئی فرق نہیں آیا بلکہ شہنشاہی جلوس گلبرگے کی طرف برابر بڑھ رہا تھا۔ یہ ایسی متوحش خبر تھی کہ اس سے قطب شاہی حکومت بہت پریشان ہوئی۔[له] کیوں کہ خوانچے شہنشاہ کے پاس جا چکے تھے یا سعادت خاں نے اپنے پاس چھپا رکھے تھے اور جب خود ابو الحسن نے واپس طلب کئے تو سعادت خاں نے کہا کہ یہ خوانچے شہنشاہ کے پاس بھیج دیئے گئے ہیں۔ لڑائی کی لڑائی ٹھیری اور زر و جواہر بھی واپس نہیں ملے۔[ٹه]

۲۴ ربیع اول ۱۰۹۸ھ (۲۸ جنوری ۱۶۸۷ء) میں شہنشاہ گولکنڈے سے دو منزل پر پہنچ گئے اور ابو الحسن قطب شاہ نے نہایت انکسار کے ساتھ صلح کرنی چاہی لیکن

له محمد ساقی کہتا ہے کہ ابو الحسن اس قدر پریشان ہوا کہ :-

"چون تصویر رو بہ دیوار ماند۔ لب از خندہ نومید۔ چشم از گریان سرشار۔ سر از ہوش خالی۔ زبان از گفتگو بے کار"

مآثر عالمگیری ص ۲۸۷۔

یہ الفاظ مبالغے پر مبنی ہیں۔ ابو الحسن ایسا مستقل مزاج بادشاہ تھا کہ وہ ایسے موقعوں پر متزلزل نہیں ہوا۔ ٹه مآثر عالمگیری ص ۲۸۸۔

شہنشاہ کی نظر میں اس کی اتنی بُرائیاں تھیں کہ اب صُلح ممکن نہیں تھی[1]۔ جب صُلح کی کوئی صورت نہ تھی تو ابوالحسن نے مدافعت کی تیاری کی۔ شرزہ خاں، شیخ منہاج اور مصطفےٰ خاں لاری کو جس کا اصل نام عبدالرزاق لاری تھا مغلوں کا مقابلہ کرنے کی ہدایت کی، لیکن ساتھ ہی یہ تاکید کی کہ اگر مغلوں کو شکست ہو جائے اور شہنشاہ گرفتار ہوں تو ان کو مارنا نہیں بلکہ نہایت احترام کے ساتھ لانا۔ ۱۰۹۸ھ/۱۶۸۷ء میں لڑائی شروع ہو گئی اور مغلوں نے ۲۴ ربیع الاول کو قلعے کا محاصرہ کر لیا جس میں بہت تیاری تھی۔ ۱۹۰۰ برق انداز ۴۰۰۰ احشام ۱۰۶ توپیں جمع کی گئی تھیں۔ منجملہ ان کے سترہ بڑی توپیں تھیں جو چار سیر سے لے کر چالیس سیر وزنی گولے پھینکتی تھیں۔ ۵۸۰۹ من بارود ۲۴۴ گولے اور خندق بھرنے کے لئے پونے چار لاکھ تھیلے موجود تھے۔ صف شکن خاں ایک ایرانی میر آتش۔ فیروز جنگ سپہ سالار اور شاہ عالم کمان دار مقرر ہوئے۔ فیروز جنگ کے باپ خواجہ عابد بھی فوجوں کی رہنمائی میں شریک تھے۔

---

[1] ابوالحسن کی درخواست صُلح پر حسب ذیل فرمان نافذ ہوا تھا:۔

"اگرچہ افعالِ قبیح آن بدعاقبت از احاطۂ تحریر بیرون است اما از صد یکے و از بسیار اندکے بشمار می آید اولاً اختیار مُلک و سلطنت بہ کف اقتدارِ کافر فاجر ظالم دادن و سادات و مشایخ و فضلا را منکوب و مغلوب او ساختن و در رواج فسق و فجور بہ افراط علانیہ کوشیدن و خود از بادہ پرستی بہ ریاست۔ و بدمستی دولت در انواع کبائر شب و روز مستغرق بودن بلکہ کفر از اسلام و ظلم از عدل و فسق از عبادت فرق نہ نمودن و در اطاعتِ کُفار حربی اصرار ورزیدن و خود را در عدم اطاعت اوامر و مناہی الٰہی خصوص در بارہ منع و معاونت دارالحربی کہ نصِ کلام مجید بہ تاکید واقع شدہ (باقی بر صفحۂ ۲۹۹)

۲۷ر ڈسمبر کو سخت خونریز لڑائی ہوئی اور مغلوں کے نامور سردار ابو المکارم سید عبد اللہ بارہہ زخمی ہوئے۔ کشور سنگھ اور کرشنا سنگھ جیسے راجپوت سردار کام آئے۔ قلعے سے شدید آتش باری ہوتی تھی۔ قلیچ خاں خواجہ عابد کا توپ کے گولے سے انتقال ہوگیا[ا] اور شاہ عالم نے پھر کوشش کی کہ ابو الحسن سے صلح ہوجائے اور اس سلسلے میں قلعے سے کچھ مراسلت بھی ہوئی۔ چونکہ شہنشاہ شاہ عالم سے ناراض تھے اور جب ان کو ابو الحسن کی مراسلت کا حال معلوم ہوا تو اور برافروختہ ہوئے اور شاہ عالم اور ان کی بیوی کو نظر بند کردیا[۲]

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۹۸) نزدِ خلق و خلائق مطعون ساختن چنانچہ مکرر درین باب فرامین نصیحت آمیز مصحوبِ مردم آداب دان مزاج گرفتہ حضور صادر شد و پنبۂ غفلت از گوش نہ کشید بلکہ درین تازگی فرستادن لک ہون برائے سنبھائے بدکردار بعرض رسید۔ بہ این ہمہ غرور و مستی بادۂ ناکامی نظر بر افعال و زشتی اعمال خود نہ نمودن و امیدِ رستگاری در ہر دو جہان داشتن زہے تصورِ باطل زہے خیالِ محال" (خافی خاں جلد دوم ص ۳۲۸)۔

[ا] محمد ساقی، عالمگیر نامہ ص ۲۸۹ و ۲۹۰، قلعہ گولکنڈے کے مغرب میں موجودہ حمایت ساگر کے پاس ان کا کیمپ تھا، وہیں ان کا انتقال ہوا اور وہیں دفن ہوئے۔ حمایت ساگر کے کٹے کے نیچے جانب مشرق ان کا مقبرہ ہے اور "قلیچ خاں کی بارہ دری" کہلاتی ہے۔

[۲] شاہ عالم اور ان کی بیوی شروع سے قطب شاہی سلطنت کے بہت ہمدرد تھے اس لئے شہنشاہ کو ہموار کرنے کے لئے ابو الحسن نے بھی ان سے کام لیا اور شاہ عالم نے ابو الحسن سے وعدہ بھی کرلیا تھا۔ لیکن اس طرزِ عمل سے شہنشاہ ناراض ہوئے۔

اس کے بعد فیروز جنگ پر ہی محاصرے کے پوری ذمہ داری پڑ گئی، کیوں کہ ان پر شہنشاہ کو پورا اعتماد تھا۔ اس کے برخلاف صف شکن خاں میر آتش اور روح اللہ خاں بخشی قابلِ اعتماد نہیں سمجھے جاتے تھے۔ جب محاصرہ شروع ہوا تو قلعے کے باہر بھی بہت بڑی فوج مغلوں کی مزاحمت کے لئے متعین تھی اور یہ کوئی چالیس ہزار بتائی جاتی ہے، یہ شیخ نظام اور مصطفےٰ خاں کی سرکردگی میں اس پھرتی سے حملہ کرتی تھی کہ مغلوں سے ان کی مدافعت بہت مشکل ہو جاتی تھی۔

اسی دار و گیر میں اکثر مغل فوجیں کام آئیں اور خافی خاں کے الفاظ میں کوئی دن ایسا نہ ہوتا تھا کہ "بندہائے کار طلب بادشاہی تلف نہ شدند"[لہ] اسی دوران میں فیروز جنگ نے قلعے پر ایک شبخون مارنے کی کوشش کی اور ۱۶ر مئی کو فصیل پر زینے لگا دیئے اور اوپر رسّے پھینک کر چڑھنے کی کوشش کی۔ اگرچہ پہرے والے تمام مستِ خواب تھے لیکن ان کی آہٹ سے ایک کُتا بھونکنے لگا اور اس کی آواز سے تمام چوکیدار جاگ گئے اور ان لوگوں نے رسّے کاٹ دیئے اور زینے پھینک دیئے اور حملہ آوروں کو ایسا دھکیل دیا کہ دو مغل فوراً مر گئے اور بعد کو بندوقوں کی زد سے بہت سے مغل سپاہیوں کا خاتمہ ہو گیا۔ فیروز جنگ کا یہ حملہ بُری طرح ناکام ہوا۔ ابوالحسن نے اس کُتے کی جس کے بھونکنے سے مغلوں کو شکست ہوئی تھی بڑی عزت کی۔ اس کے گلے میں سونے کی زنجیر باندھی اور اس کو "سہ طبقہ" خطاب دیا[سہ] مغلوں کی شکست سے فائدہ اُٹھا کر قلعے والوں نے ان کے توپخانے پر حملہ کیا اور بہت سے توپچیوں کا

لہ خافی خاں، جلد دوم ص ۳۴۲۔

سہ چونکہ فیروز جنگ کو "سہ طبقہ خطاب" یعنی "خان بہادر جنگ" حاصل تھا اس لئے تانا شاہ نے اس کے مقابلے میں کُتے کو بھی یہ خطاب دیا تھا (خافی خاں جلد دوم ص ۳۴۲) نعمت خانِ عالی، وقائع گولکنڈہ ص ۶۰۷۔

خاتمہ کر دیا۔

شعبان یعنے اواخر جون تک محاصرے کے پانچ مہینے ہو رہے تھے اور مغل فوج کو مختلف مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا تھا، کیوں کہ دو سال سے دکن میں بارش نہیں ہوئی تھی، دوسرے سنبھاجی نے گولکنڈے کی تائید میں ہر طرف کھیت جلا کر خاک کر دیئے تھے، اس کا نتیجہ یہ تھا کہ مغلوں کو غلہ ملنا بہت دشوار ہو گیا اور جب رجب کے مہینے میں بارش شروع ہو گئی تو آمد و رفت اور غلے کی فراہمی بہت دشوار ہو گئی۔ اس کے علاوہ مسلسل بارش کی وجہ سے توپوں کے دمدمے اور مورچے سب تباہ ہو گئے اور محاصرین کا بہت نقصان ہوا۔ اس سے قلعے والوں کو بہت موقع ملا، انھوں نے ۱۵ جون کو مغلوں کے مورچوں اور توپخانوں پر اس قدر زور سے حملہ کیا کہ مغل پریشان ہو گئے۔ توپوں کے سوراخوں میں کیلے ٹھونس دیئے، تمام بارود چرالی اور پھر مغل افسروں پر دھاوا بول دیا۔ سلیم خاں اور صف شکن خاں نے گڑھوں میں منہ چھپا لیا۔ جمشید خاں پہلے سے بھاگ گیا تھا۔ عزیز خاں اپنے کو چھپانے کے لئے منہ پر کیچڑ لگا کر ایک گلی میں روپوش ہو گیا تھا کہ یہ اور سربراہ خاں دونوں گرفتار ہو گئے اور قلعے میں پہنچا دیئے گئے۔ گو قلعے میں قطب شاہ نے ان کے ساتھ اچھا برتاؤ کیا تھا، اس کے باوجود شہنشاہ گولکنڈے کی تسخیر پر تلے ہوئے تھے۔ حالانکہ اکثر صداقت پسندوں کی رائے اس کے خلاف تھی۔ چنانچہ جب قاضی شیخ الاسلام سے مہم بیجاپور اور گولکنڈے کے متعلق استفسار کیا گیا تو اس نے نہایت جرأت کے ساتھ یہ رائے دی تھی کہ:۔ "شہنشاہ کے لئے ان اسلامی سلطنتوں پر حملہ کرنا جائز نہیں ہے"۔ اس پر شہنشاہ بہت خفا ہوئے اور وہ اپنی خدمت سے مستعفی ہو کر حجاز چلا گیا۔

قاضی عبد اللہ جو اس کی جگہ مامور ہوا تھا اس نے بھی یہی رائے دی کہ "ابوالحسن مسلمان ہے، اس کے خلاف دار و گیر جائز نہیں"۔ یہ قاضی بھی

بہت معتوب ہوا، اور اس پر دربار کی آمد و رفت موقوف ہو گئی۔[۱]

محاصرے میں جب کہ پانچ مہینے ہو گئے تھے ابوالحسن نے پھر ایک مرتبہ معافی درخواست کی وہ یہ تھی کہ:-

"جب قلعہ آپ کے تصرف میں آجائے تو اس ملک کا انتظام کسی اور امیر کو سپرد کرنے کی بجائے مجھے سپرد کیا جائے کیوں کہ یہ ملک بہت پامال ہو گیا ہے اور اس کی فلاح و بہبود کے لئے بہت کچھ محنت درکار ہے اور اس کام سے مجھے جو ہمدردی ہو سکتی ہے وہ دوسروں کو نہیں ہو سکتی اور اس کے معاوضے میں کثیر رقم ادا کر دوں گا۔ یعنے جب آپ اس سرزمین میں تشریف لائیں گے تو ہر منزل پر ایک کروڑ روپئے ادا کروں گا اور اس وقت قلعے پر جتنی یورشیں ہوئی ہیں ان کے مطابق ایک کروڑ روپے بطریق نثار ادا کروں گا۔ اور یہ سب کچھ اس وجہ سے کہ مسلمانوں کا ناحق خون ہو رہا ہے اور یہ مال و عیال سے محروم ہو رہے ہیں"[۲]

یہ درخواست منظور ہونا تو کجا بہ قول خافی خاں:-

"در جواب کلمات ناصواب ولغو فرمودند کہ اگر ابوالحسن از فرمودۂ حکم ما بیرون نیست، باید کہ دست بستہ حاضر شود یا سر دگردن او بستہ حاضر سازند"[۳]

کیوں کہ اب شہنشاہ کو یہ فکر آپڑی تھی کہ کہیں مغل سلطنت کا وقار غائب نہ ہو جائے اس لئے وہ کسی طرح گولکنڈے کو مسخر کر ہی لینا چاہتے تھے۔

۱؎ خافی خاں، جلد دوم ص ۳۴۳۔ نعمت خان عالی، وقائع گولکنڈہ ص ۱۲۔

۲؎ ،، ،، ،، ص ۳۴۹ و ۳۵۰۔

۳؎ ،، ،، ،، ص ۳۴۹ و ۳۵۰۔

اس کے بعد محاصرہ سخت کر دیا گیا اور قلعے کے ارد گرد مورچے باندھ کر توپوں کے ذریعے یورش ہونے لگی اور فصیل میں کئی مرتبہ نقب لگا کر بارود کے ذریعے اُڑانے کی کوشش کی گئی، لیکن اہلِ قلعہ کی باخبری اور عبدالرزاق لاری کی رہنمائی سے مغلوں کو سخت پسپائی ہوتی تھی، چنانچہ ۲۰ جون کو سُرنگیں اُڑانے کا جو اہتمام کیا گیا تو اس کا یہ حشر ہوا کہ جن فصیلوں میں نقب لگا کر بارود بھر دی گئی تھی قلعے والوں نے بہت سی بارود خارج کر دی اور کچھ بارود کا رُخ مغل فوج کی طرف پھیر دیا اور اس کا نتیجہ یہ تھا کہ جب سُرنگ اُڑی تو قلعے کی فصیل کو تو کوئی دھکا نہیں لگا بلکہ بارود کے دھماکے اور پتھروں کے اڑنے سے اُلٹے مغلوں کے گیارہ سو آدمی ہلاک ہو گئے اور جو باقی رہ گئے تھے ان میں "وادیلائے کشتہ شدن و زخمی گردیدن و دست و پا باختن" بلند ہونے لگا۔ اس سے قطب شاہی فوج کو اور موقع ملا اور اس فوج نے قلعے سے یورش کی اور بہتیرے مغل سپاہیوں کو تہ تیغ کیا۔ جن خندقوں پر مغل قابض ہو گئے تھے ان کو دوبارہ حاصل کر لیا۔ اس کے بعد مغلوں نے دوسری مرتبہ سُرنگ اُڑائی تو اس کا بھی وہی حشر ہوا جو پہلے ہوا تھا۔ یعنے ایک ہزار مغل مارے گئے اور اس سے مغل کیمپ میں اس قدر مایوسی چھا گئی کہ تمام مغل سپاہی گولکنڈے سے بھاگنا چاہتے تھے اور آرزومند تھے کہ کسی طرح محاصرہ اُٹھا لیا جائے[1]۔ اپنے سپاہیوں کی ہمت بڑھانے کے لئے خود شہنشاہ فصیل کے قریب آتے اور محاصرے میں حصہ لیتے تھے۔ اس کے باوجود قلعہ کشائی ناممکن تھی۔ کئی مغل افسر مر گئے اور غازی الدین خاں فیروز جنگ جو اس تمام محاصرے کی روحِ رواں تھے اور ان کے ساتھ رستم خاں و دلپت رائے بندیلہ بری طرح زخمی ہوئے اور اہلِ قلعہ کا یہ حال تھا کہ

---

[1] خافی خاں، جلد دوم ص ۳۵۲۔

اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہیں ہوتے تھے۔ نہ صرف حملہ کرتے بلکہ مغلوں کی توپوں کو اس پھرتی سے قلعے کے اندر لے جاتے تھے کہ مغل حیران رہ جاتے تھے اور قلعے سے بان اور بندوقوں کی اس قدر بارش ہوتی تھی کہ ایک انچ آگے بڑھنا ناممکن تھا[1]۔ غالباً محصورین کی مستعدی کا اصل باعث خود ابوالحسن قطب شاہ تھا جس نے آخری دم تک ہمت نہیں ہاری اور خافی خاں کے الفاظ ہیں :- "ابوالحسن سنگ دل دل از حصارِ گولکنڈہ بر نمی کند[2]"۔ یہ ابوالحسن کی مستعدی تھی کہ بعض بے وفاؤں کے سوا عام اہلِ قلعہ آخری دم تک لڑتے رہے۔ اسی دورانِ جنگ میں گھٹا ٹوپ بادل چھا گئے اور موسلا دھار بارش ہونے لگی۔ گولکنڈے کی فوجیں تو محفوظ تھیں۔ برخلاف اس کے مغل فوج کے لئے کوئی سایہ نہ تھا اور ان کو راستہ ملنا مشکل ہو گیا اور ہر طرف اتنا پانی بھر گیا کہ توپ خانے بہہ گئے۔ نالے اس قدر بھرپور چل رہے تھے کہ عبور و مرور دشوار تھا۔ اس سے فائدہ اٹھا کر قطب شاہی فوجیں حملہ کرتی تھیں اور توپیں قلعے میں لے جاتی تھیں۔ مغلوں کی مزاحمت ہر وقت بے کار ہوتی تھی۔ اسد خاں وزیر اعظم اور شہزادہ کام بخش نے مزاحمت کی بہتیری کوشش کی لیکن ان کی ایک بھی نہیں چلی۔ ۲۱ر جون کو ایک اور سُرنگ اُڑانے کی بے سود کوشش کی گئی۔ وہ اس وجہ سے نہیں اُڑی کہ اہلِ قلعہ نے تمام بارود نکال لی تھی۔ مغل سپاہی ناکام واپس آ گئے اور شہنشاہ بھی جو اس دوران میں محاصرے کو پُر زور بنانے کے لئے فیروز جنگ کے خیمے میں آ گئے تھے چپ چاپ اپنے خیمے میں واپس ہو گئے[3]۔

---

[1] خافی خاں، جلد دوم ص ۳۵۴۔

[2] ماثر عالمگیری ص ۲۹۵۔

[3] ساقی، ماثر عالمگیری ص ۲۹۵۔

اگرچہ ۱۰ر جولائی کو شہزادہ اعظم اور روح اللہ خاں کی سرکردگی میں نئی فوجیں آگئیں اور گولکنڈے کا مشہور جنرل شیخ منہاج مغلوں سے مل گیا لیکن اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوا، کیوں کہ قحط اور وبا سے علیحدہ جان عذاب میں تھی جنگ کے علاوہ آسمانی مصیبتوں سے لوگ علیحدہ مر رہے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ ندی نالے سب مردوں سے پٹے ہوئے تھے، ہر طرف سے لاشوں کے پشتے نظر آتے تھے اور ان کو ندی نالوں میں بہا دیا جاتا تھا اور یہ بھیانک منظر ہر روز دکھائی دیتا تھا۔ اکثر مغل سپاہی جو ان مصیبتوں سے بیزار ہو گئے تھے قطب شاہی حکومت سے مل رہے تھے۔[۱] شہنشاہ نے آخری کوشش یہ کی کہ قلعے کے اردگرد لکڑی اور مٹی کی ایک دیوار بنائی اور نئے مورچے کھڑے کئے اور شہزادہ اعظم آیا تو اس کو سپہ سالار بنا دیا، کیوں کہ فیروز جنگ بہت زخمی ہو گئے تھے[۲] لیکن اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ اس مایوسی میں بالآخر اس بات پر غور ہوا کہ قلعے کو اپنی حالت پر چھوڑ دینا چاہئے۔ ابوالحسن چند روز اور "پردہ نشین" رہے، باقی تمام سلطنت پر قبضہ کر لینا چاہئے۔ چنانچہ حیدرآباد کا نام "دارالجہاد" رکھا گیا اور تمام سلطنت میں شہنشاہ کے نام کا خطبہ پڑھا گیا۔[۳]

اگر یہی صورتِ حال رہتی تو ظاہر ہے کہ قلعے کی تسخیر ہمیشہ کے لئے ناممکن ہو جاتی کیوں کہ اب مغلوں کے پاس یہی ایک صورت باقی تھی کہ یہ چپ چاپ مہینوں تک محاصرہ کئے ہوئے پڑے رہتے اور اہلِ قلعہ کو رسد کی قلت کی وجہ سے ہتھیار ڈالنے پر مجبور کرتے، مگر مغلوں کے لئے اول تو مہینوں تک محاصرہ کئے ہوئے پڑے رہنا ناممکن تھا، دوسرے اہلِ قلعہ بھی خاموش نہیں تھے بلکہ

---

[۱] مآثر عالمگیری ص ۲۹۵۔ خافی خاں جلد دوم ص ۳۴۷۔

[۲] ساقی عالمگیری ص ۲۹۹۔ خافی خاں جلد سوم ص ۳۵۸۔

[۳] خافی خاں، جلد دوم ص ۳۵۸۔ نعمت خانِ عالی، وقائع گولکنڈہ ص ۹۳ و ۶۸۔

دشمن کو تھکانے اور بیزار کرنے کے لئے وہ سب کچھ کرتے تھے اور ان کامیاب یورشوں کے مقابلے میں بالآخر مغلوں کو محاصرہ اٹھا دینا ضروری ہوتا، لیکن اس اثنا میں اچانک قلعے میں غداری ہوگئی اور ایک لمحہ میں مدافعت کے پرخچے اُڑ گئے۔ شروع سے ہی جب کہ محمد ابراہیم سپہ سالار مغلوں سے مل گیا تھا اکثر بے وفا قلعہ چھوڑ کر مغل ملازمت اختیار کر رہے تھے چنانچہ اس منزل پر متعدد اہلِ قلعہ روگرداں ہو گئے اور مغل ملازمت اختیار کرلی، اب قلعے میں مصطفےٰ خاں لاری اور عبداللہ خاں پنّی دو جنرل باقی رہ گئے تھے جن پر قلعے کی مدافعت کا دارومدار تھا اور اواخر شوال تک جب کہ محاصرے کو آٹھ مہینے ہو رہے تھے یہ لوگ پوری وفاداری کے ساتھ مدافعت کر رہے تھے لیکن اس عین وقت میں جب کہ مغل مایوس ہو گئے تھے عبداللہ خاں پنّی نے بھی غداری کی اور مغلوں سے ایک شرمناک ساز باز کر کے مغل فوج کے سامنے قلعے کا دروازہ کھولنے تیار ہو گیا۔ یہ بے وفائی کی آخری کڑی تھی اور اس شرمناک حرکت سے قطب شاہی سلطنت کا ہمیشہ کے لئے چراغ گل ہو گیا۔ اگر یہ غداری سرزد نہ ہوتی تو قلعہ کبھی فتح نہ ہوتا، کیونکہ قلعے میں مصطفےٰ خاں جیسے وفادار لوگ ابھی موجود تھے اور مدافعت کا خاطر خواہ سامان تھا۔ اگر عبداللہ خاں قلعہ چھوڑ کر مغلوں سے مل جاتا تو اس سے قلعے کو نقصان نہ پہنچتا۔ مشکل یہ ہوئی کہ اس شخص نے قلعے کے اندر رہ کر دشمن کے روبرو دروازہ کھول دیا۔ چنانچہ ۲۴ ذیقعدہ کو مغل فوج کھڑکی سے رات کو قلعے کے اندر داخل ہو گئی اس کے بعد مدافعت کی تمام تدبیریں خاک میں مل گئیں۔[1]

عبداللہ خاں کے اشارے پر ۲۴ ذیقعدہ ۱۰۹۸ھ م ۲۱ ستمبر ۱۶۸۷ء کو شب کے تین بجے مغل فوج دروازے میں جو کھلا رکھا گیا تھا داخل ہو گئی۔

---

[1] خافی خاں، جلد دوم ص ۳۶۱۔

اورنگ زیب کے مشہور سپہ سالار روح اللہ خاں ۔ مختار خاں ۔ رستم خاں ۔ صف شکن خاں اور جاں نثار خاں اندر گئے اور محل کی طرف بڑھنے لگے ۔ شہزادہ اعظم ہاتھی پر سوار باہر کھڑا ہوا تھا ، ان لوگوں کے اندر آتے ہی قلعہ فتح ہونے کا شور ہوا اور باہر فتح کے شادیانے بجنے لگے ۔ یہ خبر پاتے ہی عبد الرزاق لاری جس کا مصطفٰے خاں خطاب تھا فوراً مدافعت کے لئے کھڑا ہو گیا[1] ۔ اگرچہ اس بدحواسی میں مسلح ہونے کا کہاں موقع تھا لیکن اس تھوڑے سے وقت میں جس قدر اس سے ہو سکا ہاتھ میں تلوار اور سپر لئے ہوئے گھوڑے پر سوار ہو گیا اور بارہ آدمیوں کے ساتھ مدافعت کے لئے آ گیا ۔ اگرچہ اس سیلاب کو ڈھکیلنا عبد الرزاق اور اس کے بارہ ساتھیوں کے بس کی بات نہ تھی ، نیز اس کے بارہ ساتھی بھی اس دار و گیر میں ایسے منتشر ہو گئے کہ ان کا پتا نہیں چلا لیکن اس نے کبھی ہمت نہیں ہاری بلکہ مردانہ وار دشمن پر جا گرا ، حالانکہ خافی خاں کے الفاظ میں اس کی حالت "مانند قطرہ یہ دریا افتد یا ذرہ کہ با خورشید ہمسری نماید" کی سی تھی ۔ اس پر بیسیوں تلواروں کے وار پڑ رہے تھے لیکن وہ ایک دیوانے کی طرح ہاتھ پیر مار رہا تھا اور چیخ رہا تھا کہ "تا جان دارم نثار راہ ابو الحسن خواہم نمود"[2] ہزار ہا آدمیوں سے تنہا مقابلہ کرتا رہا ، چنانچہ اس دار و گیر میں اس کے بدن پر اتنے زخم لگے تھے کہ ان کی گنتی نہ تھی ، صرف چہرے پر بارہ زخم آئے تھے اور غشی کی حالت طاری ہونے لگی تھی ، بالآخر یہ حالت ہو گئی کہ گھوڑے کی باگ ہاتھ سے چھوٹ گئی ، گو وہ گھوڑے پر سوار تو تھا لیکن گھوڑے کے اختیار میں تھا ، اور خود گھوڑا جو زخموں سے کانپ رہا تھا

---

[1] خافی خاں ، جلد دوم ص ۳۶۱ ۔

[2] 〃 〃 〃 ۳۶۲ ۔

سوار کو آہستہ آہستہ نگینہ باغ میں لایا اور ایک بڑے اپنے ناریل کے درخت کے قریب کھڑا ہو گیا، چنانچہ عبدالرزاق اسی درخت کا سہارا لے کر زمین پر گر پڑا تاکہ زمین پر کچھ آرام لے۔ اس کے ہمدرد اس کی تلاش کرتے رہے لیکن پتہ نہیں چلا۔ دوسری صبح کو حسینی بیگ کے آدمی اتفاق سے وہاں پہنچ گئے عبدالرزاق اور گھوڑے کی بعض علامتوں سے اس کو پہچان گئے اور اس کو اپنے گھر پہنچایا اور اس کے عزیز و اقارب نے اس کی مرہم پٹی کی۔[1]

مغلوں کا قلعے میں اچانک داخل ہونا بالکل خلافِ توقع تھا۔ اس خبر سے تمام قلعے میں ایک ہلڑ مچ گئی اور ہر شخص ایک اضطراب میں نظر آرہا تھا، کیوں کہ یہ قطب شاہی سلطنت کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ تھا، اس پرانی سلطنت کے ہمدرد یہ سمجھتے تھے کہ قطب شاہی سلطنت کے دن پھر نہیں پلٹ سکتے ہیں لیکن اس عالمِ اضطراب میں ابوالحسن قطب شاہ سے جو غیر معمولی خاطر جمعی اور استقلال کے جذبات ظاہر ہوئے وہ قطب شاہی تاریخ کے بہت دلچسپ اور سبق آموز واقعے تھے، کسی اور تاریخ میں ایسی مثال نہیں ملتی۔ چونکہ تین بجے شب کو مغل فوج قلعے میں داخل ہو گئی تھی ظاہر ہے کہ اس وقت بادشاہ سو رہے تھے۔ جب ان کو قلعہ فتح ہونے کی خبر ملی تو یہ اٹھے اور پہلے اندر جا کر محل والوں کو دلاسا دیا کہ وہ پریشان نہ ہوں اور سب سے رخصت چاہی اور پھر پورے اطمینانِ قلب کے ساتھ وہ اپنے شاہانہ لباس میں دیوانِ خاص میں آئے اور حسبِ عادت اپنی مسند پر بیٹھ گئے اور ان ناخواندہ مہمانوں کا انتظار کرنے لگے جو ان کو گرفتار کرنے کے لئے آرہے تھے اور آخر وقت تک اپنی بادشاہی کے پورے فرائض ادا کئے کہ

---

[1] خافی خاں، جلد سوم ص ۳۶۳۔

گویا حکومت کا جائزہ دینے تک وہ سلطنت کے بادشاہ تھے۔[1] اس پر طرہ یہ کہ ملازمین سے کہا گیا تھا کہ جب ناشتے کا وقت ہو تو حسب معمول کھانا لائیں، چنانچہ بادشاہ کے حکم کے مطابق شاہی دستر خوان چن دیا گیا۔ اسی دوران میں مختار خاں اور روح اللہ خاں اور دیگر مغل افسر ابوالحسن کو لینے کے لئے آ گئے۔ جب یہ لوگ سامنے آئے تو بادشاہ نے سبقت کر کے پہلے سلام علیک کہا، لیکن اپنی مسند پر بیٹھے رہے اور شاہانہ وقار میں کوئی فرق آنے نہیں دیا اور جب یہ لوگ بادشاہ کے سامنے بیٹھ گئے تو ان کے ساتھ نہایت گرم جوشی سے گفتگو ہونے لگی جس میں کافی فصاحت بھی تھی۔ ابوالحسن کے خدوخال اور بیان سے ذرہ برابر انتشار نہیں ظاہر ہوا، جب پیشی کے ملازمین نے دستر خوان کے تیار ہونے کی اطلاع دی تو بادشاہ کھانے کے لئے اٹھے اور ان مغل امراء کو بھی دعوت دی کہ وہ کھانے میں شریک ہوں بعضوں نے پس و پیش کیا، لیکن مختار خاں اور اس کے ساتھی دو ایک اور آدمی کھانے میں شریک ہو گئے۔ چنانچہ مہمانوں کے ساتھ میزبان نے پورے اطمینان کے ساتھ کھانا کھایا۔ روح اللہ خاں کو اس قدر حیرت ہوئی کہ وہ اپنی حیرت چھپا نہیں سکا چنانچہ اس نے بادشاہ سے پوچھا کہ "یہ کھانا کھانے کا وقت کونسا ہے؟"

---

[1] ماہ نامہ کا مولف بیان کرتا ہے کہ جب مغل فوج قلعے میں داخل ہوئی تو ابوالحسن گانا سن رہا تھا (ماہ نامہ ص ۱۳۸) اور الیشور داس کہتا ہے کہ ابوالحسن گانا سن رہا تھا اور جب قلعے میں شور ہوا تو گاین خاموش ہو گئی تو ابوالحسن نے کہا گائے جا، جو لحظہ مسرت میں صرف ہوا اچھا ہے" (تاریخ اورنگ زیب جادو ناتھ سرکار جلد چہارم ص ۳۸۶) لیکن تین بجے شب کو گانا سننا خلافِ قیاس ہے۔ اس کے علاوہ ابوالحسن جیسے بیدار مغز اور صاحب کردار بادشاہ سے اس کی توقع نہیں ہو سکتی۔

ابو الحسن نے اس حیرت کو نہیں سمجھا، یا جان بوجھ کر جواب دیا کہ "میرے کھانے کا وقت یہی ہے!" روح اللہ خاں نے کہا "یہ صحیح ہے کہ آپ ہمیشہ اسی وقت کھانا کھاتے ہیں، لیکن اس پریشانی میں آپ کی طبیعت کھانے کی طرف کیوں کر مائل ہوئی؟" ابو الحسن نے نہایت ٹھنڈے دل سے جواب دیا کہ آپ کا کہنا اس طرح درست ہے کہ اس پریشانی میں کوئی کھانا نہیں کھاتا لیکن میرا حال بالکل دوسرا ہے میں راضی بہ رضا ہوں اور سمجھتا ہوں کہ قدرت کا فیصلہ حسب مصلحت ہوتا ہے، خدائے تعالیٰ اپنی مصلحت سے ایک شخص کو بادشاہ اور دوسرے کو فقیر بنا دیتا ہے، جس خدا نے مجھے اور میرے بزرگوں کو بادشاہ بنایا اور عزت دی تھی وہ مجھ سے اب سلب کر لینا چاہتا ہے۔ بادشاہ ہونے سے پہلے میرے پندرہ سولہ سال فقیری میں گزرے اور اب بھی خدا کا منشا یہ ہے کہ میں فقیر بن جاؤں، اس کے لئے میں بالکل تیار ہوں اور میرے دل میں کوئی ہوس باقی نہیں اور میں خوش ہوں کہ اس سلطنت کی باگ جواب تک میرے ہاتھ میں تھی عالمگیر جیسے دین دار بادشاہ کے ہاتھ میں دی جا رہی ہے" اور حافظؔ کا یہ شعر پڑھتے ہوئے اٹھے ؎

سرِ ارادتِ ما و آستانِ حضرتِ دوست

کہ ہر چہ بر سرِ ما می رود ارادتِ اوست

اس کے بعد بادشاہ نے گھوڑا منگوایا اور اپنے شاہانہ لباس کے ساتھ سوار ہو گئے[1] اور مغل افسروں کے ساتھ دروازے کے باہر آ گئے جہاں

---

[1] ماہ نامہ کا مولف لکھتا ہے کہ ابو الحسن، مہابت خاں کے ساتھ ہاتھی پر بیٹھ کر گیا تھا، جب یہ فتح دروازے کے باہر نکلا تو حضرت شاہ راجو کی درگاہ کی طرف سجدے کرنے لگا اس پر مہابت خاں نے پوچھا کہ "یہ کیا حرکت ہے؟" ابو الحسن نے جواب دیا کہ "حضرت راجو ہی نے میرے سر پہ (باقی بر صفحہ ۳۱۱)

محمد اعظم انتظار کر رہا تھا۔ اس وقت قلعے میں واویلا مچی ہوئی تھی اور عورتیں اور مرد بادشاہ کو جاتا ہوا دیکھ کر دھاڑیں مار کر رو رہے تھے۔ جب مغل افسر بادشاہ کو محمد اعظم شاہ کے پاس لے گئے تو ابو الحسن نے موتیوں کا ہار اپنے گلے سے نکال کر محمد اعظم کے گلے میں ڈال دیا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ محمد اعظم نے ابو الحسن کی خاص مدارات کی اور ان کو شہنشاہ اورنگ زیب کے سامنے پیش کر دیا[۱]۔ محمد ساقی کہتا ہے شہنشاہ نے اس کے قصور معاف کر دیئے اور اس کی عزت کی اور دلاسا دیا اور اس کی تمام ضروریات مہیا کر دیں اور شاہی کیمپ میں ٹھیرنے کا حکم دیا اور جب ابو الحسن شہنشاہ کے سامنے آیا تو یہ شعر پڑھا تھا۔

آخر مرا ز خاکِ درت روشناس کرد

منت گذار سجدۂ پیشانیِ خودم[۲]

روح اللہ خاں اور دوسرے متصدیوں نے قلعے کا تمام مال و متاع ضبط کر لیا اور

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۱۰) تاجِ شاہی رکھا تھا اور وہ اب دوسرے کے سر پر رکھنا چاہتے ہیں اس لیے شکریہ ادا کر رہا ہوں (ماہ نامہ ص ۳۱۹) یہ ایک بے بنیاد واقعہ معلوم ہوتا ہے۔

[۱] ایشور داس کہتا ہے کہ ابو الحسن کو فیروز جنگ نے تخت سے اٹھا کر گھوڑے پر بٹھایا اور شہنشاہ کے سامنے لے گیا اور ابو الحسن شہنشاہ کے سامنے سیدھا آیا کوئی کورنش یا سلام نہیں کیا۔ شہنشاہ نے پوچھا کہ "کیا حال ہے؟" اس پر اس نے جواب دیا کہ "مجھے خوشی ہے نہ کہ رنج۔ بلکہ یہ دیکھ کر مجھے اطمینان ہو گیا کہ جو چیز یہاں پردۂ غیب میں چھپی ہوئی تھی وہ آنکھوں کے سامنے آ گئی۔" (تاریخ اورنگ زیب جلد چہارم ص ۳۸۶)۔

[۲] محمد ساقی ص ۳۰۰۔ منوچی کہتا ہے کہ ابو الحسن قید کر دیا گیا تھا (باقی بر صفحہ ۳۱۲)

اس کی فہرست تیار کی، اس کی جملہ مالیت جواہر و آلات مرصع، ظروف طلا کے علاوہ چھ کروڑ اسی لاکھ دس ہزار روپے تھی۔ یہ سب چیزیں شاہی خزانے میں داخل کر لی گئیں[1]۔ اس سلطنت کے بے شمار لوگ ملازم اور عہدہ دار و پیشہ ور مغل ملازمت میں داخل ہو گئے، ان سب کو خطابات اور مناصب ملے۔ ابو الحسن کے بیٹوں کو مناصب دیئے گئے اور بیٹیوں کی شادی کا انتظام کیا گیا[2]۔ محمد ساقی نے ایک بیٹے کا نام عبداللہ بتایا ہے جو ابو الحسن کا پسر خواندہ تھا، اور کہتا ہے کہ اس کو چار ہزاری منصب اور چار ہزار سوار دیئے گئے[3]۔ غالباً یہ کوئی دوسرا شخص تھا۔ لیکن ابو الحسن کا ایک صلبی بیٹا بھی تھا جس کا نام خدا بندہ یا بندہ سلطان بتایا جاتا ہے، یہ دولت آباد کی نظر بندی کے زمانے میں پیدا ہوا تھا

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۱۱) اس کو ہاتھی پر بٹھا کر پہلے اعظم کے خیمے پر لے گئے۔ شہزادہ اعظم سو رہا تھا اس کے بیدار ہونے تک اس کو دھوپ میں کھڑا رکھا گیا اور بڑی منت سماجت کے بعد پینے کے لئے پانی دیا گیا اعظم نے مہربانی کر کے اس کو اپنے سامنے بٹھایا اور شہنشاہ کے پاس لے گیا۔ اعظم تو خود اندر گیا لیکن اس کو بہت دیر تک دھوپ میں کھڑا کر دیا۔ اس کے بعد اورنگ زیب نے اس کو قید خانے میں رکھنے کا حکم دیا اور اس سے دریافت کیا کہ "خزانے کہاں ہیں؟" اس نے جواب دیا کہ "میں نے سب خرچ کر دیئے ہیں اور مجھے اس کا حق تھا!" اس گستاخی پر شہنشاہ نے اس کو مارنے کا حکم دیا، چنانچہ مغل عہدہ داروں نے اس کو بے رحمی سے پیٹا اور پھر اس کو دولت آباد کے قلعے میں قید کر دیا گیا (منوچی جلد دوم ص ۳۰۷-۳۰۸) منوچی کے بیان میں صداقت نہیں ہے۔

[1] خافی خاں جلد دوم ص ۳۶۷۔

[2] محمد ساقی، مآثر عالمگیری ص ۳۰۳۔

[3] حدیقۃ العالم مقالہ اول ص ۱۴۳۔

جب یہ لڑکا سن شعور کو پہنچا اور شہنشاہ کے دربار میں اس کی آمد و رفت ہونے لگی تو قدیم قطب شاہی ملازم اس کی دل سے تعظیم کرنے لگے کیوں کہ یہ قطب شاہی شاہزادہ تھا۔ اس نظارے سے شہنشاہ بہت خائف ہوئے اور اس کو ایک نامعلوم جگہ نظر بند کر دیا اور اس کے بعد پھر اس کا پتہ نہیں چلا۔[1] اس کے علاوہ ابو الحسن کی تین بیٹیاں تھیں جو قلعۂ گولکنڈہ کی فتح سے پہلے سن شعور کو پہنچ چکی تھیں شہنشاہ نے ان تینوں کی شادیاں کر دیں۔ بڑی بیٹی سکندر عادل شاہ کے ساتھ بیاہی گئی جو اچھا سنجوگ تھا، اور دوسری بیٹی محمد عمر کے ساتھ جو شیخ محمد نقشبندی سرہندی کا بیٹا تھا، اور تیسری عنایت خاں ولد جملۃ الملک اسد خاں کے ساتھ بیاہی گئی۔[2]

۲۴؍ ذیقعدہ ۱۰۹۸ھ / ۱۶۸۷ء کو مغل فوج قلعے میں داخل ہوئی تھی، اس طرح گولکنڈے کا خاتمہ ۱۰۹۸ھ / ۱۶۸۷ء کا واقعہ ہے۔ چنانچہ میر عبد الکریم نے جس کا ملتفت خاں خطاب تھا "فتح قلعہ گولکنڈہ مبارک باد" سے اس واقعے کی تاریخ اخذ کی تھی۔ اس سے یہی سنہ مستخرج ہوتا ہے۔ نعمت خان عالی نے

---

[1] حدیقۃ العالم، مقالۂ اول ص ۴۳۱۔

[2] محمد ساقی، عالمگیری ص ۳۱۲۔ خافی خاں کا بیان ہے کہ ابو الحسن کی چار بیٹیاں تھیں سب سے بڑی لڑکی نے شادی کرنے سے انکار کر دیا اور وہ اپنے باپ کے ساتھ قلعۂ دولت آباد میں رہی اور تجرد کے دن گزارے۔ دوسری تیسری اور چوتھی بیٹی علی الترتیب سکندر عادل شاہ، عنایت خاں، شیخ محمد نقشبندی کے ساتھ بیاہی گئیں۔ سب سے چھوٹی بیٹی کی شادی جو عنایت خاں کے ساتھ ہوئی تھی اس کی مرضی کے خلاف تھی (خافی خاں، جلد دوم ص ۳۰۷)۔ کسی تاریخ سے ان لڑکیوں کے نام معلوم نہیں ہوتے اور یہ بھی نہیں معلوم ہوتا کہ شادی کے بعد یہ لڑکیاں کہاں رہیں اور ان کا کیا انجام ہوا۔

ذیل کے قطعے سے اس واقعے کی تاریخ نکالی تھی ؎

قطعہ

ابوالحسن داشت جا بہ چار محل   کرد بیرون ازآن مکان تقدیر
چون برون رفت او بجاش نشست   شاہ اورنگ زیب عالمگیر

قلعۂ گولکنڈہ سے فارغ ہونے کے بعد شہنشاہ، محرم ۱۰۹۹ھ/۱۶۸۷ء میں شہر حیدر آباد آئے، تمام شہر اور شاہی عمارتوں کا معاینہ کیا۔ کہا جاتا ہے کہ چارمینار کے مشرقی گوشے میں جہاں جامع مسجد کا حمام واقع تھا یہیں شہنشاہ نے سکونت اختیار کی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قطب شاہی تمدن اور معاشرت کے نظارے سے بہت متاثر ہوئے۔ ساقی شہر حیدر آباد کی بہت تعریف کرتا ہے، قیاس یہ ہوتا ہے کہ شہنشاہ کے بھی یہی جذبات ہونے چاہیئے، ساقی درباری مورخ ہے، وہ شہنشاہ کے نقطۂ خیال کے خلاف کچھ نہیں لکھتا، گو بظاہر اس کا اظہار نہیں کیا بلکہ کہیں غیض و غضب کا اظہار کردیا تاکہ شاہی تمکنت ہاتھ سے نہ جائے، لیکن یہاں کی آب و ہوا خوشگوار و طبیعت کے موافق ثابت ہوئی کہ اس شہر میں دو مہینے سے زیادہ رہ گئے اور یکم ربیع الاول ۱۰۹۹ھ/۱۶۸۷ء کو بادلِ ناخواستہ بیجاپور کے ارادے سے کوچ کیا[۱]، کیوں کہ مرہٹوں کی سرکوبی ناگزیر تھی۔ لیکن جانے سے پہلے حیدر آباد کے تمام ضروری بندوبست کئے اور اس کا نام "دارالجہاد" رکھا۔ پہلے عارضی طور پر روح اللہ خاں اس کا گورنر مقرر کیا گیا تھا، لیکن چند روز کے بعد جاں سپار خاں، کو جس کا اصل نام سید بہادر دل خاں تھا اس خدمت کا مستقل جائزہ دے دیا گیا۔ شہنشاہ کے اس سفر میں جو حیدر آباد سے

---

[۱] مآثر عالمگیری ص ۳۰۷، ۳۰۸ - خافی خاں کہتا ہے کہ شہنشاہ نے ربیع الثانی کے اوائل میں حیدر آباد سے کوچ کیا تھا، اس طرح ان کا قیام حیدر آباد میں تین ماہ کے قریب ہوتا ہے (خافی خاں، جلد دوم ص ۳۷۱)۔

شروع ہوا تھا، ابوالحسن بھی ہمراہِ رکاب تھا، لیکن جب شہنشاہ بیدر پہنچے تو اس نے مجبوراً درخواست کی کہ "مجھے کسی جگہ گوشہ نشینی کی اجازت دی جائے." چنانچہ اس درخواست پر اس کے لئے قلعۂ دولت آباد تجویز ہوا اور جاں سپار خاں کو حکم ہوا کہ وہ ابوالحسن کو دولت آباد پہنچا دے۔ غالباً ایک محافظ دستے کے ساتھ اس مظلوم بادشاہ کو قلعے میں نظر بند کر دیا گیا تاکہ وہ یہاں اپنے باقی ایامِ حیات گزارے۔ گو اس کی تمام ضروریات کا انتظام ہوا[2] اور بہ قول خافی خاں تاکیدی احکام نافذ ہوئے کہ ابوالحسن کی تمام ضروریاتِ خورونوش وغیرہ کا خاطر خواہ بندوبست کیا جائے لیکن اس کی ضروریات کے لئے صرف پچاس ہزار روپے سالانہ مقرر ہوئے[3]۔

---

[1] محمد ساقی کہتا ہے کہ ابوالحسن اس قدر تن آسان آدمی تھا کہ "... در پانزدہ سالہ حکومت سفر گزیں نہ شدہ وسواری ہر روزہ برو دشوار بود" (مآثر عالمگیری ص ۳۰۹) یہ صحیح نہیں ہے۔ غالباً اس کی خودداری اس بات کی اجازت نہیں دیتی تھی کہ ہمیشہ شہنشاہ کے جلوس کے ساتھ منسلک رہے، اسی لئے گوشہ نشینی کی اجازت چاہی تھی۔ [2] خافی خاں جلد دوم ص ۳۷۱۔

[3] مآثر عالمگیری ص ۳۰۹۔ یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ ابوالحسن کے ساتھ اس قدر تنگ نظری سے کیوں کام لیا گیا، کیوں کہ جب چھ مہینے پہلے بیجاپور کی سلطنت فتح ہوئی تھی تو سکندر عادل شاہ کو خلعتِ خاصہ، خنجر مرصع با علاقۂ مروارید، پھول کٹارہ قیمت ہفت ہزار روپے، مالائے مروارید بہ آویزۂ زمرد قیمت سیزدہ ہزار روپے، کلغی و عصائے مرصع، سکندر خاں خطاب و ایک لاکھ روپے سالانہ عطا ہوئے۔ دوسری مرتبہ سرپیچ الماس مرحمت ہوئے تھے اور اس کو دربار میں بیٹھنے کی اجازت ملی تھی، اس کے خاص ملازم اور عزیز و اقارب کے ساتھ بہت رعایت کی گئی (مآثر عالمگیری ص ۲۸۰)۔

اس ڈرامے کا دوسرا ہیرو مصطفٰے خاں عبد الرزاق لاری تھا جو شہرتِ دوام کا مالک ہے۔ عبد الرزاق کی وفاداری ضرب المثل بنی ہوئی ہے۔ اگرچہ بہتیرے باغی سلطنت سے روگرداں ہو گئے اور مغلوں سے مل گئے لیکن عبد الرزاق آخر دم تک اپنی وفاداری پر ثابت قدم رہا۔ قلعے کی گرتی ہوئی حالت اور مغلوں کی ترغیبوں کے باوجود اس کے پائے استقامت میں ذرہ برابر فرق نہیں آیا۔ جس وقت عبد اللہ خاں پنی سے مغلوں کی ساز باز ہو رہی تھی شہنشاہ کے جاسوس شش ہزاری منصب اور شش ہزار سوار اور دیگر عنایات کے وعدے لے کر اس کے پاس بھی آئے لیکن وہ انتہائی غیظ و غضب میں سب ٹھکرا دیئے اور شہنشاہ کا ترغیبی فرمان خود شہنشاہ کے آدمیوں کے سامنے چاک کر دیا اور :-

"جواب داد کہ این جنگ بلاتشبیہ بہ جنگِ کربلا میماند۔ عبد الرزاق امیدوار است کہ تا نفس باقی است در جرگہ بست و دو ہزار سوار کہ با امام بیعت نمودہ آخر تیغ بر روئے آن شہیدِ کربلا کشیدند[۱] در نیاید بلکہ منجملہ ہفتاد و دو تن سرخروئی دُنیا و آخرت حاصل نماید۔"[۲]

اس کی بے مثال وفاداری سے شہنشاہ بھی بہت متاثر ہوئے اور اس کے علاج کے لئے ہندوستانی اور یورپی جرّاح مقرر کر دیئے اور یہ کہا کہ "اگر قلعے میں اس جیسا ایک اور شخص وفادار ہوتا تو قلعہ فتح ہونا ناممکن تھا۔"[۳] جرّاحوں نے رپورٹ دی تھی کہ اس کے سر پر اتنے زخم لگے ہیں کہ ان کی گنتی مشکل ہے۔ ویسے ستر زخم معلوم ہوتے ہیں۔ اگرچہ ایک آنکھ زخم سے محفوظ ہے لیکن شائد بعد کو دونوں آنکھیں بے کار ہو جائیں[۳]۔ تیرہ روز کے علاج کے بعد اس نے

۱؎ خافی خاں، جلد دوم ص ۳۶۰۔

۲؎ 〃 〃 〃 ۳۶۶۔

۳؎ 〃 〃 〃 〃

آنکھیں کھولیں اور لکنت سے بات کرنے لگا۔ جب شہنشاہ کو اس کے صحت کی اطلاع ہوئی تو اس کے پاس پیغام بھیجا کہ:۔ "ہم تمہارے قصور معاف کرتے ہیں، تم کو اور تمہارے بیٹوں کو مناصب اور اعزاز دیئے جائیں گے۔" لیکن اس نے یہ اعزاز قبول کرنے سے صاف انکار کر دیا اور اپنے بستر علالت سے شاہی پیغام کا یہ جواب دیا کہ:۔ "ہر چند این سخت جان تا حال بر نیامدہ اما امید حیات بدین حال معلوم۔ اگر حیات ہم شد بہ دست و پائے مجروح تقدیم مراسم نوکری ہم نہ توانم۔ کسے کہ گوشت و پوست او از نمک ابوالحسن پرورش یافتہ باشد نوکری عالمگیر بادشاہ نتواند نمود۔"[1] ان الفاظ سے شہنشاہ خفا ہوئے تاہم یہ حکم دیا کہ جب اس کو پوری صحت ہو جائے تو مجھے اطلاع کرنا۔ جب اس کو پوری صحت ہو گئی تو پھر اس کو شہنشاہی پیغام پہنچایا گیا، پھر اس نے وہی جواب دیا اور حجاز جانے کی خواہش کی۔ اس بات سے شہنشاہ بہت برہم ہوئے اور حکم دیا کہ اس کو قید کر کے میرے ہاں پہنچایا جائے۔ لیکن فیروز جنگ نے بیچ بچاؤ کیا۔ ایک طرف عبدالرزاق کو سمجھایا کہ وہ مان جائے اور دوسری طرف شہنشاہ کے ہاں اس کی صفائی کی۔ چنانچہ ایک سال کے بعد وہ بڑی مشکل سے قبولِ منصب کے لئے راضی ہو گیا۔ چار ہزاری منصب، تین ہزار سوار، خطابِ خانی گھوڑا اور ہاتھی عطا ہوئے۔ پہلے راہبری کی اور بعد کو کوکن کی فوجداری دی گئی۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس نے دل سے نوکری نہیں کی۔ چند سال کے بعد بہت اصرار سے حج بیت اللہ کے لئے رخصت لے لی وہاں سے پھر واپس نہیں آیا۔

اس کے چار بیٹے تھے جن کے نام عبدالقادر، عبدالکریم، رزاق علی، خلیل محمد بتائے جاتے ہیں۔ یہ سب مختلف مناصب اور جاگیروں سے سرفراز ہوئے۔ یہ جاگیریں اتھیں اورنگ آباد میں دی گئی تھیں[2]۔ انگریز شاعروں نے بھی

---

[1] خافی خاں، جلد دوم ص ۳۶۶ و ۳۶۷۔ مآثر الامراء، جلد دوم ص۔ ۸۲ و ۸۲۱۔

[2] ؍؍ ؍؍ ؍؍ ؍؍ ؍؍ ؍؍ ؍؍ ؍؍

اپنی نظموں میں عبدالرزاق کی وفاداری کی داد دی اور خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔
ان حالات میں آخر قطب شاہوں کی دو سو سالہ سلطنت ختم ہوگئی اور آثارِ قدیمہ کے سوا ان کا کوئی تسمہ لگا نہیں رہا۔ آج پچاس سال سے مغل شہنشاہت اس کی بیخ کنی کے در پے تھی، غالباً پہلے اس کا خاتمہ آسان معلوم ہوتا ہوگا لیکن آخری محاصرے میں معلوم ہوا کہ اس سلطنت کا استیصال مغلوں کے لئے بہت دشوار گزار ہے اور دُنیا کے مشہور محاصروں میں اس کا شمار ہونا چاہئے۔ مغلوں کی تاریخ میں قلعۂ اسیر گڈھ کے بعد گولکنڈے کا درجہ ہے جو بہت صبر آزما ثابت ہوا، کیوں کہ اس قلعے کی تسخیر میں بھی آٹھ مہینے لگ گئے جس طرح اکبر کو اسیر گڈھ کی فکر دامن گیر تھی اور وہ اس کی ناکامی کو اپنے لئے ایک بدنما داغ سمجھتا تھا کچھ اسی طرح گولکنڈے کی دیواروں کے سامنے اورنگ زیب کا حال تھا۔ کیوں کہ محاصرے کی پیہم ناکامیوں میں جو مغل محاصرین کو برداشت کرنی پڑیں مغل سلطنت کے وقار اور نیک نامی کو دھکا لگ رہا تھا۔ واقعات بتاتے ہیں کہ قطب شاہی قوتِ مدافعت مغلوں سے کم نہیں تھی، بادشاہ کی حوصلہ مندی ہر وقت محصورین کا دل بڑھاتی رہی۔ خود شہنشاہ کے الفاظ میں اُگر عبدالرزاق لاری کی طرح دو ایک آدمی قلعے میں اور ہوتے تو قلعہ فتح کرنا ناممکن تھا" اور قلعہ کشائی بھی کچھ مغلوں کے زورِ بازو سے نہیں ہوئی بلکہ اس کا باعث عبداللہ خاں پنی کی بے وفائی تھی جس نے اپنے ولی نعمت کے خلاف غداری کر کے دشمن کے سامنے دروازے کھول دیئے ورنہ آٹھ مہینوں کے دوران میں بار بار ایسے مواقع آرہے تھے جب کہ مغل فوجوں نے ہار مان لی اور مصیبتوں سے تنگ آکر خود مغل سپاہی قطب شاہی حکومت کی پناہ میں جارہے تھے۔ خود شہنشاہ بھی اس سوچ میں پڑ گئے تھے کہ قلعے کو اپنی حالت پر چھوڑ کر محاصرہ اُٹھا لینا چاہئے۔
قلعہ گولکنڈہ کی تسخیر میں کوئی عاقبت اندیشی نہ تھی کیوں کہ بعد کے

واقعات سے ظاہر ہے کہ گولکنڈہ اور بیجاپور کی فتح سے مغل سلطنت کو کوئی فائدہ نہیں ہوا بلکہ اُلٹے اس کا نقصان ہی ہوا، کیوں کہ اگر ان سلطنتوں کے خاتمے سے مغل شہنشاہ مرہٹوں کا استیصال چاہتے تھے تو وہ پورا نہیں ہوا، کیونکہ گولکنڈہ اور بیجاپور کی سلطنتوں کا خاتمہ تو ہو گیا لیکن انتہائی کوشش کے باوجود مرہٹوں کی طاقت جوں کی توں رہی، بلکہ اُلٹے یہ ہوا کہ اورنگ زیب کے بعد مرہٹہ طاقت اس قدر ابھری کہ جنوب سے نکل کر شمال پر بھی چھا گئی اور خود مغل سلطنت کو کمزور کر دیا، کیوں کہ ان سلطنتوں کے بے روزگار سپاہی یا تو پنڈاروں میں شریک ہو گئے یا مرہٹوں کی فوج میں داخل ہو گئے اس سے زیادہ مغل سلطنت کی اور کیا ناکامی ہو سکتی ہے۔ برخلاف اس کے اگر مغل شہنشاہت ان سلطنتوں کو قائم رکھتی اور مرہٹوں کے استیصال کے لئے ان سلطنتوں سے اتحادِ عمل کرتی تو قرائن یہ ہیں کہ یہ طریقۂ عمل زیادہ مفیدِ مطلب ہوتا بلکہ اس طریقے سے دکن کی یہ سلطنتیں مغلوں کے ساتھ متحد رہتیں اور شمال و جنوب کی متحدہ طاقت آسانی سے مرہٹوں کا خاتمہ کر سکتی تھی، چنانچہ علی عادل شاہ ثانی کے عہدِ حکومت میں یہ اتحادِ عمل ہوا تھا ہم جانتے ہیں کہ جے سنگھ کے دکن آنے سے پہلے اورنگ زیب نے مرہٹوں کے خلاف بیجاپور سے مدد طلب کی تھی اور علی عادل شاہ نے اس صدا پر لبیک کہا تھا۔ کیوں کہ سیواجی جس طرح مغلوں کا دشمن تھا اسی طرح دکن کی اسلامی سلطنتوں کا بھی حریف تھا اور انھیں تباہ کر کے اپنی طاقت بڑھا رہا تھا۔ لیکن یہ ایک ستم ظریفی تھی کہ مغل شہنشاہت نے وقت پر بیجاپور کے تعاون سے فائدہ تو اٹھایا اور اس کی مدد سے سیواجی کو شکست دی لیکن اُلٹے سیواجی سے اتحاد کر کے اسی سلطنت پر یلغار کر دیا۔ اس بداخلاقی کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان سلطنتوں کو آئندہ مغلوں پر اعتماد باقی نہیں رہا اور اب وہ مغلوں کے بجائے مرہٹوں کا سہارا ڈھونڈنے لگیں، کیوں کہ مرہٹے آخر دکن کی طاقت تھی اور ان کو طاکر

وہ دکن کی ایک برادری بنانا چاہتی تھیں۔ مغل سلطنت نے ان عواقب پر قطعاً غور نہیں کیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گولکنڈہ اور بیجاپور کی تسخیر اورنگ زیب کا ایک جذباتی مسلک بن گیا تھا، اور یہ آج سے نہیں بلکہ زمانۂ شاہزادگی سے جب کہ یہ دکن کے ناظم تھے ان سلطنتوں کو ہضم کرنا چاہتے تھے۔ گولکنڈے سے تو شہنشاہ کو دلی نفرت تھی۔ بیجاپور کے ساتھ بہتیری رعایتیں کی گئیں۔ برخلاف اسکے گولکنڈے کے ساتھ غیض و غضب کا اظہار ہوا۔ اس کا نام "دارالجہاد" رکھا گیا، حالانکہ یہ ایک اسلامی سلطنت تھی، "دارالکفر" نہ تھا جو قاضی شیخ الاسلام اور قاضی عبداللہ کے فتوے سے ظاہر ہے۔ خود ابوالحسن کے ساتھ جو برتاؤ کیا گیا تھا اس سے شہنشاہ کے اندرونی جذبات پر روشنی پڑتی ہے۔

گولکنڈے اور بیجاپور کی تسخیر سے مغل سلطنت کو نقصان پہنچا ہی تھا، لیکن دکن کو بھی ناقابلِ تلافی ضرب لگی۔ اس کے تمدن کی رفتارِ ترقی بہت دنوں تک رُکی رہی، بلکہ دکن کے بعض اقطاع تو ہمیشہ کے لئے بے چراغ ہو گئے۔ قطب شاہوں نے تلنگانے میں جو تمدن پیدا کیا تھا اس کا بُری طرح شیرازہ بکھر گیا۔ شاہ عالم کے حملے میں شہر حیدرآباد کی اس قدر افسوسناک تاخت و تاراج ہوئی کہ تمام قطب شاہی تمدن خاک میں مل گیا۔ تسخیر سلطنت کے بعد شاہی محلات کی خاطر خواہ نگہداشت نہیں کی گئی چنانچہ یہ سب بربادی کی نذر ہو گئے۔ مغل فاتح یہاں سے لاکھوں روپے زر و جواہر تو لے گئے لیکن قطب شاہی عمارتوں کو برباد ہونے دیا۔ اس وقت حیدرآباد اور اس کے گرد و نواح میں قطب شاہی مساجد کے سوا کسی محل کا پتا نہیں چلتا حالانکہ مختلف بادشاہوں کے بنائے ہوئے یہاں بے شمار محل تھے۔ داد محل، گگن محل اور چار محل کے نام تو اہلِ حیدرآباد کو یاد ہیں لیکن ان کا کہیں نام و نشان نہیں۔ داد محل کی تمام ایشیا میں شہرت تھی، اس کو دانستہ توڑا گیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ مغلوں کے قبضے کے بعد جو مغل گورنر یہاں

مامور ہوئے تھے انھوں نے ان کی نگہداشت کی طرف کوئی توجہ نہیں کی۔ اس کے علاوہ گولکنڈے کی آبادی بھی جس میں امیر و غریب دونوں شامل تھے بہت گھٹ گئی۔ شاہی محل کی صدہا عورتوں نے اپنے کو باؤلیوں میں گرا کر خودکشی کر لی۔ قلعے کے بے شمار حبشی پہرہ دار تہِ تیغ ہو گئے[1]۔ شہر حیدرآباد کے صدہا شرفاء اور اہلِ علم نے جن میں زیادہ تر مسلمان تھے اور گولکنڈے کی سرکار سے فیض پاتے تھے اپنے وطن کو خیرباد کہہ دیا اور کرناٹک کے جنوبی قصبات میں جاکر آباد ہو گئے اور اس کا نتیجہ یہ تھا کہ شاہی محلات کے علاوہ سینکڑوں گھر ویران اور آفاتِ سماوی سے منہدم ہو گئے، چنانچہ یہ شہر ایسا بے چراغ ہو گیا کہ غفراں مآب نواب نظام علی خاں کے عہد تک جنھوں نے بالآخر اورنگ آباد کو چھوڑ کر حیدرآباد کو اپنا پایۂ تخت بنایا تھا آباد نہیں ہوا اور بہ قول لچھمی نارائن شفیق آصف جاہی سرپرستی کے باوجود اس کی ویرانی کے آثار باقی تھے[2]۔

---

[1] بیان کیا جاتا ہے کہ قلعے کے مشرقی دروازے پر تقریباً پانچسو حبشیوں کا پہرہ ہوتا تھا، جب قلعہ فتح ہو گیا اور مغل فوج مشرقی دروازے سے آنے لگی تو ان حبشیوں نے مزاحمت کی۔ ان وفاداروں نے کہا کہ جب تک ان کو قتل نہیں کیا جائے گا وہ اپنی جگہ سے قدم نہیں اُٹھائیں گے، چنانچہ یہ سب اپنی وفاداری میں تہِ تیغ ہو گئے۔

[2] لچھمی نارائن شفیق نے آصف جاہی دور میں دکن کا اس طرح خاکہ کھینچا تھا:۔

"بیجاپور، برہان پور و بیدر ہر پنج بلدہ نامی کہ سابق تخت گاہ سلاطین دکن بودند الحال کمال خستگی دارند ... مگر حیدرآباد درین ایام بنا بر چھاونی متواترہ رئیس از سی سال رونقے تازہ دارد گذرگاہ مردم امصار دور دست است ... با وصف گذرگاہ عالم مردم از آفاق اکثر جا ویران است۔ پیش ازین چند سال سہ لک و پنجاہ ہزار منزل از پختہ و سفال پوش شمرہ بودند ... الحال از آن آبادی

(باقی بر صفحہ ۳۲۲)

ویران مکانوں میں آبادی نہیں ہوئی، کیوں کہ بہت سے خاندان جو گولکنڈے کے خاتمے کے بعد باہر چلے گئے تھے واپس نہیں آئے۔ نعمت خانِ عالی کے پُر درد مرثیے سے جو حیدر آباد کی تباہی کا دل خراش مرقع ہے اس کا اندازہ ہوتا ہے۔ یہ مرثیہ اس وجہ سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے کہ یہ ایک مغل امیر کے قلم سے نکلا ہے۔ نعمت خاں نے اس میں اپنے چشم دید حالات لکھے ہیں۔ اس مرثیہ کا رنگ وہی ہے جو شیخ سعدیؒ کے مرثیے اور داغ کے شہر آشوب کا ہے جو زوالِ بغداد اور زوالِ دہلی پر کہے تھے۔ جہاں فتح گولکنڈے کی مبارک بادیں قصیدۂ تہنیت لکھے جا رہے تھے نعمت خاں گولکنڈے کی تباہی پر آنسو بہا رہا تھا، حالانکہ وہ فاتح فوج کے ساتھ قلعے کی تسخیر کے لئے آیا تھا۔

قصیدہ شہر آشوب

درین ملکِ خراب امروز کس را نیست سامانے	چو گنج افتادہ اند اہلِ ہنر در کنجِ ویرانے
بہ آن حد سے رسیدہ خلق را افلاس و ناداری	کہ معنی ہم ندارد این زمان حرفِ سخندانے
سپاہی ہم بہ میدانِ قناعت می کند جولان	ز شمشیر و سپر دارد دمِ آبے لبِ نانے
. . . .	. . . .
. . . .	. . . .
رسیدہ پان سپاری کار بے برگی و تنبولی	برائے سُرخ روی چون ندارد بیڑۂ پانے
تنور آسا بہ خاکستر نشستہ نانبا این غم	کہ از افتادن نان بر سرش افتاد تاوانے
درین لشکر بحا نم یار و م باخویش می سنجد	نماندہ در دکان بقال را جز سنگ و میزانے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۲۱) پدید نیست۔ مگر جاہا سنگہائے آن افتادہ اند۔ ہرگاہ داد محل را شکستند۔ در عرصہ سی سال بہ شکست رسید . . . اکثر عمارات عمدہ شہر تباہ شد ہنوز تہ خانہ ہائے آن بعضے قائم۔"

(احوال حیدر آباد کچھمی نارائن شفیق)

. . . .

. . . .

یکے گفتہ خداوندا بحقِ نوح پیغمبر
برائے قلعۂ گولکنڈہ کُن ایجاد طوفانے[1]

اس کے علاوہ ایک بہت بڑا نقصان یہ ہوا کہ قطب شاہی سلطنت کی تباہی سے مشرقی ساحلوں پر مغربی کمپنیوں کو اپنی طاقت بڑھانے کا موقع مل گیا، کیوں کہ مغل شہنشاہت ساحلِ کارومنڈل پر اپنا نظم و نسق قائم نہیں کر سکی اور قطب شاہی حکومت پورے طور پر اثر انداز تھی اور اس کے ہوتے ہوئے انگریز، فرانسیسی، ولندیزی آگے نہیں بڑھ سکتے تھے۔

نظر بندی کے بعد ابوالحسن کا پھر نام نہیں سنائی دیا، اپنی زندگی کے آخری چودہ سال اس نے قلعۂ دولت آباد کی چار دیواری میں گزارے[2]۔ ایک بادشاہ کے لئے جس نے تلنگانہ جیسی وسیع سلطنت پر پندرہ سال فرماں روائی کی ہو نظر بندی میں گزارنا کتنا مشکل تھا۔ اس پر طرّہ یہ کہ قلعے میں اسکے خورد و نوش کا

---

[1] وقایع گولکنڈہ، نعمت خانِ عالی ص ۱۵۔

[2] منوچی کہتا ہے کہ مرہٹوں نے ابوالحسن کو قلعے سے رہا کر کے پھر بادشاہ بنانے کی سازش کی تھی، لیکن وہ کامیاب نہیں ہوئے۔ جب اورنگ زیب کو اس کا پتا چلا تو اس نے ابوالحسن کو قلعۂ دولت آباد سے نکال کر قلعۂ گوالیار میں نظر بند کر دیا اور وہیں اس کا انتقال ہوا (منوچی، جلد دوم ص ۳۰۴) لیکن مقامی تاریخوں سے اس کی تصدیق نہیں ہوتی۔ غالباً وہ دولت آباد سے منتقل نہیں کیا گیا۔ اسی قید میں اس کے ایک بچہ پیدا ہوا تھا جس کا نام خدا بندہ یا بندہ سلطان بتایا جاتا ہے۔

خاطر خواہ انتظام نہ تھا۔ بعض مرتبہ خراب قسم کا غلّہ فراہم کیا گیا۔ قلعہ دار بخاری کی رپورٹ سے معلوم ہوتا ہے کہ ابو الحسن نے اس احتجاج میں کئی روز کھانا نہیں کھایا۔[1] ۱۱۱۲ھ/۱۷۰۰ء میں دولت آباد کے قلعے میں ان کا انتقال ہوا اور خلد آباد کی پُر سکون فضاء میں بہ پیوندِ خاک کر دیئے گئے۔[2] ابو الحسن کے متعلق صحیح رائے قائم کرنا بہت مشکل ہے، کیوں کہ اس کی خانگی اور سیاسی زندگی بے سروپا الزامات کی وجہ سے جس میں مغلوں کی اشتہار بازی کو بہت بڑا دخل ہے، ایک رازِ سربستہ ہو کر رہ گئی ہے، کیوں کہ شہنشاہ کی نظر میں اس کی اتنی بُرائیاں تھیں جو احاطۂ تحریر میں نہیں آسکتی تھیں۔ درباری مورخ محمد ساقی جو شہنشاہ کا عین ہم خیال ہے اس کو "ابو الحسن سفیہ بوالہوس" کے قبیح الفاظ سے یاد کرتا ہے اور شہنشاہ سے زیادہ اس کی بُرائیاں گناتا ہے۔[3] خافی خاں نے اس کو "ابو الحسن قبیح کردار" لکھا ہے۔[4] ان پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ابو الحسن میں کوئی انسانی خوبی نہ تھی بلکہ وہ از سر تا پا بُرائیوں میں ڈوبا ہوا تھا کہ وہ بہ ظاہر کسی ہمدردانہ ذکرِ خیر کا مستحق نہیں ہے۔[5] ان بُرائیوں کے علاوہ کہ اس نے مادنّا کو وزیر بنا کر اسلام کو ذلیل کر رکھا تھا اور سنبھاجی کی مدد کرتا تھا۔ "فسق و فجور" کو علانیہ

---

[1] نامہ قیاقس عالم لسید مرتضےٰ مبارک خاں بخاری۔ مخطوطہ کتب خانہ ادارہ ادبیات اُردو۔

[2] ابو الحسن کے انتقال کے متعلق بہت اختلاف ہے۔ حدیقۃ العالم کا مولف ۱۱۱۱ھ/۱۶۹۹ء یا ۱۱۱۲ھ/۱۷۰۰ء بتایا ہے (حدیقۃ العالم مقالہ اول ص ۴۱۳) بعض لوگ ۱۱۱۴ھ/۱۷۰۲ء بتاتے ہیں (منوچی جلد سوم ص ۱۹۳)۔

[3] عالمگیر نامہ ص ۲۸۵ و ۲۸۶ [4] خافی خاں جلد دوم ص ۳۴۲۔

[5] جو تاریخیں آصف جاہی دور میں لکھی گئی ہیں وہ بھی براہ راست مغل تاریخوں سے متاثر ہیں، ان میں بھی کوئی تحقیق نہیں کی گئی بلکہ اندھی تقلید ہوئی ہے۔

مُلک میں رائج کر دیا تھا اور خود "در انواع کبائر روز و شب مستغرق" تھا اور تمام اہلِ مُلک بھی انھیں بُرائیوں میں مبتلا تھے۔

اگرچہ اس زمانے کی کوئی مقامی تاریخ دستیاب نہیں ہوتی اور اسی وجہ سے صحیح حقیقت کا پتا چلانا بہت مشکل ہے تاہم مغل مورخوں کے بیانات بھی صداقت کی کسوٹی پر پورے نہیں اترتے، چونکہ مغل گولکنڈے کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ کر دینا چاہتے تھے اس لئے اپنی دست درازی کو حق بجانب ثابت کرنے کے لئے قطب شاہی سلطنت اور اس کے والی کو بدنام کرنا ضروری سمجھتے تھے لیکن واقعات کی ٹوہ لگائیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ابو الحسن اس قدر بے مایہ آدمی نہیں تھا جس طرح اس کو مغل تاریخیں پیش کرتی ہیں۔ اس پر بڑا الزام یہ تھا کہ اس نے سنبھاجی سے اتحاد کر رکھا تھا، لیکن یہ اتحاد اس وجہ سے ہوا تھا کہ مغل شہنشاہ دکھنی سلطنتوں کو تعاون کا موقعہ نہیں دیتے تھے۔ مغلوں کی دشمنی کی وجہ سے دکھنی سلطنتیں بالآخر مرہٹوں سے اتحاد کرنے پر مجبور ہو گئیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کی سیاست کسی قدر کمزور تھی اور جن وزراء کو اس نے عنانِ حکومت سپرد کی تھی ان میں بیحد کمزوریاں تھیں، ان کے اعمال پر نگرانی نہیں رکھی گئی اور ان کے خلاف مُلک میں جو غیض و غضب پیدا ہوا اس سے چشم پوشی کی گئی اور اس کے بُرے نتائج ہوئے۔ تاہم یہ عیاش آدمی نہیں تھا،[1] بلکہ اگر ایک مقامی تاریخ پر اعتماد کیا جائے تو یہ ایک ذی علم اور متقی آدمی تھا اور

---

[1] باہر کے سیاحوں نے بھی ابو الحسن کی خانگی زندگی سے متعلق اچھے خیالات ظاہر نہیں کئے۔ فرایر کہتا ہے کہ: "ابو الحسن مسلسل عیاشیوں میں غرق رہتا تھا اور اس طریقے سے اس نے اپنے کو غفلت میں رکھنے کی کوشش کی" (فرائر، جلد اول ص ۸۵)۔
لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اس نے اوائلِ حکومت میں سید مظفر کو دھوکا دینے کے لئے دانستہ عیاش بننے کی کوشش کی تھی، دراصل وہ عیاش نہیں تھا۔

قارسی سلیقہ تھا۔ اس نے کبھی مسکرات کا استعمال نہیں کیا، اور ظاہر ہے کہ جب ابوالحسن حضرت شاہ راجوؒ جیسے پیر طریقت کا مرید تھا تو اس کے متعلق "قبیح افعال" کا اتہام لگانا کہاں تک صحیح ہو سکتا ہے۔[۱] حضرت شاہ راجوؒ کا اخلاقی اور مذہبی اثر جس طرح اس کے بادشاہ ہونے سے پہلے تھا بادشاہ ہونے کے بعد بھی رہا، بلکہ یہ کہنا صحیح ہو گا کہ بادشاہ ہونے کے بعد اس کی عقیدت مندی بہت بڑھ گئی تھی اور اکثر وہ اپنے مرشد کے گھر پیدل جایا کرتا تھا جو اس شعر سے ظاہر ہے ؎[۲]

چل آیا ہے شہ تیرے گھر شاہ راجوؒ

---

[۱] "ماہ نامہ" کا مولف کہتا ہے کہ :۔ "ابوالحسن شب و روز وظائف و خدمت گذاری فقراء می گذرانید۔" اور اگرچہ فقراء گانجہ وغیرہ پینے کے عادی ہوتے ہیں، لیکن ابوالحسن نے اس کا شوق نہیں کیا، گو اس نے فقراء کے لئے یہ چیزیں ضرور فراہم کی تھیں (ماہ نامہ ص ۲۱۴)۔

[۲] شاہ راجوؒ جن کا پورا نام شاہ رضی الدین راجو قتالؒ ہے آخری قطب شاہی دور کے بلند پایہ صوفی اور مذہبی پیشوا ہیں۔ یہ حضرت حسین شاہ ولیؒ کے بھائی اور حضرت بندہ نوازؒ کی اولاد میں سے ہیں۔ یہ بیجاپور میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کے والد جو اسی نام سے موسوم ہیں محمد قلی قطب شاہ کے عہد میں حیدرآباد آئے تھے، لیکن شاہزادہ عبدالقادر کی وجہ سے ان کو حیدرآباد سے باہر جانا پڑا تھا کیوں کہ دوسرے مشائخین کے ساتھ یہ بھی عبدالقادر کی تائید پر کھڑے ہوئے تھے اس لئے یہ بیجاپور چلے گئے۔ شاہ راجوؒ ثانی جو ابوالحسن کے مرشد ہیں بیجاپور میں پیدا ہوئے تھے اور غالباً عبداللہ قطب شاہ کے عہد میں حیدرآباد آکر بس گئے۔ حیدرآباد میں ان کے بے شمار مرید تھے اور ان کا بہت اونچا مقام تھا۔ ابوالحسن تاناشاہ ان کا خاص مرید تھا اور (باقی بر صفحہ ۳۲۷)

اس کے علاوہ اپنے چودہ سالہ عہدِ حکومت میں اس نے خارجی اور داخلی مسالک میں جس بیدار مغزی اور انہماک سے کام کیا تھا اس کی ایک عیاش آدمی سے کبھی توقع نہیں کی جا سکتی۔ نیز اس کی غیر متزلزل خودداری اور استقلال کے سبق آموز مظاہرے جو فتح گولکنڈہ کے وقت ظاہر ہوئے تھے ان الزامات کی صریح تردید کر دیتے ہیں، یہ ایک عیاش آدمی کا کردار نہیں ہو سکتا۔ برخلاف اس کے ان واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ ابوالحسن ایک بڑا آدمی تھا، اور اگر اس کو موقع ملتا تو وہ ایک مدت تک دکن کی صحیح رہنمائی کرتا۔ اس میں ایک اچھا ذوقِ سلیم تھا اس نے علم و فن اور فنونِ لطیفہ کی بھی خدمت کی ہے، اس کے دربار میں کئی شاعر و عالم تھے اس انتشار کے زمانے میں بھی جب کہ اس کو ہمیشہ مغل سیلاب کا خدشہ لگا ہوا تھا۔ لطیف عمارتیں بھی بنائی تھیں منجملہ کے بعض عمارتیں اب تک موجود ہیں۔ اس کے لطیف ذوق کے تو حیدرآباد میں عجیب قصے مشہور ہیں۔ اگرچہ اس نے چودہ سال سے زیادہ حکومت نہیں کی لیکن واقعہ یہ ہے کہ ابوالحسن اپنے بلند کردار اور اوصاف کی وجہ سے تمام قطب شاہوں میں سب سے زیادہ ہر دل عزیز تھا۔ آج یہ تاریخ کی ایک ناقابلِ فراموش ہستی کے طور پر سامنے آتا ہے۔ صدیوں کے بعد آج بھی ہندو و مسلمان دونوں طبقوں میں اس کی یاد تازہ ہے۔ آندھرا کے ہندو گھروں میں تو وہ رشی اور بھگت کے طور پر گنا جاتا ہے اور مسلمان شادی اور خصوصاً

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۲۶) اس کی تعلیم و تربیت میں شاہ راجو کا بڑا حصہ ہے۔ ۱۰۹۶ھ/۱۶۸۴ء میں ان کا انتقال ہوا۔ فتح دروازے کے باہر یہ دفن ہوئے۔ یہیں ان کی خانقاہ تھی۔ تاناشاہ نے ان کی قبر پر ایک عظیم الشان گنبد بنائی۔ (اولیائے دکن۔ عبدالجبار خاں آصفی، جلد اول ص ۳۳۷ و ۳۳۹) ، مآثر دکن۔ بلگرامی ص ۵۰۔

جلوے کے موقعے پر برکت کے لئے اس کا نام لیا جاتا ہے[1]۔ اور کچھ اسی وجہ سے اس زمانے کے اہل الرائے اس قطب شاہی سلطنت کو بہت امید افزا سمجھتے تھے اور اس کی بقا کے آرزومند تھے۔ چنانچہ ایک ہمعصر مورخ نے ان الفاظ میں اپنی دلی تمنا کا اظہار کیا تھا:۔

"بہ یمن تائیدات ایزد داد گر حسن اعتقاد بہ آئمہ اثنا عشرہ علیہم الصلواۃ من الملک الاکبر این دولت ابد قرین تا حال تحریر این صفحات فردوس آئین کہ سنہ ہزار نود و دو است (۱۰۹۲ھ) یک صد و ہشتاد سال می شود کہ در آن سلسلہ علیہ متداول است۔ امید از حضرت مالک الملک اللذی تجری بہ امرہ الفلک آن است کہ انتہائے این سلطنت ابد نشان بہ ابتدائے دولت حضرت صاحب العصر و الزمان علیہ وعلی آباہ الصلواۃ الملک المنان اتصال پذیرد۔"

اور اسی مورخ نے ذیل کے اشعار میں ابوالحسن قطب شاہ کو دعا دی ہے ؎

بہ تخصیص شاہ جہاں بوالحسن — کہ در سایۂ اوست مارا وطن
خدایا بہ اعزاز خیر الورا — بحق نجوم سپہر ہدا
کہ آن خسرو عادل پاک دین — ہمیشہ بہ اقبال بادا قرین

---

[1] تانا شاہ کے متعلق آندھرا پردیش کی ایک روایت یہ مشہور ہے کہ تانا شاہ اپنے پہلے جنم میں ایک پاکباز برہمن تھا اور شیو لنگ کی پوجا کرتا تھا لیکن وہ اپنے بعض گناہوں کی علت میں روحانیت کی بلندیوں تک نہیں پہنچ سکا۔ تاہم اس کے سامنے شیو کا ظہور ہوا اور اس کو یقین دلایا گیا کہ دوسرے جنم میں وہ بادشاہ ہوگا یعنی ہندو راجہ تو نہ ہوگا کیوں کہ اس سے گناہوں کا ارتکاب ہوا ہے بلکہ اچھوت مسلمان ہوگا (ویدم دینکٹ تارا کی تصنیف "اکنا اور مادنا کی کہانی")۔

بہ دُنیا بماناد بسیار سال نگہبان او حضرتِ ذوالجلال[1]

---

[1] حدائق السلاطین، مولفۂ علی بن طیفور بسطامی۔ آخری ورق۔ یہ تاریخ جس میں گولکنڈے کے سلاطین اور اُمراء کا حال درج ہے ۱۰۹۲ھ میں لکھی گئی ہے۔ ابوالحسن کے عہد کا یہ ایک ہی ماخذ ہے جس پر اعتماد کیا جا سکتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کا مولف علی بن طیفور کئی مرتبہ گولکنڈہ آیا اور گیا، لیکن اپنی تاریخ اس نے گولکنڈے ہی میں لکھی ہے اور بادشاہ نے اس کو بہت کچھ انعامات دیئے۔

حصّۂ پنجم

گولکنڈے کا تمدن

عبداللہ قطب شاہ

- دختر زوجہ سید احمد
- دختر زوجہ شہزادہ محمد سلطان
- دختر زوجہ ابوالحسن قطب شاہ
  - خدابندہ
  - دختر زوجہ سکندر عادل شاہ
  - دختر زوجہ عنایت خاں
  - دختر زوجہ محمد عمر نقشبندی

نوٹ :- یہ شجرہ کلام الملوک مولفہ سعادت علی صاحب رضوی سے ماخوذ ہے۔



محمد امین میر جمله



میر محمد مومن



مادنا (دیوان ابو الحسن تانا شاہ)



اکنا پیشکار

بائیسواں باب

سیاست و معاشرت

قطب شاہ تمدن کے بہت بڑے شمع بردار تھے۔ تلنگانے کی سرزمین میں جہاں ان لوگوں نے راج کیا ایک ایسا پاکیزہ تمدن پیدا کیا تھا جس کے نقوش اب تک موجود ہیں۔ اس تمدن میں جس کو قطب شاہی تمدن کہنا چاہئے مختلف عناصر کا امتزاج تھا۔ پہلے تو یہ لوگ ایران و ترکستان سے بھی جو ان کا جنم بھوم تھا کچھ تمدنی عناصر اپنے ساتھ لائے تھے۔ ہم جانتے ہیں کہ سلطان قلی قطب شاہ جو ہمدان سے آیا تھا ترکستان کے ایک بڑے شاہی خاندان کا چشم و چراغ تھا۔ یہ سمجھنا کچھ خلاف قیاس نہیں ہے کہ اس کے دل و دماغ میں ترکستانی سیاست اور معاشرت کے کچھ نہ کچھ اثرات ضرور رہے ہوں گے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ قطب شاہوں کا تمدنی سرمایہ زیادہ تر گلبرگہ اور بیدر کے تمدنی ذخائر سے ماخوذ تھا، کیوں کہ قطب شاہ اس سلطنت بہمنی کے براہ راست حلقہ بگوش اور خوشہ چیں تھے جس نے چودھویں اور پندرھویں صدی عیسوی میں دکن کی پرزور سیاسی اور معاشرتی رہنمائی کی تھی۔ دکنی ملت کا تخیل اور اس کی انوکھی سیاست و معاشرت جسے دکن کے مخصوص جغرافیہ اور قومیتوں کا عکس سمجھنا چاہئے بہمنی سلطنت کی

پیداوار تھی، اسی سلطنت نے دکن کے لئے بہترین نظامِ حکومت بنایا، معاشرت کے زرین اصول سکھائے اور نئی وضع قطع پیدا کی۔ اہلِ دکن کی ذہنی اور اخلاقی تربیت کا اچھا سامان جمع کیا جو اس کے پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ دکن کے تمام طول و عرض میں جہاں اس سلطنت کا پرچم لہراتا تھا بہمنیوں کے گہرے نقوش موجود تھے اور یہ آج بھی ہیں۔ یہ ظاہر بات ہے کہ اس ماحول میں جو جدید نظامِ حکومت و معاشرت قائم ہوتا وہ کبھی ان تاثرات سے کیسے خالی ہو سکتا ہے۔ سلطان قلی نے برسوں بہمنی فضا میں سانس لی تھی اور جب وہ تلنگانے کا صوبہ دار ہوا تو اس کے سامنے سوائے بہمنی آئین کے اور کیا ہو سکتا ہے۔ اسی آئین کی اس نے پیروی کی، یہ اور اس کے تمام جانشین بہمنی معاشرت میں ڈوبے ہوئے تھے اور وہ اس سے کبھی الگ نہیں ہو سکے۔ اس طریقے سے تلنگانے میں جو قطب شاہی تمدن اُجاگر ہوا اس کی بنیاد اور سراپا سب بہمنی تھا۔ گولکنڈے کی قطب شاہی سلطنت پر کچھ حصر نہیں ہے بلکہ اس کی تمام ہمعصر سلطنتیں جو بہمنی سلطنت کے کھنڈروں پر قائم ہوئی تھیں، وہ سب بہمنی معاشرت اور سیاست کی خوشہ چین تھیں، ان کا نظامِ حکومت بہمنی تھا، اور جس قدر معاشرت تھی اس پر بہمنی رنگ چڑھا ہوا تھا۔ اس سے اور آگے بڑھ کر دیکھا جائے تو سترھویں اور اٹھارھویں صدی میں مرہٹوں نے جو ایتی راجدھانیاں قائم کی تھیں ان میں بھی بہمنی عناصر پائے جاتے تھے اور آج بھی دکن اسی تمدن کا رہینِ منت ہے۔

لیکن یہ بات نظر انداز نہیں ہونی چاہیے کہ قطب شاہوں نے اپنے تمدن کو تلنگانے کے نئے ماحول میں مقامی عناصر کے ساتھ کچھ اس طرح مرکب کیا تھا کہ وہ دکھنی پیداوار معلوم ہوتی تھی۔ قطب شاہ اس بات کو خوب سمجھتے تھے کہ ان کی سلطنت تلنگانے میں ٹھیٹ ترکستانی اور بہمنی نہیں ہو سکتی بلکہ اس میں مقامی عناصر بھی ایسے جذب ہونے چاہئیں کہ اس میں تلنگانے کا پورا عکس دکھائی دے۔ یہ قطب شاہی سلطنت کا سرمایۂ افتخار ہے کہ اس نے اپنے آپ کو تلنگانے کی قومی اور جغرافی

خصوصیات کے ساتھ کچھ اس طرح پیوست کر دیا کہ نصف صدی کے بعد یہ ایک آندھرا اجدھانی معلوم ہونے لگی اور شاہان قطبیہ آندھرا راجگان معلوم ہوتے تھے، کیوں کہ تلنگانے کو ان لوگوں نے اپنا گھر بنا لیا، تلنگی عورتوں سے شادیاں کیں اور ترکستانی وضع قطع چھوڑ کر مقامی لباس اور طور وطریق اختیار کیے اور تلنگی زبان سیکھی اور اس میں شاعری کی۔ ملک کے ہر طبقے کو مذہب کی پوری آزادی حاصل تھی[1]۔ اس ہم آہنگی کا نتیجہ یہ تھا کہ قطب شاہوں نے نہایت آسانی کے ساتھ تلنگانے کی قومی اور جغرافی خصوصیات کی صحیح پیمائش کر کے بہت جلد ایک تعمیری خاکہ تیار کر لیا اور اس ملک کی ہر طرح سے تعمیر کی۔ آندھرا قوم کو اپنی رعایا سمجھ کر آگے بڑھایا، تلنگی زبان کی سرپرستی کی اور تمدنی ترقی کے تمام راستے کھول دیئے اور غالباً یہ تاریخ آندھرا کا سنہری زمانہ تھا۔

زمانہ حال کے ایک مورخ نے قطب شاہوں کو ان الفاظ سے سراہا ہے جس سے حقیقت حال پر خاطر خواہ روشنی پڑتی ہے: "تمام مسلمان خاندانوں میں جنھوں نے ہندوستان میں راج کیا قطب شاہ سب سے زیادہ روشن خیال گزرے ہیں اس میں کوئی شک نہیں ان لوگوں نے جب کبھی غیر علاقوں پر حملہ کیا تو دشمن کی سرزمین میں ہندو مندروں کو برباد کیا لیکن اپنی سلطنت میں ہندوؤں کو جو آزادی دے رکھی تھی وہ دوسری مسلمان سلطنتوں میں نہ تھی۔ نہ صرف یہ بلکہ قطب شاہوں نے مذہبی بنیاد پر ہندوؤں کو ملکی خدمات پر فائز کرنے میں کوئی تفریق نہ کی۔ ہندو بھی سلطنت کی بڑی سے بڑی خدمت پر ایسے فائز ہو سکتے تھے جیسے خود مسلمان قطب شاہی راج کا سب سے زیادہ دلچسپ پہلو یہ ہے کہ راعی اور رعایا میں بڑی یگانگت تھی۔ قطب شاہوں نے کبھی اپنی رعایا پر برتری نہیں جتائی گو بادہ فاتح کی حیثیت میں آئے تھے۔ یوں تو وہ مسلمان تھے مگر اپنے طور و طریق میں اپنی رعایا کی طرح آندھرائی ہو گئے تھے"[2]۔

اگرچہ قطب شاہی دستور میں بہمنی نظام حکومت کا چربہ اُتارا گیا تھا اور یہ قطب شاہوں کیلئے ناگزیر تھا

بادشاہ | تاہم اس میں زمانی اور مقامی خصوصیات نظر انداز نہیں کی گئی تھیں۔ مرکزی اور مقامی حکومتوں کی

---

[1] گولکنڈے کے تعلقات ص ۱۲ [2] ڈاکٹر دینکٹ رامیا۔ سلور جوبلی سووینیر ایڈیٹر حمیرآف کامرس ص ۴۶۔

ترتیب میں اس بات کا پورا لحاظ تھا کہ وہ عصری ضروریات کا جواب ہو، اس لئے گو دستور کی بنیاد تمام تر بہمنی تھی لیکن بایں ہمہ اس میں فروعی اختلافات بھی تھے۔ بہمنیوں کی طرح قطب شاہی حکومت بھی ایک "شاہی" تھی، یعنے بہمنی بادشاہوں کی طرح قطب شاہ بھی مطلق العنان حکمران تھے۔ دستور میں کوئی ایسا آلۂ حکومت نہ تھا جسکی بدولت وہ رائے عامہ کا مظہر ہوتا اور بادشاہوں کو عام خوشنودی کا پابند کرتا۔ بادشاہوں کی ذات ظاہری و باطنی مختلف صفات کی حامل سمجھی جاتی تھی اور اس میں تقدس بھی تھا۔ قرونِ وسطیٰ کے تمام اسلامی بادشاہوں کی طرح یہ بھی "ظل اللہ" سمجھے جاتے تھے، یہ خود بھی اپنے کو "ظل اللہ" کہتے تھے اور بعض تو "ظل اللہ" تخلص کرتے تھے[1]۔ یہ شاہی رعب داب قائم کرنے کا اچھا ہتھیار تھا جو قرونِ وسطیٰ میں ہر جگہ استعمال کیا گیا۔ تاہم یہ ماننا پڑتا ہے کہ تمام قطب شاہ بڑے ذی علم شایستہ انسان تھے اور حکمرانی میں اپنی پوری ذمہ داری محسوس کرتے تھے۔ اکثر واقعات سے پتہ چلتا ہے کہ یہ لوگ اپنے وزراء سے مشورہ کرتے تھے اور اس پر عمل کرتے تھے اور خاص معاملات میں علمائے عصر سے بھی مشورہ کیا کرتے تھے، چنانچہ عبداللہ قطب شاہ نے ۱۰۴۶ھ/۱۶۳۶ء میں علماء سے مشورہ کرکے شاہجہاں کی شرطیں تسلیم کی تھیں[2]۔ ان میں رواداری اور رعایا پروری بے حد تھی اور عدل گستری ان کا خاص شعار تھا۔ ان لوگوں نے اپنی تلنگی رعایا کے ساتھ وہی سلوک کیا جو مسلمانوں کے ساتھ کرتے تھے۔ یہاں تک کہ بادشاہوں نے ہندو طبقے کے مذہبی جذبات کا لحاظ کرکے منگل کو تعطیلِ عام قرار دی تھی اور تانا شاہ نے بھدراچلم اور بھرمارامیشور سوامی نامی مندروں کو جو گوداوری اور کرشنا پر واقع ہیں زرخیز جاگیریں عطا کی تھیں

---

[1] محمد قلی قطب شاہ اور سلطان محمد قطب شاہ "ظل اللہ" تخلص کرتے تھے۔ حیدرآباد کے مشرق میں ایک موضع اسی نام سے "ظل اللہ گوڑہ" کہلاتا ہے۔

[2] حدیقۃ السلاطین، صاعدی، مطبوعہ ادارہ ادبیات اردو، ص ۱۵۲۔ ۱۷۳۔

جس سے اس بادشاہ کی کشادہ خیالی اور مذہبی رواداری معلوم ہوتی ہے[1]۔ اس لئے اہل تلنگانہ قطب شاہی سلطنت کو اپنی سلطنت سمجھتے تھے۔ چنانچہ سلطان قلی قطب شاہ کو تلنگانہ میں آئے ہوئے ابھی بہت روز نہیں ہوئے تھے کہ تلنگی رعایا اس کو بڑے ملک کے ہر دلعزیز لقب سے یاد کرنے لگی اس کے جانشینوں کے ساتھ بھی یہی محبت تھی اور بلکہ اکثر "ماں صاحب" کے نام سے یاد کی جاتی تھیں۔

---

[1] بھدراچلم کا مندر گوپنا رام داس کا تعمیر کیا ہوا ہے جو غالباً مارچ ۱۶۵۲ء میں تعمیر ہوا ہے (دثائق دفتر دیوانی) گوپنا رام داس اس زمانے کا مشہور رام بھگت ہے۔ اس مندر کی تعمیر کا دلچسپ قصہ یہ ہے کہ گوپنا بھدراچلم کا تحصیلدار تھا۔ ایک مرتبہ اس نے رقم مالگذاری جو اس کے ہاں جمع ہوئی تھی شاہی خزانے میں داخل کرنے کی بجائے مندر کی تعمیر میں صرف کر دی۔ جب سلطنت کے عہدہ داروں کو یہ حال معلوم ہوا تو اس کو تغلب کے الزام میں گرفتار کر لیا اور قلعۂ گولکنڈہ میں قید کر دیا۔ چنانچہ آج بھی لوگ اس کوٹھری کی نشان دہی کرتے ہیں جس میں گوپنا قید تھا۔ کہتے ہیں کہ اس قید کا گوپنا پر کوئی اثر نہیں ہوا بلکہ وہ اطمینان کے ساتھ اپنی روزمرہ عبادت کرتا رہا اس عبادت سے متاثر ہو کر شری رام انسان کی شکل میں ظاہر ہوئے اور مالگذاری کی تمام رقم جس سے مندر تعمیر ہوا تھا خزانۂ شاہی میں داخل کر دی اور گوپنا قید سے رہا کر دیا گیا اور رام بھگت کے نام سے مشہور رہا۔ ابو الحسن تانا شاہ نے اس مندر کے اخراجات کے لئے بھدراچلم، پالونچہ اور شنکر گیری پٹی ناحی تین موضعے عطا کئے تھے اور یہ موضع اور گاؤں وغیرہ آصف جاہی دور میں بھی جاری رہے۔ اس کے علاوہ تانا شاہ نے بھرواطیشور اسوامی کے مندر کے لئے تین اور موضع یعنی بھوگا درم، چروکورو اور دیرانا پٹم عطا کئے تھے۔ اس عطا کے لئے تانا شاہ نے جو فرمان جاری کیا تھا وہ اب بھی موجود ہے اور اس پر ۱۲ ربیع الاول ۱۰۹۵ھ تاریخ درج ہے۔ کتب خانہ پروفیسر سجن لال سکندرآباد۔

جلوس و تخت نشینی جب بادشاہ کا انتقال ہوتا تھا تو اس کی تجہیز و تکفین سے پہلے ہی اس کی جانشینی کا انتظام کیا جاتا تھا تاکہ حکومت کی رفتار میں کوئی فرق نہ آئے۔ چنانچہ عبداللہ قطب شاہ کی اسی طریقے پر محمدی محل میں تخت نشینی ہوئی، اس میں تمام اُمراء و عمائدِ سلطنت اور فوجی افسر جمع ہوتے تھے اور سلام کرتے تھے اور اس کے بعد عوام کو بھی موقع دیا جاتا تھا کہ وہ نئے بادشاہ کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں اور اس کو دربارِ عام کہا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ عام اطلاع کے لئے ہاتھیوں اور اونٹوں پر، تمام شہر میں منادی کی جاتی تھی، یعنے جارچیاں اور منادیاں ہاتھیوں اور اونٹوں پر بیٹھ کر شہر میں گھومتے تھے اور اُدپر سے نئے بادشاہ کا اعلان کرتے تھے۔ یہ ایک موقتی انتظام تھا۔ لیکن اس کے دو چار روز کے بعد جب تجہیز و تکفین اور سوگ سے فراغت ہو جاتی تو باضابطہ تخت نشینی کا انتظام ہوتا تھا۔ اس کے لئے ایک مناسب اور مُبارک تاریخ مقرر ہوتی تھی اور خاص اہتمام کے ساتھ تخت نشینی کا دربار ہوتا تھا۔ صبح سے اس کا اہتمام ہوتا تھا۔ پہلے نقارے، دمامے، کرنا و نفیر بجتے تھے تاکہ دُور دُور تک اس کی اطلاع پہنچ جائے، اس کے بعد تمام اُمراء و عمائدِ سلطنت اور مُلک کے تمام علماء و فضلاء ایوانِ شاہی میں جمع ہوتے اور بادشاہ کو قطب شاہی تخت پر بٹھاتے تھے اور پھر اپنی جگہ کھڑے ہو کر آداب و سلام بجا لاتے تھے اور دعا دیتے تھے، اور بالعموم ایسے درباروں میں قصیدۂ مُبارک باد بھی پڑھے جاتے تھے۔ سلطان محمد قطب شاہ کی تخت نشینی کے وقت میر مومنؔ نے دو زبردست قصیدۂ تہنیت پڑھے تھے جن میں تاریخی اہمیت پائی جاتی ہے۔ اس دربار کے بعد اظہارِ مسرت میں نہ صرف ارکانِ سلطنت کو جو مرکزی حکومت سے وابستہ ہوتے تھے جامہ دار خانے سے خلعتیں تقسیم ہوتی تھیں بلکہ دُور دراز قلعہ داروں اور نایک واڑیوں کو بھی حسبِ مراتب کپڑے اور انعام دیئے جاتے تھے تاکہ سب اس مسرت میں برابر کے شریک ہیں۔

اس کے علاوہ عام لوگوں کو بھی ہاتھیوں اور توپخانوں پر شیرینی اور شکر بھر کر تقسیم کی جاتی تھی تاکہ ہر طبقہ اس مسرت سے بہرہ اندوز ہو۔[1] اور پھر ایسے موقعے پر ہمسایہ سلطنتوں کی طرف سے سفیر آتے تھے اور مرحوم بادشاہ کی تعزیت اور جدید بادشاہ کی تہنیت کرتے تھے۔ چنانچہ قطب شاہوں کے پاس نہ صرف احمد نگر اور بیجاپور سے سفیر آئے بلکہ بعض موقعوں پر سلاطینِ خلیہ اور سلاطینِ صفوی نے بھی سفیر بھیجے اور تعزیت و تہنیت کی۔

شاہی دربار

بہمنی سلاطین کی طرح قطب شاہ بھی بڑے تزک و احتشام کیساتھ اپنے دربار جماتے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سلطان قلی قطب شاہ کے عہد میں شاہی بارگاہ اور دربار کا سیدھا سادہ رنگ تھا، لیکن ابراہیم کے عہد میں جب دولت خانۂ عالی کی تعمیر ہوئی تو اس میں بڑے تزک و احتشام کے ساتھ دربار ہونے لگے اور محمد قلی قطب شاہ کے عہد میں تو اس کی رونق بہت بڑھ گئی۔ دولت خانۂ عالی کا بڑا ایوان جہاں دربار ہوتا تھا کوئی ہزار گز کے قریب طویل تھا، اور اس کے چاروں طرف عالی شان ایوان اور محرابیں تھیں۔ اس کا دروازہ جو ہندو طرزِ تعمیر کا آئینہ دار تھا شرقی جانب واقع تھا، اور بیس گز بلند رفیع الشان ستونوں پر قائم تھا۔ دروازے کے بالائی حصے میں ایک نہایت بلند عمارت تھی اور اس کے سامنے نقارخانہ تھا جس میں نوبت بجتی تھی جو شاہی امتیاز ہے۔ ہر روز صبح دربار ہوتا تھا، تمام اُمراء و عمائد کو حکم تھا کہ اپنی فوج اور ہاتھیوں کے ہمراہ سلام کے لئے دربار میں آئیں۔ یہ اپنے خدم و حشم کو باہر چھوڑ دیتے تھے اور خود تنہا آکر سلام کرتے تھے۔ شاہی رُعب داب کے لئے شاہی فیل خانے کے ہاتھی اور شاہی فوج کے ہزار پیادے دولت خانۂ عالی کے سامنے دو رویہ صفیں باندھ کر

---

[1] حدیقۃ السلاطین، مطبوعہ ادارۂ ادبیاتِ اُردو ص ۲۹ و ۳۰ و ۳۱۔

کھڑے رہتے تھے اور اس کے علاوہ حبشی سرداروں کے تحت کئی سو مسلح سپاہی پہرہ دیا کرتے تھے۔ اس بارگاہِ شاہی کے جنوب میں شاہی دفترخانہ اور مغرب میں جام دار خانہ اور شاہی کارخانوں کی عمارتیں تھیں"۱ شہر حیدر آباد میں شاہی قصر یعنے داد محل اور محمدی محل تعمیر ہوئے یہاں بھی یہ دربار ہونے لگے۔ ان درباروں میں اُمراء و عمائدِ سلطنت بیٹھ نہیں سکتے تھے اپنے مراتب کے مطابق کھڑے ہوتے تھے۔ بعض مرتبہ مُلک کی بڑی شخصیت رکھنے کی اجازت دیجاتی تھی اور وہ خاص امتیاز اور بڑا اعزاز سمجھا جاتا تھا بڑے درباروں کے علاوہ قطب شاہوں کی چھوٹی اور خاص مجلسیں بھی ہوتی تھی یہاں شاہی تخت کی جگہ صرف مسند بچھی ہوتی تھی اور وزراء سے گفتگو ہوتی۔

خارجی مسلک

قطب شاہوں کا خارجی مسلک وسعت نظر، راستبازی اور دُور اندیشی پر مبنی تھا۔ ملک میں اپنی سلطنت کی فلاح کے ساتھ پورے دکن کی سالمیت پیش نظر تھی۔ اسی اصول کی روشنی میں جنگ و صلح کے فیصلے اور بین المملکتی معاہدے ہوتے۔ گولکنڈے کے ساتھ جتنی لڑائیاں ہوئیں اور معاہدے ہوئے ان میں بھی بین مملکتی بھائی چارہ پنہاں تھا۔ جب کسی مملکت کا پلہ بھاری ہوتا اور وہ قوی مملکت کمزور مملکت پر دست درازی کرتی تو قطب شاہی سلطنت نے موقع پر کمزور کی دستگیری کرتی۔ چنانچہ بیجاپور کے مقابلے میں گولکنڈے نے ہمیشہ احمد نگر کا ساتھ دیا تاکہ توازن قوت قائم رہے، اور جب کبھی پورے دکن کی سالمیت خطرے میں پڑتی تھی تو قطب شاہی مملکت بڑے اتحاد میں شریک ہوتی تھی اور آنے والے خطرے کو روکتی تھی چنانچہ جنگ تالیکوٹ اور دوسری لڑائیاں اسی برادرانہ جذبے کی روشن مثالیں ہیں۔ چاند بی بی اور ملک عنبر کی تائید میں بھی یہی جذبہ

۱؎ مضمون مولوی غلام یزدانی صاحب ناظم آثار قدیمہ حیدر آباد۔ رسالہ اُردو ۱۹۱۶ء۔

کارفرما تھا۔ سترھویں صدی کے اوائل میں وسط ایشیا کی ایک اور سیاسی رو اس خارجی مسلک میں شامل ہو گئی۔ محمد قلی قطب شاہ نے کچھ تو مغلوں کے خطرے سے ڈر کر اور کچھ مذہبی یگانگت سے ایران کے صفوی سلاطین کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا تھا اور اس دوستی میں صفوی حکمرانوں کا بھی فائدہ تھا کیوں کہ وہ ایک طرف عثمانی ترک اور دوسری طرف ہندوستان کی مغل طاقت سے خائف تھے اور گولکنڈہ اور بیجاپور کی تائید سے اپنی طاقت بڑھانا چاہتے تھے۔ چنانچہ ہم اوپر دیکھ آئے ہیں کہ محمد قلی قطب شاہ کے عہد میں سب سے پہلے ۱۰۱۲ھ/۱۶۰۳ء میں سفیر ایران گولکنڈہ آیا اور قطب شاہی دربار سے قنبر علی اور مہدی قلی سفیر بن کر گئے اور رسم بازدید ادا کی۔ اس کے بعد ۱۰۲۳ھ/۱۶۱۴ء میں ایران سے حسین بیگ قبچاچی گولکنڈہ آیا اور اس نے محمد قلی کی وفات پر تعزیت کی اور سلطان محمد قطب شاہ کی تخت نشینی پر رسم تہنیت ادا کی اور اس کے ایک سال بعد گولکنڈے سے ۱۰۲۴ھ/۱۶۱۶ء میں شیخ محمد بن خاتون ایران بھیجا گیا اور اس نے صفوی دربار میں پیامِ دوستی و اتحاد پہنچایا لیکن شیخ سلطان محمد کے انتقال کے بعد ۱۰۳۵ھ/۱۶۲۶ء میں واپس آیا اور شیخ کے ساتھ سفیر ایران قاسم بیگ آیا تھا اور اس نے عبداللہ قطب شاہ کو جلوسِ شاہی کی مبارک باد دی۔ لیکن بدقسمتی سے یہ سفیر حیدر آباد میں مر گیا اور اس کا بیٹا محمد قلی بیگ دو سال کے بعد واپس ہوا تو اس کے ساتھ گولکنڈے سے خیرات خاں روانہ کیا گیا[1]، اور یہ ایران اور گولکنڈے کی آخری سفارتیں تھیں۔ اس کے بعد ایران کے ساتھ سفارتی تعلق باقی نہیں رہا کیوں کہ اس اثنا میں دکن میں مغلوں کا غلبہ اس قدر بڑھ گیا تھا کہ اس کے ہوتے ہوئے کسی بیرونی طاقت کا رسوخ ناممکن ہو گیا۔ ۱۰۴۵ھ/۱۶۳۵ء میں نظام شاہی سلطنت ہمیشہ کے لئے مغل سیلاب میں بہہ گئی اور ایک سال کے بعد

---

[1] حدیقۃ السلاطین، ص ۸۱ و ۱۴۳۔ مآثر دکن، بلگرامی ص ۴۲ و ۴۳ و ۳۹ و ۴۰۔

۱۰۴۶ھ / ۱۶۳۶ء میں بیجاپور اور گولکنڈہ کی سلطنتیں مغل شہنشاہیت کی باجگذار ہوگئیں۔ اب مغل شہنشاہ ایران کا بیرونی تعلق کیسے گوارا کرسکتے، چنانچہ ۱۰۴۶ھ / ۱۶۳۶ء والے معاہدے میں یہ شرط عائد کی گئی تھی کہ وہ ایران سے اپنا رشتۂ اتحاد منقطع کرلیں۔ اس کے بعد ایرانی سفرا کی جگہ مغل حاجب آنے لگے اور قطب شاہی سیاست میں دخیل ہوگئے جس کی وجہ سے عبداللہ قطب شاہ کی سیاست بدمزہ ہوگئی۔

وزرا

پیشوا

اگرچہ بادشاہ سلطنت کا نفسِ ناطقہ تھا۔ لیکن حکومت کے عاملانہ فرائض کیلئے مرکز میں کئی وزیر مقرر تھے اور ان پر خاص سلیقے کے ساتھ فرائض اور اختیارات کی تقسیم کی گئی تھی۔ بعض وزراء تو بالکل وہی تھے جو بہمنی وزارتی ترتیب میں پائے جاتے تھے، یعنے وزیر اعظم "وکیلِ مطلق" یا پیشوا کہلاتا تھا جسکے ہاتھ میں امورِ سلطنت کی نگرانی، داخلی اور خارجی مسلک حکومت کی تشکیل تھی۔ بادشاہ بالعموم اسی وزیر سے مشورہ کرتے تھے، اس خدمت پر اکثر بڑے پایہ کی شخصیتیں مامور کی جاتی تھیں جن کی علمی وعملی قابلیت مسلمہ ہوتی تھی اور عطائے عہدہ کے موقعے پر خلعتِ پیشوائی اور دوسرے اعزازی امتیازات عطا کئے جاتے تھے اور بالعموم میر جملہ کے عہدے سے پیشوائی پر ترقی دی جاتی تھی، چنانچہ ابراہیم قطب شاہ کے عہد میں مصطفےٰ خاں اردستانی اور محمد قلی قطب شاہ کے عہد میں میر محمد مومنؒ اور عبداللہ قطب شاہ کے عہد میں شیخ محمد ابن خاتون جیسی شخصیتیں اس خدمت پر فائز تھیں۔ میر مومن اور شیخ محمد تو ایسے سربلند تھے کہ ان لوگوں کو پالکی میں بیٹھ کر دولت خانۂ عالی میں آنے کی اجازت تھی اور یہ تخت کے بائیں جانب بیٹھ جاتے تھے۔ چنانچہ عبداللہ قطب شاہ کے ابتدائی عہد میں جب شاہ محمد پیشوا تھا تو اس کی امداد کے لئے شیخ محمد کو اس کا نائب بنایا گیا۔ ابوالحسن قطب شاہ کے عہد میں ایک جدت یہ ہوئی کہ پیشوا کو

دیوان" کے لقب سے یاد کیا گیا۔ یادتا جو پیشوا کے فرائض انجام دیتا تھا "دیوان" کہلاتا تھا نہ کہ پیشوا۔

میر جملہ پیشوا کے بعد دوسرا بڑا وزیر "میر جملہ" تھا جس کو بہمنی اصطلاح کے مطابق امیر جملہ کہنا چاہئے۔ اس کو جملۃ الملک خطاب ہوتا تھا، اور اس عہدے کو وزارت جملۃ الملکی کہتے تھے۔ فرائض کے اعتبار سے دیکھا جائے تو یہ زمانۂ حال کا وزیر مالیات تھا، یعنے تمام سلطنت کے مداخل اور مصارف کی جانچ پڑتال اسی کے سپرد ہوتی تھی، یہ سلطنت کی تمام مالگزاری کی گرفت اور ہر محکمے کے خرچ کی تنقیح کرتا تھا، کیوں کہ مالیات کے ساتھ بالعموم حسابی تنقیح شامل رہتی ہے۔ دوسرے شعبوں کے ساتھ یہ بالخصوص کوتوالی اور فوج کی بھی تنقیح کرتا تھا۔ اس طریقے سے اس عہدہ دار کے اختیارات اور اثرات بہت وسیع تھے جو خود پیشوا کو بھی حاصل نہ تھے، کیوں کہ اس کے ہاتھ میں تمام سلطنت کا روپیہ ہوتا تھا اور اس کو تنقیح کا اختیار تھا۔ چنانچہ بعض موقعوں پر قطب شاہی میر جملہ پیشوا سے بھی بڑھ گئے اور بعض جلیل القدر میر جملہ خود پیشوا کے اختیارات بھی استعمال کرتے تھے۔ چنانچہ محمد قلی قطب شاہ کے عہد میں مرزا محمد امین اور عبداللہ قطب شاہ کے عہد میں مُلّا تقی اور میر محمد سعید اردستانی بڑے میر جملہ گزرے ہیں، ان کے ہوتے ہوئے لوگ پیشوا کو خاطر میں نہیں لاتے تھے[1]۔ محمد امین اور مُلّا تقی کو تقرر کے وقت قلمدانِ مرصع دیا گیا تھا جو دوسروں کو نہیں دیا گیا۔

وزیر عین الملک قطب شاہی دستور میں ایک اور بڑی وزارت تھی جس کو "وزارت عین الملکی" کہتے تھے اور اس وزیر کو عین الملک خطاب دیا جاتا تھا۔ اس وزیر کے فرائض اور اختیارات تو

---

[1] حدیقۃ السلاطین ص ۴۶۔

واضح نہیں ہیں لیکن قرائن یہ ہیں کہ یہ محکمۂ فوج کا صدر رہا تھا۔ اگر یہ صحیح ہے تو اہلِ فوج کا تقرر و تنزل اور ان کی دیکھ بھال اس کے ہاتھ میں تھی اور یہ غالباً قطب شاہی افواج کا سپہ سالار بھی ہوتا تھا، چونکہ فوجوں کی رہنمائی بڑی امتیازی چیز ہوتی ہے اس لیئے اس وزیر کی بہت اہمیت تھی۔ نظام الدین صاعدی کے الفاظ میں "سرداری عین الملکی از اعاظم وزارت است"[۱]۔ اس خدمت پر ابتداء میں سیف خاں عین الملک اور آخری زمانے میں منصور خاں حبشی فائز ہوئے۔

مجموعہ دار یہ بھی ایک بڑا عہدہ دار تھا جو مرکزی حکومت میں تمام ملک کی مالگزاری جمع کرتا، اور مرکزی خزانہ کی نگرانی کرتا تھا صاعدی اس عہدے کی ان الفاظ میں وضاحت کرتا ہے "منصب رفیع مجموعہ داری کہ عبارت از استیفائے ممالک است"[۲]۔ لیکن ان فرائض کے اعتبار سے معلوم ہوتا ہے کہ مجموعہ دار میر جملہ کے ماتحت اور اس کا شریک کار تھا، اور اس طریقے سے غالباً یہ وزیر کے رتبے سے کمتر تھا۔ عبداللہ قطب شاہ کے عہد میں نارائن راؤ اس خدمت پر فائز تھا، نہ صرف اس عہدے پر بلکہ محکمۂ مال میں بھی اکثر ہندو مامور کیئے جاتے تھے۔

ناظر جس کو ناظر الممالک خطاب دیا جاتا تھا۔ آمد و خرچ کا حساب رکھتا تھا، اور غالباً یہ بھی مجموعہ دار کی طرح وزیر کے رتبے سے کم اور میر جملہ کے ماتحت سمجھا جاتا تھا۔ مجموعہ دار جمع بندی کرتا تھا تو ناظر خرچ کی تنقیح کرتا تھا۔ محمد قلی قطب شاہ کے عہد میں ابو طالب اور عبداللہ کے عہد میں میر قاسم اس عہدے پر فائز تھے اور بہت مشہور تھے۔

---

[۱] حدیقۃ السلاطین، مطبوعہ ادارہ ادبیات اردو ص ۱۷۔
[۲] ؍؍ ؍؍ ۳۶

دبیر جس کو کبھی "دبیر الممالک" اور کبھی منشی الممالک خطاب ہوتا تھا، بادشاہ کے خاص فرائض انجام دیتا تھا، یعنے یہ شاہی فرامین اور احکام شائع کرتا تھا، اور ملک کے عرائض بادشاہ کے پاس پیش کرتا تھا۔ اس کو زمانۂ حال کی اصطلاح میں "پرایوٹ سکرٹری" کہنا چاہئے۔ سلطان محمد قطب شاہ کے عہد میں خواجہ منظفر علی اور عبداللہ قطب شاہ کے عہد میں مولانا اویس وغیرہ اس خدمت پر مامور تھے۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فرامین فارسی اور تلنگی دو زبانوں میں شائع ہوتے تھے تاکہ سب رعایا ان کو سمجھے اور فائدہ اٹھائے۔ چنانچہ آخر الذکر فرامین کی تدوین کے لئے جن کو "فرامین ہندوی" کہا جاتا تھا ایک برہمن دبیر مامور ہوتا تھا، چنانچہ عبداللہ قطب شاہ کے عہد میں اس خدمت پر اعتماد رائو برہمن مامور تھا۔[1]

کوتوال گو یہ وزیر نہیں تھا لیکن شہر میں قیام امن کے لئے اس کی بڑی اہمیت محسوس ہوتی تھی خصوصاً ایسے موقعوں پر جب کہ شورش کا ڈر ہوتا تھا کوتوال کے فرائض بہت اہم ہو جاتے تھے، چونکہ اس خدمت پر کارکرد لوگ مامور ہوتے تھے اس لئے قطب شاہی سلطنت میں کوتوالی یا پولیس کا انتظام بہت اچھا تھا۔ اس کی باہر کے سیاحوں نے بڑی تعریف کی ہے۔ ٹیورنیر کہتا ہے کہ "شہر میں نہایت اچھی پولیس ہے اور انتظام خاطر خواہ ہے"۔ اور تھیونو کا بیان ہے کہ "قطب شاہی کوتوال ایسے کارکرد ہوتے تھے جیسے زمانۂ حال کے کوتوال ہوتے ہیں۔ بغیر کوتوال کی اجازت کے کوئی اجنبی شہر میں داخل نہیں ہو سکتا تھا۔[2] اجنبیوں پر کڑی نگرانی رکھی جاتی تھی۔ جب نئے لوگ باہر سے آتے تھے تو ان کو دروازوں پر روک لیا جاتا تھا، اور ان کی تحقیق کی جاتی تھی تاکہ وہ مایۂ فساد نہ ہوں، اور

---

[1] حدیقۃ السلاطین ص ۳۶۔

[2] سیاست نامہ تھیونو حصۂ سوم ص ۹۷۔

ان کا سامان بھی دیکھا جاتا تھا[1]۔ کوتوال کی امداد کے لئے ایک نائبِ کوتوال بھی مامور تھا۔

ان بڑے وزرا اور عہدہ داروں کے علاوہ چند چھوٹے عہدہ دار بھی ہوتے تھے، مثلاً فوج کے چھوٹے افسر "سرخیل" کہلاتے تھے، غالباً یہ عین الملک کے ماتحت ہوتے تھے۔ جو سرخیل خاص بادشاہ کی حفاظت کے لئے مقرر ہوتے تھے وہ "سرخیل شاہی" کہلاتے تھے۔ بعض عہدہ دار ایسے تھے جو جام دار خانے اور فیل خانے کا انتظام کرتے تھے، یہ "حوالدار" کہلاتے تھے۔ یہ تمام چھوٹے بڑے عہدہ دار آئینِ سلطنت کے پورے پابند تھے اور جب کبھی ان سے کوئی غلطی سرزد ہوتی یا آئین شکنی ہوتی تو ان کو سزا دی جاتی، اور یہ لوگ بلا لحاظ عہدہ برطرف کر دیئے جاتے تھے۔ چنانچہ ابراہیم قطب شاہ نے اپنے پیشوا مصطفےٰ خاں کو اور سلطان محمد نے اپنے میر جملہ مرزا محمد امین کو ان کی خلاف ورزی کی علت میں برطرف کر دیا۔

حکومت میں کوئی قانون سازی کا شعبہ تو نہ تھا، البتہ مُلک کے رسم و رواج اور شاہی احکام قانون کا درجہ رکھتے تھے جو حکومتِ شاہی کا خاصہ ہے۔ لیکن ان اعضائے عاملہ کے علاوہ جن کا اوپر ذکر ہوا قطب شاہی سلطنت میں عدلیہ کا بھی خاطر خواہ انتظام تھا جس پر قطب شاہ بہت زور دیتے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مُلک میں بالعموم فصل مقدمات کا کام قاضیوں اور پنڈتوں کے تفویض تھا، لیکن بادشاہ بھی بذاتِ خود اس میں دلچسپی لیتے تھے۔ محمد قلی قطب شاہ اور اس کا جانشین سلطان محمد قطب شاہ بڑے انصاف پسند حکمران تھے۔ اول الذکر نے معدلت گستری کے لئے "داد محل" کے نام سے ایک بہت بڑی عمارت بنائی تھی جس کی بہت شہرت تھی۔

---

[1] سیاحت نامہ ٹیورنیر جلد سوم ص ۱۲۵۔

باہر کے سیاحوں نے بھی اس کی تعریف کی ہے، اسی میں بیٹھ کر بادشاہ مظلوموں کی فریاد سنتے تھے، اس کے دروازے بازارات کی طرف کھلتے تھے اور یہ عام حکم تھا کہ جس کسی کو کچھ عرض کرنا ہو وہ بلا مزاحمت بادشاہ کے سامنے آجائے۔ دربان اور چوبدار مزاحمت نہیں کرتے تھے۔ لیکن جب یہ عمارت بجلی کے صدمے سے خراب ہوگئی تو سلطان محمد قطب شاہ کے عہد میں اس کی از سرِ نو تعمیر ہوئی، لیکن اس کے علاوہ سلطان محمد نے "امان محل" کے نام سے ایک اور عمارت بنائی تھی جس کا مقصد بھی یہی تھا یعنے وہ مظلوموں کی پناہ گاہ سمجھی جاتی تھی۔ یہ شاہی دادرسی ہر عہد میں برابر قائم رہی۔ ہر بادشاہ نے اس کا پورا لحاظ رکھا۔ جب فرانسیسی سیّاح ٹیوزنیر، عبداللہ قطب شاہ کے عہد میں گولکنڈہ آیا تو اس نے اپنی آنکھوں سے شاہی عدل گستری کا انتظام دیکھا تھا، وہ کہتا ہے کہ "بادشاہ خود دادرسی کرتے ہیں اور طریقۂ کار یہ ہے کہ بادشاہ محل کے برآمدے پر آتے ہیں اور سب لوگوں کے سامنے میدان میں نیچے اپنی جگہ کھڑے ہو جاتے ہیں، لیکن لوگوں کے کھڑے رہنے کا انتظام یہ تھا کہ زمین میں لکڑیاں نصب کر کے رسیوں کی تین قطاریں باندھی جاتی تھیں اور یہ قطاریں تمام میدان میں پھیلی ہوئی تھیں، ان میں لوگ کھڑے ہوتے ہیں اور بغیر طلب کئے کوئی رسیوں کو پھاند کر نہیں جا سکتا۔ شہ نشین کے سامنے جہاں بادشاہ ہوتے ہیں ایک رستہ چھوڑ دیا جاتا ہے جس میں سے دادخواہ بادشاہ کے سامنے پیش کئے جاتے ہیں، لیکن یہاں بھی سامنے ایک رسی ہوتی ہے، جب کسی کو بلایا جاتا ہے تو دو آدمی شہ نشین کے سامنے کی رسی نیچے جھکا دیتے ہیں تاکہ دادخواہ بادشاہ کے سامنے پہنچ جائے۔ ایک وزیر برآمدے کے نیچے کھڑا ہوتا ہے اور عرائض لیتا ہے۔ جب اس کے ہاتھ میں پانچ یا چھ عرائض جمع ہو جاتے ہیں تو وہ ان کو ایک تھیلی میں رکھ دیتا ہے جو ایک ڈوری کے سہارے اوپر سے چھوڑی جاتی ہے اور ایک خواجہ سرا جو

بادشاہ کے برابر کھڑا ہوتا ہے اس کو اوپر کھینچ لیتا ہے اور بادشاہ کے سامنے پیش کر دیتا ہے[1]۔" دوسرے سیاح تھیونو کا بیان ہے کہ عبداللہ قطب شاہ بہت انصاف پسند ہے، وہ بذاتِ خود عدل گستری میں دلچسپی لیتا ہے اور اُمراء بھی سزا سے نہیں بچتے"۔ چنانچہ یہی ایک امیر کا واقعہ بیان کرتا ہے کہ اس نے ایک صراف کو محل میں بند کر کے اس سے پانچ ہزار روپے وصول کر لئے۔ عبداللہ قطب شاہ کو اطلاع ہوتے ہی اس امیر کو سزا دی اور رقم واپس لے لی[2]۔ دوسرا واقعہ یہ بیان کیا جاتا ہے کہ ایک عہدہ دار ایلچی بیگ نے تاجروں سے قرض لے لیا تھا اور ادا نہیں کرتا تھا، جب تاجروں نے بادشاہ کے پاس شکایت کی تو بادشاہ نے تیس یا چالیس ہزار ہون اس کی آمدنی سے ادا کر دیئے اور جو باقی رہ گئے تھے وہ شاہی خزانے سے ادا کئے[3]۔

مقامی حکومت مقامی حکومت کا نظم و نسق بھی ویسا ہی تھا جیسے مرکزی حکومت کا تھا۔ سلطنت مختلف صوبوں پر منقسم تھی جن کو بہمنی تقلید میں "طرف" کہتے تھے۔ آخری زمانے میں سلطنت کے کوئی چھ صوبے ہو گئے تھے، منجملہ ان کے کرناٹک کا بہت بڑا صوبہ تھا جہاں ساحلوں کی بدولت تاجروں سے بہت آمدنی ہوتی تھی، ان کے انتظام کے لئے صوبہ دار ہوتے تھے جو صوبوں میں بادشاہ کی نیابت کرتے تھے اور "طرفدار" کہلاتے تھے۔ بہمنی انتظام کے مطابق یہ اپنے صوبے کے "سر لشکر" بھی ہوتے تھے، یعنے صوبے کی تمام فوج انھیں کے ماتحت ہوتی تھی اور ضرورت کے وقت یہی فوج کی رہنمائی بھی کرتے تھے، لیکن ان کے ماتحت "سر خیل" کے نام سے

---

[1] سیاحت نامہ ٹیورنیر، جلد ا ص ۱۲۵ و ۱۲۶۔

[2] سیاحت نامہ تھیونو، جلد سوم ص ۹۷۔

[3] حدیقۃ السلاطین، صاعدی، مطبوعہ ادارۂ ادبیات اُردو ص ۲۹۴۔

ایک چھوٹا فوجی افسر بھی ہوتا تھا جو فوجوں کی کمان کرتا تھا! اس خدمت پر لائق لوگ مامور ہوتے تھے، چنانچہ کرناٹک میں محمد سعید میر جملہ۔ نیک نام خاں۔ اکنّا۔ محمد ابراہیم۔ خلیل اللہ خاں اور لنگپا جیسے لائق لوگ مامور ہوئے تھے صوبے میں ان کے بڑے اعزاز تھے، دن کو ان کے سر پر چھتر پکڑی جاتی تھی اور رات کو ان کے ساتھ بارہ مشعلیں ہوتی تھیں۔ صوبے کی جمع بندی کے لئے ایک اور عہدہ دار ہوتا تھا جس کو "دیوان" کہتے تھے، غالباً یہ سال میں ایک یا دو مرتبہ اضلاع کے اجارہ داروں سے مالگزاری جمع کر کے خزانۂ شاہی میں داخل کرتا تھا، اسکے علاوہ مرکزی حکومت کی طرح ہر صوبے میں قاضی و پنڈت بھی مقرر تھے جو عدل گستری کے فرائض انجام دیتے تھے۔ صوبے کئی "سرکاروں" میں منقسم تھے جن کو زمانۂ حال کی اصطلاح میں "ضلع" کہنا چاہیئے، اور "سرکار" کی تقسیم "سمت" تھی جس کو "پرگنہ" بھی کہتے تھے اور ہر سمت میں کئی "محال" یا موضع ہوتے تھے۔ ان چھوٹی سمتوں کا نظم و نسق بالکل وہی تھا جو صوبوں کا تھا، صرف فرق یہ تھا کہ یہاں طرفدار یا سرلشکر کی جگہ فوجدار ہوتے تھے اور سمتوں و محالات میں امنِ عامہ کی حفاظت کیلئے حوالدار مقرر تھے۔ مدراس مسولی پٹم اور پلی کٹ جیسے اہم ساحلی قصبوں پر جہاں مغربی اقوام کی تجارتی منڈیاں تھیں، ذی اختیار حوالدار مقرر تھے جو مغربی تاجروں کی نگرانی کرتے تھے۔ دوسرا فرق یہ تھا کہ عدالتی فیصلوں کے لئے تو قاضی و پنڈت مامور ہوتے تھے، مگر اس کے علاوہ ایک نیا عہدہ دار بھی تھا جس کو "خطیب" کہتے تھے۔ یہی عہدہ دار اپنے علاقے میں شاہی فرامین کی تشہیر بھی کرتا تھا۔ ان سب عہدہ داروں کی تنخواہیں خزانۂ شاہی سے ادا کی جاتی تھیں جس کی بدولت۔ مرکزی حکومت کو مقامی عہدہ داروں پر کافی گرفت حاصل تھی۔ اس کے علاوہ بادشاہ اور اس کے وزراء بھی اپنے اضلاع اور قصبات کا دورہ کر کے مقامی حالات کا خود معاینہ کرتے تھے تاکہ مرکزی حکومت مقامی حکومتوں سے وابستہ رہے، چنانچہ ابوالحسن قطب شاہ اور اس کے وزیر

مادنانے چار مرتبہ صوبۂ کرناٹک کا دورہ کیا تھا۔

طریقۂ مالگزاری قطب شاہی سلطنت میں مالگزاری کا ایک بے ڈھنگا طریقہ رائج تھا۔ یعنے مقامی حکام خود رعیت سے براہ راست مالگزاری وصول نہیں کرتے تھے بلکہ سرکار، یعنے اضلاع ایک مقررہ رقم کے لئے اجارہ داروں کے سپرد کردیئے جاتے تھے جو موعودہ رقم وصول کرکے خزانے میں داخل کرتے تھے۔ یہ اجارہ دار جو اکثر ہندو ہوتے تھے ایک سال کے لئے مقرر ہوتے تھے اور سال ختم ہونے پر ان کا تعلق منقطع ہو جاتا اور ضلعے پھر ہراج کئے جاتے تھے اور جو شخص بڑی بولی لگاتا اس کو ضلع سپرد کردیا جاتا تھا اس میں دوسری خرابی یہ تھی کہ اضلاع کی طرح بندرگاہیں بھی اجارہ داروں کے سپرد کردی جاتی تھیں۔ سال بھر اجارہ دار اپنے مقبوضہ ضلعے[1] کے مالک ہوتے تھے کہ جو چاہے سو کریں۔ ان کو اضلاع میں فوجداری اور دیوانی اختیارات بھی حاصل ہوتے تھے، چنانچہ یہ لوگ رعیت سے زیادہ سے زیادہ مالگزاری وصول کرتے تھے۔ حکومت کو تو موعودہ رقم ادا کرتے تھے، کیوں کہ اس رقم کی ادائی کے وہ پابند تھے لیکن فاضلات سے اپنا جیب بھرتے تھے، اس کے علاوہ ان کو جمع بندی کا معاوضہ علیحدہ ملتا تھا، گو مالگزاری تین قسطوں میں ادا ہوتی تھی لیکن وہ بہت سختی سے وصول کی جاتی تھی۔ جب اجارہ دار اپنی موعودہ رقم ادا کرنے میں تساہل کرتے تو ان کو سخت سزائیں دی جاتی تھیں اور کبھی انھیں ہاتھی کے پیروں کے نیچے کچلا جاتا تھا، چنانچہ ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ مسولی پٹم کے اجارہ دار دسو یلی راؤ نے اپنی مقررہ رقم ادا نہیں کی تو اس کو شاہ راہ عام پر کوڑے لگائے گئے یہاں تک کہ وہ بے ہوش ہو گیا! اس بے ڈھنگے انتظام کا نتیجہ یہ تھا کہ ملک زرخیز ہونے کے باوجود مفلس تھا، اور رعایا تنگ دست تھی اور بہت سے قصبات ویران ہو گئے تھے، یا غالباً

---

[1] گولکنڈے کے تعلقات ص ۸۱۔

یہ لوگ لالچی حکام اور ٹھیکہ داروں سے بچنے کے لئے اپنا اندوختہ چھپائے تھے، لیکن ابوالحسن قطب شاہ کے عہدِ حکومت میں جب کہ مادنا دیوان تھا اس بے ڈھنگے طریقے کو مسدود کر دیا گیا۔ اجارہ داروں کے بجائے جن سے مُلک کو نقصان پہنچ رہا تھا حصولِ مالگزاری کے لئے تنخواہ یاب حکام مقرر کئے گئے۔ اس جدید انتظام سے مُلک کو بہت فروغ ہوا۔

صوبوں اور سرکاروں کی تقسیم حسب ذیل تھی۔ ابوالحسن قطب شاہ کے عہد میں سلطنت کے چھ صوبے، سینتیس سرکار اور پانچ سو سترہ سمت بنائے گئے تھے۔

صوبہ ۱۔ سرکار محمد نگر۔ سرکار میدک۔ سرکار کولاس۔ سرکار ملنکور۔

صوبہ ۲۔ سرکار ایل گندل۔ سرکار ورنگل۔ سرکار کھمم میٹ۔ سرکار دیورکنڈہ۔

صوبہ ۳۔ سرکار پانگل۔ سرکار مصطفےٰ نگر (کونڈپلی)۔ سرکار بھونگیر۔ سرکار آکرکرا۔

صوبہ ۴۔ سرکار کوئیل کنڈہ۔ سرکار گمن پورہ۔ سرکار مرتضےٰ نگر (گنٹور)، سرکار مچھلی پٹن۔

صوبہ ۵۔ سرکار نظام پٹن۔ سرکار ایلور۔ سرکار راج بندری۔ سرکار سیکاکول۔

صوبہ ۶۔ کرناٹک، یعنے ارکاٹ، اس میں ۱۶ سرکار تھے۔[1]

فوجی تنظیم

قطب شاہوں کی فوجی تنظیم بھی خاطرخواہ تھی۔ تمام قطب شاہی فوج دارالسلطنت اور صوبوں و اضلاع میں پھیلی ہوئی تھی تاکہ جہاں ضرورت ہوتی اس سے کام لیا جاتا تھا۔ اگرچہ دارالسلطنت میں عین الملک وزیر فوج کا ذمہ دار تھا، مگر اس کے علاوہ ایک اور عہدہ دار "بخشی الممالک" کے خطاب سے اس غرض کے لئے مقرر ہوتا تھا کہ وہ فوج بھرتی کرے اور ان کی تنخواہیں تقسیم کرے۔ نیز میر جملہ فوج کی تنقیح کرتا تھا، تاہم بادشاہ بھی

---

[1] یہ تقسیم ابوالحسن قطب شاہ کے عہد کے ایک گوشوارے سے لی گئی ہے۔ اس میں سوائے کرناٹک کے اور صوبوں کے نام درج نہیں ہیں۔ یہاں یہ صوبے امتیاز کے لئے ۱۔۲۔۳ کے ہندسوں سے واضح کئے گئے ہیں۔ تاریخ ظفرہ ص ۱۷۴۔

براہ راست فوج کا معاینہ کرتے اور اس سے وابستہ رہتے تھے۔ یہ روایت مشہور ہے کہ مقتے میں دو تین مرتبہ گولکنڈے میں تمام فوج مشرقی دروازے سے داخل ہو کر شاہی سلام کی عزت حاصل کرتی تھی اور بادشاہ شاہ نشین پر بیٹھ کر سلام لیتے تھے۔ پچھلے قطب شاہ تو خود فوج کی کمان کرتے تھے سلطان قلی۔ جمشید۔ ابراہیم اور محمد قلی قطب شاہ نے اکثر موقعوں پر خود فوجوں کی رہنمائی کی اور میدانِ کارزار میں غنیم کا مقابلہ کیا تھا۔ جو فوجیں صوبوں میں متعین تھیں وہ متعلقہ صوبہ داروں کی نگرانی اور قیادت میں تھیں، کیوں کہ صوبہ دار سرلشکر بھی تھے۔ بعض صوبوں میں جہاں فوجی نقل و حرکت زیادہ ہوتی تھی کثیر فوجیں متعین تھیں، چنانچہ کرناٹک میں جب محمد سعید میر جملہ اور نیک نام خاں طرفدار تھے چالیس ہزار فوج تھی۔ محمد سعید نے تو اپنے ذاتی خرچ سے پانچ ہزار فوج علیحدہ نوکر رکھی تھی۔ غالباً شمالی اور مغربی صوبوں میں بھی جہاں سرحدی حفاظت ضروری تھی زیادہ فوجیں متعین ہوں گی۔ مرکزی اور صوبہ واری فوجوں کی جملہ تعداد کوئی پانچ لاکھ بتائی جاتی ہے[1]۔ یہ فوجیں دو طرح کی تھیں۔ فوج کا ایک حصہ نظام جاگیری کی رو سے اُمراء اور جاگیرداروں کے ذمے تھا، ان اُمراء کا فرض تھا کہ جب سلطنت کو ضرورت ہو یہ فوج کی مقررہ تعداد بہم پہنچائیں اور فوج کے مصارف کے لئے ان کو زمینیں اور جاگیریں دی جاتی تھیں۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ بالعموم اتنی فوج نہیں رکھتے تھے جو ان کے ذمے مقرر تھی، بلکہ اس سے کم یا صحت کے ساتھ کہا جائے تو بالعموم اس کی آدھی فوج رکھتے تھے اس کے علاوہ قطب شاہی سلطنت میں مستقل فوج بھی تھی۔ یہ فوج جیسے عبداللہ قطب شاہ کے

---

[1] تھیونو کہتا ہے کہ عبداللہ قطب شاہ کی فوج کی تعداد پانچ لاکھ ہے لیکن اسی کا بیان یہ ہے کہ اُمراء اتنی فوج نہیں مہیا کرتے تھے جتنی ان کے ذمے ہوتی ہے بلکہ آدھی فوج مہیا کرتے تھے تو اس لحاظ سے تقریباً ڈھائی لاکھ فوج کم ہو جاتی ہے (سیاحت نامہ تھیونو حصۂ سوم ص ۱۰۲، ۱۰۳)۔

عہد میں تھی۔ اسی طرح پیشرو عہد ہائے حکومت میں بھی موجود تھی۔ تھیونو کہتا ہے کہ عبد اللہ اپنی فوج کی تنخواہ ادا کرتا ہے۔ ابو الحسن قطب شاہ نے چالیس ہزار کی تعداد میں اپنی ایک خاص فوج بنائی تھی جن کی تنخواہیں وہ خود ادا کرتا تھا اس کے وزیر مادنا نے دس ہزار سواروں کا ایک علیحدہ رسالہ تیار کیا تھا ایک مورخ کے الفاظ میں ابو الحسن نے اپنے خسر کے خزانے سے ایک بڑی رقم حاصل کی اور اسی رقم سے چالیس ہزار کی فوج تیار کی تھی اور فوج کی تنخواہیں خود ادا کرتا تھا۔[۱] ابو الحسن قطب شاہ کی فوج کی تعداد جو مرکز میں تھی پچیس ہزار سوار، چھیا نو ہزار پیدل اور باقی یورپی سپاہی تھے اور ان کی تنخواہوں کا خرچ :-

سوار - ایک کروڑ مدعہ للعالوعہ

پیدل - مدعہ لک معہ سیامدصہ

اور رکابہ فرنگ - ایک لک للعوب اللمامدعہ

ہوتا تھا۔[۲] فوج کو باضابطہ قواعد پریڈ سکھائے جاتے تھے "نصر الملک سر خیل شاہی لشکر۔ ورزش سواری کہ در معرکہ کارزار مفید است"[۳] فوج میں مسلمان اور تلنگی سپاہی دونوں ہوتے تھے اور غالباً تلنگوں کی کثرت تھی مسلمانوں میں زیادہ تر عراقی اور ایرانی تھے اور یہ مرکزی فوج میں زیادہ پائے جاتے تھے۔ ان کی تنخواہ دس ہون ماہانہ ہوتی تھی تو تلنگوں کی دو ہون ماہانہ تھی۔ لیکن اول الذکر کو دو گھوڑے اور چار پانچ نوکر رکھنے پڑتے تھے۔[۴] سلطان محمد قطب شاہ کے عہد میں تلنگے سپاہیوں کی تنخواہ زیادہ تھی، کیوں کہ اس زمانے میں مغل اور ایرانی بہت کم تھے، لیکن

۱؎ ماہ نامہ ص ۳۱۷۔

۲؎ تاریخ ظفرہ ص ۱۷۵۔

۳؎ حدیقۃ السلاطین مطبوعہ ادارہ ادبیات اُردو ص ۸۵۔

۴؎ سیاحت نامہ تھیونو جلد سوم ص ۱۰۰۔

عبداللہ قطب شاہ کے عہد میں مغل اور ایرانی بہت جمع ہو گئے[1]۔ ابوالحسن قطب شاہ کے عہد میں یورپی سپاہی بھی فوج میں بھرتی کئے گئے تھے جن کو رکابہ فرنگ کہتے تھے مسلمان سواروں کی وردی قباء اور سرخ رنگ کی ہوتی تھی اوپر سے زرہ اور سر پر خود پہنتے تھے اور تلوار نیزے سے مسلح ہوتے تھے۔ پیادے پتلون تمام سرخ رنگ کے پائجامے پہنتے تھے اور ان کے سر پر سیاہ کلاہ ہوتی تھی اور تلوار، بھالوں سے مسلح ہوتے تھے۔ کرناٹکی سواروں کی وردی، پائجامے زانو تک سیاہ رنگ کا کیچہ اور سر پر سرخ رنگ کی پگڑی ہوتی تھی اور یہ تلوار سے مسلح ہوتے تھے۔ تلنگی سپاہی دھوتی، کیچہ اور پگڑی پہنتے تھے اور نایک واڑیوں کی وردی زیادہ اچھی ہوتی تھی، کیوں کہ یہ قلعہ دار اور افسر ہوتے تھے۔ تمام سلطنت میں (۶۶) قلعے تھے[2] اور یہ سب بلند پہاڑیوں پر بنائے گئے تھے، منجملہ ان کے کونڈبیر۔ کونڈپلی۔ کوئل کنڈہ۔ گھنپورہ۔ پانگل۔ کھمم میٹھ کے قلعے بہت مستحکم تھے۔ ہر قلعے میں (۱۲۰۰) سپاہی رکھے جاتے تھے۔ کونڈپلی اور کونڈبیر میں جو بڑے قلعے تھے تین ہزار تا چار ہزار سپاہی رکھے جاتے تھے[3] اور یہ سب تلنگے تھے اور قلعہ دار نایک ہوتے تھے۔ ان قلعوں کا انتظام اور نگرانی اس قدر سخت تھی کہ رات کو قلعہ دار نایک بھی شاہی احکام کے بغیر اندر نہیں آسکتے تھے۔ جب کبھی نایک دن کو باہر جاتا اور اس کو یہ ڈر ہوتا کہ رات ہونے سے پہلے اندر نہیں آسکے گا تو وہ ایسی صورت میں بادشاہ سے خاص اجازت لیتا تھا، اور اجازت بھی خاص مواقع پر دی جاتی تھی ورنہ نہیں ہوتی تھی۔ راتوں کو ایک قلعے سے دوسرے قلعے کو مشعلوں کی جنبش سے پیام پہنچائے جاتے تھے[4]۔ قلعۂ گولکنڈہ کی مدافعت کا کیا کہنا! اس کا ایسا

---

[1] تھیونو کہتا ہے کہ عبداللہ کے عہد میں اکثر امرا ایرانی ہیں یا ان کی اولاد ہیں۔

[2] گولکنڈے کے تعلقات ص ۱۱۔

[3] 〃 〃 〃 〃 ۷۹۔

[4] 〃 〃 〃 〃 ۱۲۔

انتظام تھا کہ اس کی مثال ہندوستان بھر میں نہ تھی، چنانچہ اس کے آخری محاصرے کے وقت اس کی اچھی خاصی آزمایش ہوگئی اور مغل محاصرین ہار مان گئے۔

گولکنڈے کی معاشرت گولکنڈے کی معاشرت بہت بلند اور پاکیزہ تھی، چونکہ قطب شاہ خود بہت پاکیزہ معاشرت کے دلدادہ تھے، اس کا اثر رعایا پر بھی پڑتا تھا۔ بادشاہوں کی خانگی اور درباری زندگی اس قدر شان دار تھی کہ دوسرے ہمعصر شاہی خاندان اس کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔ ان کے عظیم الشان دربار، شان دار جلوس، فلک بوس محل اور پُر لطف علمی و سماجی محفلیں ان کی عظمت کا ثبوت دیتی تھیں۔ ان کے طریقۂ بود و باش کا اندازہ کسی قدر ان کی عمارتوں سے ہوتا ہے۔ بعض عمارتیں اس وقت موجود ہیں اور بعض کی صفحاتِ تاریخ پر تعریف رہ گئی ہے۔ شاہی بارگاہ تو کجا ان کے رہنے کے قصر بھی اس قدر بلند تھے کہ ان کی مشکل سے مثال ملتی ہے۔ اندر بہترین قالینوں کا فرش اور چینی و بلوریں آلات کی سجاوٹ اور باہر سے عمارتوں کی رفعت و باغبانی بڑی کیفیت پیدا کرتی تھیں۔ ایک مغل شہزادے نے جو شاہجہانی محلات کا رہنے والا تھا لکھا تھا کہ "ان محلات میں رہنا تو کجا ان میں چراغ جلانا مشکل ہے"۔[۱] شاہی درباروں کا حال ہم اوپر پڑھ آئے ہیں شاہی جلوس بھی اسی قدر شان دار ہوتے تھے۔ بادشاہ ہاتھی پر باہر نکلتے تھے اور ان کے ساتھ بڑا ہجوم ہوتا تھا۔ اُمراء اور وزراء گھوڑوں اور پالکیوں میں جلوس کے ساتھ رہتے تھے اور ایک بڑا لشکر ہمراہ ہوتا تھا۔ بادشاہوں کے مقبرے بھی بڑے شان دار بنائے جاتے تھے جو اب تک موجود ہیں۔ قبروں پر زر دوز غلاف پہنائے جاتے تھے اور قبروں کے ارد گرد قیمتی قالین بچھائے جاتے تھے اور سونے چاندی کی شمعیں

---

[۱] گولکنڈے کے تعلقات ص ۵۶۔

روش کی جاتی تھیں اور ہر روز غربا کو کھانا کھلایا جاتا تھا۔[1] اُمراء کی زندگی بھی کچھ کم شان دار نہ تھی۔ یہ بڑی بڑی حویلیوں میں رہتے تھے جو کئی منزل بلند ہوتی تھیں۔ ان کا جلوس بھی ایسا ہی شان دار ہوتا تھا گویا خود بادشاہوں کا جلوس تھا۔ جب یہ باہر نکلتے تھے تو ان کے ہمراہ بھی ہاتھی اور اونٹوں کی قطاریں ہوتی تھیں اور بڑا لشکر ہمراہ ہوتا تھا اور سب کے پیچھے ان کا ہاتھی یا پالکی ہوتی تھی۔[2] ٹیورنیر اس جلوس کی بڑی تفصیل پیش کرتا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ "جلوس ہاتھیوں سے شروع ہوتا ہے۔ پہلے اس میں بارہ ہاتھی ہوتے ہیں اور یہ تعداد امیر کے مرتبہ امارت کے مطابق معین ہوتی ہے۔ ان پر ہودے اور عماریاں کسی ہوتی ہیں اور ایک ہاتھی پر جھنڈا ہوتا ہے۔ ہاتھیوں کے پیچھے اونٹوں کی قطار ہوتی ہے اور ان کے پیچھے گاڑیاں آتی ہیں جن کے ساتھ پیدل ملازم چلتے ہیں، پھر ان کے پیچھے صاحب جلوس کی سواری ہوتی ہے اور ان کے پیچھے سوار و پیدل ہوتے ہیں۔"[3] ایسا معلوم ہوتا ہے کہ متوسط طبقہ بھی بہت پاکیزہ اور پُر تکلف زندگی بسر کرتا تھا۔ شہر حیدرآباد میں دو لاکھ مکانوں کی گنتی کی گئی تھی اور ہر مکان کے رہنے والے اوسط پانچ آدمی قرار دیئے جائیں تو شہر کی دس لاکھ آبادی ہونی چاہیئے۔ اس لحاظ سے یہ قرونِ وسطیٰ کا بہت بڑا شہر تھا۔ اس آبادی اور بلند عمارتوں کو دیکھ کر ایک مغل مورخ نے "آبادی وسیع تر از احاطۂ خیال" اور "عمارات رفیع تر از پایۂ اندیشہ" کہا تھا[4] جو قطب شاہی تمدن کی بہت بڑی دلیل ہے۔ غالباً شمال کے شہنشاہی شہر بھی اتنے آباد نہیں تھے، اور آبادی میں ہر طرح کے لوگ تھے، تاجر، عہدہ دار، قانون داں۔

---

[1] سیاحت نامہ تھیونو ص ۱۰۳۔

[2] " " " "

[3] سیاحت نامہ ٹیورنیر جلد اول ص ۱۲۶۔

[4] مآثر عالمگیری ص ۲-۳۔

مہاجن۔ صناع اور جوہری[1]۔ لیکن اس میں باہر کے لوگ، یعنے مغل۔ ایرانی۔ ترک زیادہ تھے جو حیدرآبادی تھے۔ ان کی معاشرت بے حد پُر تکلف تھی! اول تو ان کے رہنے بسنے کے مکانات نہایت شان دار اور بلند ہوتے تھے، پھر ان کے در و دیوار سے بڑی شان و شوکت جھلکتی تھی۔ سونے اور چاندی کی اشیاء کے علاوہ چینی کے ظروف، روشنی کے جھاڑ استعمال ہوتے تھے جن کو مورخ "چینی آلات" کہتے ہیں۔ شیشے اور بلوریں ظروف ممالکِ غیر سے جہازوں میں لدکر آتے تھے اور مسولی پٹم و حیدرآباد کے بازاروں میں فروخت ہوتے تھے[2]۔ چنانچہ جب ۱۰۹۷ھ / ۱۶۸۷ء میں حیدرآباد کی لوٹ ہوئی تو ہزار ہا قسم کی چیزیں ظروف اور کپڑے باہر نکلے اور قالین اور دریوں کے بہترین فرش راستوں پر نظر آتے تھے جن کو دیکھ کر خود مغلوں کو حیرت ہوئی[3] اور ان اشیائے تمدن سے گھر اتنے بھرے ہوئے تھے کہ لوٹ مار کے باوجود خالی نہ ہوئے[4]۔ حالانکہ چار پانچ کروڑ کی لوٹ ہوچکی تھی۔ ان واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ گولکنڈے کا متوسط طبقہ بھی کچھ کم متمدن نہ تھا۔

لباس گولکنڈے کی مخلوط آبادی تھی۔ اہلِ دکن کے علاوہ یہاں بہتیرے ایرانی اور مغل بھی تھے، آبادی میں ان کا عنصر نمایاں تھا۔ یہ لوگ تو اپنا وطنی لباس اور وضع قطع قائم رکھتے تھے، لیکن اہلِ گولکنڈہ کے لباس و وضع قطع پر مقامی رنگ چڑھ رہا تھا، تین چار پشتوں کے بعد تو خود بادشاہوں کی وضع قطع اور لباس بالکل بدل گیا، اور اس میں دکنی رنگ غالب ہوگیا۔ چنانچہ محمد قلی قطب شاہ نے جو قطب شاہی خاندان کا پانچواں بادشاہ ہے اپنے بدن سے تاتاری لباس بالکل اُتار پھینک دیا تھا۔ سر پر

---

[1] سیاحت نامہ تھیونو، حصۂ سوم [2] گولکنڈے کے تعلقات ص ۶۲۔

[3] خافی، جلد دوم ص ۳۰۶ [4] مآثر الامراء، جلد دوم ص ۵۳۳۔

سمور کی کلاہ کے بجائے دکنی وضع کی پیچ دار پگڑی، پوستین اور بانانی قبا کے عوض ململ کا جامہ اور شبنم کا نیمہ پہنتا تھا، ہاتھوں میں جڑاؤ کڑے ہوتے تھے اور ڈاڑھی منڈھاتا تھا[1] جو بالکل تلنگانے کی طرز تھی، اور اس کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کو دکن کے رسوم و روایات سے کس قدر شغف تھا۔ اُمراء اور عوام بھی جو متناسب بدن، بلند قامت اور خوش رنگ ہوتے تھے[2] تقریباً یہی لباس پہنتے تھے، یعنے بجائے قبا اور پوستین کے جو ترکستان اور ایران سے آئی تھی، جامہ اور نیمہ پہنتے تھے، اور کم درجے کے لوگ ململ کا انگرکھا اور چوبغلہ پہنتے تھے جو خاص دکن کا انداز تھا، اور سر پر دکنی وضع کی سفید یا رنگین پگڑی باندھتے تھے اور پیر میں آپشاہی ہوتی تھی۔ سپاہیوں کے علاوہ جب عام لوگ بھی باہر نکلتے تھے تو کمربستہ اور مسلح ہوتے تھے اور تقریباً ہر شخص تلوار اور لکڑی کے ہاتھ جاتا تھا جو دکن کا خاص فن ہے۔ جب اُمراء دربار میں جاتے تھے تو سر پر دکنی دستار پہنتے تھے اور کمر میں بگلوس باندھتے تھے۔ جہاں تک ہندو آبادی کا تعلق ہے، خواہ وہ سپاہی ہوں یا غیر سپاہی ان کا لباس وہی تھا جو آج سے صدیوں پہلے تھا۔ کرناٹک کے باشندے سر پر لمبے بال چھوڑتے تھے اور عورتوں کی طرح اُوپر جوڑا باندھتے تھے[3]۔

اخلاقی حالت اگرچہ اس زمانے کی اخلاقی حالت کا اندازہ لگانا بہت مشکل ہے، لیکن قرائن یہ ہیں کہ قطب شاہی رعایا میں عام طور پر اخلاقی حالت خراب نہ تھی اور متوسط طبقے میں علمی سرگرمی بھی

---

[1] مضمون مولوی غلام یزدانی صاحب ناظم آثار قدیمہ حیدر آباد، رسالہ اُردو ۱۹۲۱ء۔
یہ وضع قطع محمد قلی کی ایک تصویر سے معلوم ہوتی ہے جو برٹش میوزیم میں ہے۔

[2] ٹیورنیر، جلد اول ص ۱۲۸۔

[3] ؍؍ ؍؍ ؍؍ ۱۲۷۔

پائی جاتی تھی، کیوں کہ حیدر آباد کی جب لوٹ ہوئی تو اس میں دوسری چیزوں کے علاوہ ہر گھر سے بہتیری کتابیں بھی بر آمد ہوئی تھیں۔ صوم و صلوٰۃ کا بھی عام شوق تھا، کیوں کہ شہر اور اس کے نواح میں مساجد اس قدر کثرت سے پائی جاتی ہیں کہ شمار میں نہیں آتیں اور یہ سب قطب شاہی دور کی بنی ہوئی ہیں۔" تاہم یہ بات بھی ماننی پڑتی ہے کہ شہر حیدر آباد کی ترقی کے ساتھ اہلِ شہر میں تعیشات کی بھی فراوانی ہو گئی تھی اور ہر جگہ عیش و عشرت کا سامان مہیا تھا جو شہری زندگی کا خاصہ ہے۔ چونکہ قطب شاہی سلطنت میں اُمراء کی کثرت تھی اور مُلک میں خوشحالی تھی اس لئے ان کی بے کاری اور فارغ البالی کی وجہ سے مُلک میں عیش و عشرت کا سامان ہونا ضروری تھا۔ اس میں خود بادشاہوں کی زندگی بھی اثر انداز تھی۔ یہ کچھ خلافِ قیاس نہیں ہے کہ محمد قلی قطب شاہ کے عہد میں شہری تعیشات میں بہت اضافہ ہوا، کیوں کہ بادشاہ خود عیش پرست تھا۔ یہ صحیح ہے کہ اس کے جانشین سلطان محمد قطب شاہ کی زاہدانہ زندگی کی وجہ سے عیش و عشرت کی رفتار بہت دنوں تک سُست ہو گئی، کیوں کہ سلطان محمد نے پاکیزہ زندگی پائی تھی اور دن رات مذہبی فرائض میں ڈوبے رہتے تھے۔ ان کا اخلاقی اثر رعایا پر بھی پڑتا تھا، لیکن عبداللہ قطب شاہ کے عہد میں یہ بات باقی نہیں رہی، بلکہ اس عہد میں پھر عیش و عشرت کے دروازے کُھل گئے۔ عبداللہ کو رقص و سرود کا بہت شوق تھا، چنانچہ مقامی ذرائع سے لطف اندوز ہونے کے علاوہ لاہور۔ آگرہ اور برہان پور سے عیش و عشرت کا سامان جمع کیا جاتا تھا۔[1] شاہی زندگی کا اثر عوام پر بھی پڑتا تھا، چنانچہ گولکنڈہ اور

---

[1] حدیقۃ السلاطین کا مولف کہتا ہے کہ عبداللہ کے عہد میں تلنگانہ۔ کرناٹک۔ احمد آباد۔ کابل۔ لاہور۔ آگرہ و برہان پور سے طوائف بلائی جاتی تھیں (حدیقۃ السلاطین ص ۴۲) یہ طوائف اکثر حیدر آباد میں قیام پذیر ہو گئیں اور ان سے عوام کے (باقی بر صفحہ ۳۷۰)

حیدر آباد میں رقص و سرود کی محفلیں عام ہونے لگیں اور عیش و عشرت کی گرم بازاری ہوگئی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہندو، مسلمانوں کی کوئی تقریب خواہ وہ مذہبی ہو یا غیر مذہبی، بغیر طوائف اور رقص و سرود کے نہیں ہوتی تھی[1]۔ یہ طرزِ زندگی ابو الحسن قطب شاہ کے عہد میں بھی جاری رہی۔ غالباً انھیں حالات کو دیکھ کر لوگ ابو الحسن اور اس کے عہد سے متعلق غلط رائے قائم کر لیتے ہیں۔

مذہب

گولکنڈے کی رعایا میں کئی مذہبی طبقے پائے جاتے تھے۔ ہندو رعایا کی کثرت تھی جو مذہبی و سماجی روایات میں مسلمانوں سے جدا تھے۔ اب رہے مسلمان تو وہ سنّی اور شیعہ دو فرقوں میں بٹے ہوئے تھے۔ سُنّیوں کی کثرت تھی، لیکن یہ سب دکنی نژاد تھے۔ برخلاف اس کے شیعہ اکثر غیر مُلکی تھے جو ایران اور ترکستان کے تو وارد تھے۔ خود شاہی خاندان بھی شیعہ مذہب کا پیرو تھا۔ لیکن یہ قطب شاہوں کا طرۂ امتیاز ہے کہ اس خاندان میں کسی قسم کی مذہبی تنگ نظری پیدا نہ ہوئی۔ ان لوگوں نے ہمیشہ سیاست کو مذہب سے جُدا رکھا۔ اپنی سلطنت کو ایسے قالب میں ڈھالا تھا جس میں مذہبی اور

(بقیہ حاشیہ صفحۂ ۳۵۹) اخلاق پر بُرا اثر پڑتا تھا، چنانچہ عبد اللہ قطب شاہ کے عہد میں ٹیورنیر نے ان طوائف کی تعداد بیس ہزار بتائی ہے۔ داروغہ کے رجسٹر میں ان کے نام درج ہوتے تھے (سیاحت نامہ ٹیورنیر، جلد اول ص ۱۲۷) غالباً ان کو خاص ہدایتیں بھی ہوتی ہوں گی۔ تھیونو نے بھی ان عورتوں کی تعداد کچھ اسی کے لگ بھگ بتائی ہے۔ یہ رنگ ابو الحسن کے عہد میں بھی قائم رہا، چنانچہ اس عہد میں طوائف کو سرکار سے تین لاکھ چوبیس ہزار روپے دیئے جاتے تھے (تاریخ ظفرہ ص ۱۷۵)

[1] گولکنڈے کے تعلقات ص ۷۱۔

ثقافتی حد بندیاں تام کو نہ تھیں۔ پہلے تین سلاطین یعنے سلطان قلی۔ جمشید اور ابراہیم بے حد وسیع مشرب واقع ہوئے تھے۔ ان لوگوں نے کبھی مملکت کو مذہبی رنگ نہیں دیا، بلکہ مذہب کو رعایا کے ضمیر اور نقطۂ خیال پر چھوڑ دیا اور تمام طبقات رعایا کو خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان، شیعہ ہوں یا سنی برابر کے حقوق دے رکھے تھے۔ ہندوؤں کو نہ صرف ہر قسم کی مذہبی اور سماجی آزادی حاصل تھی بلکہ ان کے مندروں کو بڑی بڑی زمینیں اور جاگیریں دی گئی تھیں اور ان کو اونچی خدمات پر فائز کیا گیا۔ سلطان قلی کی وسیع مشربی کا اس سے زیادہ کیا ثبوت ہوسکتا ہے کہ وہ یوسف عادل خاں والیٔ بیجاپور کے خلاف اس تعزیری مہم میں شریک ہوا تھا جو محمود شاہ بہمنی نے روانہ کی تھی کیوں کہ یوسف نے بیجاپور میں شیعہ مذہب کو سرکاری مذہب قرار دیا تھا، حالانکہ سلطان قلی خود شیعہ مذہب کا پیرو تھا۔ سلطان قلی کے بیٹے ابراہیم قسلی کی وسیع مشربی اس سے کہیں زیادہ تھی۔ اس کو سُنّی طبقے کے ساتھ ایسی ہمدردی تھی جیسی شیعوں کے ساتھ تھی، چنانچہ اس نے اپنی شادی گلبرگے کے ایک مشائخ گھرانے میں کی تھی اور اس شادی سے جو لڑکے پیدا ہوئے تھے ان کے نام شاہ عبدالقادر اور عبدالفتاح رکھے تھے۔ اس کے علاوہ اس نے اپنی بیٹیوں کی شادی حضرت حسین شاہ ولیؒ اور شاہ مظہر الدین سے کی تھی جو اس زمانے کے جلیل القدر صوفی اور پیرِ طریقت تھے۔ لیکن ابراہیم کے بعد جب ۹۸۰ھ میں اس کا بیٹا محمد قلی تخت نشین ہوا تو سلطنت کا مذہبی مسلک بہت کچھ بدل گیا۔

محمد قلی قطب شاہ میں اس کے باپ دادا کی طرح مذہبی روشن خیالی مطلق نہ تھی اور وہ ہمیشہ مذہبی معاملات کو تعصب کی آنکھ سے دیکھتا تھا۔ ہندو طبقے کے ساتھ تو وہ ایسی رواداری کرتا تھا جیسے اس کے باپ دادا کرتے تھے لیکن جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے اس میں سخت فرقہ پرستی دکھاتا تھا۔

وہ کٹر شیعہ تھا اور اہلِ سنت کا دل سے مخالف تھا۔ اس وقت حیدر آباد میں محرم کے جو رسوم پائے جاتے ہیں وہ سب محمد قلی کی اختراع ہیں۔ اسی نے پہلی مرتبہ گولکنڈے میں علم استاد کئے تھے۔ گولکنڈے کا حسینی علم اسی کا استاد کیا ہوا ہے۔ محرم کے تمام رسوم جو اس عہد میں جاری ہوئے تھے وہ آج تک حیدر آباد میں جاری ہیں[۱]۔ وہ سنی طبقے کے خلاف شیعوں پر عنایات کی بوچھار کرتا تھا۔ اس کو سنی طبقے سے اس قدر نفرت تھی کہ ان کو وہ کافر اور خارجی کہتا تھا، اور یہ بدگوئی اس کے کلام میں پائی جاتی ہے[۲]۔ یہی فرقہ دارانہ جذبہ تھا جس کی وجہ سے اس نے ایران سے سفارتی تعلقات قائم کر رکھے تھے، اور شاہِ ایران کو وہ اپنا مقتدرِ اعلیٰ سمجھتا تھا۔ اس کے علاوہ اس نے بے شمار ایرانی خاندانوں کو حیدر آباد بلایا اور شہر و اضلاع میں ایسا بسا دیا کہ وہ حیدر آبادی ہو گئے اور اسی طبقے پر اس کو اعتماد تھا۔ ایرانیوں کو تجارت اور دست کاری کی اس قدر مراعات دی گئیں کہ اس طریقۂ عمل سے دکھنیوں کو نقصان پہنچا۔ حیدر آباد اور مسولی پٹم میں ایرانیوں کی تجارتی منڈیاں اور صرافے قائم ہو گئے تھے[۳]۔ چنانچہ مسولی پٹم میں جو شیعہ خاندان اب آباد ہیں وہ انھیں ایرانی آباد کاروں کی اولاد ہیں۔

محمد قلی کا نیا مسلک خطرے سے خالی نہ تھا۔ اس سے نہ صرف سیاست میں بدمزگی پیدا ہو گئی بلکہ مسلمانوں کا بڑا طبقہ حکومت سے بدظن ہو گیا اور سلطنت میں دو بغاوتیں کھڑی ہو گئیں اور بغاوت کرنے والے شاہ عبدالقادر اور خدا بندہ خود بادشاہ کے بھائی تھے۔ اول الذکر عبدالقادر، محمد قلی سے

---

[۱] حدیقۃ السلاطین، صاعدی، مطبوعہ ادارہ ادبیاتِ اردو ص ۴۹۔

[۲] محمد قلی قطب شاہ۔ ڈاکٹر زور ص ۹۲۔

[۳] گولکنڈے کے تعلقات ص ۵۶ و ۷۸۔ ماہنامہ ص ۱۹۳۔

بڑا تھا اور ایک سازش سے اس کو تخت سے محروم کر دیا گیا تھا، اور دوسرا خدا بندہ، محمد قلی کا سگا بھائی تھا، اور اس کو یہ اُمید تھی کہ محمد قلی کے بعد اس کو تخت ملے گا، لیکن جب بادشاہ کا بھتیجا سلطان محمد جانشینی کے لئے نامزد ہو گیا تو خدا بندہ پر مایوسی چھا گئی اور بالآخر وہ بھائی کے خلاف بغاوت کر بیٹھا۔ ان دونوں بغاوتوں کے پیچھے تمام دکھنی شامل تھے اور حضرت راجُو اول اور بیدر کے شاہ محب اللہ جیسے مشائخ ان کی تائید پر تھے۔[۱] اگرچہ یہ بغاوتیں بادشاہ کے حسب منشا فرو کر دی گئیں، لیکن مُلک کی سیاسی فضا برابر مکدّر رہی اور مسلمانوں کے دو طبقوں دکھنی اور غیر دکھنیوں کے درمیان کشیدگی بڑھتی گئی۔[۲] البتہ سلطان محمد قطب شاہ کے عہد میں مذہبی رنگ پھیکا پڑ گیا۔ سلطان محمد اپنے باپ دادا کی طرح وسیع المشرب واقع ہوئے تھے اور کسی قدر سُنّی مذہب کی طرف مائل تھے، اس لئے انھوں نے اپنے چچا کے اکثر رسوم بند کر دیئے تھے اس کا نتیجہ یہ تھا کہ اس عہد کے شاعروں نے اپنی نظموں میں سُنّی عقائد کا اظہار کیا ہے۔[۳] لیکن جب عبداللہ قطب شاہ تخت نشین ہوا تو مذہب میں وہی شدت پیدا ہو گئی جو محمد قلی کے عہد میں تھی۔ عبداللہ کی تربیت اس کی ماں حیات بخشی بیگم کی آغوش میں ہوئی تھی جو محمد قلی کی بیٹی تھی اس لئے عبداللہ پر اپنی ماں اور نانا کا رنگ چڑھنا ضروری تھا۔

۱؎ تاریخ قطب شاہی ص ۲۶۷ و ۲۶۸ - محمد قلی قطب شاہ، ڈاکٹر زور ص ۹۰ و ۹۱۔

۲؎ 〃 〃 〃 ۲۹۴ 〃 〃 〃 〃

۳؎ دیکھو کلیات غواصی، مرتبہ محمد بن عمر۔

تئیسواں باب

معاشی حالت

دکن کی دوسری سلطنتوں کے مقابلے میں گولکنڈے کی قطب شاہی سلطنت زیادہ مالدار اور خوش حال تھی، کیوں کہ اس سلطنت کو آمدنی کے جو قدرتی اور انتظامی ذرائع حاصل تھے وہ دوسری سلطنتوں کو میسر نہ تھے۔ اول تو یہ سلطنت بہت وسیع تھی۔ ابراہیم قطب شاہ کے عہد سے جوں جوں کرناٹک کے اضلاع سلطنت میں ضم ہوتے گئے تو یہ سلطنت بہت پھیلتی گئی اور ان فتوحات کا سلسلہ آخر وقت تک جاری رہا، یہاں تک کہ یہ ساحل کارومنڈل کے ایک بڑے حصے پر قابض ہوگئی، چنانچہ زمینوں کی نوعیت کے اعتبار سے اس سلطنت کے دو حصے کئے جا سکتے ہیں۔ ایک تو ساحلِ کارومنڈل کا مستطیل حصہ جو سمندر کے متوازی چلا گیا تھا، اسی میں دریائے کرشنا اور گوداوری کی سیراب زمینیں بھی شامل تھیں اور اس کے بعد ملک کا اندرونی حصہ خاص میں مشرقی گھاٹ اور دکن کی سطح مرتفع داخل تھی۔ یہ دونوں خطے زرخیز اور بہت سیر حاصل تھے۔ اس لحاظ سے یہ کہنا صحیح تھا کہ قطب شاہی سلطنت میں "یک قطعہ زمین بے مزرعہ نیست"[1]۔ نیز

---

[1] یہ اورنگ زیب کا فقرہ ہے جو اس نے بحیثیت ناظم دکن کے لکھا تھا (رقعات عالمگیری)۔

باہر کے سیاح بھی اس سلطنت کی زرخیزی کے بہت مداح رہے ہیں۔ ٹیورنیر کہتا ہے کہ گولکنڈے کی سلطنت بہت زرخیز ہے[1]۔ اگرچہ طریقۂ مالگزاری کی خرابی سے رعیت کو نقصان پہنچتا تھا، تاہم آخری زمانے میں اس کی بہت کچھ اصلاح ہو چکی تھی۔ ویران دیہات آباد ہوئے اور تھے تالاب اور باؤلیاں کھدوائی گئی تھیں۔ اس سلطنت میں ہر قسم کا غلہ پیدا ہوتا تھا۔ گیہوں۔ چاول۔ جوار۔ باجرا۔ مونگ۔ چنا۔ مسور۔ تور۔ تل کثرت سے پیدا ہوتے تھے۔ اس کے علاوہ کپاس۔ تمباکو اور ارنڈی کی بہت پیداوار تھی۔ تمباکو اور تاڑی سے بہت محصول وصول ہوتا تھا۔ پھلوں میں آم۔ موز۔ لیمو۔ انار۔ اننا س بہت پیدا ہوتے تھے۔ ان کے علاوہ سنگترے اور امرود بھی پیدا ہوتے تھے[2]۔ مزروعہ زمینوں کے علاوہ اس سلطنت میں جنگلات بھی بہت تھے جس کی لکڑی اور جانوروں سے بہت بڑی آمدنی ہوتی تھی۔ جنگلات میں شیر۔ ہاتھی۔ ریچھ۔ چیتے۔ بندر۔ ہرن اور چیتل پائے جاتے تھے جو اب بھی ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ سلطنت کو اپنے چھ صوبوں کی زرعی پیداوار سے جن میں (۳۷) سرکار اور (۵۱۷) پرگنے تھے کافی محاصل وصول ہوتے تھے۔

معدنیات مزروعہ و غیر مزروعہ زمینات کے علاوہ قطب شاہی سلطنت کو معدنیات سے بھی غیر معمولی آمدنی ہوتی تھی۔ اس سلطنت میں ہیرے کی بے شمار کانیں تھیں۔ گولکنڈہ اپنے ہیرے کی کانوں کی وجہ سے نہ صرف دنیا میں مشہور تھا بلکہ بہت مالدار تھا، اور دکن کی کوئی سلطنت اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھی۔ ہیروں کی بہتات کی وجہ سے جو اس سلطنت میں پیدا ہوتے تھے اس کو بالعموم "ہیروں کا ملک" کہتے تھے۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ

---

[1] سیاحت نامہ ٹیورنیر جلد اول ص ۱۲۱۔ گولکنڈے کے تعلقات ص ۶۸۔

[2] گولکنڈے کے تعلقات ص ۸۵۔

اس سلطنت کے حدود میں ہیروں کی کانیں کب دریافت ہوئی تھیں اور کس زمانے سے ہیرے زمین سے کھودے جانے لگے۔ ایک روایت یہ ہے کہ سولھویں صدی کے اوائل میں ایک اتفاق سے یہاں ہیروں کا پتا چل گیا۔ انگریز کمپنی کا ملازم ولیم میتھولڈ جو ۱۶۱۵ء میں ہندوستان آیا تھا لکھتا ہے کہ ایک روز اتفاق سے ایک چرواہے کا پاؤں ایک پتھر سے ٹکرایا، اس نے پتھر اُٹھایا تو معلوم ہوا کہ وہ بہت چمکدار ہے، وہ اصل میں ہیرا تھا مگر اس نے معمولی داموں میں اس کو فروخت کر دیا۔[۱] یہ سلطان محمد قطب شاہ کا عہد تھا۔ غالباً اسی عہد میں یہ معدن دریافت ہوئے تھے اور عبداللہ قطب شاہ کے عہد میں اس دریافت میں ترقی ہو گئی اور ایک کان سے دوسری کان کا پتا چل گیا اور حکومت نے ان کی نگرانی شروع کر دی۔ پھر تلنگانے سے آگے بڑھ کر کرناٹک میں یہ معدن دریافت ہو گئے۔ کھودنے والوں کو اتنی مشق اور مہارت ہو گئی تھی کہ ٹیلے کی نوعیت، بُو اور زمین کے رنگ سے ان کا پتا چلا لیتے تھے۔[۲] چنانچہ جب محمد سعید میر جملہ نے کڑپا، سدھوٹ اور کنڈی کوٹ مسخر کئے تو یہاں بھی بے شمار معدن دریافت ہوئے اور لاکھوں روپیوں کے ہیرے بر آمد ہوئے اور اتنے ہیرے نکلے کہ ایک دو کی گنتی کرنے کی بجائے تھیلوں سے ان کی گنتی کی جاتی تھی محمد سعید نے شاہجہاں کی خدمت میں اپنی کمائی سے کوئی چالیس لاکھ قیمت کے ہیرے پیش کئے تھے اور ایک بہت بڑا ہیرا نذر کیا تھا جس کا وزن (۳۶۰) قیراط تھا۔[۳]

۱؎ گولکنڈے کے تعلقات ص ۸۵۔

۲؎ " " " ۳۲۔ بعضوں کا خیال ہے کہ سب سے پہلے کولور میں ہیرے دریافت ہوئے تھے اور اس کا باعث میر جملہ تھا، لیکن یہ صحیح نہیں ہے۔

۳؎ منوچی، جلد اول ص ۲۳۷۔ قیراط ایک اونس کا چوبیسواں حصہ ہوتا ہے۔

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس نے کرناٹک سے کتنے ہیرے جمع کئے تھے۔ اگر ہیروں کی خوبی اور قیمت کا اندازہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کے بڑے بڑے ہیرے گولکنڈے کی پیداوار ہیں۔ چنانچہ عبداللہ قطب شاہ اور ابوالحسن قطب شاہ کے جواہر خانوں میں بے شمار ہیرے تھے جو (۳۰) قیراط سے کم وزنی نہ تھے بلکہ اس سے زیادہ تھے۔ عبداللہ کے تاج میں بہترین ہیرے تھے۔ اور تھیونو ان ہیروں کی بہت تعریف کرتا ہے۔[1]

ٹیورنیر کے بیان کے مطابق قطب شاہی سلطنت میں (۲۳) کانیں پائی جاتی تھیں۔ یہ کچھ تلنگانے میں تھیں اور کچھ کرناٹک میں[2]۔ کونڈپلی جو دریائے کرشنا سے بہت قریب ہے اور نرساپور جو راج مندری سے جانب جنوب (۳۹) کے فاصلے پر واقع ہیں، ہیروں کے مخزن تھے۔ یہاں متعدد کانیں دریافت ہوئی تھیں۔ نرساپور میں تو ہیروں کی بہترین کانیں تھیں جہاں سے عمدہ اور بڑے ہیرے حاصل ہوتے تھے۔ عبداللہ قطب شاہ کے عہد میں جب گولکنڈہ مغلوں کے زیر اثر آگیا تو مغل شہنشاہ کی نظر اسی نرساپور پر پڑنے لگی، چنانچہ اسی خوف سے یہاں کی کانیں بہت دنوں تک بند کرادی گئیں[3]۔ اس کے علاوہ کنڈی کوٹ اور کولور میں جو کرناٹک میں واقع ہیں، بے شمار کانیں تھیں۔ بیان کیا جاتا ہے کہ ان کانوں میں بیس ہزار آدمی کام کرتے تھے، منجملہ ان کے بعض مزدور کان کھودتے تھے اور بعض مٹی نکالتے تھے اور بعض پانی خارج کرتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ ان مقامات میں جو پہلے ویران تھے اب بہت آباد ہو گئے تھے[4]۔ اکیلے کنڈی کوٹ کی

---

[1] سیاحت نامہ تھیونو حصۂ سوم ص ۱۰۲۔ [2] سیاحت نامہ ٹیورنیر جلد دوم ص ۵۶۔
[3] گولکنڈے کے تعلقات ص ۳۴۔
[4] " " " " ۳۱۔

کانوں میں محمد سعید نے کان کنی کے لئے بارہ سو آدمی مقرر کئے تھے[۱]۔ ان کانوں سے بہت آمدنی ہوتی تھی اور یہ قطب شاہی سلطنت کی آمدنی کا بہت بڑا ذریعہ تھا۔ بعض کانوں کو بادشاہ نے محض اپنے استعمال کے لئے مختص کر لیا تھا۔ یا ولیم میتھولڈ کا بیان صحیح سمجھا جائے تو دس قیراط سے زیادہ وزنی ہیرے سب بادشاہ کے لئے مختص تھے اور ان کی نگرانی کے لئے کہ ان میں کوئی چوری نہ کی جائے بادشاہ اپنے حاکم مقرر کرتا تھا[۲]، لیکن اس کے باوجود ہیرے چوری جاتے تھے اور باقی معدن تاجر اور ٹھیکہ داروں کے سپرد کر دیئے جاتے تھے کہ وہ شاہی محصول کے تحت کان کنی کر کے ہیرے برآمد کریں اور بازار میں فروخت کریں۔ یعنے جو لوگ ان کانوں سے ہیرے نکالنے کا ٹھیکہ لیتے تھے سرکار ان سے ہر کان سے فی گھنٹہ ایک ہون کے حساب سے شاہی معاوضہ لیتی تھی، خواہ کان کنی سے انھیں ہیرے دستیاب ہوں یا نہوں[۳]۔ یا بعض کانیں تین لاکھ ہون سالانہ معاوضہ پر دی جاتی تھیں۔ ہیروں کے علاوہ معدنیات میں لوہا۔ فولاد اور سیسہ بھی ملتا تھا اور باہر بھیجا جاتا تھا۔ گولکنڈے کا لوہا اور فولاد تو ہر جگہ مشہور تھا۔ سیاح کہتے ہیں کہ گولکنڈے میں لوہا بے حد پیدا ہوتا تھا اور اس کے فولاد کی دُور دُور تک شہرت تھی اور یہ پنجاب۔ لاہور اور ایران جایا کرتا تھا، اسی کی تلواریں بنتی تھیں جو دمشقی تلواریں کہلاتی تھیں[۵]۔

صنعت

گو یہ صحیح ہے کہ گولکنڈہ ایک زرعی ملک تھا، تاہم اس میں صنعت و حرفت کو بھی بہت فروغ تھا، کیوں کہ جوں جوں

---

۱ سیاحت نامہ ٹیورنیر، جلد اول ص ۲۳۰۔

۲ گولکنڈے کے تعلقات ص ۳۲ و ۳۳۔ یہ ۲۲ کانیں ۲۳ مختلف مقامات میں واقع تھیں۔ طوالت کے لحاظ سے یہ ترک کر دیئے گئے ہیں۔ ۳ سیاحت نامہ تھیونو حصہ سوم ص ۱۰۳۔

۴ گولکنڈے کے تعلقات ص ۳۲۔

۵ سیاحت نامہ تھیونو، جلد اول ص ۱۲۷۔

قطب شاہی تمدن ترقی کرتا گیا اس کی متمدن زندگی کے لئے بے شمار مصنوعات کی ضرورت ہوئی اور بادشاہ سے لے کر غریب آدمی تک ہر صاحبِ ذوق اس میں اضافہ کرتا رہا۔ چنانچہ جب شہرِ حیدر آباد آباد ہوا تو اس کے پرانے اور نئے تمدن کے لئے بے شمار مصنوعات تیار ہونے لگیں اور ملک میں باکمال صناع اور اہلِ حرفہ جمع ہونے لگے۔ ایک مغل مورخ کہتا ہے کہ حیدر آباد میں اتنے "ہنروراں۔ پیشہ وراں۔ کارگراں" تھے کہ ان کی تفصیل کے لئے ایک جلد کی ضرورت ہے۔[۱] مصنوعات میں کپڑا گولکنڈے کی خاص پیداوار تھی۔ کپڑا تمام ملک میں بنا جاتا تھا۔ غالباً یہ پہلے پہل مقامی ضروریات کے لئے بنا جاتا تھا، لیکن بعد کو اس کی باہر بھی برآمد ہونے لگی۔ اہلِ گولکنڈہ کے لطیف ذوق نے اس صنعت میں بڑا اضافہ کیا۔ ایسے نفیس کپڑے تیار ہوتے تھے کہ دوسری جگہ ان کی مثال نہیں تھی۔ جلاہے کسی کارخانے میں کام نہیں کرتے تھے بلکہ اپنے گھروں میں کام کرتے تھے اور خریدار پیشگی روپیہ دے کر اپنے ذوق اور ضرورت کے مطابق اچھے کپڑے تیار کرواتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ ہر روز نیا کپڑا تیار ہوتا تھا۔ بافت و رنگ اور وضع میں ہر روز نت نئی اختراعیں کی جاتی تھیں۔ کپڑے کی دو بڑی قسمیں تھیں، ایک سادہ اور دوسرے وضع دار۔ سادہ میں تن زیب اور کلف دار ہوتے تھے۔ کلف دار کپڑے بھی مختلف قسم اور دیازت و رنگ کے تیار کئے جاتے تھے اور بعض بہت مضبوط بھی ہوتے تھے۔ تن زیب جو مہین کپڑا ہوتا ہے مختلف رنگ کا تیار ہوتا تھا اور ورنگل میں بنا جاتا تھا اور یہ دونوں کپڑے سمندر کے راستے سے دوسرے ملکوں کو بھی جاتے تھے۔ ان کے علاوہ وضع دار کپڑے مختلف نقش و نگار کے ساتھ تیار کئے جاتے تھے جس کو چھینٹ کہتے ہیں۔ ان کی

---

[۱] ماثر عالمگیری ص ۳۰۲۔

تیاری میں بڑی محنت اور باریک بینی درکار تھی۔ یہ تن زیب اور کلف دار کپڑے سے بنائے جاتے تھے، لیکن ان پر رنگا رنگ کے چھاپے کئے جاتے تھے اور سادے کپڑوں سے قلمکار تیار کئے جاتے تھے اور ان کو قلمکار اس وجہ سے کہتے ہیں کہ سادہ کپڑے پر قلم اور برش سے نقش و نگار بنائے جاتے تھے اور دیکھنے میں زربفت معلوم ہوتے تھے۔[۱] قلمکار اپنے زمانے کی نایاب چیز تھی اور یہ صرف گولکنڈے کا خاص تحفہ تھا۔ اگرچہ رنگین نقش و نگار ہاتھ اور قلم سے بنائے جاتے تھے لیکن یہ اس قدر "پکے" ہوتے تھے کہ دُھلنے سے کبھی بدرنگ نہیں ہوتے تھے بلکہ کپڑا پھٹنے تک باقی رہتے۔ یہ کپڑے بالعموم ساحلی علاقوں میں اور بالخصوص مسولی پٹم اور ترساپور میں تیار ہوتے تھے اور ہندوستان بھر میں مشہور تھے۔ مسولی پٹم کا قلمکار بہت مشہور تھا اور اس کی دُور دُور تک مانگ تھی، کیوں کہ سوائے گولکنڈے کے ہندوستان میں کہیں نہیں تیار ہوتا تھا۔[۲]

دوسری مصنوعات میں لوہے کے اوزار اور اسلحہ شامل ہیں۔ گولکنڈے کی سلطنت میں اچھا فولاد تیار ہوتا تھا، اور اس کے کئی ہتھیار بنائے جاتے تھے۔ ترمل اور اندور میں جو گولکنڈے کے شمال میں واقع ہیں، فولاد کی اچھی صنعت قائم تھی، یہاں اچھا فولاد مہیا کیا جاتا تھا۔[۳] تھیونو کہتا ہے کہ اندلوائی میں جو اندور یا نظام آباد کے قریب ہے، تلوار، خنجر اور نیزے تیار ہوتے ہیں اور تمام ہندوستان میں جاتے ہیں۔[۴] لکڑی کی صنعت بھی

۱؎ حدیقۃ السلاطین، صاعدی، مطبوعہ ادارہ ادبیات اردو ص ۲۷۲۔

۲؎ گولکنڈے کے تعلقات ص ۳۵۔ منوچی جلد دوم ص ۴۳۱۔

۳؎ بلگرامی اور دلموٹ جلد اول ص ۳۹۹۔

۴؎ سیاحت نامہ تھیونو جلد سوم ص ۲۳۵۔

اچھی ہوتی تھی اور اس کے عمدہ صندوق، قلمدان اور دوسرا گھریلو سامان تیار ہوتا تھا، اور ان پر اچھی پالش کی جاتی تھی۔ یہ صنعت ابھی تک کونڈپلی میں جاری ہے۔ نرسا پور پیٹ، جو دریائے گوداوری پر واقع تھا اپنی صنعت کی وجہ سے بہت مشہور تھا۔ یہاں جہاز بھی تیار ہوتے تھے، چنانچہ یہاں متعدد کارخانے قائم تھے جن میں مسلمان، ہندو اور پرتگالی اپنے جہاز تیار کرواتے تھے اور انھیں جہازوں کے ذریعے مختلف سامان ندیوں کے راستے سے باہر بھیجا جاتا تھا۔ یہاں بڑے جہاز بھی بنتے تھے جو بحری سفر کے قابل ہوتے تھے۔ چنانچہ انگریز کمپنی کا ملازم شورر کہتا ہے کہ انگریزوں نے بھی یہاں "گلوب" نامی اپنا ایک جہاز تیار کروایا تھا۔[1] اس کے علاوہ ناگلونچا[2] میں نیل تیار کی جاتی تھی اور اس کی برآمد ہوتی تھی۔ مسولی پٹم میں بارود اور کارتوس بھی بنتے تھے اور جہاز کے بادبان بھی تیار ہوتے تھے۔[3] مسولی پٹم میں نمک بھی بنایا جاتا تھا۔

تجارت یہ عجیب اتفاق ہے کہ جس زمانے میں سلطنت گولکنڈہ قائم ہو رہی تھی مغربی اقوام ہندوستان کا راستہ دریافت کر رہی تھیں۔ ان اقوام نے چند ہی دنوں میں ہندوستان کے ساحلوں پر اپنے قدم جمالئے۔ یہ ماننا پڑتا ہے کہ ان کے آنے سے ہندوستان کی تجارت کو بہت فروغ ہوا۔ گولکنڈے کی سلطنت مشرق میں واقع تھی اور جب عبداللہ قطب شاہ کے عہد میں مشرقی ساحل کارومنڈل اس سلطنت کے قبضے میں آیا تو اس کے سامنے تجارت کی بہت سی

۱؎ گولکنڈے کے تعلقات ص ۶۳۔

۲؎ ناگلونچا، کھمم میٹ میں جنوب مشرق بارہ میل کے فاصلے پر واقع ہے۔

۳؎ گولکنڈے کے تعلقات ص ۶۴۔

راہیں کھل گئیں۔ سولھویں صدی میں صرف پرتگالی یہاں آئے تھے، لیکن سترھویں صدی میں انگریز اور ولندیزی بھی یہاں متمکن ہو گئے، چنانچہ انھوں نے پلی کٹ۔ سان تھوم اور مسولی پٹم میں اپنی کمپنیاں قائم کر لیں۔ جب یہ بندر گاہیں قطب شاہی عملداری میں آگئیں تو ان سے قطب شاہی سلطنت کو غیر معمولی فائدہ پہنچا۔ عبداللہ قطب شاہ اور ابوالحسن کے عہد میں مسولی پٹم نے اتنی ترقی کر لی کہ یہ اس زمانے کی بمبئی معلوم ہوتا تھا۔ یہ نہ صرف صنعت و حرفت کا بڑا مرکز تھا بلکہ انگریزوں اور ولندیزی کمپنیوں کی وجہ سے جو یورپ اور مشرقی ممالک سے تجارت کرتی تھیں اس کی حیثیت بین الاقوامی ہو گئی تھی اور اسی بندرگاہ کی وجہ سے جس کو مچھلی بندر بھی کہتے تھے قطب شاہی سلطنت کی شہرت میں بہت اضافہ ہوا۔ یورپ اور ایشیا کے لوگ اس سلطنت سے واقف ہوئے اور یہاں کی مصنوعات اور معدنیات دُور دراز ممالک میں فروخت ہوتیں، اور استعمال کی جاتی تھیں۔ گولکنڈے کی تجارت خشکی اور سمندر دونوں راستوں سے ہوتی تھی۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ تاجر غلّہ اور مصنوعات گولکنڈے کے بازاروں میں فروخت کرتے تھے اور غیر ممالک کی اشیاء اور مصنوعات کی درآمد کرتے تھے۔ مگر ان تاجروں کی تجارت میں زیادہ فروغ اس وقت ہوا جب کہ مغربی تاجروں کی بدولت مُلک کی مصنوعات اور پیداوارِ خام مُلک کے باہر جانے لگی اور بیرونی مصنوعات باہر سے آنے لگیں۔ چنانچہ مقامی تاجر اپنا سامانِ تجارت بندرگاہوں پر لے جاتے تھے اور مغربی تاجروں کے ہاتھ فروخت کرتے اور مغربی تاجروں سے بیرونی سامان حاصل کرتے تھے۔ قطب شاہی سلطنت بیرونی تاجروں کے مقابلے میں مُلکی تاجروں کے ساتھ زیادہ رعایت کرتی تھی اور ان سے بالعموم محصول نہیں لیتی تھی، اور آخری زمانے میں مغربی تاجروں پر یہ شرط عائد تھی کہ وہ مُلکی تاجروں پر کوئی محصول عائد نہ کریں۔ اسی وجہ سے مُلکی تجارت کو بہت فروغ ہوا، لیکن مُلکی تاجروں میں

ایرانیوں کا عنصر زیادہ تھا، اور غالباً مذہبی یگانگت کی وجہ سے کہ ایرانی شیعہ مذہب کے پیرو تھے ان پر شاہی عنایات کی بوچھار تھی۔ تمام قطب شاہی ساحلوں پر یہ ایرانی تاجر آباد تھے اور غالباً شاہی عنایات کی وجہ سے یہ بد اخلاق اور بد دماغ بھی ہو گئے تھے[1]۔ لیکن دوسری طرف جو بحری تجارت ہوتی تھی وہ اس سے کہیں زیادہ تھی مسولی پٹم کے ساحل سے ہر سال بنگال۔ اراکان۔ پیگو اور تناسرم اور جزائرِ ملایا کو جہاز جایا کرتے تھے۔ ان جہازوں میں ہر قسم کا کپڑا۔ لوہا۔ فولاد۔ سفید و رنگین سوت۔ تمباکو اور تیل جایا کرتا تھا جو گولکنڈے کی بر آمد تھی، اور جب یہ جہاز واپس آتے تھے تو ان میں شکر، بعض قسم کے کپڑے۔ یاقوت۔ نیلم۔ لاکھ۔ سونا۔ ٹین، مختلف قسم کی لکڑی۔ مرتبان۔ ریشم۔ سیاہ مرچ ملک میں آتی تھی[2]۔ بعض جہاز سیلون اور مالدیو کو بھی جاتے اور وہاں کی خاص اشیاء لاتے تھے اور یہ تمام اشیاء مسولی پٹم میں فروخت ہوتیں اور ملکی تاجران کو خرید کے بازاروں میں لاتے تھے۔ در آمد میں یہ چیزیں بھی تھیں:۔ سیاہ مرچ۔ صندل کی لکڑی۔ سیسہ۔ چین کا ریشم، شکر۔ مشک۔ مسام دار مٹی کے برتن۔ سُرخ کپڑے۔ چین کا مخمل۔ لاکھ۔ بلوریں ظروف وغیرہ۔ حکومت در آمد و بر آمد پر ۳½ فی صدی محصول وصول کرتی تھی اور یہ محصول بہ شکل جنس یا عہدہ دار کی صواب دید سے بہ شکلِ زر لیا جاتا اور سختی سے وصول کیا جاتا تھا۔ ان محاصل در آمد و بر آمد کے علاوہ مدراس اور مسولی پٹم کے توطن کا کرایہ بھی وصول کیا جاتا تھا۔ یعنے جو تاجران ساحلوں پر رہتے اور اپنی منڈیاں قائم کرتے تھے ان کو سکونت کا کرایہ دینا پڑتا تھا۔ پلی کٹ میں در آمد و بر آمد کا محصول دو فی صدی تھا لیکن

---

[1] گولکنڈے کے تعلقات ص ۵۶ و ۵۸۔

[2] " " " ۶۰۔

ہر جہاز سے جب وہ بندرگاہ پر لنگر انداز ہوتا پندرہ ہون زائد محصول لیا جاتا تھا۔ یہ جہاز بالعموم سپٹمبر میں مشرق کی طرف اور جنوری میں مغربی ممالک کو جایا کرتے تھے۔ ان میں دیسی تاجروں اور خصوصاً مسلمانوں کے جہاز بھی ہوتے اور مغربی کمپنیوں کے جہازوں سے ملک کا سامانِ تجارت یورپ جاتا تھا۔[1]

ملک کی خوش حالی

ان قدرتی اور انتظامی ذرائع کی بدولت جن کا اوپر ذکر ہوا، قطب شاہی سلطنت کی آمدنی خاطر خواہ تھی۔ ابوالحسن قطب شاہ کے عہد کے ایک گوشوارے سے سلطنت کی آمدنی دو کروڑ سینتالیس لاکھ پچاس ہزار پانچ سو تین روپے معلوم ہوتی ہے۔ اس کی تفصیل سرکار اور پرگنوں کے اعتبار سے حسب ذیل ہے:۔

صوبہ (۱) سرکار محمد نگر ۱۲ پرگنے	سرکار میدک ۱۳ پرگنے
ﻉ لک معہ لمہالوسہ ۱۳ ر	وسہ لک ع لولہ ۶ ر
سرکار کولاس ۵ پرگنے	سرکار ملنکور ۳ پرگنے
ہو لک ﻋ للوالمہالے ۸ ر	معہ سیامعلہ
صوبہ (۲) سرکار ایلگندل ۱۲ پرگنے	سرکار ورنگل ۱۶ پرگنے
لو ع صامعہ ع لک ۴ ر	ہ لک اہ معہ اسمالہ لف ۸ ر

۱؎ گولکنڈے کے تعلقات ص ۵۴ و ۵۵۔

سرکار کھم میٹ ۱۱ پرگنے

لوعہ سماعہ عے لکھ

۱۳ ار

سرکار دیورکنڈہ ۱۳ پرگنے

لوعہ سماعے لہ عے لکھ

صوبہ (۳) سرکار پانگل ۵ پرگنے

دہ مارہ عہ للعہ لکھ

۱۴ ار

سرکار مصطفےٰ نگر ۲۴ پرگنے

ماعے عے لکھ

۱۵ ار

سرکار بھونگیر ۱۱ پرگنے

معہ للعہ لماعہ لہ لکھ

۹ ر

سرکار اکرکرا ۶ پرگنے

مدعہ مارمدعہ صہ لکھ

۱۲ ار

صوبہ (۴) سرکار کویل کنڈہ ۱۳ پرگنے

لہ صماعہ عے لکھ

۱۴ ار

سرکار گھن پورہ ۸ پرگنے

سہ اسماللعہ صہ لکھ

۴ ر

سرکار مرتضےٰ نگر ۳۹ پرگنے

معہ لمہاللعہ لہ عے لکھ

۴ ر

سرکار مچھلی پٹن ۸ پرگنے

للعہ عسہ صہ لکھ

صوبہ (۵) سرکار نظام پٹن محال

معہ لکان

سرکار ایلور ۱۲ پرگنے

لعہ انہماللعہ لے لکھ

۱۵ ار

سرکار راج بندری ۲۴ پر گنے　　　　سرکار سیکاکل ۱۱۵ پر گنے

لعہ لکھ

معہ عہ لعہ للعہ

۱۱ر

سرکار کانات

لکان

عص

صوبہ (٦) کرناٹک، یعنے ارکاٹ ١٦ سرکار ١٦٢ پر گنے

عہ لکھ

معہ لعہ

ہون [1]

لیکن یہ صرف زمینات کی آمدنی تھی۔ معدنیات اور تجارت کی آمدنی اس کے علاوہ ہونی چاہئے، کیوں کہ اکیلے سرکار کونڈپلی کا محصول چالیس ہزار ہون، مسولی پٹم کا محصول اٹھارہ ہزار ہون اور نظام پٹن کا محصول پانچ لاکھ پانچ ہزار سے لے کر چھ لاکھ چھ ہزار تک وصول ہوتا تھا، یہ تجارتی مرکز تھے۔ اس طریقے سے سلطنت کی مجموعی آمدنی پانچ کروڑ روپے ہونی چاہئے [2] اور

---

[1] تاریخ ظفرہ ص ۷۳ اور ۱۷۴ سے منوچی نے جو گولکنڈے کے آخری زمانے میں آیا تھا، سلطنت کی آمدنی پانچ کروڑ روپے بتائی ہے (منوچی جلد دوم ص ۱۵۱) انگریز کمپنی کے ملازم ولیم متھولڈ نے سلطنت کی آمدنی پچیس لاکھ ہون یا ایک کروڑ روپے، اور شورر نے انیس لاکھ اور دوسروں نے سترہ لاکھ ہون بتائی ہے۔ آخر الذکر دو اعداد بہت پہلے کے ہیں ممکن ہے سترھویں صدی کے اوائل میں آمدنی کم ہو، لیکن اس کو فاضل آمدنی سمجھنا چاہئے۔ شورر نے تو اس کو واضح کر دیا ہے کہ انیس لاکھ ہون فاضل آمدنی ہے (گولکنڈے کے تعلقات ص ۱۰ اور ۵٦ و ۷۷)۔

قرینہ یہ ہے کہ مصارفِ سلطنت منہا ہونے کے بعد تقریباً ایک کروڑ روپے شاہی خزانے میں فاضل رہتے تھے، گو ایک انگریز نامہ نگار شورر نے صرف انیس لاکھ ہون، یا تقریباً اسّی لاکھ روپے سلطنت کی بچت بتائی ہے۔ اس میں بالکل شبہ نہیں ہے کہ سلطنت کی بچت بہت تھی اور شاہی خزانے ہمیشہ فاضلات سے بھرے رہتے تھے، گو یہ فاضلات اکثر خارجی سیاست کی نذر ہوئے، یعنے ایک طرف مغل حکومت کو پیش کش، خراج اور تاوان کی صورت میں ادا کئے جاتے تھے تو دوسری طرف مرہٹوں کو دیئے جاتے تھے، لیکن اس کے باوجود شاہی خزانہ نقد و جواہر سے بھرا ہوا تھا جو گولکنڈے کے خاتمے کے بعد فاتحوں کے ہاتھ لگا۔ پوشیدہ دفینے اس کے علاوہ تھے جن سے بعد کی حکومتوں نے فائدہ اُٹھایا۔

اُمراء و عوام

اُمراء اور عوام بھی بہت مال دار تھے۔ اُمراء کو دو طرح کی زمینیں و جاگیریں حاصل تھیں۔ ایک مدد معاش دوسرے فوجی خدمت کے لئے مشروط تھیں، لیکن آخر الذکر جاگیروں سے بھی ان کا ذاتی فائدہ بہت تھا۔ اس طرح ان کی مالی حالت بہت اچھی ہونی چاہئے۔ سچ تو یہ ہے کہ گولکنڈے کے اُمراء شاہانہ زندگی بسر کرتے تھے۔ عوام میں جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے دو طرح کے لوگ تھے:۔ تاجر پیشہ جو اندرونِ مُلک اور بندرگاہوں میں مغربی اقوام کے ساتھ تجارت کرتے تھے بہت خوش حال اور مال دار تھے، لیکن ایسے تاجر زیادہ تر ایرانی تھے۔ یہ ایرانی سود پر روپیہ کا لین دین بھی کرتے تھے اور چار فی صد سود لیتے تھے اور اس سودی کاروبار سے یہ لوگ بے حد مال دار ہو گئے تھے۔[1] لیکن دوسرے مسلمان سرکاری نوکری پر گذارہ کرتے تھے، گویا ان کی روزی سب شاہی خزانے سے

---

[1] گولکنڈے کے تعلقات ص ۷۸۔

ملتی تھی[1] ممکن ہے کہ یہ لوگ اس زمانے کی ارزانی کی وجہ سے خوش حال ہوں، لیکن ان کا ذریعۂ معاش ناپائیدار تھا۔ ہندو آبادی میں ملازم پیشہ و تاجر دونوں طرح کے لوگ تھے۔ سلطنت کی مقامی حکومت اور دیہی نظم و نسق سب انھیں کے ہاتھ میں تھا۔ نہ صرف اضلاع کے گورنر بلکہ تمام مستاجر، جو اضلاع ٹھیکے پر لیتے تھے اور مالگزاری ادا کرتے تھے سب ہندو تھے۔ تاجر اور دکان کن بھی اکثر ہندو ہوتے تھے اور حکومت کی طرف سے معدنوں کی نگرانی بھی انھیں لوگوں کے سپرد تھی۔ ذیلی طبقے کی جو کاشتکار اور مزدوروں پر مشتمل تھا، معاشی حالت کا پتا چلانا بہت مشکل ہے۔ قیاس یہ ہے کہ اجارہ داری کے قبیح عملدرآمد کی وجہ سے جو ابتدائے سلطنت سے لے کر ابوالحسن کے عہد تک جاری تھا۔ کاشتکاروں کو بہت نقصان پہنچا تھا اور یہ بے حد مفلس نظر آتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ اکثر دیہات ویران ہو گئے تھے۔ یہ تو ظاہری حالت تھی۔ یہ لوگ دراصل اتنے مفلس نہیں تھے جس قدر وہ نظر آتے تھے، ممکن ہے کہ یہ گورنروں اور اجارہ داروں کے ڈر سے اپنا اندوختہ زمین میں چھپا رکھتے ہوں[2]۔ لوہا، سونا۔ چاندی کا کام کرنے والوں کو تجارت گھروں سے تنخواہ ملتی تھی۔ لوہار اور سُنار کو سارے دن کی تین آنے مزدوری ملتی تھی اور ان کے ملازم پالکی اُٹھانے والے کہار ایک آنہ پاتے تھے، لیکن ان لوگوں کا یہ فرض تھا کہ اپنی کمائی میں سے مقامی حکام کی بھی خدمت کریں[3]۔ اس طریقے سے ذیلی طبقے کی معاشی حالت

---

[1] ایک انگریز نامہ نگار کہتا ہے کہ تقریباً تمام مسلمان شاہی خزانے سے اپنی روزی کماتے ہیں (گولکنڈے کے تعلقات ص ۸۷)۔

[2] گولکنڈے کے تعلقات ص ۷۷۔

[3] ״ ״ ״ ۲۷۔

اچھی نہیں تھی۔

قطب شاہی سلطنت میں غلّہ اور دوسری اشیاء مندرجہ ذیل قیمتوں پر فروخت ہوتی تھیں جن سے اس زمانے کی طلب و رسد کا اندازہ ہو سکتا ہے:۔

گیہوں۔ ۳ تا ۴ ہون ایک کھنڈی	بیل۔ ۱ تا ۲ ہون
چاول۔ ۱ تا ½ ″ [۱]	بکرا۔ ۱ تا ۲ فنم
مکھن۔ ۷ تا ۱۰ فنم ایک من (۱۲ سیر)	مرغیاں۔ ۱ ہون۔ ۶۰۔۷۰ یا کبھی ۸۰
انڈے۔ ۱ فنم ۸۰	چین کا خام ریشم۔ ۴۰ تا ۴۵ ہون ایک من
سیاہ مرچ۔ ۲۵ ہون ایک کھنڈی	مشک۔ ۱۰ تا ۱۲ ہون ایک سیر
جوتر۔ ۳۳ تا ۶۰ ″ ″	پارا۔ ۲۰ تا ۲۵ ″ ایک من
لونگ۔ ۵½ تا ۱۰ ″ ایک من	کافور۔ ۵ تا ۳۰ ″ ایک سیر
صندل کی لکڑی۔ ۱۰۰ تا ۱۲۰ ″ ایک کھنڈی	چینی مخمل۔ ۱ تا ۱¼ ″ ایک گز
سیسہ۔ ۷ تا ۲۰ ہون ″	یوروپین سامان ایک ہون ۲ یا ۳ عدد
ٹن۔ ۵۴ تا ۸۰ ہون ″	لاکھ کا سامان ¾ تا ایک ہون ایک عدد
پھٹکری۔ ۱۲ ہون ″	آئینے بھی فروخت ہوتے تھے۔ [۲]

سکے

قطب شاہی سکوں کی مختصر تاریخ ہے۔ اس سلطنت میں اکثر سونے کے سکے استعمال ہوتے تھے جن کو ہون کہتے تھے، اور یہ ہون جن کی قدر و قیمت چار یا ساڑھے چار مغل روپیوں کے برابر ہوتی تھی، دکن میں بہت مقبول تھے اور اسی سکے سے عام لین دین ہوتا تھا، اور چونکہ یہ سکے مقدار میں بہت چھوٹے ہوتے تھے اور ان کے گننے میں دشواری ہوتی تھی اس لئے لکڑی کے تختوں کی مدد سے گنے جاتے تھے۔ یعنے ایک صاف لکڑی کے

---

[۱] فنم یا پنم مقامی سکہ تھا جو ہون کا سولھواں حصہ تھا۔

[۲] گولکنڈے کے تعلقات ص ۶۲ و ۶۳۔

تختے پر خانے بنائے جاتے تھے اور ان پر ہون پھیلائے جاتے اور جو ہون ان خانوں میں رہ جاتے وہ گنتی میں آجاتے اور باقی نکال دیئے جاتے تھے۔ عوام میں ہون اس قدر مقبول تھے کہ بہمنی دور میں اس کی خاطر بڑی شورش ہو گئی۔ جب محمد شاہ اول بہمنی نے ہون کو خارج کر کے بہمنی سکے جاری کر دیئے تو ملک میں بڑی بے چینی پھیلی، چنانچہ بالآخر بہمنی سکوں کے رواج کے ساتھ ہون کا چلن بھی باقی رہا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قطب شاہی دور میں ہون شاہی دارالضرب میں ڈھلتے تھے اور ان پر شاہی علامت، یعنے بادشاہ کے نام کا سر حرف کندہ ہوتا تھا، چنانچہ بعض ہون ایسے دریافت ہوئے ہیں جن پر عبداللہ قطب شاہ کا ع کندہ ہے۔ غالباً قطب شاہوں نے چاندی کا روپیہ مضروب نہیں کیا۔ ہون سے ہی تمام جمع بندی ہوتی اور رقمی ادائیاں کی جاتی تھیں۔ ہون کے علاوہ تانبے کے تین سکے مضروب ہوتے تھے۔ ایک فنم یا پنم تھا جو ہون کا سولھواں حصہ تھا، اور فنم آٹھ حصوں میں تقسیم تھا، اس آٹھویں حصے کو "تول" کہتے تھے اور تول کے چار حصے ہوتے تھے اور ان کو "نار" کہتے اور یہ نار سب سے چھوٹا سکہ تھا۔

چوبیسواں باب

علمی سرپرستی

بیجاپور کے ساتھ گولکنڈے کی قطب شاہی سلطنت بھی علم و فن کی سچّی پرستار تھی۔ اس سلطنت نے علم و فن کی بہت بڑی خدمت کی اور ایک ایسا علمی سرمایہ چھوڑا جو کبھی نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔ گو یہ ایک حقیقت ہے کہ دکن کی تمام علمی سرگرمیاں بہمنیوں کی یادگار تھیں جنھوں نے اپنے بلند پایہ علمی ذوق سے دکن کو جگمگا دیا تھا اور یہ کہنا صحیح ہے کہ گولکنڈے کا علمی شغف بہمنی سلطنت سے ورثہ میں ملا تھا، چنانچہ سلطان قلی قطب شاہ اور اس کے جانشین گلبرگہ اور بیدر کے علمی خزانوں کے ریزہ چیں تھے، تاہم اس خاندان کے بانی بھی ترکستان کے ایک ذی علم و شائستہ خاندان کے سپوت تھے اور اپنے ساتھ ایک اچھا علمی ذوق لے کر آئے تھے، چنانچہ جب گولکنڈے کی سلطنت قائم ہوئی تو ان قطب شاہوں کی بدولت تلنگانے میں بھی علم کی بساط بچھ گئی اور حیدرآباد بھی علم کا ایک بہت بڑا مرکز بن گیا۔ اس سلطنت کے تمام فرماں روا سب کے سب تعلیم یافتہ اور علم و حکمت کے دل دادہ تھے جس طرح ان لوگوں نے ملک جہانبانی کو اپنا فرضِ منصب سمجھا تھا اسی طرح علم و حکمت کی سرپرستی کو بھی اپنا فریضۂ حیات بنایا تھا۔ ان حکمرانوں نے نہ صرف علماء و شعراء کی حوصلہ افزائی کی بلکہ خود شاعری کی

اور بڑی کتابیں لکھیں اور ذاتی دلچسپیوں کے علاوہ اپنی رعایا کی ذہنی تربیت کا بھی انتظام کیا کہ وہ اس نعمت سے محروم نہ ہوں۔ ملک میں جگہ جگہ مدرسے بنائے اور بیش قرار معلم مقرر کئے اور مقامی زبان تلنگی کی اس طرح سرپرستی کی کہ گویا یہ خود ان کی زبان تھی تاکہ ملک کا ہر طبقہ دولتِ علم سے مالا مال ہو۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قطب شاہوں کی اس علم دوستی کی وجہ سے تمام تلنگانے میں علم کی لہریں دوڑ گئیں اور اکتسابِ علم کا عام شوق پیدا ہوگیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دو پشتوں کے بعد ہی تمام ملک میں ایک علمی چہل پہل پیدا ہوگئی تھی۔ مسلمان تو تمام تعلیم پاتے تھے اور کتب خانے جمع کرتے تھے، کیوں کہ شاہی کتب خانوں کے علاوہ جن میں ہزارہا کتابیں تھیں عام لوگوں کے بھی بے شمار کتب خانے تھے۔ لیکن ہندو رعایا بھی اس شوق سے خالی نہ تھی۔ ہندو طبقوں میں لکھنے پڑھنے اور حساب دانی کا خاطرخواہ مشغلہ تھا۔ سرکاری محکموں میں ان سے کام لیا جاتا تھا۔[۱] مقامی زبان کے علاوہ ہندو فارسی بھی پڑھتے تھے جو سرکاری زبان تھی، چنانچہ مادنا کا تمام خاندان فارسی جانتا تھا، یہ شاہی فرامین لکھنے اور پڑھنے کے قابل تھا۔ قرائن یہ ہیں کہ ملک میں ایسے متعدد خاندان ہوں گے جو اپنے کو ملک اور حکومت کی ضروریات کے لئے تیار کرتے تھے۔ تلنگی زبان کی ترقی اس کے علاوہ تھی کیوں کہ حکومت اس کی بھی بڑی سرپرست تھی۔

سلطان قلی کے عہد میں جب کہ سلطنت کی تاسیس ہو رہی تھی کسی علمی سرگرمی کی توقع رکھنا بے معنے ہوگا، کیوں کہ اس ابتدائی زمانے میں سلطنت کو بہت کچھ سیاسی و دفاعی کام کرنا تھا جو ہر نوخیز سلطنت کو کرنا پڑتا ہے۔ ہر سلطنت میں علمی و تمدنی کام اس وقت ہوتے ہیں جب کہ وہ چاروں طرف سے مستحکم ہو جائے اور ملک کے دل و دماغ ٹھنڈے دل سے علمی جستجو کر سکیں۔ اگرچہ

---

[۱] گولکنڈے کے تعلقات ص ۱۵۔

سلطان قلی قطب شاہ کے جانشین جمشید نے اپنے علمی شغف کا کافی ثبوت دیا تھا، لیکن گولکنڈے کی اصل علمی سرگرمیاں ابراہیم قطب شاہ کے عہد سے شروع ہوئیں جب کہ یہ سلطنت چاروں طرف سے مستحکم ہو گئی اور اس کو سانس لینے کا موقع ملا۔ چنانچہ اس کے جانشین محمد قلی قطب شاہ اور سلطان محمد کے عہدِ حکومت جو بہت پُرامن تھے علمی و تمدنی ترقیوں کے لئے مختص تھے، قطب شاہوں کا تمام علمی سرمایہ انھیں دو عہدوں کا ہے۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ قطب شاہی سلطنت اپنے زوال کے زمانے میں بھی جب کہ مختلف دشمن اس کی گھات میں لگے ہوئے تھے اپنا علمی و تمدنی سرمایہ اسی رفتار سے جمع کرتی رہی جیسے پہلے کرتی تھی، اور یہ کہنا خلافِ واقعہ نہیں ہے کہ یہ اپنی آخری گھڑیوں تک عمرانی خدمت کرتی رہی جیسے پہلے کرتی رہی۔ اس کا آخری تاجدار اپنی نظربندی میں بھی شعروسخن کا مشغلہ رکھتا تھا، اگرچہ سلطان قلی قطب شاہ کے عہد میں کوئی علمی کام نہیں ہوا، تاہم اس کا پایہ تخت اہلِ علم سے خالی نہیں تھا۔ اتنا تو معلوم ہوتا ہے کہ اس نے "آش خانہ" کے نام سے ایک حلقہ بنا رکھا تھا جہاں علماء جمع ہوتے تھے، یہ ایک محل تھا جس میں علمی مباحث ہوتے تھے اور سلطان قلی بھی اس میں شریک ہوتا تھا۔[1] اس کے جانشین جمشید قطب شاہ نے شعروسخن میں بڑی دلچسپی کا اظہار کیا، یہ اچھا شاعر تھا اور جمشید تخلص کرتا تھا بعض مرتبہ فی البدیہہ اشعار بھی کہے تھے، چنانچہ احمد نگر میں برہان نظام شاہ کی طرف سے جو شاہی اعزاز پیش کئے گئے تو اس نے نظم میں اس کا فی البدیہہ جواب دیا تھا۔ اس کے علاوہ فرصت کے موقعوں پر بھی اس نے بہت سے قصیدے اور غزلیں کہی تھیں۔ تاریخ قطب شاہی کے مولف نے منجملہ ان کے چند قصیدے اور غزلیں نقل کی ہیں، ان کے چند نمونے یہ ہیں جن سے سلاستِ زبان کا

---

[1] شہ پارے۔ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور۔

پتا چلتا ہے :-

قصیدہ

اے بتو ختم ملک زیبائی | کارِ عشق از تو یافت بالائی
کاکل و چین زلف و خال لبت | ہر یکے در کمالِ رعنائی
در رہ عشق ہر کہ پا بہ نہاد | آخر او سرکشد بہ رسوائی

غزل (۱)

بے لبِ لعلِ بتان بادہ حرام است مرا | لبِ میگون بنما چون مہِ جام است مرا
با سرے زلفِ تو سودائے سیاہے دارم | اینچہ سود است کہ با زلفِ چو شام است مرا

. . . .

. . . .

ترک این کار نخواہم من بیدل کردن | من کہ جمشیدم و این کار تمام است مرا

غزل (۲)

اشک از دیدہ بہ بینید کہ چون می آید | قاصدے ہست کہ از شہرِ جنون می آید
چند در عشقِ بتان شہرہ شوی اے جمشید | گر کند غیر تو این کار زبون می آید

غزل (۳)

آن پری روئے بہ بینید چسان می آید | دل زِ من بُردہ کنون از پے جان می آید
جان بہ سودائے تو دادیم کہ سودے بہ بریم | اینچہ سود است کہ دایم بہ زیان می آید

. . . .

چون بہ بینند بتان از سرِ ناز می گویند | عاشقِ دل شدہ جمشید چہان می آید

غزل (۴)

اے بہ رخ نوردہِ دیدۂ صاحب نظران | خون شد از محنتِ ہجرت دلِ خونیں جگران
عمرہا رفت کہ رفتی دیراہِ تو ہنوز | ہمچنان چشم ترم ماند بہ حیرت نگران

غزل (۵)

سر بلندی من از بالائے رعنائے تو شد　　این پریشانیم از زلفِ سمن سائے تو شد

غزل (۶)

سر و روانِ خویش راکردم درونِ دیدہ جا　　تا پرورش یابد دگر آں سرو زآب چشم ما

غزل (۷)

بارِ جفائے جز تو نگارے نمی کشیم　　غیر از جفا و جورِ تو بارے نمی کشیم

ابراہیم قطب شاہ کے عہد میں جب کہ سلطنت کی صحیح معنوں میں تعمیر ہوئی تھی علم و فن کی شاہی سر پرستی شروع ہو گئی اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابراہیم کو علم کا بڑا چسکا تھا، چنانچہ اس نے اپنے ارد گرد بڑے علماء و فضلاء جمع کر رکھے تھے اور ان کے ساتھ بادشاہ کی دلچسپ صحبتیں ہوتی تھیں، اور یہ بھی دلچسپ بات ہے کہ یہ اہلِ علم سفر میں بھی بادشاہ کے ساتھ رہتے تھے اور ان سے مختلف مسائل پر بحثیں ہوتی تھیں، چنانچہ تاریخ قطب شاہی مورخ کہتا ہے :۔ "در سفر و حضر ہموارہ اہلِ فضل و ہنر در خدمتش می بودند۔ در مجلسِ ہمایوں در مباحثہ علومِ دینی پرداختہ در تحقیق مسائل یقینی شرائط اہتمام بجائے می آوردند"[۲] یہ علماء شاہی عنایات سے سرفراز ہوتے تھے۔ ابراہیم کے درباری علماء کے چند نام یہ ہیں :۔ امیر شاہ محمد انجو۔ امیر عماد الدین محمود شیرازی۔ جالینوس الزمان قاسم بیگ شیرازی اور حسین قلی مرزا، جو علم منطق کے بڑے عالم تھے قاسم طبسی نے شاہی مکاتیب کا ایک مجموعہ مرتب کیا تھا جس میں ابراہیم قطب شاہ کے خطوط اور سرکاری دستاویز ہیں۔ ابراہیم نے مساجد اور دوسری عمارتوں کے علاوہ مدرسے بھی بنائے تھے: "مساجد و مدارس رفیعہ و عمارات رفیعہ کہ بہ یمن آنحضرت اتمام یافتہ"[۳]

---

[۱] حدیقۃ العالم حصہ اول ص ۱۹۸ دکھنی مخطوطات نصیر الدین ہاشمی۔

[۲] تاریخ قطب شاہی ورق ۲۲۵ کتب خانۂ نواب سالار جنگ بہادر۔

اس عہد میں تالیف کا کام بھی شروع ہو گیا تھا، چنانچہ خور شاہ بن قباد الحسینی نے تاریخ قطب شاہی کے نام سے ایک مبسوط تاریخ لکھی تھی[1] اسکے جانشین محمد قلی قطب شاہ کے عہد میں یہ علمی سرگرمی بہت بڑھ گئی اور اس کی علم دوستی اور قدر دانی کی وجہ سے بے شمار اہلِ علم گولکنڈے میں جمع ہو گئے، چنانچہ علامہ میر مومنؒ استر آبادی جو بعد کو سلطنت کے پیشوا ہو گئے اپنے زمانے کے بہت بڑے عالم تھے اور علمی تبحر اور اپنی اخلاقی زندگی کی وجہ سے "مرتضائے ممالک اسلام" کے لقب سے موسوم تھے۔ یہ فارسی کے بڑے شاعر اور کئی کتابوں کے مصنف تھے۔ ان کا فارسی دیوان بھی پایا جاتا ہے، ان کے علمی حلقوں سے حیدر آباد میں تعلیم و تعلم کی بڑی گرم بازاری تھی ان کے علاوہ قاضی سمنانی۔ میرک معین سبزواری۔ مرزا محمد امین سیستانی علمائے دربار تھے۔ مرزا محمد امین نے خمسہ نظامی کے جواب میں چار مثنویاں لکھی تھیں:۔ شیریں خسرو۔ لیلیٰ مجنوں۔ فلک البروج اور مطمح الانظار[2]۔ قرصی نے "نسب نامہ قطب شاہی" کے نام سے ایک طویل نظم لکھی تھی جس میں بیس ہزار اشعار ہیں[3]۔ محمد قلی قطب شاہ نے مسجد۔ شفاخانوں اور حماموں کے ساتھ مدرسے بھی بنائے تھے جن کے آثار اب تک موجود ہیں، اور اس بادشاہ کی علم دوستی کا پتا دیتے ہیں۔ یہ خود بھی فارسی کا اچھا شاعر تھا، اور فارسی میں "قطب شاہ" تخلص کرتا تھا۔ اس کے کلام کے چند نمونے ذیل میں درج ہیں، یہ استادانہ کلام معلوم ہوتا ہے:۔

غزل (۱)

یا شمع بگو گرمیٔ دیوانۂ خود را　　کاتش زند از رشک تو پروانۂ خود را

---

[1] یہ تاریخ عبد اللہ قطب شاہ کے عہد میں ۱۰۳۸ھ میں جا کر ختم ہوئی اس میں قطب شاہوں کا حال نہیں ہے۔ اس کا ایک اچھا نسخہ نواب سالار جنگ بہادر کے کتب خانے میں ہے۔

[2] مخطوطات، مولفۂ نصیر الدین ہاشمی صاحب۔

[3] مقالہ اختر حسن، کتب خانہ مولانا ابو الکلام آزاد، اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ۔

ہوش و خرد از پائے در افتند چو مستاں ۔۔۔ چوں سُرمہ کشی نرگسِ مستانۂ خود را

غزل (۲)

ملک محبت کہ داد خواہ ندارد ۔۔۔ ملک چنین ہیچ بادشاہ ندارد

. . . .

تکیہ گہ قطب شاہ کہ چون دگران نیست ۔۔۔ جز کرم دوست تکیہ گاہ ندارد

غزل (۳)

حرفی ز لبِ یار شنیدیم شنیدیم ۔۔۔ صد شکر کہ این بادہ چشیدیم چشیدیم

. . . .

اے قطب شاہ از درد دل خویش چہ گوئیم ۔۔۔ مشتاق ترا ز خویش ندیدیم ندیدیم

غزل (۴)

بہ دور خطہ ز چشمت کم نشد شوخی و صیادی ۔۔۔ کہ این دام دگر شد بہر دل بے خطہ آزادی

. . . .

اگرچہ نیست زیبے بہ ز عدل و داد شاہاں را ۔۔۔ ازان زیبندہ تر باشد بہ عاشق از تو بیدادی[1]

سلطان محمد قطب شاہ اپنے باپ دادا سے زیادہ علم پرور بادشاہ ثابت ہوا، جیسے یہ مذہب پرست تھا ویسے وہ بہت بڑا عالم بھی تھا، اور تاریخ کے الفاظ میں:-
"از اقسام علوم عقلی و نقلی آگاہی تمام ایشان را حاصل است" تاریخ سے اس کو خاص دلچسپی تھی، چنانچہ نظام الدین کہتا ہے کہ سلطان محمد ہمیشہ کتب سیر و تواریخ پڑھتا تھا، اور اس کا حافظہ اس قدر زبردست تھا کہ ایک مرتبہ پڑھی ہوئی چیز اس کو ازبر ہو جاتی تھی اور جو واقعہ اس کے سامنے بیان کیا جاتا تھا وہ اپنے معلومات سے اس کی وضاحت کر دیتا تھا، اور جو کتاب پڑھتا تھا اس کی پشت پر اپنے ہاتھ سے مصنف یا مولف کا حال اور ضروری توضیح کر دیتا تھا، چنانچہ

---

[1] تاریخ قطب شاہی، ورق ۲۸۳ و ۲۸۴۔

اس وقت شاہی کتب خانے کی کئی کتابیں ایسی موجود ہیں جن پر سلطان محمد کے ہاتھ کی تحریریں پائی جاتی ہیں۔ اگر ان سب کو ایک جگہ جمع کر لیا جائے تو ان سے سلطان محمد کے عہد کی اچھی تاریخ ہو سکتی ہے۔ ان پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ سلطان محمد اپنے ہمعصر علماء سے کسی طرح کم نہیں تھا بلکہ "فضلائے بائے سریر و فصحائے خویش تقرر بہ کمالات و استعداد آن مغفور و مبرور اعتراف داشتند"[ا] یہ اچھا شاعر بھی تھا اور فارسی میں "ظل اللہ" تخلص کرتا تھا۔ کلام سے شاعری کا صحیح ذوق اور بلند خیالی معلوم ہوتی ہے۔ اس کے دربار میں سید کمال الدین مازندرانی، میر قطب الدین نعمت اللہ جیسے لائق لوگ تھے۔ اس عہد میں کئی بلند پایہ تصنیفیں لکھی گئیں۔ تاریخ قطب شاہی جو قطب شاہی خاندان کی مستند تاریخ ہے اسی عہد میں اور اسی بادشاہ کے ایما سے

[ا] حدیقۃ السلاطین ص ۲۷۔ تاریخ قطب شاہی کے مولف نے ان الفاظ میں سلطان محمد کی علمیت پر روشنی ڈالی ہے:۔

"از اقسام علوم عقلی و نقلی آگاہی تمام ایشان را حاصل است و استحضار آن حضرت در تواریخ بہ مرتبہ است کہ مورخان زمان ہرگونہ حکایتے را کہ ابتدا نمایند آن حضرت بہ اختلاف روایات بہ اتمام رسانند و ہموارہ بہ ارباب فضل و حکمت صحبت داشتہ بہ افادات دانشمندانہ اہل مجلس را مستفیض می گردانند و بے شائبہ تکلف ہر شخصے کہ در فنے از فنون دانشوری چہ از حکمت پرستان بالغ نظر و چہ از صنعت پردازان صاحبِ ذوق سالہائے دراز پیشِ کاملان مشق آن علم کردہ باشد چو بہ شرف ملازمت نکتہ یاب دقیقہ فہم می رسد از مشاہدہ کمال دانش خود را گم کردہ در مقام حیرت می آید و بدائع آنکہ در مشارب مختلف و مدارج متنوعہ در یک مجلس آرامیدہ می فرمایند کہ بر طبع عالم دشواری نمی آید...... نیز آن حضرت را در نظم و نثر پایۂ اعلیٰ است۔ ظل اللہ تخلص اشرف می فرمایند۔" (تاریخ قطب شاہی ورق ۳۰۲۔ کتب خانہ نواب سالار جنگ بہادر)۔

لکھی گئی تھی۔ اس کا مولف نامعلوم ہے اور اس تاریخ میں ۱۰۲۰ھ تک کے حالات درج ہیں۔ یہ بات کچھ خلافِ قیاس نہیں ہے کہ خود بادشاہ نے بھی تصنیف و تالیف کا کام کیا تھا، چنانچہ ذیل کی نو کتابیں اسی بادشاہ سے منسوب کیجاتی ہیں:۔

(۱) روح القدس (۲) ظفر القلوب (۳) قدرت نامہ (۴) مصباح الارواح (۵) احکام المحبین (۶) نہایت الحکم (۷) ہدایۃ المحبتہ (۸) ہدایت اللمعہ (۹) فتح ابواب۔

کتابوں کے نام سے معلوم ہوتا ہے کہ مختلف علوم مثلاً تصوف۔ اخلاقیات۔ سائنس اور فلسفہ ان کے موضوع تھے۔ اگر یہ درحقیقت سلطان محمد کی تصنیفیں تھیں تو ان سے اس کا علمی تبحر معلوم ہوتا ہے، اگر یہ اس کی نہیں ہیں تو یہ کہنا صحیح ہے کہ یہ سب تصنیفیں کم از کم اسی عہد میں اور اسی بادشاہ کی سرپرستی میں تالیف ہوئی تھیں اور اس سے سلطان کی علمی سرپرستی معلوم ہوتی ہے[۱]۔ یہ بڑا شاعر بھی تھا۔ اس نے اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شاعری کی تھی۔ ظل اللہ اور سلطان تخلص کرتا تھا۔ اس کا فارسی کلام بھی بہت ملتا ہے جو مختلف اصناف پر مشتمل ہے۔ یعنے قصیدہ۔ رباعی۔ غزل۔ مرثیے اس نے متعدد لکھے تھے۔ کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کو زبان اور خیالات پر بڑی قدرت تھی۔ فارسی کلام کے چند نمونے ذیل میں درج ہیں:۔

حمد حضرت باری تعالیٰ

یارب چہ برتری تو زِ وصفِ لسانِ ما
پنہان شدہ زِ شرم زبان در دہانِ ما

---

[۱] ان کتابوں کا مجموعہ نواب سر سالار جنگ کے کتب خانے میں موجود ہے اور اس کے سرِ ورق پر "لعبد الخالق السلطان محمد قطب شاہ" کے الفاظ درج ہیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتابیں سب سلطان محمد کی تصنیفیں ہیں۔

در حضرتت یقین و گمان را چو راہ نیست
حیران وصف تست یقین و گمانِ ما

. . . .

. . . .

ظل اللہ از شر بدان در پناہ تست
اے درگہ جلالِ تو دار الامانِ ما

نعت و منقبت

مصطفیٰ و مرتضےٰ چون نیستند از ہم جُدا
نعت و مدح ہر دو شہ را می کنم باہم ادا
آن یکے فرماں روائے ہر نبیؑ و ہر ولی
واں دگر مسند نشین بارگاہِ کبریا

. . . .

. . . .

ہمچو ظل اللہ یابی شاہ راہے از بہشت
گر بدانی بعدِ پیغمبرؐ علیؓ را مقتدا

منقبت حضرت چہاردہ معصوم

بعد ذکرِ مصطفیٰؐ و ذکرِ شاہِ اولیا
خود بود ذکر و درود جملہ خاصانِ خدا

. . . .

. . . .

شکرِ این نعمت چسان گوییم کہ از لطفِ الٰہ
ہمچو ظل اللہ ندانم غیر ایشان مقتدا

غزل (۱)

یافت وصلِ تو دلم صدق و صفا را دریافت
اثرِ مہر نگر فیضِ وفا را دریاب
رہنمایان ہمہ در عشقِ تو رہ گم کردند
اندرین رہ دلِ بے راہ نما را دریاب

غزل (۲)

قربِ یارم ز عشق و دولت اوست | این ہمہ حشمتم بہ ہمتِ اوست
نعمتِ عشق کم نمی دانم | شرمساری ز حقِ نعمتِ اوست

رباعی (۱)

اے درگہ تو سجدہ گہ شاہ و گدا | در خورد تو توحید کہ دارد یارا
از امر مطاع قل ہو اللہ احد | شد جرات این بیان دلکش مارا

رباعی (۲)

ہر چند کہ حق داد عطا خواہد بود | روزے کہ ز نیک و بد سزا خواہد بود
در عرصہ میا رہ آنچہ لئیمانہ بود | کز لطفِ کریمانہ خدا خواہد بود

مرثیہ (۱)

آمد محرم و غمِ دل بر ملاست باز | در دہر شور و زلزلۂ کربلاست باز

مرثیہ (۲)

دوران غم ز ماہ محرم رسیدہ است | ہنگام آہ و نالہ و ماتم رسیدہ است

مرثیہ (۳)

اے چرخ از تو رنج و بلائے عجب رسید | شرمے کہ فتنۂ تو بجائے عجب رسید

مرثیہ (۴)

آن دورِ ماتم است کہ از غم زبان نماند
آن عہدِ غم کہ طاقت تاب و توان نماند

مرثیہ (۵)

در کربلا ہجوم بلا را نظر کنید　　جمعیت بلا ہمہ یکجا نظر کنید

عبداللہ قطب شاہ کا عہدِ حکومت بھی علمی سرگرمیوں کا بہت بڑا منبع تھا۔ اپنے اسلاف کی طرح یہ بادشاہ بھی بہت بڑا علم دوست تھا۔ اس کی تعلیم و تربیت بڑے اچھے پیمانے پر ہوئی تھی۔ اس کے دربار میں بھی بڑے عالم جمع تھے اور وہ یہ ہیں :۔ علامی میر مجد الدین۔ مولانا نارو نقی۔ قاضی احسن میر میراں۔ حکیم عبدالجبار گیلانی۔ شیخ عبداللطیف۔ نور اللہ۔ مرزا محمد جوہر تبریزی۔ مرزا حمزہ استر آبادی۔ میر فضل اللہ شیرازی۔ شیخ ہارون۔ مُلاّ تقتائی شیرازی۔ ملا عرب خوشنویس۔ ان شعراء اور علماء کے ساتھ بادشاہ کی رات رات بھر علمی محفلیں گرم رہتی تھیں جہاں استادوں کے کلام پڑھے جاتے تھے اور ان پر بحث ہوتی تھی۔ اس عہد میں مختلف علوم کی کتابیں تصنیف ہوئیں جن سے قطب شاہی خاندان کو بہت بڑا امتیاز ہے۔ نظام الدین احمد نے اس عہد کی حدیقۃ السلاطین قطب شاہی کے نام سے ایک مبسوط تاریخ لکھی۔ علامہ ابن خاتون نے کتاب الارشاد اور جامع عباسی پر حواشی لکھے اور اربعین کا ترجمہ کیا۔ علامہ جمال الدین نے المصباح کا اور مُلاّ علی ابن طیفور نے عیون اخبار رضا کا فارسی میں ترجمہ کیا۔ مولانا حسین آملی نے نہج البلاغہ کی شرح لکھی۔ مُلاّ فتح اللہ سمنانی نے امام یافعیؒ کی کتاب روض الریاحین کا ترجمہ کیا۔[1] اس کے علاوہ ابن عماد روزبھان نے خرقۃ العلماء کے نام سے ایک فاضلانہ تصنیف لکھی تھی جس میں مختلف علوم و فنون مدون کئے گئے۔ اس میں چھ جلدیں ہیں :۔ جلد اول تفسیر۔ جلد دوم حدیث۔ جلد سوم فقہ۔ اس جلد کا نام مجمع الدقائق ہے۔ جلد چہارم علل اشیاء، اس جلد کا نام کاشف الاسرار ہے۔ جلد پنجم حکمت۔ جلد ششم متفرقہ۔ غرض اس ایک

---

[1] ہاشمی صاحب

کتاب میں سائنس۔ فلسفہ۔ دینیات تمام علوم پر بحث کی گئی ہے جو قطب شاہی دور کی بہت بڑی یادگار ہے۔[1] برہان قاطع کے نام سے ایک مشہور فارسی لغت بھی لکھائی گئی جو اب بھی متداول ہے۔ اس کا مولف محمد حسین ہے جو برہان تخلص کرتا تھا۔ وہ کہتا ہے کہ اس نے عبداللہ قطب شاہ کی سرپرستی میں ایک لغت لکھی تھی۔

سید احمد کی بدولت جو عبداللہ قطب شاہ کا بڑا داماد ہے، گولکنڈے میں عربی زبان اور ادب کی بہت بڑی خدمت ہوئی۔ سید احمد حجاز کے ایک بہت بڑے علمی خاندان کا چشم و چراغ تھا۔ اس کے باپ دادا سب بڑے عالم اور انشاپرداز تھے جنھوں نے عربی زبان و ادب میں بڑا اضافہ کیا۔ سید احمد خود بھی اعلیٰ تعلیم یافتہ اور علم دوست آدمی تھا، اس کی بدولت گولکنڈے میں عربی کے بہتیرے علماء جمع ہو گئے تھے جو اس کے دربار کی زیب و زینت تھے۔ اس فہرست میں شیخ محمد حکیم الملک۔ سید حسن۔ سید محمد کبر بن المدنی۔ خطیب عبداللہ۔ زین الدین آملی۔ سید ابو غنائم۔ جمال الدین محمد ہیکلی جیسے علماء پائے جاتے ہیں۔ سید احمد کا بیٹا سید علی جو حجازی بیوی کے بطن سے پیدا ہوا تھا، عربی کا اچھا شاعر اور انشاپرداز تھا۔ یہ اپنے کو اپنے دادا کے نام سے منسوب کر کے سید علی بن معصوم لکھتا ہے۔ یہ ۱۰۵۲ھ (۱۶۴۲ء) میں مدینہ طیبہ میں حجازی ماں کے بطن سے پیدا ہوا تھا، اور ۱۰۶۸ھ (۱۶۵۴ء) میں گولکنڈہ آیا اور اپنے باپ کے ساتھ رہا اور باپ کی تمام محفلوں میں شریک ہوتا تھا اور بحث و شعر گوئی میں حصہ لیتا تھا۔ بلا کا عالم تھا۔ عربی زبان میں بے شمار کتابیں لکھیں جن سے نہ صرف عربی زبان میں اضافہ ہوا بلکہ قطب شاہی سلطنت میں روشنی پھیل گئی۔ اس کی تصانیف میں

---

[1] اس کتاب کا صرف ایک نسخہ نواب سالار جنگ بہادر کے کتب خانے میں موجود ہے اور بہت بوسیدہ ہے۔

سلوۃ الغریب ۔ سلافتہ العصر ۔ درجات المرفیعہ ۔ ریاض السالکین نزہت المجلس وغیرہ جیسی بلند پایہ کتابیں ہیں اس کو تاریخ گولکنڈے کا زرین علمی سرمایہ سمجھنا چاہیے[1]۔

ابوالحسن تانا شاہ کا عہد اس خصوص میں کسی طرح پیچھے نہیں رہا اس عہد میں بھی نہ صرف علمی سرگرمیاں برابر جاری رہیں بلکہ دینیات اور الہیات میں بلند پایہ کتابیں لکھی گئیں ۔ مہذب الدین احمد نے تفسیر القرآن کے نام سے کلام مجید کی بسیط تفسیر لکھی تھی اور علی حسینی الکوکھوی نے حلیتہ القاری کے نام سے فن تجوید پر عالمانہ کتاب لکھی تھی ۔ اول الذکر تصنیف ۱۰۸۹ھ میں مکمل ہوئی اور غالباً یہ بادشاہ کے ایما سے لکھی گئی ہوگی اور آخر الذکر تصنیف کا مولف کہتا ہے کہ فن تجوید کی یہ کتاب اس نے بادشاہ کے حکم سے قلمبند کی تھی اور بادشاہ کو نصرت اس فن سے گہری دلچسپی ہے بلکہ وہ قاری سبعہ ہے ۔ ان دونوں تصنیفوں کو اس عہد کی عالمانہ پیداوار سمجھنا چاہیے اور ان سے ابوالحسن کی علمیت اور مذہبی رجحان پر روشنی پڑتی ہے[2]۔

اُردو کی سرپرستی

اُردو زبان کی سرپرستی قطب شاہی خاندان کا بہت بڑا طغرائے امتیاز ہے۔ دوسرے دکنی درباروں کی طرح قطب شاہوں نے بھی اُردو یا دکنی کو سنوارنے میں پورا حصہ لیا۔ ان بادشاہوں نے دکنی زبان اور اس کے شاعروں کو وہ درجہ دیا جو مغل شہنشاہ فارسی شاعروں کو دیتے تھے ۔

---

[1] دیکھو گولکنڈے کے عربی شعراء، از ڈاکٹر عبدالمعید خاں، جلد ا ص ۴۰۵۰۔

[2] یہ تفسیر قلمی ہے اور کتب خانہ سالارجنگ میں محفوظ ہے۔ اس مصنف کے اور چھ رسالے جو اصول فقہ اور حدیث وغیرہ پر قلمبند ہوئے ہیں اس کتاب میں موجود ہیں، مگر یہ رسالے ہندوستان کے باہر لکھے گئے ہیں۔ حلیتہ القاری کتب خانہ ڈاکٹر عبدالحق، مدراس۔

مغل دربار میں فیضی اور ابو طالب کلیم ملک الشعراء تھے تو دکنی درباروں میں وجہی غواصی جیسے دکنی شاعروں کو ملک الشعراء ہونے کی عزت حاصل تھی بلکہ بادشاہوں نے اسی زبان میں شاعری کرکے دکنی زبان کو ایسا اجاگر کر دیا کہ وہ قومی اور شاہی زبان ہو گئی اور لوگ اس کو اپنی زبان کہتے ہوئے فخر کرنے لگے ورنہ عادل شاہی اور قطب شاہی سرپرستی سے پہلے دکنی کو کون پوچھتا تھا۔ اس سرپرستی کے غالباً دو محرکات تھے۔ ایک تو سلطنتِ گجرات کا مغل سلطنت میں الحاق تھا جب ۹۸۰ھ سنہ ۱۵۷۲ء میں شہنشاہ اکبر نے گجرات فتح کر لیا تو یہاں کے اردو شاعر سب بھاگ کر دکنی درباروں میں پناہ گزیں ہو گئے اور ان کی سرپرستی حاصل کی۔ حضرت شاہ میراں جی کا ورود بیجاپور میں جو دکنی زبان کے بہت بڑے قائد تھے اس تاریخ کا پہلا باب ہے۔ دوسرا محرک دکن کی شمال سے تمدنی کش مکش تھی۔ شمال و دکن کی آویزش بہ ظاہر سیاسی معلوم ہوتی تھی، لیکن اگر اس کے اجزائے ترکیبی الگ کیے جائیں تو اس میں تمدنی کش مکش کے بھی بہت سے مناظر دکھائی دیں گے۔ جس طرح دکنی دربار اپنے دست و بازو سے میدانِ سیاست میں مغل سطوت کا مقابلہ کرتے تھے اسی طرح میدانِ علم و فضل میں وہ اپنی تمدنی برتری نمایاں کرتے تھے تاکہ اس کی بدولت وہ اپنی ہستی قائم رکھ سکیں، اور چونکہ زبان تمدن کا بہت بڑا عنصر ہے اس لئے اس ہتھیار سے بھی شمالی طاقت کا مقابلہ کیا جاتا تھا، یعنے شمال میں فارسی کی سرپرستی ہوتی تھی تو اہلِ دکن اس کے علی الرغم دکنی زبان کو اپنا سرمایۂ حیات سمجھتے تھے اور دکنی ملت قائم رکھنے کی کوشش کرتے تھے، ورنہ مغل دربار کی طرح یہاں بھی فارسی کا بول بالا ہوتا تو دکنی انفرادیت ختم ہو جاتی اور مغل سیلاب میں ڈوب جاتی۔ گویا دکنی کے پیچھے جذباتی اور قومی تائید تھی جو اس کی حیاتِ جاوید کا باعث ہوئی۔

اس سرپرستی کا پہلا سہرا غالباً عادل شاہی دربار کے سر ہے کیوں کہ

اسی خاندان کو گولکنڈے سے پہلے مغلوں کے ساتھ کشمکشِ حیات کرنی پڑی۔ اس کے علاوہ گجرات کی سیاسی بساط اُلٹتے ہی اُردو کا تمام سرمایۂ حیات بیجاپور آگیا، کیوں کہ یہ احمد آباد کے پڑوس میں تھا، اور جو شاعر یہاں جمع ہوئے تھے وہ سب عادل شاہی دامانِ فیض سے چمٹے ہوئے مخلصانہ دکنی ادب کی خدمت کرنے لگے اور دکنی کو مختلف اصنافِ سخن سے اس قدر مالامال کر دیا کہ وہ فارسی سے بہت آگے بڑھ گئی۔ اس طریقے سے یہ کہنا چاہئے کہ گولکنڈہ اس میدان میں بیجاپور سے کچھ پیچھے تھا، اور قطب شاہی سرپرستی بیجاپور کا نقشِ ثانی تھی، کیوں کہ اس کی زرین دو زلہریں شاید بیجاپور سے ہی یہاں پہنچی تھیں۔ تاہم قطب شاہی دربار نے دکھنی کی کم خدمت نہیں کی، جو اصنافِ سخن اور بلند مضامین بیجاپور نے پیدا کئے تھے وہ گولکنڈے نے بھی کئے۔ گولکنڈے کو یہ امتیاز ہے کہ اس کے سلاطین سب کے سب اعلیٰ تعلیم یافتہ اور علم دوست تھے۔ انھوں نے دکھنی کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنایا، اس میں شاعری کی اور بڑے دواوین چھوڑے۔ اس کے ساتھ یہ بھی ماننا پڑتا ہے کہ قطب شاہی دربار ایک اور طریقے سے بیجاپور پر بھی اثر انداز ہوئے۔ اگر پہلی منزلوں میں گولکنڈے نے بیجاپور کی شاگردی کی تھی تو آگے چل کر اس نے استادی کا بھی فخر حاصل کیا۔ بیجاپور کے شاعر مقیمی نے اپنے کلام میں اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ وہ غواصی کا خوشہ چیں ہے۔ اس کے علاوہ بیجاپور کا آخری دور جس میں مُلّا نصرتی اور اس کے ہمعصر طبع آزمائی کرتے تھے قطب شاہی رہنمائی کا ممنون تھا، کیوں کہ علی عادل شاہ ثانی کی ماں خدیجہ سلطانہ جو بیجاپور کی تاریخ میں "حاجی بڑے صاحبہ" کے نام سے مشہور ہے، تمام ادبی سرگرمیوں کی روحِ رواں تھی، اسی نے بیجاپور میں ازسرِنو علمی اور ادبی سرگرمیوں کا سامان جمع کیا۔ ٹوٹے ہوئے شاعروں کی دستگیری کی اور یہ رہنمائی گولکنڈے سے آئی تھی، کیوں کہ خدیجہ سلطانہ عبداللہ قطب شاہ کی بہن تھی۔

سلطان قلی قطب شاہ اور جمشید قطب شاہ کے عہد میں تو دکنی زبان کو کوئی فروغ نہیں ہوا، مگر ابراہیم قطب شاہ کے عہد میں جب کہ قطب شاہی سلطنت مستحکم ہو گئی تو دکنی کا شوق پیدا ہو گیا، چنانچہ اس عہد میں فیروز و محمود اور ملا خیالی تین دکھنی شاعروں کے نام آتے ہیں، یہ دکھنی کے اولین شعراء ہیں۔ فیروز نے توصیف نامہ لکھا تھا، اس کو متاخر شعراء وجہی اور غواصی اپنا استاد مانتے ہیں، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بڑا شاعر تھا۔ دوسروں کا کلام دستیاب نہیں ہوتا، اور ان شاعروں کے حالات بھی معلوم نہیں ہوتے، تاہم ان کے وجود سے معلوم ہوتا ہے کہ ابراہیم کے عہد میں اردو ادب کی خدمت کا پایہ بڑھ گیا تھا،[له] اور جب اس کے جانشین بر سر حکومت ہوئے تو ان کو ترقی کرنے کا کافی موقع ملا، کیوں کہ محمد قلی اور سلطان محمد کے عہد میں سلطنت چاروں طرف سے بہت پُر امن ہو گئی تھی۔ محمد قلی قطب شاہ نے اپنے تیس[۳۰] سالہ عہدِ حکومت میں دکھنی کی اتنی خدمت کی کہ وہ اوجِ کمال پر پہنچ گئی اور ایک شایستہ زبان ہو گئی، یہ خود بھی ایک بڑا قادر الکلام شاعر تھا، اور اردو میں معانی تخلص کرتا تھا۔ اس کے کلام کا ایک ضخیم مجموعہ موجود ہے جس میں قصیدے۔ غزلیں، مرثیے اور قطعات جیسے کئی اصنافِ سخن پائے جاتے ہیں۔ سیاسی، معاشرتی اور سماجی ہر مضمون پر طبع آزمائی کی گئی ہے۔ محمد قلی کے کلام میں ادبی روانی اور گھلاوٹ پائی جاتی ہے اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ محمد قلی ذہنی کد وکاوش میں اپنے زمانے سے بہت آگے تھا غالباً گولکنڈے بادشاہوں میں اتنا پُرگو شاعر جس کو زندگی کے ہر پہلو سے مس ہو، نہیں پیدا ہوا۔ دکن کی ادبی تاریخ اس پر جس قدر فخر کرے بجا ہے۔ کلام کے چند نمونے یہ ہیں:۔

قصیدہ عیدِ نوروز:۔ کہ تس دن عید ہور نوروز منج کون نت خدا دینا
ہمرے دل مرغ کی خاطر پھولان عشرت لو ادینا

له دیکھو "شہ پارے" مصنفہ ڈاکٹر زور۔

رباعی

اپ دوست سوں مل پنتھ کہ میں جام منگوں
اس ہونٹ شکر ایسے تھے میں کام منگوں
آرام دل آرام تجھے ہے دل کوں سدا
میں اپنے دل آرام تھے آرام منگوں

نظم جلوہ

پرم پیاری کا جلوہ گاو سارے
اسے چندسور سوں پریاں سنگارے
سہاگاں بھاگ پھل منک کھلے ہیں
سہیلیاں آرتی نارے لوارے
رچاو تخت جلوے کا خوشی سوں
کہ چوندھر چوک موتیاں سوں سنوارے

غزل (۱)

ہے عشق ہر اک دھات ہر اک دل میں پیارا
مج عشق پیاری کا اہے جیو کا ادھارا

. . . .

اے قطب معانی کہ ترا قطب خطاب ہے
کر شکر خدا پر کہ قرار ہے سو ستارا

غزل (۲)

باغ دل میں تج محبت کا اچنبا پھل لگیا
باس سُنگ پھولاں عرق کا میں ہوا ہوں ڈگمگیا
لے علم ہور لے کتب ہور کس تھے بوجھیا جائے نا
عالماں بیچارہ دکھ کر اس کی نک میں رہے تھکیا

. . . .

تم معانی کے گناہاں کا رقم کرتے ہیں کیا؟
یں محمد نائوں تے دونوں جہاں میانے جگیا[1]

محمد قلی قطب شاہ کے دربار میں اردو کے اکثر شاعر تھے لیکن افسوس یہ ہے کہ

---

[1] ماخوذ از کلیات محمد قلی قطب شاہ ۔ مرتبہ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور ۔

اس وقت صرف دو شاعروں کا حال معلوم ہوتا ہے، ایک وجہی اور دوسرے احمد۔ وجہی ایک بلند پایہ شاعر تھا جو غالباً ابراہیم قطب شاہ کے عہد میں پیدا ہوا، لیکن اس کا شاعرانہ کمال سب محمد قلی قطب شاہ کے عہد میں ظاہر ہوا اور اس کی بڑی شہرت ہوئی۔ اس نے نظم میں قطب مشتری اور نثر میں "سب رس" کے نام سے ایک کتاب لکھی تھی۔ یہ دونوں قصے ہیں جو بڑے لطیف اور استادانہ انداز میں لکھے گئے ہیں۔ یہ ادبی تاریخ کا بہت بڑا اضافہ ہے۔ احمد نے بادشاہ کے حکم سے لیلیٰ مجنوں لکھی تھی، لیکن اس کے جانشین سلطان محمد قطب شاہ کا عہد دکھنی زبان کی سرگرمیوں سے خالی ہے۔ سلطان محمد قطب شاہ کے عہد میں دکھنی کے کوئی شاعر منظر عام پر نہیں آئے، حالانکہ خود سلطان محمد نے اردو میں ایک دیوان لکھا تھا،[1] اور اس میں وہ قطب شاہ تخلص کرتا ہے۔ اپنے چچا کے کلام کو بھی اسی نے مرتب کیا، اور اس پر مقدمہ لکھا تھا، لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کو دکھنی سے زیادہ فارسی اور عربی سے دلچسپی تھی اس لئے اس کے عہد میں فارسی میں متعدد کتابیں لکھی گئیں، حالانکہ دکھنی کے نوخیز شاعر جو عبد اللہ قطب شاہ کے عہد میں منظر عام پر آئے تھے سلطان محمد کے عہد میں موجود تھے، لیکن ان کی دربار سے آؤ بھگت نہیں ہوئی، اس لئے جہاں تک دکھنی کا تعلق ہے سلطان محمد کا عہد زیادہ درخشاں نہیں ہے۔

عبد اللہ قطب شاہ کے عہدِ حکومت میں جو پچاس سال طویل ہے دکھنی نے انتہائی ترقی کرلی، اس کو اردو ادب کا سنہری زمانہ کہنا چاہیئے۔ اول تو خود بادشاہ نے جو بڑا عالم و شاعر تھا، دکھنی ادب میں دلچسپی لی، ایک دیوان لکھا۔ اس کا طرزِ بیان سلطان محمد سے زیادہ صاف اور سلیس سمجھا جاتا ہے، گو اس کے کلام میں اتنی روانی اور لوچ نہیں ہے جیسے اس کے

---

[1] سلطان محمد قطب شاہ کا اردو دیوان اب تک دستیاب نہیں ہوا۔

دادا محمد قلی قطب شاہ کے کلام میں پایا جاتا ہے۔ یہ عبد اللہ تخلص کرتا تھا۔ اس کے کلام کے چند نمونے یہ ہیں:۔

غزل (۱)

منجے نور و تر تھے اگلا صفا تم لکھ جدا دیتا
صفا جیسا جو منگتا تھا سو ویسا منج خدا دیتا

ترا قد پھول کی ڈالی نمن کھل مکھ کانے تھے
خوشی پا جیو کا بلبل سو غم کون سب ود دا دیتا
وداع

نبیؐ کے صدقے عبد اللہ سدا تو شکر کر اس کا
جو کوئی تجکوں تو اتر یا ہو بہ شاہی کا ہدا دیتا

غزل (۲)

اثر عشق کا آ مرے سر چڑیا ... تو میں وصل سوں مل برہ سوں لڑیا[له]
ہوا ہوں ترے روپ پر مبتلا ... تو تج سوں منجے کام آکر پڑیا
واق

. . . .

نبی صدقے عبد اللہ سلطان کے ... ہر اک بول کو میں سونے میں مڑیا[له]

دوسرے اس کی سرپرستی میں دکھنی کے بڑے بڑے شاعروں نے طبع آزمائی کی اور بڑا ادبی سرمایہ چھوڑا۔ غالباً یہ کہنا صحیح ہو گا کہ عبد اللہ کے عہد میں دکھنی ایک مستند زبان ہو گئی، اس عہد میں غواصی اور ابن نشاطی دو بڑے شاعر گزرے ہیں۔ غواصی نے سیف الملوک بدیع الجمال اور طوطی نامہ کی مشہور مثنویاں لکھی ہیں۔ یہ دونوں قصے ہیں اور دکھنی زبان کے شہ کار سمجھے جاتے ہیں۔ ابن نشاطی کی تصنیف "پھول بن" خاص شہرت رکھتی ہے، یہ بھی ایک قصہ ہے جو کسی فارسی قصے کا ترجمہ ہے، لیکن اپنے اسلوب بیان اور قصے کی ترتیب کے لحاظ سے یہ قطب شاہی دور کی بہت بڑی پیداوار ہے۔ ان مشہور شاعروں کے علاوہ

له کلیات عبد اللہ قطب شاہ۔ مرتبہ پروفیسر سید محمد صاحب۔

طبعی اور آئین بھی قابلِ ذکر ہیں۔ اول الذکر نے "بہرام و گُل اندام" کے نام سے ایک دلچسپ قصّہ لکھا تھا جو زبان اور طرزِ بیان کا لحاظ کرتے بہت دل کش ہے۔

عبد اللہ کے انتقال کے بعد یہ ادبی سرگرمی ختم نہیں ہوئی بلکہ برابر جاری رہی۔ چنانچہ ابو الحسن قطب شاہ جو بہت تعلیم یافتہ صاحبِ ذوق آدمی تھا، دکھنی کا بڑا مُربی تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس نے فارسی اور دکھنی دونوں زبانوں میں شاعری کی تھی اور قید میں بھی شعر و سخن کے مشغلے کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ اس وقت دو ایک غزلوں کے سوا اس کا کوئی کلام دستیاب نہیں ہوتا۔ نمونے کے لئے ذیل میں ایک شعر درج کیا جاتا ہے ؎

کس در کہوں جاوں کہاں مجھ دل پہ بھل بچھڑاٹ ہے
یک بات گے ہو سنگے سجن یاں جی ہی یارہ پاٹ ہے [1]

لیکن بادشاہ کے علاوہ اس بدنصیب عہد میں کئی شاعر بھی ہوئے تھے جو شعر و سخن کے مشغلے میں مصروف تھے۔ چنانچہ فائزؔ، لطیفؔ، شاہیؔ، نوریؔ، مرزا غلام علی مشہور شاعر تھے۔ ان میں فائزؔ اور شاہیؔ بلند پایہ شاعر سمجھے جاتے ہیں۔ مرزاؔ، ابو الحسن کا بہت وفادار درباری شاعر تھا۔ ان سب کا کلام قصّوں اور مثنویوں کی صورت میں دستیاب ہوتا ہے اور اس طریقے سے کہا جا سکتا ہے کہ ابو الحسن کا عہد دکھنی شعر و سخن کی خدمت سے خالی نہیں تھا۔

تلنگی کی سرپرستی

قطب شاہوں نے تلنگی زبان اور ادب کی بھی اسی گرمجوشی سے سرپرستی کی تھی جیسے وہ اُردو اور فارسی کی کرتے تھے۔ یہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ قطب شاہ تلنگانے کو اپنا وطن اور تلنگی زبان کو اپنی زبان سمجھتے تھے۔

---

[1] دکنی مخطوطات، مولفۂ نصیر الدین صاحب ہاشمی۔

ان لوگوں نے اس مقامی زبان کی مخلصانہ خدمت کی، اس کے زبان دانوں اور شاعروں کی حوصلہ افزائی کر کے اس کے ادب کو بہت بلند کیا۔ یہ خود تلنگی جانتے تھے اور اس میں شاعری کرتے تھے۔ اگر قطب شاہی دور کو آندھرا دیش اور تلنگی ادب کا سنہری زمانہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا، کیوں کہ قطب شاہوں سے پہلے اور پھر ان کے بعد تلنگی کو ایسی شاہانہ سرپرستی نہیں نصیب ہوئی اور ظاہر ہے کہ ہر زبان بادشاہوں کے درباروں میں پروان چڑھتی ہے۔ ابراہیم قطب شاہ تلنگی کا سب سے پہلا سرپرست ہے، اس کی ابتدائی زندگی دیورکنڈے میں گذری تھی اور اس کے بعد یہ سات سال وجیانگر میں جلاوطن رہا۔ غالباً اسی ماحول میں اس نے مقامی اثرات اپنے میں جذب کیے اور تلنگی کا ذوق حاصل کیا۔ یہ تلنگی خوب جانتا تھا اور تلنگی ادب سے لطف اندوز ہوتا تھا۔ اسی وجہ سے ابراہیم تلنگی رعایا میں بہت مقبول تھا اور "ملک برام" کے نام سے مشہور تھا۔ اس کے دربار میں عربی و فارسی کے علماء کی طرح تلنگی زبان کے کئی شاعر تھے اور ان کو شاہانہ سرپرستی حاصل تھی۔ منجملہ ان کے گنگادھر نامی تلنگی کا ایک مشہور شاعر تھا جو ادبیات تلنگی کا بڑا قائد سمجھا جاتا ہے۔ ابراہیم قطب شاہ کی سرپرستی میں اس نے تلنگی ادب کی مشہور کتاب "تپتی سموَرن پا کھیانم" جو بلند پایہ منظوم تصنیف ہے، لکھی تھی۔ یہ ایک منظوم کہانی ہے جو مہابھارت سے ماخوذ ہے اور ابراہیم قطب شاہ کے نام سے معنون کی گئی ہے۔ اس میں پہلے قطب شاہوں کا شجرہ ہے اور اس کے بعد ابراہیم کی مدح ہے[1]۔ اس کے علاوہ دو اور شاعر جن کو ابراہیم کی سرپرستی حاصل تھی وہ کندی کو ی ردراکوی اور مرن گنٹی سنگراچاریہ ہیں۔ اول الذکر ردراکوی کو ابراہیم نے چنتل پالم کی جاگیر دی تھی۔ اس کی دو تصنیفیں نرن کشا پا کھیانم اور سگر یودھم ہیں۔ اول الذکر میں

---

[1] یہ کتاب سبا راؤ صاحب سابق پروفیسر تلنگی جامعہ عثمانیہ نے اپنے فاضلانہ مقدمے کے ساتھ شائع کی ہے۔

سماجی اور تاریخی واقعات اور جنگ تالیکوٹ کا حال ملتا ہے۔ سنگر آچاریہ کی نظموں میں سلاست اور شیرینی بھری ہوئی ہے[1]۔ ابراہیم کے درباری امرا بھی تلنگی ادب کے بڑے سرپرست تھے، چنانچہ اس کے ایک سردار امین خاں کو لوگ اب بھی جانتے ہیں جس نے ایک مشہور شاعر پنا گنڈی تلگنا آریہ کی سرپرستی کی تھی۔ اس شاعر نے جو پٹنچرو کا رہنے والا تھا ادب کی ایک زبردست کتاب لکھی تھی جس کا نام "ییا یاتی چرترا" ہے۔ اس کتاب سے اس زمانے کے رسم و رواج، سماجی زندگی اور تہذیب و تمدن پر روشنی پڑتی ہے اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ کس طرح امین خاں نے جو پٹنچرو کا گورنر تھا شیو پرستی کی رہبانیت کو توڑنے کی کوشش کی تھی اور اس کی بیوی شکر بی بی نے بذات غربا میں گھوم کر ان کو کھانا کپڑا دیتی تھی۔

آندھرا دیش کا بڑا قومی معمار محمد قلی قطب شاہ ہے جس نے اس ملک کی خدمت کے لئے اپنی زندگی وقف کردی تھی۔ اگر اس کے باپ دادا تھوڑے بہت غیر ملکی تھے تو محمد قلی تو بالکل دکھنی تھا کیوں کہ اگر ماہ نامے کے مولف کا خیال صحیح سمجھا جائے تو اس کی رگوں میں تلنگی خون دوڑتا تھا۔ اس کو تلنگانہ اور اس کی قومی و سماجی روایتوں سے جو اُنس ہوسکتا ہے وہ ظاہر ہے۔ اس کی قوم پروری تحریکوں کی بدولت تلنگانے کے طول و عرض میں نئی زندگی دوڑ گئی۔ قومی تعمیر کے سلسلے میں محمد قلی قطب شاہ کا قابلِ قدر کام یہ تھا کہ اس نے تلنگی زبان کی خاطر خواہ قدر کی۔ قیاس یہ ہے کہ اس کے عہد میں تلنگی زبان میں بہت سی ادبی کتابیں لکھی گئی ہوں گی۔ محمد قلی قطب شاہ خود بھی تلنگی زبان کا بڑا دلدادہ تھا، اور یہ روایت مشہور ہے کہ اس نے تلنگی زبان میں بھی ایک دیوان مرتب کیا تھا اور اس میں "ترکمان" تخلص کرتا تھا۔ اگرچہ یہ دیوان

---

[1] ماخوذ از تلگو ادب کی تاریخ، مصنفہ ڈی راماچ راؤ اور ترجمت ساجدہ ص۔ ۱۴۰ و ۱۴۱۔

اب دستیاب نہیں ہوتا، تاہم اس کی دوسری نظموں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کو مقامی زبان سے کتنی دل بستگی تھی۔ اس کے اردو دیوان میں اکثر تلنگی کے الفاظ ملتے ہیں جو بلا تکلف استعمال ہوئے ہیں، لیکن عجیب بات یہ ہے کہ اردو نظموں میں ہندو تہواروں اور سماجی دلچسپیوں کا ذکر ہے اور ان کو بڑی اہمیت دی گئی ہے۔ چنانچہ بسنت کی عید۔ ساون بھادوں کی موسمی روایات۔ تلنگن کا سراپا اور "پھوگڑی پھو" کے کھیل کو اس نے ایک شاعرانہ انداز میں پیش کیا ہے۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ اس کے دل و دماغ میں اسلامی روایات کے ساتھ مقامی روایات بھی پوری طور پر رچ گئی تھیں اور اس طرح دونوں روایتوں کے امتزاج سے تلنگانے میں ایک جدید قومیت تعمیر ہو گئی۔ اس کی چند انوکھی نظمیں یہ ہیں :۔

بسنت کی عید

پیارے بسنت کا ہوا آئیا   سکیاں تن مشک زعفراں لائیا

. . . .

پیارے سکو میاں نے کھیلیا بسنت   پھولاں حوض تھے چر کے چھڑکیا بسنت

پھوگڑی پھو

سکی تال دے منج ٹھکتی کھڑی   کہ ڈھاں ڈھکنی کھیل کو ٹھکتی کھڑی

تلنگن

پیاری جو وتی میں پت تج پیم   منجے جیو دیوتا ہے پیم میں نیم

. . . .

. . . .

بنی صدقے قطب شہ سانولی سون   بچن ہندی سون بولے ایم رئیم[1]
ایم رے ایم

---

[1] کلیات محمد قلی قطب شاہ۔ مرتبہ ڈاکٹر زور۔

محمد قلی قطب شاہ اور سلطان محمد قطب شاہ کے عہد میں جو تلنگی شاعر گزرے ہیں ان میں سارنگ تمیا ملاریڈی سورنبھی مادھورایا بہت مشہور ہیں سارنگ تمیانے دونوں بادشاہوں کا زمانہ دیکھا تھا اور اس کو دونوں بادشاہوں کی سرپرستی حاصل تھی۔ "ویجنتی ولاسیم" اس کی مشہور تصنیف ہے جو سری رام کے نام سے معنون ہے، لیکن اس میں شاعر نے قطب شاہوں کو بہت سراہا ہے۔ اس کتاب کے دیباچے میں قطب شاہوں کی مدح کرتے ہوئے اس نے محمد قلی قطب شاہ کی رعایا پروری، رواداری اور علم دوستی کی بہت تعریف کی ہے۔ اس کے علاوہ سلطان محمد قطب شاہ کا بھی ذکر کرتا ہے اور بادشاہ سے اپنی دوستی کو فخریہ انداز میں بیان کرتا ہے۔ ملاریڈی کا تعلق سمستان دم کنڈہ کے حکمران خاندان سے تھا۔ اس کی تین تصنیفیں شٹ چکرورتی شیوادھرم دوترم اور پدما پران بہت مشہور ہیں۔ پہلی تصنیف تو کسی قدر مغلق ہے، لیکن آخری دو تصنیفوں کی زبان سادہ اور سلیس ہے۔ اس شاعر کی قطب شاہی دربار میں بڑی عزت تھی۔ مادھورایا بھی بڑا شاعر تھا اور اس کی تصنیف چیندریکا پرنیم تلنگی ادب میں ممتاز جگہ رکھتی ہے۔ قطب شاہی دور کا آخری شاعر گوپنا رام داس ہے جو ابوالحسن تاناشاہ کے عہد میں گزرا تھا۔ یہ بھدراچلم اور پالونچہ کا تحصیلدار تھا اور سرکاری روپیہ غبن کرنے کے الزام میں قلعہ گولکنڈہ میں قید کر دیا گیا تھا، اس قید کے زمانے میں اس نے کچھ نظمیں اور گیت لکھے تھے جو بہت مقبول ہوئے۔ یہ گیت سری رام کی مدح میں ہیں اور اپنے سوز و گداز کی بدولت رام داس کی زندگی میں[1] زبان زدِ عام ہو گئے تھے اور آج بھی گائے جاتے ہیں۔ اس زمانے کے صوفیوں اور مشائخوں نے بھی تلنگی اور سنسکرت کا مطالعہ کیا اور ان زبانوں میں کتابیں لکھی تھیں

---

[1] ماخوذ از تلنگو ادب کی تاریخ، مصنفہ ڈی راما نج راؤ اور تربیت ساجدہ ص ۱۳۱ و ۱۴۳۔

چنانچہ اس ضمن میں شاہ اکبر حسینیؒ جو حضرت بڑے صاحبؒ کے نام سے مشہور ہیں یاد رکھنے کے قابل ہیں۔ یہ حضرت شاہ راجو ثانی کے فرزند ہیں۔ حضرت بڑے صاحبؒ ایک جلیل القدر صوفی عالم تھے اور کئی کتابوں کے مصنف تھے، انھوں نے سرنیگارا منجیری کے نام سے تلنگی میں ایک کتاب لکھی تھی جس میں نسوانی زندگی اور نسوانی جذبات سے بحث کی گئی ہے اور عورتوں کی قسمیں بتائی گئی ہیں۔ خود مصنف نے ہی اس کتاب کا سنسکرت میں بھی ترجمہ کیا تھا اس تصنیف سے واضح ہوتا ہے کہ اس زمانے کے علماء و صوفیاء کو بھی مقامی زبان تلنگی اور سنسکرت سے پورا شغف تھا اور ان کی حوصلہ افزائی کرتے تھے۔[۱]

---

[۱] سرنیگارا منجیری، مرتبہ ڈاکٹر راگھون و شائع شدہ محکمۂ آثار قدیمہ حیدرآباد ص ۹۔

پچیسواں باب

شہر و عمارات

شہر حیدر آباد کی تعمیر شہر و عمارات کی تعمیر بھی قطب شاہوں کا بہت بڑا کارنامہ ہے۔ ان کا پاکیزہ ذوق، سلیقہ جو شہر و عمارات کی تعمیر میں ظاہر ہوا، قرونِ وسطیٰ کی بہت بڑی یادگار ہے، دوسری جگہ اس کی مثال نہیں ملتی۔ اگر ایک مورخ کے الفاظ دُہرائے جائیں تو "تاجدارانِ قطب شاہی در علو ہمت فراخی حوصلہ و قابلیت در تمامی دُنیادارانِ دکن ممتاز بودند"[1]۔ اکیلا شہرِ حیدر آباد اور اس کی تعمیر قطب شاہوں کے نام کو زندہ رکھنے کے لئے کافی ہے۔ اس شہر نے تلنگانے کے طول و عرض میں زندگی کی ایک لہر دوڑا دی۔ اس وقت حیدر آباد واحد شہر ہے جو پورے آندھرا کی تمدنی خدمت کر رہا ہے اور یہ قطب شاہوں کا عطیہ ہے۔ اس شہر کی تعمیر کے بہت سے محرکات تھے[2]۔ بات یہ ہے کہ

---

[1] ماہ نامہ ص ۳۰۴۔

[2] شہر حیدر آباد کی تعمیر کی تہ میں عشق و محبت کی ایک دلچسپ داستان بھی چھپی ہوئی ہے۔ اگر یہ داستان صحیح ہے تو اس شہر کا پس منظر کسی قدر رومانی (باقی بر صفحہ ۴۰۸)

محمد قلی قطب شاہ کے عہد تک سلطنت کا مستقر صرف گولکنڈہ تھا جہاں مرکزی حکومت تھی۔ حصار کے اندر عام آبادی تھی۔ اگرچہ اس کی بنیاد سلطان محمد قلی نے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۰۷) ہو جاتا ہے۔ وہ دلچسپ داستان یہ ہے کہ بانیِ شہر محمد قلی قطب شاہ بھاگ متی نام ایک تلنگن کا گرویدہ تھا اور وہ اسی نواح میں رہتی تھی جہاں آج شہر آباد ہے۔ محمد قلی شہزادگی کے زمانے میں اس لڑکی سے ملنے کے لئے گولکنڈے سے چچلم آیا کرتا تھا۔ چنانچہ پُرانا پل اسی واقعے کی یادگار ہے۔ روایت یہ ہے کہ محمد قلی ایک روز گولکنڈے سے چچلم آرہا تھا، برسات کا موسم تھا اور موسیٰ ندی چڑھی ہوئی تھی، لیکن محمد قلی پانی کے بہاؤ سے ٹھٹکا نہیں بلکہ فوراً پانی میں گھوڑا ڈال دیا اور تیرتے ہوئے چچلم آیا اور واپس گیا۔ جب اس کے باپ ابراہیم قطب شاہ کو اس کی خبر ہوئی تو اس نے بہ نظرِ احتیاط پُل کی تعمیر کردی۔ جب محمد قلی باپ کے مرنے کے بعد ۹۸۸ھ / ۱۵۸۰ء میں بادشاہ ہو گیا تو اس تلنگن کو حیدر محل خطاب دے کر شاہی محل میں داخل کر دیا اور اس کی حفاظت کے لئے بارہ سو سوار مقرر کر دیئے (فرشتہ، مقالۂ سوم ص ۱۷۳) اور جب شہرِ حیدرآباد کی تعمیر ہوئی تو اس تلنگن کی محبت میں اس شہر کا نام پہلے بھاگ نگر رکھا، اور جب اس کو حیدر محل خطاب دیا گیا تو اسی مناسبت سے شہر کا نام بجائے بھاگ نگر کے حیدرآباد کر دیا، اور راوی کہتے ہیں کہ درباری شاعر ملا وجہی کی عشقیہ مثنوی "قطب مشتری" محمد قلی اور بھاگ متی کا ادبی مرقع ہے۔ اس شاعر نے نام بدل کر اسی واقعے کو منظوم کیا ہے۔ خود محمد قلی نے بھی اپنی نظموں میں حیدر محل کا ذکر کیا ہے ؎

حیدر محل میانے ناپات گھول ساجے
دن دن انند سیتے طبلاں امدن کے باجے
اس سرو قد کے اوپر جلوہ ہے نور تن کا
عشق کے پاتراں سب اس کا س دیکھ لاجے

یہ روایت نہ صرف بیرونی سیاح بیان کرتے ہیں بلکہ (باقی بر صفحہ ۴۰۹)

رکھی تھی، لیکن اس کی تمام تعمیر اور استحکام ابراہیم قطب شاہ نے کیا، اور سلطنت کی ترقی کے ساتھ یہ بھی ایک بہت بڑا شہر ہو گیا تھا، اور اس میں

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۰۸) ملک اور بیرونِ ملک کے تمام مورخ اس کی تصدیق کرتے ہیں۔ بیرونی سیاحوں برنیئر۔ ٹیورنیر۔ منوچی اور تھیونو ہیں۔ ملک کے مورخوں میں فرشتے کے علاوہ جو دکن کا بڑا مورخ ہے ابوالفضل۔ فیضی۔ نظام الدین احمد بخشی خافی خاں اور محمد ساقی شامل ہیں۔ ابوالفضل نے اس شہر کا نام بھاگ نگر لکھا ہے۔ خافی خاں نے تو دکن میں رہ کر تمام دکن کی تاریخ لکھی تھی اور وہ بھاگ متی کے عشق کا پورا واقعہ بیان کرتا ہے۔ فیضی جو ابوالفضل کا بھائی ہے بغرض سفارت دکن آیا تھا اور برہان نظام شاہ ثانی والیِ احمد نگر سے ملا تھا اور ملاقات کی کیفیت میں جو شہنشاہ اکبر کے سامنے پیش کی گئی تھی بھاگ متی کا ذکر کرتا ہے اور شہر کا نام بھاگ نگر لکھتا ہے۔

لیکن مقامی مورخوں کی خاموشی سے اس روایت کی صداقت میں بہتیرے شبہات پیدا ہو جاتے ہیں۔ تاریخ قطب شاہی کا گمنام مورخ اس واقعے کو سرے سے بیان نہیں کرتا بلکہ وہ اس شہر کا محرک ایک شکار کا واقعہ سمجھتا ہے کہ بادشاہ ایک روز موضع چچلم میں شکار کے لئے آیا تھا اور اس کو یہ جگہ بہت پسند آئی اس لئے اس نے یہاں شہر کا ڈھنگ ڈال دیا۔ ماہ نامہ کا مورخ غلام حسین جوہر ایک دوسری روایت پیش کر کے اس واقعے پر پردہ ڈال دیتا ہے، وہ لکھتا ہے کہ بھاگ متی کا کوئی وجود ہی نہیں ہے بلکہ ایک عورت بھاگ رتی نام ابراہیم قطب شاہ کی بیوی تھی جس کے بطن سے محمد قلی پیدا ہوا ہے اور شہر حیدر آباد بھاگ رتی کی خواہش سے آباد ہوا اور اس کے نام سے موسوم ہوا (ماہنامہ ص ۲۸)۔ یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ یہ تاریخ گولکنڈہ کے خاتمے کے ایک سو سال کے بعد لکھی گئی اور اس طریقے سے غلام حسین کی روایت اس قدر قوی نہیں سمجھی جا سکتی جیسے ہمعصر تاریخ ہو سکتی ہے۔ بہر حال ماہنامہ یا تاریخ قطب شاہی بھاگ کے متعلق ان کی (باقی صفحہ ۴۱۰)۔

تمام شہری ضرورتیں بہم پہنچائی گئی تھیں ۔ چنانچہ ایک مورخ کے الفاظ ہیں :۔
"از وسعت آن بہ مرتبہ نقل می نمایند کہ تا چہل ہزار سوار اندرونِ حصار
می گنجید عمارت ہائے عالی دل نشین با فضا داشت[1]" لیکن اس کی آبادی
ہر روز بڑھ رہی تھی اور آبادی کی کثرت سے نہ صرف تنگی محسوس ہوتی تھی
بلکہ آب و ہوا خراب ہو رہی تھی، چنانچہ ایک مورخ کہتا ہے کہ "بہ سبب
کثرتِ آبادی و اژدہام مردم ہوائے آنجا تغیر یافتہ بہ افساد گرائیدہ
موجب ابتلائے مردم بہ آلام و اسقام گردید[2]" چنانچہ بعض امیر و رئیس
گولکنڈے کے باہر اپنے مکانات اور باغات بنانے لگے تھے اور آبادی
مشرق کی طرف پھیلنے لگی تھی پھر پرانے پُل کی تعمیر کے بعد سے آبادی کے پھیلاؤ کے لئے راستہ صاف ہو گیا۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۰۹) خاموشی معنی خیز ضرور ہے۔ ممکن ہے کہ یہ مورخ محمد قلی قطب شاہ کے دامنِ عفت کو اس بد نما واقعے سے داغدار نہیں کرنا چاہتے، کیوں کہ بھاگ متی ایک نیچ ذات عورت تھی جس کو فرشتہ فاحشہ اور خافی خاں رقاصہ لکھتا ہے۔ (فرشتہ ص ۱۷۴ ۔ خافی خاں، جلد سوم ص ۳۸۴) اگر فرشتہ کا قول صحیح سمجھا جائے تو خود محمد قلی بھی بعد کو بھاگ متی کی نسبت سے پشیمان ہوا اور شہر کا نام بھاگ نگر کی جگہ حیدر آباد کر دیا۔ ان مختلف اور متضاد بیانات میں اصل حقیقت مشتبہ ہو جاتی ہے اور رائے قائم کرنا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ اگر بھاگ متی کا کوئی وجود ہے بھی تو بادشاہ نے اس کو ملکہ کا درجہ نہیں دیا، بلکہ محمد قلی کی اصلی ملکہ ایک اونچے گھرانے کی خاتون تھی جو خافی خاں کے الفاظ میں شاہ مرزا اصفہانی طبا طبا کی بیٹی اور تاریخ قطب شاہی کے الفاظ میں میر شاہ میر کی بیٹی تھی جس کے بطن سے بادشاہ کی اکلوتی بیٹی حیات بخشی بیگم پیدا ہوئی تھی۔ اب رہا شہر کا نام جس کو مغل مورخ اور مغربی سیاح بھاگ نگر لکھتے ہیں وہ بھی ہمعصر تاریخوں میں نہیں پایا جاتا۔ بانیِ شہر خود اس کو شہرِ حیدر لکھتا ہے۔

[1] خافی خاں جلد سوم ص ۲۸۷۔

[2] حدیقۃ العالم، مقالۂ اول ص ۲۱۴۔ خافی خاں جلد سوم ص ۳۸۴۔

چنانچہ گولکنڈے کے شہری موضع چچلم کی طرف قدم بڑھانے لگے اور شہر کی واقعی تاسیس سے پہلے یہاں کئی لوگ جمع ہو گئے۔ بزرگوں میں حضرت شاہ چراغ اور حضرت نور الہدیٰ شہرِ حیدر آباد کے اولین آباد کار ہیں۔ میر کے دائرے میں ان بزرگوں کے مزار ہیں۔ پرانا پل ۹۸۶ھ ۱۵۷۸ء میں تیار ہوا۔ چنانچہ "صراطِ مستقیم" ۹۸۱ھ–۱۵۷۲ء اس کے آغاز کار اور "گذر گہ ما" اس کے تکمیل کی تاریخ ہے۔ اس کی تعمیر پر ۹۸۶–۱۵۷۸ دو لاکھ پچاس ہزار روپے صرف ہوئے تھے [1]

زِ تختِ او گذرد ماہ و ما براہ گذریم

ازین سبب شدہ تاریخ "او گذر گہ ما" ۹۸۶

اس کے علاوہ خود سلطنت کے اغراض و مقاصد اس قدر وسیع ہو تے جا رہے تھے کہ ان کے روبراہ کرنے کے لئے گولکنڈے کا مستقر کافی نہیں تھا۔ باہر کے سفراء جو مختلف سلطنتوں کی طرف سے آیا کرتے تھے گولکنڈے میں ان کا خاطر خواہ خیر مقدم نہیں ہو سکتا تھا۔ ایشیائی مملکتوں کے علاوہ مغربی ممالک کے سیاح بھی یہاں آتے تھے اور برسوں رہتے تھے۔ نیز سلطنت کی روز افزوں ترقی کی وجہ سے علماء اور تاجروں، کا علیحدہ جمگھٹا ہو رہا تھا۔ خود حکومت ان سے کام لیتی تھی اور ان نوواردوں کی بدولت غیر ممالک میں اس سلطنت کی خبریں جاتی تھیں اور شہرت تھی۔ محمد قلی قطب شاہ کی بلند خیالی ایک وسیع اور متمدن شہر کی طالب تھی۔ گولکنڈے کا پرانا شہر اس بلند ہمت بادشاہ کے حوصلوں کا جواب نہیں تھا، چنانچہ ان حالات میں شہر بھاگ نگر یا حیدر آباد کی مبارک تاسیس بہت ضروری ہو گئی۔

شہرِ حیدر آباد کی بنیاد محمد قلی قطب شاہ کی تخت نشینی کے تقریباً بارہ سال کے بعد رکھی گئی تھی۔ ۹۹۹ھ ۱۵۹۰ء آندھرا دیش کا مبارک سال تھا جس میں شہرِ حیدر آباد کی

---

[1] مآثرِ دکن؛ بالگرامی ص ۲۔

تاسیس عمل میں آئی، گو اس کی تکمیل کئی سال کے بعد ہوئی، لیکن جس اہتمام اور سلیقے سے اس شہر کی تعمیر کی گئی تھی وہ قرونِ وسطیٰ کا اعجوبہ تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ محمد قلی قطب شاہ کو شہر کی تاسیس اور آباد کاری کا خاص ذوق اور سلیقہ تھا۔ شہر کا ایسا اچھا ڈھنگ ڈالا گیا کہ قرونِ وسطیٰ میں اس کی نظیر نہ تھی۔ پہلے دریائے موسیٰ کی خوشگوار وادی میں اس کا ڈھنگ ڈالا گیا، اس سے نہ صرف پانی کی ضرورت پوری ہوئی بلکہ شہر کی رونق بھی بڑھی۔ دوسرے شہر کے بیچ میں چار مینار کی سڈول عمارت قائم کر کے چاروں طرف سیدھی سڑکیں بنائی گئیں۔ چار مینار کی بنیاد سے اس شہر کا آغاز سمجھنا چاہیئے۔ وہ عجیب دلفریب منظر تھا کہ موضع چچلم کے چھوٹے بڑے معمار تلنگی گیتوں کے کورس میں چار مینار کی تعمیر کرتے اور اس کا مسالہ جمع کرتے تھے۔ غالباً یہ عمارت ڈیڑھ دو سال میں تیار ہوئی اور "یا حافظ" سے اس کی تاریخ اخذ ہوتی ہے۔ خود چار مینار کی عمارت تعمیر کاری کا بہترین نمونہ ہے اور دنیا میں ایسی عمارتیں بہت کم پائی جاتی ہیں۔ فرانسیسی سیاح تھیونو کے الفاظ ہیں:— "یہ ایک مہتم بالشان عمارت ہے۔"[1] اس اکیلی عمارت کی تعمیر میں تین لاکھ ہون صرف ہوئے تھے۔ اس کے چاروں طرف چار سیدھی سڑکوں سے معلوم ہوتا ہے کہ شہر کی تعمیر میں خاص ضابطہ اور سلیقہ ملحوظ تھا، اور شہروں کی طرح یہ شہر حیدرآباد خودرو نہیں ہے بلکہ یہ ایک خاص نقشہ کے مطابق بنایا گیا۔ سڑکوں کے دونوں طرف عمارتوں کی تعمیر کا خاص اسلوب مقرر کیا گیا، چوراہے متساوی الاضلاع بنائے گئے اور بازار تعمیر کئے گئے تو ان میں دکانوں کا یہ انتظام تھا کہ ہر دکان کے سامنے ایک ہی وضع کا برآمدہ بنایا گیا تھا تاکہ خوش نمائی بھی ہو، اور تاجروں اور گاہکوں کو دھوپ اور پانی سے آرام ملے۔

---

[1] تھیونو، حصۂ سوم ص ۹۵۔

لیکن شہر کی تعمیر صرف اس مختصر خاکے پر منحصر نہ تھی۔ قطب شاہ یہ بھی چاہتے تھے کہ مُلک میں ایک اجتماعی زندگی پیدا ہو تاکہ اہلِ شہر ایک جگہ رہ کر اپنے ذہنی اور اخلاقی قوتوں کو ترقی دے سکیں اور اس کا اثر تمام مُلک میں پھیلے، اس لئے اہلِ شہر کی بود و باش کے لئے خاطر خواہ سہولت اور ان کی عمرانی ضرورتیں بہم پہنچائی گئیں۔ چنانچہ بادشاہ نے شہر کی تعمیر کے ساتھ اس بات کا پورا لحاظ کیا تھا کہ اس میں ایک متمدن زندگی کی تمام ضرورتیں مہیا ہوں، چنانچہ اس شہر میں چار بازار بنائے گئے جہاں اہلِ شہر کی تمام مایحتاج میسر آتی تھیں۔ ان بازاروں میں چودہ ہزار دُکانیں تھیں۔ دُکانوں کی ان تعداد سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں متمدن معاشرت کی ہزارہا اشیاء فروخت ہوتی ہوں گی۔ اس کے علاوہ اہلِ شہر کی سماجی اور مذہبی ضروریات کے لئے بے شمار محلے۔ حمام۔ خانقاہیں۔ مدرسے۔ مسجدیں۔ لنگر خانے۔ مہمان خانے اور کاروان سرائیں بنائی گئیں۔ ان عمارتوں کی تعداد کوئی بارہ ہزار بتائی جاتی ہے اور اس میں کوئی مبالغہ نہیں معلوم ہوتا۔ محلات کو چھوڑ کر محمد قلی قطب شاہ کے عہد کی اکثر عمارتیں اب تک موجود ہیں۔ چار مینار کے پاس جو جامع مسجد بنائی گئی تھی وہ خاص اہمیت رکھتی ہے، وہ تعمیر کاری کا اچھا نمونہ ہے اس کے احاطہ میں ایک حمام بنایا گیا جو حال تک موجود تھا۔ چھوٹے مہمان خانوں کے علاوہ بڑی کاروان سرائیں بنائی گئیں جہاں ایک وقت میں بڑے قافلے ٹھیر سکتے تھے۔ پُرانے پُل کے پاس ایک بڑی کاروان سرائے موجود ہے۔ ٹیورنیر کہتا ہے کہ:۔ "خود شہر میں چار پانچ کاروان سرائیں موجود ہیں جو دو منزلہ ہیں"[۱]۔ تعلیم کے لئے مدرسوں کا انتظام تھا۔ بیماروں کے لئے ایک بہت بڑا اسپتال "دار الشفا" کے نام سے تعمیر کیا گیا تھا جس کے بوسیدہ در و دیوار اب تک موجود ہیں اور

---

[۱] سیاحت نامہ ٹیورنیر ص ۱۲۳۔

محمد قلی قطب شاہ کی تمدنی عظمت کی یاد تازہ کرتے ہیں۔ اس میں شاہی طبیب اور جراح کام کرتے تھے۔ مریضوں کو دوا و غذا مفت دی جاتی تھی[1] اسکے علاوہ شہر میں ہر جگہ پانی کی نہریں دوڑتی تھیں اور راستوں پر سایہ دار درخت نصب کئے گئے تھے[2]۔ اس شہر میں شاہی بود و باش اور امور سلطنت کے سرانجام کے لئے بے شمار محلات بنائے گئے تھے، ان کی بہت بڑی تفصیل ہے، ان سے شہر کی عظمت ظاہر ہوتی تھی۔ چار مینار کے شمالی جانب مساوی فاصلوں پر

---

[1] تاریخ ظفرہ ص ۱۳۔

[2] حیدرآباد کے ایک مؤرخ نے شہر کے اس تعمیری اہتمام کو ان الفاظ میں ظاہر کیا ہے:۔
"شہرے مشتمل بر چہار بازار و چہار طاقہائے رفیع۔ در ہر بازارے چند چہارسوکہ بہ ہندی چوراہا گویند متساوی الاضلاع و سوائے آن بازارہائے دیگر و در اکثر بازارہا دو طرف جداول آبِ روان۔ بر کنار جداول درختان سایہ دار دکاکین چہار دہ ہزار گفتہ اند در پیش ہر دکان ایوانے و ماورائے این از محلہ ہا و حمام ہا و خانقاہ و مدرسہ و مسجد و لنگر و مہمان خانہا و دوازدہ ہزار مکان بر لوح مہارت کشیدند و جانب شمال را مرکز دولت و مستقر سلطنت قرار دادہ ایوانہائے عالی و قصرہائے رفیع نمودار گردانیدند و در احسن اوقات و یمن ساعات بنائے این شہر فرخندہ اثر نہادہ مجموع عمارات کوچہ و بازار وغیرہ را از سنگ و آہک بہ تکلف ہرچہ تمامتر بر آوردند و منازل بادشاہی بہ نوعے ساختند کہ مسافرانِ اقالیم سبعہ نظیر آن در ہیچ ملک نشان نہ می دہند۔ بالجملہ چو خسرو زمان چنان شہر را کہ در تمام مملکت ہندوستان شرقاً و غرباً جنوباً و شمالاً باعتبار مطبوعیت عدیلے ندارد طرح افگند۔" (حدیقۃ العالم مقالہ اول ص ۲۱۵)۔

چار بلند کمانیں بنائی گئیں اور ان کے درمیان گلزار حوض بنایا گیا اور اس کے مغربی جانب شاہی محلات تعمیر ہوئے تھے۔ داد محل جو عدل گستری کے لئے بنایا گیا تھا بہت عظیم الشان محل تھا، اس کی کئی منزلیں تھیں اور ہر منزل میں بڑے بڑے ایوان تھے۔ یہ اس قدر عظیم الشان محل تھا کہ بیرونی سیاح بھی اس کی تعریف کرتے رہیں۔ موسیٰ ندی کے کنارے ندی محل کے نام سے ایک عظیم الشان محل بنایا گیا تھا جہاں سے ندی کا اچھا نظارہ ہوتا تھا۔ اس کے بہترین موقع و محل اور نفیس تعمیر کاری کی بہت تعریف کی جاتی ہے، اگرچہ اب وہ باقی نہیں رہا، لیکن اس کی تعریف میں جو قصیدہ لکھا گیا تھا اس کے الفاظ سے اس کی عظمت کا پتا چلتا ہے:۔

قصیدہ

این مقام خوش کہ مستغنی است از نقش و نگار
ہست با جنات تجری تحتہا الانہار یار
فرخ آن منزل کہ شاہی را بود در وے نشست
روشن آن محفل کہ ماہی را بود بر وے گزار
بے قراراں را قرار دل فزاید چون در آں
جائے آن دارد کہ باشد نام او دار القرار
چوں دل دانا در و پیدا است صورتہائے غیب
بسکہ معقول است دیوار و درش آئینہ وار

ان محلات کے علاوہ داد محل کے قریب ایک اور محل خدا داد محل بنایا گیا تھا جو بلند ترین تھا، اس کی سات منزلیں تھیں، چونکہ ہر منزل اتنی بڑی اور عظیم الشان تھی کہ بجائے خود ایک محل تھی، اس لئے ہر منزل کا نام علیحدہ رکھا گیا تھا۔ ساتویں منزل الٰہی محل۔ چھٹی محمدی محل۔ پانچویں حیدری محل۔ چوتھی حسنی محل۔ تیسری حسینی محل۔ دوسری جعفری محل اور پہلی منزل موسوی محل کے نام سے موسوم تھی اور اس میں

بزرگوں کے نام سے تقدس بھی پیدا کیا گیا تھا۔ میرک معین سبزواری نے جو احمد نگر کا حاجب تھا ذیل کی رباعی میں اس کی تعریف کی تھی ؎

ایں قصر کہ ہست رشک افزائے بہشت — ایام بہ آب زندگانیش نوشت
تاریخ مرتب شد نقش کلک قضا — بر لوح بقا بنائے جان بخش نوشت

نبات گھاٹ، باغ محمد شاہی اور کوہ طور کی تعمیریں ایک علٰحدہ مضمون کی طالب ہیں۔ نبات گھاٹ شہر کے شمال میں تعمیر ہوا تھا جہاں نوبت پہاڑ واقع ہے اور باغ محمد شاہی ندی کے کنارے واقع تھا جہاں آج میر عالم کی بارہ دری پائی جاتی ہے اور کوہ طور کا محل اس پہاڑی پر تعمیر ہوا تھا جہاں آج کل قصر فلک نما واقع ہے۔ ان سے محمد قلی کا بلند حوصلہ ظاہر ہوتا ہے۔ کوہ طور کی ان الفاظ میں تعریف کی گئی تھی ؎

قطعہ

ازاں ایوان چہ گویم کز لطافت — جہان را نسخۂ خلد برین است
خم طاق بلندش چوں مہ نو — ز رفعت تا فلک پہلو نشین است

جب کوہ طور کا قصر تیار ہو گیا تو بڑے جشن کے ساتھ اس کا افتتاح ہوا، تمام اُمراء درو ساء سلطنت کو خلعتِ فاخرہ عطا ہوئے۔ میر ابو طالب جو محمد قلی قطب شاہ کا ناظر تھا بیان کرتا ہے کہ:۔ "حیدر آباد اور اس کی عمارتوں کی تعمیر میں ستر لاکھ ہون صرف ہوئے تھے[۱]۔ گولکنڈے کے اُمراء نے بھی شہر کو سجانے میں بڑا حصہ لیا۔ ہر جگہ اچھی خوش نما عمارتیں بنائیں اور باغ لگائے، اس کا نتیجہ یہ تھا کہ چند سال کے اندر حیدر آباد دُنیا کا ایک بارونق شہر ہو گیا۔

شہر و عمارات کی یہ خوش اسلوبی اور عظمت کے مدِ نظر نار یخ کے یہ الفاظ کہ:۔ "در تمامی ہندوستان عدیلے ندارد[۲]" صحیح معلوم ہوتے ہیں۔

---

[۱] تاریخ ظفرہ ص ۲۱ [۲] حدیقۃ السلاطین ص ۲۶۔

بیرونی سیاح اور مورخوں نے جو بالکل غیر جانب دار تھے شہرِ حیدرآباد اور اس کی عمارتوں کی اس سے زیادہ تعریف کی تھی۔ فرانسیسی سیاح ٹیورنیر نے جو گولکنڈے میں کئی مرتبہ آیا تھا بہت تعریف کرتا ہے:۔ "شہر نہایت سلیقے سے بنایا گیا ہے اور اس میں بڑے بڑے راستے ہیں"۔[1] ولیم منفولڈ کہتا ہے کہ:۔ "شہرِ حیدرآباد اپنی خوشگوار آب و ہوا اور پانی کی بہتات کی بدولت ہندوستان کا بہترین شہر ہے"۔[2] یہ سیاح شمال کے تمام شہنشاہی شہروں سے واقف تھے۔ مورخ فرشتہ نے جس کو قطب شاہی سلطنت سے کوئی واسطہ نہ تھا ان الفاظ میں تعریف کی تھی:۔ "شہرے کہ در تمامی ہندوستان شرقاً و غرباً، شمالاً و جنوباً مثل آن در لطافت و صفا ہرگز یافت نمی شود"۔[3] فرشتے کے عہد میں جو محمد قلی قطب شاہ کا ہمعصر تھا، شہنشاہی شہر آگرہ اور لاہور آباد تھے، خصوصاً فتح پور سیکری جو اکبر اعظم کا آباد کیا ہوا تھا، بڑا بارونق شہر تھا، اور فرشتہ ان سے ناواقف نہ تھا۔ شہنشاہ اورنگ زیب کے عہد کے مورخ حیدرآباد کی اس سے زیادہ تعریف کرتے ہیں۔ خافی خاں کہتا ہے کہ:۔ "خوشہائے آن شہر لطافت و آب و ہوائے آن سرزمین و حسن ہائے نمکین آن سبز فام و سیر حاصلی آن مرز بوم اگر پر دازم از سر رشتۂ سخن بازمی مانم"۔[4] محمد ساقی نے جو شہنشاہ اورنگ زیب کا خاص مورخ تھا، اور گولکنڈے کے محاصرے کے وقت حیدرآباد میں موجود تھا اس کی پُرزور الفاظ میں تعریف کی ہے:۔ "آرامگاہے است بر قطعۂ زمین بہشت، راحت جسم و آرام جان۔ آبادی وسیع تر از احاطۂ خیال، عمارات رفیع تر

---

[1] سیاحت نامہ ٹیورنیر، جلد اول ص ۱۲۳۔

[2] گولکنڈے کے تعلقات ص ۹۔

[3] تاریخ فرشتہ، مقالۂ سوم، روضۂ چہارم ص ۱۷۳۔

[4] منتخب اللباب، خافی خاں، جلد دوم ص ۳۶۸۔

از پایۂ اندیشہ ۔ رطوبت ہوا و عذوبت و روانی چشمہا ۔ شادابی سبزہ بہ مرتبہ کہ پنداری گُل و سبزہ این سرزمین را آب و رنگ زمرد و لعل است"[1] یہ دونوں مورخ شاہجہاں آباد کے رہنے والے تھے اور اس زمانے کے لوگ تھے جب کہ مغل تمدن و شہریت اپنے پورے عروج پر پہنچ گئی تھی، اس کے باوجود شہرِ حیدرآباد کی ان الفاظ میں تعریف کرنا قطب شاہی تمدنی عظمت کی بہت بڑی دلیل ہے ۔ خود شہنشاہ گولکنڈے کی تسخیر کے بعد شہرِ حیدرآباد آئے تو اسکی رونق اور شاہی عمارات کی عظمت سے بہت متاثر ہوئے اور ان کو اس قدر دلچسپی ہوئی کہ یہاں بہت دنوں تک رہ گئے ۔ اس زمانے میں خود اہلِ حیدرآباد بھی یہ سمجھتے تھے کہ شہرِ حیدرآباد کے مقابلے میں ہندوستان کے شہنشاہی شہر بے حقیقت ہیں ۔ جب کبھی حیدرآباد کی تعریف کی جاتی تو ایران کے شہروں کی مثال دی جاتی تھی ۔ آگرہ ۔ لاہور اور شاہجہاں آباد کا کسی نے نام نہیں لیا ۔ چنانچہ حضرت میر مومنؒ نے قصیدۂ تہنیت میں لکھا تھا ؎

چو صفاہان تو شد از شاہجہاں عباس شاہ
حیدرآباد از تو شد شاہا صفاہانِ نوی

شاہی عمارتیں

قطب شاہی عمارتیں بھی بڑے ذوق و سلیقے سے بنائی گئی تھیں ۔ اگرچہ ان عمارتوں میں وہ لطافت نہیں ہے جو عادل شاہی عمارتوں میں پائی جاتی ہے ۔ تاہم یہ بہت بلند اور مضبوط ہیں ۔ ان سے قطب شاہوں کی حقیقی عظمت کا پتا چلتا ہے ۔ تاہم جو آثار اس وقت پائے جاتے ہیں ان سے بہت کچھ اندازہ

---

[1] مآثر عالمگیری ص ۳۰۲ ۔

ہو جاتا ہے۔ قطب شاہی عمارتوں پر لاکھوں روپے اور بڑی محنت صرف ہوئی[1] بعض عمارتیں ایسی بنائی گئیں جو کئی عہدوں میں جاکر تیار ہوئیں۔ اگرچہ ان عمارتوں کے بنانے والے جانتے تھے کہ یہ ان کی مختصر زندگی میں ختم نہ ہو سکیں گی، لیکن ان کی بلند خیالی اس بات کو گوارا نہیں کرتی تھی کہ کوئی چیز ان کے حوصلے سے کم بنے۔ چار مینار اور مکہ مسجد تو ایسی عمارتیں ہیں جو دُنیا کے عجائبات میں شمار کی جا سکتی ہیں۔ ان کی رفعت و عظمت کا دُنیا میں کوئی جواب نہیں۔ مکہ مسجد دُنیا کی بہت بڑی عمارت ہے۔ سلطان محمد قطب شاہ نے اپنے مقدس ہاتھوں سے اس کی بنیاد رکھی تھی۔ رنگیا میستری اور فیض اللہ بیگ انجینیر نے اس کا کام شروع کیا تھا، لیکن (۷۷) سال میں یہ کام ختم ہوا، اور یہ اس وقت پایۂ تکمیل کو پہنچا جب کہ اورنگ زیب کی عملداری قائم ہو گئی۔ ہزاروں آدمیوں نے اس پر کام کیا ہے۔ اس کی اکیلی محراب جو صرف ایک پتھر سے تراشی گئی ہے پانچ سال میں تیار ہوئی تھی اور پانچ ہزار آدمیوں نے اس پر کام کیا تھا۔ جس وقت فرانسیسی سیاح ٹیورنیر گولکنڈہ آیا تھا ابھی یہ مسجد ناتمام تھی۔ اس نامکمل مسجد کو دیکھ کر اس نے کہا تھا کہ:۔ "اگر یہ پوری ہو جائے تو دُنیا میں سب سے بڑی اور ایشیا میں سب سے بہترین عمارت ہو گی"[2] اگر اورنگ زیب کی کفایت شعاری حائل نہ ہوتی تو اس کے مینار آج سلطان محمد کی حقیقی بلند خیالی ظاہر کرتے، لیکن اس کوتاہی کے باوجود حیدرآباد کا یہ "بیت العتیق" قطب شاہوں کی اصل عظمت کی یاد دلاتا ہے۔ آج بھی حیدرآباد میں یہ واقعہ سب کو یاد ہے کہ زہد و تقوٰی کے بڑے دعوے کے ساتھ اس کا سنگ بنیاد رکھا گیا تھا۔ چوبیس گھنٹوں میں کبھی یہ مسجد عبادت گزاروں سے خالی نہیں رہتی۔ غالباً اسی وجہ سے

---

[1] ابو طالب ناظر الممالک شہر حیدرآباد اور تمام شاہی عمارتوں کا خرچ ستر لاکھ ہون بتاتا ہے۔ تاریخ قطب شاہی ص ۳۰۵۔ [2] سفرنامہ ٹیورنیر، جلد اول ص ۱۲۳۔

یہ مکہ مسجد کہلاتی ہے۔ ایک شاعر نے کہا تھا ؎

طوافِ خانۂ اشرف گرت میسر نیست بیا بہ کعبۂ ملکِ دکن عبادت کن

قطب شاہوں کی حقیقی عظمت ان کے محلات سے بھی ظاہر ہوتی ہے۔ اپنے دو سو سال کی تاریخ میں قطب شاہوں نے اتنے قصر اور محل بنائے تھے جو غالباً دُنیا کے کسی شاہی خاندان نے نہیں بنائے۔ خود گولکنڈے کے اندر جو سلطنت کا اصلی مستقر تھا بے شمار محل بنائے گئے تھے۔ اس کی ابتداء غالباً ابراہیم قطب شاہ نے کی تھی اس کے عہد میں سب سے پہلے ایک ایوان شاہی بنایا گیا جو دولت خانۂ عالی کے نام سے موسوم ہے۔ اس کے علاوہ ابراہیم نے چند اور محل۔ باغ اور عمارتیں بنائی تھیں۔ منجملہ ان کے باغ گلشن۔ ابراہیم باغ۔ لنگر دوازدہ امام۔ بارہ دری مشہور ہیں۔ لیکن قطب شاہی سلطنت کی حقیقی تعمیر کاری محمد قلی قطب شاہ کے عہد میں ہوئی جو اس خاندان کا بڑا معمار ہے۔ اس کی مشہور عمارتیں دا د محل اور خداداد محل تھیں جن کا اُوپر ذکر آیا ہے۔ خداداد محل کی محمد قلی قطب شاہ نے ان الفاظ میں تعریف کی تھی ؎

خداداد محل کوں محمدؐ سنوارے تو اس میں جنت کے نگاداں نگارے

بلندی محل کا ہے اسمان جیسا سُورج، چاند، تارے سو اس تھے سنگارے

نہ اس جگ میں دیکھے کوئی ایسے محل کوں مگر دھرت پر قدسیاں لاکے ٹھارے

سجن محل اور اعلیٰ محل ان کے علاوہ تھے جن کی بادشاہ نے ان الفاظ میں تعریف کی تھی ؎

ساجنی سجن محل میں ساج کر چھند ان سو آئی

جان جاتی ہو کے جان کا پیالا سو منجکوں پلائی

اعلیٰ محل اعلیٰ دسے اعلیٰ خوشیاں بہتر گھڑی

اعلیٰ سکی اعلیٰ دسے جوبن کھڑی دو دان بھری

اور دریائے موسیٰ کے کنارے ندی محل کے نام سے ایک پُر فضا محل بنایا گیا تھا جو ندی کی روانی کے ساتھ دلکش منظر پیدا کرتا تھا۔ لیکن محمد قلی قطب شاہ کی مشہور عمارتوں میں "کوہ طور" اور "بنات گھاٹ" بھی شامل ہیں۔ یہ عمارتیں شہر سے قریب بلندی پر تعمیر کی گئی تھیں اور بڑے سلیقے سے بنائی گئی تھیں اور ان کے اطراف نہریں اور آبشاریں تھیں۔ چوطرف فوارہ دار حوض تھے[1]۔ محمد قلی قطب شاہ نے خود ایک نظم میں "کوہ طور" کی یوں تعریف کی تھی ؎

کہہ طور پر سدا ہے سبحان کا اُجالا تو خلق سرمہ کرتی رحمان کا اُجالا

اس طور کا سو ٹھارا مانند ہشت بہشت ہے اس نور تل چھپیا ہے اسمان کا اُجالا

مُشک محل اپنی خاص نوعیت کے اعتبار سے علحدہ شہرت رکھتا تھا اور گولکنڈے کی ایک تاریخ کے الفاظ ہیں :- "مثل آن قصر ہا بروے زمین بناء نشدہ"[2]۔ سلطان محمد قطب شاہ نے خود کئی محل تعمیر کئے تھے۔ اس کا بنایا ہوا "امان محل" اکیلا بہت بڑی تفصیل کا محتاج ہے۔ محل کی آرایش اور اس کے ساتھ جو باغ محمد شاہی بنا تھا اس کی دلچسپیاں سلطان محمد کے حقیقی ذوق کو ظاہر کرتی تھیں۔ اس کی تعریف میں ایک شاعر نے کہا تھا کہ ؎

زہے چہ قصرے کو ز رفعت تا فلک بوسد درش

زہے چہ باغے کز لطافت ہست چون باغ جنان

عبداللہ قطب شاہ کے عہد میں بھی بڑی بڑی عمارتیں بنی تھیں۔ نظام الدین ایک بہت بڑے محل کا ذکر کرتا ہے جو چار منزل بنایا گیا تھا۔ گو اس کا نام نہیں معلوم ہوتا، اس میں صندل کی لکڑی اور ہاتھی دانت استعمال کئے گئے اور اندر دیواروں پر رنگ کا کام کیا گیا تھا، اور اس میں تصویریں بھی تھیں۔ اس نظم میں اس محل کی

---

[1] تاریخ ظفرہ ص ۱۸۔

[2] حدیقۃ السلاطین ص ۲۶۔

تعریف کی گئی تھی ؎

قصر عالی بنائے شاہنشاہ   ہست بر کلہ زمین چو کلاہ
تاج بر سر نہادہ شخص زمین   می کند فخر بر سپہر برین[1]

اس کے علاوہ عبد اللہ قطب شاہ نے نبی باغ اور باغ لنگم پلی بنائے تھے۔ دونوں باغ شہر کے شمال میں واقع تھے۔ باغ لنگم پلی میں تین منزلہ محل بھی بنایا تھا جس کے آثار اب تک موجود ہیں۔ ان باغوں میں بڑے سلیقے کے ساتھ درخت اور پودے لگائے گئے اور کیاریاں بنائی گئیں اور ان میں آب رسانی کا اچھا انتظام تھا۔ ابو الحسن قطب شاہ نے بھی ندی کے کنارے ایک بہت بڑا محل بنایا تھا جو "چار محل" کے نام سے موسوم تھا اس میں چار عمارتیں تھیں اور ان کے بیچ میں ایک بڑا حوض تھا اور ندی کے کنارے بلندی کی وجہ سے دل فریب منظر پیدا کرتا تھا۔ شہر کے شمالی جانب "گوشہ محل" کے نام سے ایک اور محل تعمیر ہوا تھا جس کے آثار اب تک موجود ہیں اور اس کے قریب ایک بہت بڑا حوض بنایا گیا تھا۔

اگرچہ زمانے کی ستم ظریفی سے یہ عمارتیں ٹوٹ پھوٹ گئیں اور جو باقی ہیں وہ بھی فنا ہو رہی ہیں لیکن ان کی بوسیدہ در و دیوار سے قطب شاہوں کی تمدنی عظمت کا اندازہ ہوتا ہے۔ عمارتوں کے مسلسل وسیع دالان۔ بادشاہوں اور بادشاہ بیگموں کی رہائش کا شاندار انتظام اور شہ نشین کا تزک و احتشام الفاظ سے ظاہر نہیں کیا جا سکتا، اور جب شہر حیدر آباد میں شاہی قصر تعمیر ہوئے تو پُر عظمت لوازم سے ان کی رونق بڑھائی گئی۔ کمان سحر باطل، شاہی دولت سرا کا درِ داخلہ تھا۔ اس کمان میں ایک عظیم الشان دروازہ تھا جس پر سونے کا کام تھا اور اس کے مقابل کالی کمان کے پاس نوبت بجتی تھی اور ان دونوں کمانوں کے درمیان شاہی حفاظت کے لئے فوجیں کھڑی ہوتی تھیں اور ہاتھی جھومتے تھے اور

---

[1] حدیقۃ السلاطین ص ۸۸ -

ایک عجیب حیرت انگیز بات یہ ہے کہ ان تمام شاہی عمارتوں میں آب رسانی کا عجیب انتظام تھا۔ تمام محلوں کے اندر نلوں کا جال بچھا ہوا تھا۔ بلند دیواروں اور چھتوں پر پانی پہنچتا تھا۔ چھتوں پر بھی پانی کے چشمے تھے[1]۔ ہر محل کے ارد گرد باغبانی کا بڑا اچھا انتظام تھا۔ ان کے علاوہ جو مستقل باغ تھے ان کی رونق و شادابی ایک دلکش منظر پیدا کرتی تھی۔ ان میں ہر جگہ نہریں دوڑتی تھیں اور حوض اور فوارے تھے اور جا بجا سیدھی اور خوش نما روشیں بنی ہوئی تھیں جن کی دونوں جانب گل داودی کی قطاریں ہوتی تھیں اور موقع کی مناسبت سے کھجور اور ناریل کے درخت نصب کئے جاتے تھے[2]، اور غالباً یہ خاص ذوق و سلیقہ قطب شاہوں کے لئے مختص تھا، اور جگہ اس کی مثالیں بہت کم ملتی ہیں۔ خود مغل شہنشاہ اور شہزادے بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہے۔ جب شہنشاہ اورنگ زیب کا چھوٹا بیٹا شہزادہ محمد کام بخش حیدر آباد کا گورنر بنایا گیا تو اس نے قطب شاہی محلات کو چھوڑ کر اپنی سکونت کے لئے ایک علحدہ مکان تعمیر کر لیا جس کو شہنشاہ اسراف سمجھتے تھے۔ لیکن شہزادے نے اس کا یہ جواب دیا تھا کہ "قطب شاہی محلوں میں رہنا اس سے زیادہ اسراف ہے۔ قطب شاہی محلات اس قدر وسیع اور پُرعظمت ہیں کہ ان کی کما حقہٗ پرداخت تو کجا ان میں چراغ جلانا مشکل ہے[3]۔" ایک تیموری شہزادے کے یہ الفاظ جو شاہجہانی محلات کا

---

[1] تھیونو ان محلات کی بہت تعریف کرتا ہے۔ اس کا بیان ہے کہ ان بلند محلوں کی آخری منزلوں پر بھی پانی پہنچایا جاتا ہے۔ نیز وہ یہ بھی کہتا ہے کہ چار مینار کی بلندی پر بھی پانی پہنچتا ہے (تھیونو، حصۂ سوم ص ۹۴ و ۹۵) قلعۂ گولکنڈہ میں اس وقت جو عمارتیں موجود ہیں ان میں نلوں کے آثار اب تک موجود ہیں۔

[2] تھیونو، حصۂ سوم ص ۹۵۔

[3] گلزار آصفیہ ص ۳۔

رہتے والا تھا، بہت معنے خیز ہیں اور ان سے معلوم ہوتا ہے کہ قطب شاہی قصر مغل عمارتوں سے کم نہیں تھے۔ دوسرے سیاحوں کے بیان سے بھی اس کی توثیق ہوتی ہے۔ ولیم میتھولڈ جو انگریز کمپنی کا ملازم تھا لکھتا ہے کہ:۔ "قطب شاہی محلوں کی تعریف نہیں ہوسکتی، یہ مغل محلوں سے بہت بڑے ہوئے ہیں۔"[1]

رفاہِ عام

باغات و محلات کے علاوہ قطب شاہوں کے رفاہ عام کے کام بھی قابلِ ذکر ہیں اور سب سے پہلے ابراہیم قطب شاہ نے مساجد۔ مدارس اور تالاب تعمیر کئے۔ اس کے بنائے ہوئے تالاب حسین ساگر۔ ابراہیم پٹن اور بدویل بہت مشہور ہیں جو آب پاشی اور آب رسانی کے کام آتے تھے۔ حسین ساگر کی تعمیر جو حضرت حسین شاہ ولی کی نگرانی میں ہوئی تھی آٹھ مہینے میں ختم ہوئی اور اس پر دو لاکھ ہون صرف ہوئے۔ شہرِ حیدر آباد اور گولکنڈے کی آمد و رفت کے لئے ایک پُل بنایا گیا جو پُرانا پل کہلاتا ہے، اور ابراہیم کے جانشینوں کے عہد میں متعدد مدارس۔ کاروان سرائیں اور حمام اور شفاخانے اور لنگر خانے بنائے گئے، لیکن قطب شاہی دور میں حیات بخشی بیگم کی تمدنی خدمات جو اکثر رفاہِ عام کی صورت میں ظاہر ہوئے ناقابلِ فراموش ہیں۔ حیدر آباد میں حیات ماں نے اپنی اسی سالہ عمر میں تلنگانے کی اس قدر تمدنی خدمات انجام دیں کہ ان کا صحیح موازنہ مشکل ہے۔ پانچویں محرم کا لنگر، حیات ماں کی مشہور یادگار تھا جس دلچسپ اور سنسنی خیز واقعے سے اس کی ابتدا ہوئی تھی وہ ابھی تک سب کو یاد ہے، اور محرم میں تقریباً ہر گھر میں دہرایا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ حسینی علم۔ بی بی کا علم اور بی بی کا چشمہ حیات ماں کی یاد تازہ کرتے ہیں۔ لیکن حیات ماں کی بہت بڑی یادگار

---

[1] گولکنڈے کے تعلقات ص ۹۔

اس کا آباد کیا ہوا حیات آباد ہے جس سے حیات بخشی بیگم کا صحیح ذوقِ تعمیر و آبادکاری معلوم ہوتا ہے۔ یہ ۱۰۳۵ھ میں عبد اللہ قطب شاہ کی تخت نشینی کے پہلے سال تعمیر کیا گیا۔ غالباً اس کا مقصد اس تخت نشینی کی یادگار قائم کرنا تھا، اور یہ ایک اچھی یادگار ہے۔ اول تو یہ حیدر آباد کے مشرق میں بہت قریب واقع ہے جہاں شاہی تفریحیں اور تقریبیں ہو سکتی تھیں۔ دوسرے مسولی پٹم کی شاہراہ پر آباد کیا گیا تھا تاکہ جو مسافر مشرقی بندرگاہوں سے اور ملک کے مشرقی اضلاع سے حیدر آباد آتے تھے وہ یہاں ٹھیرتے تھے اور اس طریقے سے شہر سے قریب ایک اچھا ٹھکانا تھا۔ حیات آباد میں شاہی قصر بنایا گیا، مسافروں کے لئے ایک کاروان سرائے بنائی گئی جو "سرائے ماں صاحب" کے نام سے موسوم ہے۔ اس کے کئی دروازے ہیں، اس کے احاطہ میں ایک مسجد ہے جو قطب شاہی تعمیر کاری کا اچھا نمونہ ہے۔ اس کے قریب جو "خاص باغ" بنایا گیا تھا اب تک موجود ہے، اور بچوں کی تعلیم کے لئے ایک مدرسہ تعمیر کیا گیا۔ اس سے حیات ماں کے عہد کی رونق اور چہل پہل کا اندازہ ہو سکتا ہے، چنانچہ اس کے عہد کے ایک مورخ نظام الدین صاعدی نے ان الفاظ میں حیات آباد کی تعریف کی تھی:-

"حیات آباد کہ قطعہ ایست از بہشتِ برین و بقعہ ایست جنت آئین در دو فرسخ جانبِ شرق دار السلطنت حیدر آباد صانہا اللہ فی ظل دولت ... والفساد۔ در ابتدائے سالِ جلوس شرافت مانوس خاقان یوسف جمال بہ طرحِ دلنشین و طرزِ فردوس قرین احداث فرمودہ اند۔ از وفورِ اہلِ صنعت و حرفت و جمعیت اصناف طبقات انام وکثرتِ ابنیہ و عمارات رفیعہ و بسیارے باغات بساتین مشابہ بہ شہر شدہ۔" [۱]

(تمت)

[۱] حدیقۃ السلاطین صاعدی ص ۱۲۴

ضمیمہ

شاہجہاں اور عبداللہ قطب شاہ کے مابین مراسلت

فرمان عالیشان بہ قطب الملک ایالت و امارت پناہ ، ارادت و عقیدت دستگاہ ۔ عمدہ اماجد کرام ۔ سلالہ اکارم عظام ۔ نقادۂ خاندان عزو علا ۔ عصادہ دودمان مجد و اعتلا ۔ زبدہ مخلصان صلاح اندیش ۔ خلاصہ متخصصان سعادت کیش مورد الطاف شہنشاہی ۔ مصدر آداب خیر خواہی ۔ جوہر مراۃ صفا و صفوت ۔ فروغ ناصیہ دولت و رفعت ۔ سزاوار عاطفت بیکران ۔ المخصوص بہ عنایت الملک المنان ۔ قطب الملک بہ شمول عنایات بادشاہانہ مستظہر بودہ بداند کہ ما بدولت و اقبال بادشاد اسلام مروج دین حضرت سید انام علیہ و علی آلہ و اصحابہ صلوات اللہ الملک العلام، موید و مروج مذہب اہلِ سنت و جماعتیم ۔ بر ما واجب است کہ در ہر جا کہ حکم اشرف اقدس ما جاری باشد احکام شریعت غرا و ضوابط ملتِ بیضا را جاری سازیم ۔ و آثار بدعت و ضلالت را محو فرمائیم ۔ بہ مسامع جاہ و جلال رسیدہ کہ در ملک آن قطب فلک شوکت علیٰ رؤس الاشہاد سب اصحاب کبار کہ آیات قرآن مجید و فرقان حمید دلالت می کنند بر فضل ایشان و اخبار آثار صحاح شہادت می دہند بر علو درجہ و سمو مرتبہ آن بزرگان، رضی اللہ تعالیٰ عنہم و با فضائل صوری و معنوی ایشان قرابت قریبہ حضرت رسالت صلوات اللہ و سلامہ علیہ و علی آلہ و اصحابہ اجمعین فراہم آمدہ می نمایند ۔ و آن ایالت پناہ

منع نمی کند و به سزائے اعمال نمی رساند۔ بنابر آن از روئے ارشاد حکم می فرمائیم که از ملکِ خویش این امر قبیح و فعل شنیع برطرف گرداند۔ اگر بدبختے از بے سعادتی مرتکب شود او را سیاست نماید۔ و اگر چنین نخواهد کرد و در قباحتیش به این معنی به وضوح نخواهد پیوست دریں صورت بر ما لازم است که در مقام تسخیر آن ملک شویم و مال و اہل آن ولایت را بر خود حلال دانیم۔ و خون آنها را هدر شناسیم۔ و دیگر به عرض رسید که خطبه را در آن ملک بنام فرمان روائے ایران می خوانند۔ هرگاه آن ایالت پناه دعوی مریدی ما می نموده باشد با فرمان روائے ایران چه رجوع دارد۔ باید که بعد ازین نام فرمان روائے ایران در خطبه مذکور نسازد۔ و در آن ملک خطبه بنام نامی و القاب سامی ما مزین باشد۔ دیگر مبلغ کلی از بابت پیش کش آن ایالت و شوکت پناه را باید داد۔ چنانچه تفصیل آن از اوراقے که به دستخط دیوانیانِ کرام رسیده و همراه این فرمان عالیشان فرستاده شده معلوم خواهد شد۔ آن را ادا نماید۔ چون ضرور بود که فهمیده معتمدی را به آن صوب فرستیم تا مقدمات مسطوره را خاطر نشان آن شوکت دستگاه کند و اعلام نماید که ما بدولت و اقبال نظر به وفور اخلاص و صدق اعتقادے که پدران ایالت پناه سلطان محمد قطب الملک مرحوم به خدمت داشته و خدمتے که از آن مرحوم به وقوع آمده این همه عنایات پادشاهانه نسبت به آن قطب الملک ایالت می فرمائیم و آن ملک را به او مرحمت نمائیم۔ و مقرر می کنیم که به شرط استقامت جاده دولت خواهی و اطاعت و انقیاد احکام جهان مطاع عالم مطیع و ادائے مطالبات سرکار خاصه شریفه بعد ازین ضررے از اولیائے دولت قاهره به آن ملک نرسد و در عوض مبلغے مذکور جواهر نفیسه و مرصع آلات ثمینه و فیلان بے عیب کلان نامی مثل واک سمندر و بشیر که پدر او به عنوان پیش کش فرستاده بود و دیگر تحف و هدایا از آن امارت دستگاه گرفته روانه درگاه والا گردد۔ لهذا معتمد سرکار آنگاه ملا عبداللطیف را که

از بندہائے روشناس این درگاہ خلائق پناہ است با آنکہ خدمت دفتر تن داشت و بہ دن آن لائق العنایت در رکاب ظفر انتساب لازم بود پیش آن ایالت د شوکت پناہ فرستادیم۔ و ہر ارشادے کہ آن قطب فلک ایالت و ابہت را بایست نمود بہ زبان آن معتمد حوالہ فرمودہ ایم بہ موجب آنچہ درین فرمان عالیشان حکم شد و بہ ہرچہ زبانی ارشاد فرمودہ ایم عمل نماید۔ و این پیش کش را آن چنان ترتیب دادہ مصحوب مشار الیہ روانہ سازد کہ در ایام نوروز عالم افروز در دولت آباد از نظر اشرف بگذرد۔ نقاست جواہر و خوبی فیلان پیش کش مذکور بہ عنوانے باشد کہ مجرائے خوب آن نصفت دستگاہ ازین جہت شود۔ یقین داند کہ اگر توفیق قبول این احکام نیافت و بہ این ارشاد مترشد نگشت و پیش کش مذکور را بہ روشے کہ حکم جہان مطاع واجب الاتباع شرف صدور یافتہ روانہ درگاہ فلک اشتباہ کہ ساکنان اقالیم سبعہ را عز و پناہ است نگرداند افواج قاہرہ و عساکر منصورہ بہ آن ملک خواہند درآمدہ در آن ہنگام آنچہ بہ آن ملک و اہل ملک بہ سد از نتائج اعمال خود داند۔[1]

انقیاد نامہ قطب الملک

نعہد نامہ مرید موروثی نیک خواہ مخلص و فدوی بلا اشتباہ عبد اللہ قطب الملک آنکہ چون بندگان اعلیحضرت خاقانی ظل سبحانی خلیفۃ الرحمانی سلیمان مکانی صاحب قران ثانی خلد اللہ ملکہٗ و سلطانہ و افاض علی العالمین برہٗ و احسانہٗ کہ ہزار جان گرامی فدائے نام نامی و لقب سامی آن حضرت باد۔ از روئے کرم فطری و رافت جبلی این ناحیہ مقرر را بشرائط ذیل نسلاً بعد نسلٍ و بطناً بعد بطنٍ بہ این نیازمند درگاہ جہان پناہ مرحمت فرمودہ اند۔ این مرید موروثی از صدق اعتقاد و وفور اخلاص تعہد مینماید کہ

---

[1] بادشاہ نامہ، عبد الحمید لاہوری، جلد اول حصہ دوم ص۔ ۱۳۲ و ۱۳۳۔

همواره درین ملک خطبه چاریار باصفا را چنانچه اسم سامی هر یک از ان
اکابر دین رضوان الله تعالی علیهم اجمعین صریحاً در آن مذکور شود مزین به نام نامی
لقب گرامی بندگان اعلی حضرت خاقانی ظل سبحانی در جمعه و اعیاد لاینقطع
می خوانده باشد - و هرگز پرامون روشے که سابقاً خوانده اند نگردند - و پیوسته
بر زر سرخ و سفید سکه مبارک که از درگاه عالم پناه کنده فرستاده اند می زده باشد -
و نیز قبول نمودیم که از ابتدائے سنه نه جلوس مقدس مبلغ دو لک هون را که
هشت لک روپیه می شود از جمله چهار لک هون بابت نظام الملک سال بسال
بے عذر و اهمال به سرکار خاصه شریفه واصل سازم بدین گونه که اگر بادشاه زاده
والاگوهر بلند اختر نظام بخش صوبه دکن باشند به خدمت ایشان فرستیم و الا
بهر یک از عمدهائے آن دولت ابد اتصال که پرداخت صوبه مذکور به رائے
زرین او مفوض باشد برسانم - و هشت لک روپیه از جمله سی و دو لک روپیه
پیش کش که تا آخر سنه هشت بالمقطع بر این نیازمند درگاه مقرر شده بود
باقی مانده نیز با دو لک هون سال متصل که سنه نه جلوس مبارک باشد به درگاه
بفرستم - و آنچه تفاوت قیمت جواهر و فیلان و اسپان و غیرها موافق قیمت
حضور اشرف نسبت به قیمت گولکنده از پیش کش حال مشخص شود این مرید موروثی
تعهد می نماید که بلا عذر واصل خزانه عامره سازد - و در سنوات آینده هم اگر
چیزے در جمله زر پیش کش فرستاده شود همین طریق سلوک باشد - و بعد ازین همیشه با اولیائے
دولت عظمی از صمیم قلب یکرنگ و موالف و با مخالفان که اسم بے مسمای بیش نیستند
از ته دل دشمن و مخالف باشم تا راستی و رسوخ این نیازمند در تعهدات مذکوره
ظاهر و باهر گردد - و در حضور رفعت پناه فضائل و کمالات دستگاه مولانا
عبداللطیف بر قرآن مجید دست گذاشته قسم یاد کردم که خلاف آنچه تعهد کرده ام
از من سر نزند - و اگر خدا نخواسته باشد مصدر خلاف آن گردم اولیائے دولت قاهره
در انتزاع ملک من محق خواهند بود - طریقه عمدهائے دولت که صوبه دار دکن باشند آنکه

چون همچشمان به سبب پیش قدمی این نیازمند در قبول اطاعت و بندگی درگاه جهان پناه کمر بعداوت من چست بسته اند - اگر احیاناً عادلخانیه بعد از معاودت رایات عالیات از کوته اندیشی و ناعاقبت بینی دست تطاول به ملک این نیازمند دراز کنند ایشان در دفع شر آنها از من و ملک من ممد و معاون باشند و اگر باوجود آنکه این نیازمند طلب امداد و اعانت نماید و صوبه دار دکن به تغافل گذراند و عادلخانیه به عنف و تعدی ازین نیازمند مبلغی بگیرند - آن مبلغ درین هشت لک روپیه پیش کش هر ساله مجری باشد - این چند کلمه بر سبیل حجت نوشته شد - تحریر فی التاریخ شهر ذی الحجه الحرام سنه هزار چهل و پنج -[1]

ایالت و شوکت پناه و عظمت و شوکت دستگاه - عمده ارباب دول.

عهدنامه

قدوه اصحاب عمل - زبده مخلصان ارادت کیش - قطب الملک به عنایات بے غایات بادشاهانه مستظهر و مفتخر بوده بداند که چون دریولا آن قطب الملک ایالت بیاوری بخت - اختیار بندگی و اطاعت این درگاه آسمان جاه نموده خطبه را که مزین بنام نامی خلفائے راشدین مهدیین رضوان الله تعالی اجمعین و محلی به القاب سامیه ما بود در ملک خود بر اوج منابر بلند آوازه گردانیده و وجوه دراهم و دنانیر را به سکه مبارک ما آراسته و پیراسته ساخته قرار داد که همیشه به همین دستور در تمام آن ملک خطبه میخوانده باشند و زر را به سکه مبارک ما مسکوک می نموده باشند - و پیش کشے که مقرر فرموده بودیم بدرگاه والا ارسال داشتن. و قبول نمود که از جمله آنچه به نظام الملک میداد هر سال دو لک هون که هشت لک روپیه باشد به سرکار خاصه شریفه رساند - بنابرین ما تقصیرات گذشته او را عفو فرمودیم - و ملکے که در تصرف آن عمده ارباب دول است برو مقرر و مسلم داشتیم خدا و رسول خدا را شاهد این مراتب ساخته حکم می فرمائیم که مادام که آن قطب الملک

---

[1] بادشاه نامه - عبدالحمید لاهوری جلد اول حصه دوم ۱۷۸ - ۱۷۹ - ۱۸۰ -

ایالت و اولاد و احفاد او به شروط مذکوره عمل نمایند و خلاف آن نکنند انشاء اللہ تعالیٰ از ما و از فرزندان نامدار برخوردار ما و اُمرائے عالی مقدار ما ضررے به ملک آن مرید نخواہد رسید و خلاف عہودے که درین لوح طلا که در ثبات ثانی لوح محفوظ است منقوش گشته به عمل نخواہد آمد۔ و این قرار نسلاً بعد نسل ہمچو سد سکندر استوار خواہد بود۔ ہفتم شہر ربیع الثانی سنه ہزار چہل و شش ہجری مطابق ہفدہم ماہ شہریور سنه نه جلوس مقدس سمت تحریر یافت[1]

عرضداشت قطب الملک که در سپاس گذاری عنایات مزبوره ارسال داشته بود

عرضداشت مخلص صادق الاعتقاد و مرید موروثی فدویت نہاد۔ عبد اللہ قطب الملک۔ تحفه دعائے که گروبیان ملاء اعلیٰ را استقبال آن زیبد و ہدیه ثنائے که لمعات شوارق آن بر عالم و عالمیان پرتو اندازد۔ اتحاف درگاہ آسمان جاہ و اہداء بارگاہ عرش اشتباہ اعلیٰ حضرت کیوان رفعت۔ فریدون حشمت۔ گردون بسطت۔ سلیمان جاہ۔ عالم پناہ۔ مہر درخشان سپہر سلطنت و جہان بانی۔ ماہ درخشان آسمان خلافت و کشورستانی۔ سلطان سلاطین الافاق۔ خاقان خواقین العصر بالارث والاستحقاق مالک ممالک اقالیم سبعه بالطول والعرض جالس سریر انا جعلناک خلیفةً فی الارض۔ خسرو سلیمان فر نوشیروان داد۔ دارائے خورشید رائے سکندر استعداد ناصب رایات عالیات فتح و ظفر۔ رافع اعلام نصرت فرجام سلطنت ہفت کشور۔ معمار خانه دولت و دین۔ مصداق کریمه فضل اللہ المجاہدین علی القاعدین۔ خداگان عرصه عالم و اسطه امن و امان زمرہ بنی آدم۔ پادشاہ سلیمان اقتدار مسیحا آثار۔ افضل و اکمل خواقین روزگار۔ ادام اللہ تعالیٰ مآثر سلطنته و خلافته و حشمته و اقباله علی صفائح الشہور و السنین۔ و اشاع احکام حدود

---

[1] پادشاہ نامه۔ عبد الحمید لاہوری جلد اول حصه دوم ص ۲۱۰-۲۱۱۔

نصفت داہستہ د جلالہ فی السموات و الارضین بجاہ محمد سید الاولین و الآخرین گردانیدہ بہ عرض استادگان مجلس خلد برین و بہ سمع باریافتگان محفل فردوس قرین میرساند کہ ہمایون توقیع رفیع منیع وگرامی فرمان جہان مطاع عالم مطیع کہ از موقف مرحمت و ذرہ پروری و مقر عطوفت و مرید نوازی۔ بنام این فدوی صادق الارادہ شرف نفاذ یافتہ بود کہ درضمن ہر حرف آن عنایتے و در طے ہر سطر آن مکرمتے اندراج داشت۔ مع لوح مبارک ہمایون و صفحہ ذہب مرحمت مشحون کہ بلاخلاف نموذج لوح محفوظ خالق بیچون و بہ مشابہ سرنوشت کائنات از وصمت تغیر و تبدیل مضمون و مامون بود۔ و شبیہ بے شبہ و نظیر مبارک کہ از برکات وصول فیض موصول آن عطیہ عظمیٰ و میامن ورود مسعود آن موہبت کبریٰ صحی فراق زمانی براحت وصال جاودانی تبدیل یافت۔ و شکایت حرمان ملازمت حضور قابض النور بسعادت لقائے و اقرالسرور مبدل شد۔ و مصحوب سیادت و عزت دستگاہ عمدۃ السادات الاجلا خواجہ زاہد ارسال یافتہ بود۔ مصرع

بہ ساعتے کہ تولاید و کند تقویم

کالوحی المنزل من السما بمیامن ورود سرانسر مسعود تارک مفاخرہ و فرق مباہات این مرید موروثی را عرش فرسا گردانید۔ و عنایت فیل ظفر نشان کہ بے شائبہ تکلف و غائلہ تصلف تا غایت فیلے بہ این حسن اندام و خوشخوئی و بہ این لطافت ترکیب و تناسب اعضا و نکومنظری بہ نظر این فدوی در نیامدہ است۔ و تخیل کہ تاحال واقع نہ شدہ باشد کہ باین مشابہ فیلے از فیل خانہ والا بہ ہیچ یکے از مریدان ثابت الارادہ عنایت شدہ باشد۔ بعضے تبرکات ذات البرکات کہ نمونہ حُلہائے جنان و رشک نفائس جہان بود۔ فرق عزت را بہ اوج دولت رسانید۔ شکر نعما و سپاس آلا منحصر در اعتراف بہ عجز و قصور میداند۔ چہ اگر خواہد کہ ادائے شکر یک لطف از الطاف گوناگون و تفقدات از حد و حصر بیرون کہ درضمن فرمان عالی شان عطوفت عنوان نسبت بہ این مرید صادق الاعتقاد

مندرج بود نماید۔ سالہا از عہدہ آن نمی تواند برآمد۔ و اگر در مقام سپاس یک عنایت از عنایات مذکورہ فوق درآمدہ عمر نوح و امتداد زمان بہ او کفایت نہ کند۔ بیت :۔

اگر سالہا عذر لطفت تو خواہم — برون نائم از عہدہ آن کماہی
ہمان بہ کہ آن را بہ لطفت گذارم — کہ ہم لطفت از خود کند عذر خواہی

چون علامات طلوع آن کواکب درخشان از مشارق عاطفت و احسان سمت ظہور یافت۔ علی العادۃ المستمرہ کہ لازمہ ارادت و وظیفہ بندگی این مرید موروثی است۔ بہ اقدام استکانت و خضوع استقبال کردہ وظائف تعظیم و تکریم و مراسم ادب و تسلیم قیام نمودہ چنانچہ شمۂ ازآن شاید از عرضہ داشت سیادت و عزت دستگاہ مومی الیہ بر استادگان پایہ سریر اعلیٰ بہ منصہ ظہور رسیدہ باشد۔ و امید وار است کہ بعد از وصول مشار الیہ بہ سعادت استلام درگاہ خلائق پناہ حقیقت صدق ارادت و خلوص عقیدت، و انقیاد احکام مطاعہ و پیروی آدامر لازم الاطاعہ۔ این فدوی صادق الارادہ بہ مسامع جاہ و جلال رسد۔ و بہ آن وسیلہ مجدداً در مسلک مریدان خاص و فدویان قدیم الاختصاص درآید۔ و بعضے اشارات ذات البشارات و احکام مطاعہ لازم الاطاعہ کہ در مطاوی آن منشور اقبال شرف تحریر یافتہ بود بہ تقریر دلپذیر سیادت و وکالت آیات مشار الیہ و عزت و فضیلت نصاب شیخ محمد طاہر کہ بیاوری بخت بہ سعادت آستان بوس آن درگاہ آسمان جاہ استسعاد یافتہ مشمول مراحم معاودت نمودہ بگوش جان و جنان رسید۔ و ہمہ را سمعاً و طاعۃً از صمیم قلب تلقی بہ قبول نمودہ توفیق امتثال ادامر مطاعہ را در ہر باب از درگاہ احدیت سائل است۔ و قیل گجبوتی کہ در فرمان قضا جریان در باب آن اندراج یافتہ کہ سرآمد فیلان نامی این فدوی است و فی الواقع فیل نامی جز آن نداشت بموجب اشارہ والا کہ در تضاعیف فرمان قدر توان مرقوم بہ خط قدسی نمط کہ بنام عمدۃ الملک خان دوران بہادر

شرف صدور یافته بود و نقل آن به نظر این فدوی در آمد قبل از ورود این فرمان عالی نشان روانه درگاه آسمان جاه شده است۔ یحتمل که داخل فیل خانه معلی شده باشد۔ با آنکه اطاعت به فعل آمده لیکن چون خالی فرستادن عرضه داشت مناسب نبود۔ تحفه که قابل فرستادن باشد نزد فدوی نمانده حیرت داشت که چه کند۔ چنانچه سیادت و وکالت پناه موسی الیه به عرض خواهد رسانید۔ درین اثنا پیش بعضے تجار الماسے که بوزن الماس سابق بود و در آب و رنگ بر آن رجحان داشت و صاحبش مدعی آن که الماس کهنه است بهم رسیده۔ اگرچه ظاهر است که الماس به این وزن که هرچند که خوش آب و رنگ باشد بیاقت آن ندارد که تنها فرستاده شود اما بحکم مالایدرک کله لایترک کله خریده بر ارسال آن جسارت نموده۔ لطف کریم و کرم عمیم عذر خواه حقارت آن خواهد شد۔ زیاده ترک ادب می نماید۔ ظل ظلیل سلطنت و خلافت و عظمت و فرمان روائی بر مفارق عالم و عالمیان پاینده باد۔[۱]

۱۔ بادشاه نامه۔ عبدالحمید لاهوری، جلد اول، حصهٔ دوم ص ۲۱۱-۲۱۵۔

اشاریہ تاریخ گولکنڈہ

مرتبہ

وقار خلیل

(آ)

آدم خاں - ۹۲، ۱۸۷

آذر بائیجان - ۱۹

آستانہ - ۲۶۹

آسیر راؤ - ۱۱۵، ۱۲۲، ۱۲۴

آشتی - ۱۸۴

آصف خاں - ۱۳۶، ۱۸۶، ۱۸۸، ۱۸۹

آکرکرا - ۳۵۱، ۳۷۵

آگرہ - ۱۴۵، ۳۵۹، ۴۱۷، ۴۱۸

آمنہ بی بی - ۸۷، ۸۸

آندھرا پردیش - ۹۷، ۱۰۱، ۱۰۴، ۳۲۸، ۳۳۵

(ا)

ابراہیم خلیل اللہ محمد - ۲۰۷، ۲۸۲، ۲۸۶

ابراہیم زبیری - ۸۵

ابراہیم عادل شاہ اول - ۵۱، ۵۲، ۵۴، ۵۵، ۸۳، ۸۵، ۸۷، ۱۶۹۔

ابراہیم عادل شاہ ثانی - ۱۳۸، ۱۳۶ تا ۱۳۸، ۱۴۳، ۱۴۹، ۱۵۷، ۱۶۹، ۱۸۵۔

ابراہیم قلی قطب شاہ - ۴۳، ۴۴، ۴۵، ۴۸ تا ۵۰، ۵۸، ۶۱ تا ۶۶، ۶۷، ۷۳ تا ۷۷، ۷۹ تا ۸۳، ۸۵، ۸۹ تا ۹۳، ۹۵ تا ۹۷، ۹۹ تا ۹۹، ۱۰۰ تا ۱۰۵، ۱۰۹ تا ۱۱۱، ۱۲۰، ۱۳۱، ۱۳۳، ۱۳۷، ۱۵۱، ۱۵۲، ۱۵۷، ۱۵۸، ۱۶۴، ۱۶۹، ۱۷۶، ۱۹۱، ۱۹۸، ۲۳۸، ۳۴۲، ۳۴۶، ۳۵۲، ۳۶۱، ۳۶۴، ۳۸۳، ۳۸۵، ۳۹۷، ۳۹۹، ۴۰۲، ۴۰۳، ۴۰۹، ۴۲۰، ۴۲۴۔

ابراہیم مرزا (دیکھو ابراہیم قلی قطب شاہ)۔

ابن نشاطی - ۴۰۰۔

ابو الحسن ابن شاہ طاہر - ۱۳۴۔

ابو الحسن تانا شاہ (دیکھو ابو الحسن قطب شاہ)۔

ابوالحسن قطب شاہ — ۱۶۴، ۱۸۱، ۱۸۵، ۲۰۵، ۲۰۷، ۲۱۱، ۲۲۷، ۲۳۳، ۲۳۶ تا ۲۴۰، ۲۴۳ تا ۲۵۵، ۲۵۷ تا ۲۵۹، ۲۶۵، ۲۶۷، ۲۶۸، ۲۷۲، ۲۷۸، ۲۷۹، ۲۸۱، ۲۸۴، ۲۸۶، ۲۸۹، ۲۹۰ تا ۲۹۲، ۲۹۵ تا ۲۹۷، ۲۹۹ تا ۳۰۲، ۳۰۴، ۳۰۵، ۳۰۷ تا ۳۱۱، ۳۱۳، ۳۱۸، ۳۲۳ تا ۳۲۷، ۳۲۸، ۳۳۲، ۳۳۳، ۳۴۲، ۳۴۹، ۳۵۱، ۳۵۴، ۳۶۰، ۳۶۷، ۳۷۲، ۳۷۴، ۳۹۴، ۴۰۱، ۴۰۵، ۴۲۲۔

ابوالفضل — ۱۴۲، ۱۴۵، ۴۰۹

ابوالکلام آزاد اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ — ۳۸۶

ابوالمکارم — ۲۸۵

ابوتراب — ۷۶

ابوسعید مرزا — ۱۷

ابوطالب ناظر الممالک — ۱۵۶، ۳۴۴، ۴۱۹

ابوغنائم، سید — ۳۹۳

ابو محمد — ۲۳۸

اجین — ۱۵۵، ۱۵۸

احسن — پیر میراں، قاضی — ۳۹۲

احقر، گردہاری لال — ۲۲۵، ۲۲۶، ۲۷۲

احمد — ۳۹۹

احمد آباد — ۳۵۹، ۳۹۶

احمد شاہ ولی بہمنی — ۱۱

احمد نظام شاہ — ۳۵

احمد نگر — ۴۳، ۴۹، ۵۰، ۵۱، ۵۴، ۵۵، ۶۴، ۶۵، ۶۹، ۸۳ تا ۸۸، ۹۰، ۹۳ تا ۹۶، ۱۰۴، ۱۲۶ تا ۱۳۶، ۱۳۹، ۱۴۰ تا ۱۴۲، ۱۴۳، ۱۴۵، ۱۴۶، ۱۴۹، ۳۳۹، ۴۰۹، ۴۱۷، ۳۴۰، ۳۸۳

احوالِ حیدرآباد — ۳۲۲

اختر حسن — ۳۸۶

اخلاص خاں، حبشی — ۷۸، ۷۹

اخلاص خاں قزوینی — ۵۴، ۱۴۲، ۱۴۳، ۱۷۶، ۱۸۵

ادارہ ادبیات اردو — ۱۸، ۲۹، ۱۶۹، ۱۷۷، ۱۸۵، ۱۸۶، ۱۸۹، ۳۳۶، ۳۳۹، ۳۴۴، ۳۴۸، ۳۵۳، ۳۶۲، ۳۷۰

اُردو (رسالہ) — ۳۴۰، ۳۵۸

اُردو شہ پارے — ۳۸۳

ارکاٹ — ۳۵۱، ۳۷۶

ارکان — ۳۷۳

اڑکی — ۲۸۴

اسد خاں — ۳۱۳

اسد خاں لاری — ۵۶

اسٹرنہام — ۲۰۹

اسماعیل — ۱۴۰

اسلام خاں مشہدی — ۲۱۲

اسیر راؤ — ۱۵۶

اسیر گڈھ — ۱۴۵، ۳۱۸

اصفہان — ۱۵۱ تا ۱۵۳، ۲۱۵

اعتبار خاں یزدی — ۱۱۷، ۱۲۴، ۱۲۹

اعتقاد خاں — ۲۸۰

اعتماد راؤ — ۱۷۳، ۳۴۵

اغر خاں — ۱۸، ۵۸

اغرلوسلطان۔ ۱۲۹، ۱۳۰
افضل خاں۔ ۱۱۶، ۱۹۴، ۲۳۰
اکبراعظم۔ ۹، ۱۳۹، ۱۴۰، ۱۴۱، ۱۴۲،
۱۴۳، ۱۴۵، ۱۴۶، ۱۴۹،
۲۷۶، ۲۷۷، ۳۹۵، ۴۰۹،
۴۱۷
اکبرحسینی (بڑے صاحب) ۴۰۶
اکبرنامہ۔ ۱۴۲، ۱۴۴، ۱۴۵
اکل کوٹ۔ ۳۶۳، ۳۶۸
اکنا۔ ۲۰۷، ۲۰۸، ۲۳۷، ۲۴۶، ۲۴۷،
۲۵۲، ۲۵۵ تا ۲۵۸، ۲۶۸ تا
۲۶۹، ۲۷۸، ۲۸۲، ۲۸۳،
۲۸۹، ۲۹۰ تا ۲۹۲، ۲۹۵،
۳۲۸، ۳۴۹
اکنا مادنا کی کہانی۔ ۳۲۸
الف خاں (دیکھو امین الملک)!
اللہ قلی بیگ۔ ۲۰، ۲۲، ۲۶،
۵۸، ۱۲۰
الوند امیرزادہ۔ ۵۸
امام قلی بیگ۔ ۱۵۵
امجد الملک۔ ۱۲۴
امورخاں۔ ۱۲۳
امیر برید۔ ۲۴، ۵۱، ۱۲۰
امیر زنبیل۔ ۱۸۷
امیر حسن بیگ۔ ۲۱، ۲۲
امیر مہدی۔ ۱۳۰
امیر یعقوب۔ ۲۲، ۲۶
امین۔ ۴۰۱
امین الملک۔ ۱۲۹، ۵۲، ۱۸۴،
امین خاں۔ ۳۰۴
انباجی راؤ۔ ۲۶۸
اندرکنڈہ۔ ۹۰، ۱۰۴
اننت گری۔ ۲۳۷
اونتنکور۔ ۹۶
اودیھان سنگوہ۔ ۱۹۰
اودگیر۔ ۵۳، ۱۱۵
اورنگ آباد۔ ۹، ۱۴۹، ۲۷۷،
۳۱۷، ۳۲۱
اورنگ زیب عالمگیر۔ ۲۱۲ تا
۲۱۴، ۲۱۸، ۲۲۰ تا ۲۲۲،
۲۲۴، ۲۲۵، ۲۲۷ تا ۲۲۹،
۲۳۱، ۲۳۶، ۲۴۲، ۲۴۹،
۲۵۲، ۲۵۶، ۲۷۴، ۲۷۶،
۲۹۱، ۲۹۶، ۳۰۷، ۳۱۰،
۳۱۸ تا ۳۲۰، ۳۶۳،
۴۱۷، ۴۱۹، ۴۲۳
اڈیسہ۔ ۴۰، ۱۰۰، ۱۸۷
اوسہ۔ ۵۳
اویس (مولانا) ۱۵۱، ۱۷۶،
۳۴۵
اویس قلی۔ ۲۰، ۲۲، ۵۸
’’بنادابرہمنادک‘‘، ۱۰
ایران۔ ۱۷، ۱۹، ۲۱،
۲۴، ۱۲۷، ۱۲۹، ۲۱۵،
۲۱۷، ۲۷۶، ۳۴۱، ۳۴۲،
۳۶۲، ۳۶۸
ایشورداس۔ ۳۰۹، ۳۱۱
ایلچی بیگ۔ ۳۴۸
ایل گنڈل۔ ۳۵۱، ۳۷۴
ایلورہ۔ ۹۲، ۱۰۳، ۱۱۸، ۱۱
۳۵۱، ۳۷۵
ایوی۔ ۲۰۱

(ب)

بادشاہ بی بی۔ ۲۲۵، ۲۳۶،
۲۶۷
بادشاہ نامہ۔ ۱۸۱ تا ۱۸۴،
۱۸۷، ۱۸۸، ۱۹۰ تا ۱۹۵،
۲۱۸، ۲۲۹، ۳۱۴، ۳۴۴، ۴۳۵۔

باغ محمد شاہی — ۴۱۶
باقر خاں، نجم ثانی — ۱۸۷، ۱۸۸
بجواڑہ — ۲۵۹
بحری خاں، جلتہ الملک — ۶۹، ۷۸، ۷۹
بدنور — ۱۹۷
برار — ۳۴، ۸۰، ۸۹، ۹۶، ۱۳۲، ۱۳۵، ۱۴۰، ۲۴۹
برٹش میوزیم — ۳۵۸
بریئر — ۲۲۶، ۲۲۷، ۴۰۹
برلاس خاں — ۱۱۷
برہان پور — ۱۴۵، ۱۸۱، ۱۸۳، ۱۸۴، ۱۸۶، ۱۸۹، ۲۳۲، ۲۴۹، ۲۷۵، ۲۷۷، ۳۵۹
برہان عماد الملک — ۹۶
برہان قاطع — ۳۹۳
برہان مآثر — ۳۴، ۸۶، ۸۹، ۹۰، ۹۹، ۱۱۱، ۱۴۳، ۱۵۲، ۱۵۳
برہان، محمد حسین — ۳۹۳
برہان نظام شاہ اول — ۴۹ تا ۵۱، ۵۳، ۵۴، ۵۷، ۸۳، ۱۴۱
۱۴۳، ۳۸۳
برہان نظام شاہ ثانی — ۴۰۹
بساطین السلاطین — ۸۵، ۸۷، ۸۸، ۸۹، ۹۰، ۹۳ تا ۹۵، ۹۹، ۱۸۲، ۱۸۴، ۱۸۹، ۲۳۰ تا ۲۳۲، ۲۶۱، ۲۶۵، ۲۶۶، ۲۷۸، ۲۸۰
بسواپٹن — ۱۹۷
بغداد — ۱۹، ۳۲۲
بلقیس زماں — ۶۹
بلم کنڈہ — ۴۲
بلند رائے — ۱۱۷
بندہ نواز، خواجہ — ۲۹۶
بند صبا چلی — ۱۴۰
بنکاپور — ۱۹۷
بنگال — ۱۳۹، ۱۴۸، ۲۱۹، ۳۷۳
بہادر دل خاں — ۳۱۴
بہادر خاں — ۲۱۰، ۲۶۲، ۲۶۳، ۲۶۸، ۲۷۳، ۲۷۴، ۲۷۵، ۲۷۹، ۲۸۵
بہادر شاہ — ۴۵
بہادر علی خاں — ۲۹۱
بہادر گیلانی — ۳۰، ۳۱، ۳۵
بھاگ رتی — ۴۰۹
بھاگ متی — ۴۰۹، ۴۱۰، ۴۰۸
بھاگ نگر — ۱۶۴، ۴۰۹
بھاگیا — ۲۵۷
بھالے راؤ — ۱۱۷، ۱۵۶
بھالوجی پینسلو — ۲۵۷
بھدرا چلم — ۳۳۶، ۳۳۷، ۴۰۵
بھرمارامبیشور سوامی — ۲۳۶
بہرہ مند خاں — ۲۶۸، ۲۷۹
بہزاد الملک — ۱۳۶، ۱۳۷
بہلول خاں، عبدالکریم — ۲۶۱ تا ۲۶۷، ۲۷۴، ۲۸۱
بھوپال راؤ — ۲۱۱، ۲۵۷، ۲۵۸، ۲۶۰
بھونگیر — ۴۵، ۶۳، ۷۱، ۷۴، ۳۵۱، ۳۷۵
بھیما — ۸۶
بیدر — ۱۲، ۱۴، ۲۴، ۳۰، ۳۲، ۳۴، ۴۱، ۴۳، ۴۸، ۵۰ تا ۵۲، ۵۴، ۵۶، ۶۴

۸۹، ۹۶، ۱۱۰، ۱۱۹، ۱۲۰،
۱۳۵، ۱۳۶، ۱۹۰، ۲۲۸،
۲۹۶، ۳۱۵، ۳۳۳، ۳۶۳،
۳۸۱
بیجاپور — ۳۴، ۳۷، ۴۳، ۴۵،
۵۰، ۵۲، ۵۴، ۵۵،
۶۵، ۶۷، ۸۳، ۸۴، ۸۷،
۸۸، ۹۳، ۹۵، ۹۶، ۱۰۲،
۱۰۴، ۱۲۳، ۱۲۶، ۱۲۷،
۱۳۲، ۱۳۳، ۱۳۶، ۱۳۷،
۱۴۱، ۱۴۳، ۱۴۷، ۱۵۵،
۱۵۷، ۱۶۹، ۱۷۵، ۱۷۹،
۱۸۰، ۱۸۱، ۱۸۳ تا ۱۸۵،
۱۸۸ تا ۱۹۱، ۱۹۳، ۱۹۵ تا
۱۹۸، ۲۱۰ تا ۲۱۲، ۲۱۷ تا
۲۱۹، ۲۲۷ تا ۲۳۲، ۲۴۰،
۲۶۱ تا ۲۶۸، ۲۷۳، ۲۷۴،
۲۷۶ تا ۲۷۹، ۲۸۱، ۲۹۶،
۳۰۱، ۳۱۹، ۳۲۰، ۳۳۹ تا
۳۴۲، ۳۶۱، ۳۸۱، ۳۹۵،
۳۹۶
بیجانگر — ۳۵، ۶۳، ۷۱، ۷۳،
۳۵۱، ۳۷۵

بی بی جمال — ۸۹

(پ)

پاگری — ۱۳۹
پالونچہ — ۳۳۷، ۴۰۵
پانگل — ۴۲، ۴۳، ۷۵،
۷۷، ۸۶، ۹۰، ۳۵۱،
۳۵۴، ۳۷۵
پانی پت — ۱۳۹
پٹن چرو — ۵۲، ۴۰۳
پرتاب شاہ — ۱۲۳ تا ۱۲۵
پرتگال — ۳۷۱، ۳۷۲
پرویز، شہزادہ — ۱۴۶
پربنڈہ — ۱۵، ۱۸۳، ۱۸۴
پلکیشن ثانی — ۱۰
پلی کٹ — ۲۰۰، ۲۵۹، ۳۷۲
پناگنڈی تلگنا آریہ — ۴۰۳
پنجاب — ۳۶۸
پینگنڈہ — ۱۱۳، ۱۱۵،
۱۱۹، ۱۹۶، ۱۹۷، ۱۹۸
پوٹھوہر — ۱۲۱
پوڈلی لنگپا — ۲۰۸، ۲۰۹
پونا — ۱۸۳
پونا ملی — ۲۰۸

پھول بن — ۴۰۰
پیر قلی بیگ — ۲۰ تا ۲۲، ۵۸
پیگو — ۳۷۳
پیم گڈہ — ۱۸۴

(ت)

تاڈپلی — ۹۰
تاج خاں — ۷۸
تاج رضا خاں — ۱۲۲
تاخ خاں — ۹۲
تاریخ ادبیاتِ ایران — ۱۷، ۱۹
تاریخ اورنگ زیب — ۲۶۳،
۲۷۰، ۲۹۱، ۳۰۹، ۳۱۱
تاریخ جنوبِ ہند — ۱۹۶، ۱۹۷
تاریخ ظفرہ — ۲۲۵، ۲۲۶،
۲۵۳، ۲۷۲، ۳۵۱، ۳۵۳
۳۶۰، ۳۷۶، ۴۱۴، ۴۱۶،
۴۲۱
تاریخ فرشتہ — ۱۷، ۲۱، ۲۴،
۲۵، ۲۸ تا ۳۰، ۳۲، ۳۴،
۳۱، ۴۴، ۴۶، ۴۸،
۵۶، ۶۸، ۶۹، ۷۳، ۷۷،
۷۹، ۸۶، ۸۸، ۱۳۰،
۱۳۸، ۱۴۳، ۱۴۵، ۱۵۲،

۴۱۰، ۴۱۷
تاریخ قطب شاہی — ۷ تا ۳۰،
۳۲، ۳۶، ۳۷، ۴۳، ۴۳،
۴۵، ۴۶، ۵۳، ۵۷،
۶۲، ۶۴ تا ۶۷، ۶۹ تا ۷۱،
۷۴، ۷۶ تا ۷۹، ۸۶ تا ۹۲،
۹۵، ۹۶، ۹۹، ۱۰۲، ۱۰۵،
۱۰۹ تا ۱۱۱، ۱۱۴، ۱۲۳ تا
۱۳۵، ۱۴۲، ۱۴۴، ۱۵۴، ۱۵۸،
۱۶۰، ۱۶۱، ۱۷۱، ۲۳۸، ۲۴۲،
۳۶۳، ۳۸۵ تا ۳۸۷،
۳۸۸، ۴۱۹
تاریخ قطبیہ — ۲۵، ۳۶، ۳۷،
۷۹، ۸۰
تاریخ مرغوب القلوب — ۳۷
تاریخ مرہٹہ — ۲۲۵
تاریخ وجیانگر — ۹۷
تالیکوٹ — ۹۶، ۱۰۲، ۱۱۲،
۱۱۴، ۱۳۰، ۱۳۱، ۱۳۹،
۱۹۶، ۱۹۷
تاناشاہ (دیکھو ابوالحسن قطب شاہ)
تانڈور — ۲۹

تذکرہ اولیائے دکن — ۳۲۷
تذکرۃ الملوک خافی — ۲۰، ۲۳ تا
۲۶، ۲۷، ۳۴، ۷۳، ۷۹
ترکستان — ۱۷، ۱۸، ۲۱، ۲۴ تا
۲۷، ۳۳۳، ۳۳۴،
۳۶۰، ۳۸۱
تغال خاں — ۱۷، ۱۸،
۱۳۲، ۱۳۵
تلگو ادب کی تاریخ — ۳۰۳، ۳۰۵
تلنگانہ — ۹ تا ۱۱، ۱۳، ۱۴،
۲۸، ۳۰ تا ۳۲، ۳۵،
۳۰۴ تا ۳۱۴، ۳۲۰، ۳۲۳ تا
۳۳۵، ۳۵۹، ۳۶۶،
۳۶۷، ۳۸۲
تیمور صاحبقران — ۱۷، ۱۹
تناسرم — ۳۷۳
تنجور — ۱۹۷، ۲۱۰
تنگبھدرا — ۱۰، ۴۲، ۶۵،
۱۱۳
توزہ بیگ — ۱۸، ۵۸
توصیف نامہ — ۳۹۷
تھیونو سیاح — ۱۶۹، ۳۴۵،
۳۴۸، ۳۵۴، ۳۶۰،

۳۰۹، ۳۱۲، ۳۲۳
(ٹ)
ٹرپلی کین — ۲۰۴
ٹیورنیر سیاح — ۱۹۹، ۲۳۶،
۲۳۹، ۲۴۵، ۳۴۵،
۳۴۷، ۳۵۸، ۳۶۰،
۳۶۷، ۴۰۹، ۴۱۳،
۴۱۷، ۴۱۹
(ج)
جادو ناتھ سرکار — ۲۶۳،
۲۷۰، ۲۹۱، ۳۰۹
جالینوس الزماں — ۳۸۵
جامع مسجد — ۱۵۴
جام کھنڈی — ۳۱
جانثار خاں — ۲۸، ۳۸۲، ۳۸۷
جاں سپار خاں — ۳۱۴، ۳۱۵
جانی صاحبہ — ۲۹۰
جسونت سنگھ — ۲۳۰، ۲۶۱
جعفر خاں — ۲۵۸
جگپت راؤ — ۶۹، ۷۸،
۱۱۵، ۱۵۶
جگجیون داس، لالہ — ۲۳۷
جگدیو راؤ — ۵۳ تا ۵۴، ۶۹،

۷۰ تا ۷۲، ۷۴، ۷۹، ۸۰،
۸۹، ۹۰، ۱۰۲، ۲۲۷
جلمور — ۱۲۱، ۱۲۲
جمال الدین — ۳۹۲
جمال الدین محمد مکلی — ۳۹۳
جمشید (غلام) ۲۵۰، ۳۴۲، ۳۸۳
جمشید خاں — ۱۳۷، ۲۶۵،
۳۰۱
جمشید قلی قطب شاہ — ۳۴ تا
۵۸، ۶۱، ۶۳، ۶۶، ۶۷،
۷۵، ۸۳، ۲۲۷، ۲۹۷
جملۃ الملک — ۳۱۳، ۳۴۳
جُنیر — ۸۲ تا ۸۴، ۲۲۹
جوہر تبریزی، مرزا محمد — ۳۹۲
جوہر، غلام حسین — ۳۰۹
جہاں شاہ — ۱۷، ۱۹ تا ۲۱،
۲۳، ۲۵
جہانگیر — ۱۴۷، ۱۵۶، ۱۸۰
جے سنگھ — ۲۱۲، ۲۲۹ تا ۲۳۲
۲۶۰، ۲۷۴

(چ)

چار مینار — ۱۲، ۱۵۴، ۲۱۲،
۲۱۴، ۳۱۹
چاکن — ۱۸۳
چالوکیہ — ۱۰، ۱۱، ۳۹
چاند بی بی — ۹۶، ۱۳۴ تا ۱۳۶،
۲۳۲، ۲۴۰
چاند سلطان — ۱۵۷
چاند سلطانہ — ۱۲۸، ۱۳۸
چاند میاں — ۱۶۰
چتوڑ — ۱۰
چچلم — ۴۰۸، ۴۰۹، ۴۱۱،
۴۱۲
چک نائکن پلّی — ۲۸۱
چلبی رومی خاں — ۹۸
چنا پٹم — ۱۹۷، ۲۰۰، ۲۰۵
چنا پلی مرزا — ۲۰۶، ۲۰۷
چنار — ۱۰
چنتل پالم — ۴۰۲
چینجی — ۱۹۷
چندر گیری — ۱۹۶، ۱۹۷،
۱۹۹، ۲۱۴
چندہ خاں — ۱۴۳

(ح)

حاجی خاں — ۷۸
حافظ شیرازی، خواجہ — ۲۴، ۳۱۰
حبیب السیر — ۱۸، ۲۲
حبیب خاں — ۶۶
حدائق السلاطین — ۱۵۴،
۱۵۵، ۳۲۹
حدیقۃ السلاطین — ۱۸، ۱۵۶،
۱۶۹، تا ۱۷۱، ۱۷۳، تا ۱۷۷،
۱۸۵، ۱۸۶، تا ۱۹۰، ۱۹۲،
۱۹۳، ۲۰۲، ۲۰۳، ۳۳۶،
۳۳۹، ۳۴۱، ۳۴۳،
۳۴۴، ۳۴۵، ۳۴۸، ۳۵۳،
۳۵۹، ۳۶۲، ۳۷۰،
۳۸۸، ۳۹۲، ۴۲۱، ۴۴۲
حدیقۃ العالم — ۲۲ تا ۲۴،
۲۷، ۶۲، ۷۶، ۹۱، ۹۲، ۱۰۳ تا
۱۰۵، ۱۱۴ تا ۱۲۵، ۱۴۳،
۱۵۴، ۲۳۸، ۲۴۱، ۲۴۸،
۲۶۹ تا ۲۷۲، ۲۸۰، ۳۱۲،
۳۱۳، ۳۲۴، ۳۸۵،
۴۱۰، ۴۱۴، ۴۱۶
حسن بیگ — ۲۱، ۲۲، ۱۷۱،
۱۷۳، ۱۷۴
حسن خاں — ۹۰
حسن علی — ۱۱۷

حسن علی خاں — ۱۲۳
حسن علی سبزواری — ۱۳، ۳۰، ۳۲
حسین آباد — ۲۹، ۵۳
حسین آملی — ۳۹۲
حسین بیگ ترکمان — ۱۳۵
حسین بیگ قبچاجی — ۳۳۱
حسین ساگر — ۲۲۲
حسین شاہ ولی — ۱۰۳، ۳۶۱، ۴۲۴
حسین قلی — ۹، ۱۰ تا ۱۱۲، ۱۱۹، ۱۵۲، ۱۵۳، ۱۵۷، ۳۸۵
حسین معمور خاں — ۱۲۰
حسین نظام شاہ — ۸۳، ۸۴ تا ۸۹، ۹۵، ۹۷، ۹۸، ۱۰۲، ۱۳۱، ۱۴۰، ۱۸۲، ۱۸۳
حسینی بیگ — ۳۰۸
حکیم تبریزی — ۹۶
حکیم جبرئیل — ۱۷۶
حلیۃ القاری (ک) ۳۹۴
حمزہ استرآبادی، مرزا — ۳۹۲
حمید خاں حبشی — ۶۳، ۶۴، ۶۶ تا ۶۸، ۷۵، ۷۶
حیات آباد — ۲۳۵، ۴۲۵
حیات بخشی بیگم — ۱۲۳، ۱۲۸، ۱۳۰، ۱۵۷، ۱۶۱، ۱۷۱، ۱۷۲، ۱۷۶، ۱۷۷، ۲۲۵، ۲۳۵، ۲۳۸، ۲۴۴، ۳۶۳، ۴۱۰، ۴۲۴، ۴۲۵
حیات میر مومن (ک) — ۱۵۱
حیدر خاں — ۵۸
حیدر محل — ۳۰۸
حیدر قلی — ۴۴

(خ)

خافی خاں — ۲۳۹، ۲۴۷، ۲۵۶، ۲۷۱، ۲۷۲، ۲۷۵، ۲۷۸، ۲۸۰، ۲۸۳ تا ۲۸۸، ۲۹۰، ۲۹۲، ۲۹۶، ۳۰۰، ۳۰۲، ۳۰۸ تا ۳۱۲، ۳۱۴، ۳۱۶، ۳۱۷، ۳۳۱، ۳۵۷، ۴۰۹، ۴۱۰، ۴۱۷، ۴۱۴
خانِ جہاں لودی — ۱۴۶، ۱۸۰، ۱۸۱، ۲۸۲ تا ۲۸۴، ۱۸۸
خانخاناں عبدالرحیم — ۱۴۳، ۱۴۵
خانِ دوراں — ۱۹۲، ۲۱۲
خاندیس — ۱۳۱، ۱۳۴
خانم آغا — ۱۶۵، ۱۷۱
خدا بندہ خاں — ۱۲۰، ۱۲۲، ۱۲۳، ۳۳۲، ۳۹۲، ۳۶۳
خداداد محل — ۳۲۰
خداوند خاں — ۱۳۷، ۱۴۰
خدیجہ بیگم — ۲۰
خدیجہ دوراں — ۶۹
خدیجہ سلطانہ — ۱۳۸، ۱۶۹، ۲۳۱، ۲۳۲، ۳۹۶
خرم، شہزادہ (دیکھو شاہجہاں)
خطیب عبداللہ — ۳۹۳
خلد آباد — ۳۲۴
خلف حسن بصری — ۱۲، ۳۲، ۳۳
خلیل اللہ — ۲۳۷، ۲۷۹
خلیل اللہ بت شکن — ۱۱۰
خلیل اللہ خاں — ۲۱۱، ۲۶۳، ۲۶۷ تا ۲۶۹، ۲۷۰، ۲۸۷، ۲۷۹، ۲۸۳ تا ۲۸۴، ۲۸۸، ۳۰۶، ۳۴۹
خلیل سلطان — ۲۳
خلیل محمد — ۳۱۷
خواجہ احمد — ۱۷۳
خواجہ افضل ترکہ — ۱۸۷
خواجہ جہاں فخر الملک — ۳۱
خواجہ طاہر — ۱۹۴

خواجہ عابد — ۲۹۹
خواجہ عثمان — ۲۵۳
خواجہ علی شیرازی — ۱۲۸
خواجہ محمد — ۱۵۳
خواص خاں — ۲۳۰، ۲۳۱،
۲۶۱، ۲۶۲
خورشاہ بن قباد الحسینی — ۳۸۶
خورشید بی بی — ۱۶۹
خونزہ ہمایوں — ۱۳۳
خیرات خاں — ۱۲۰، ۱۲۴، ۳۴۱

(د)

دارا شکوہ — ۲۲۴، ۲۲۵
دار الشفاء — ۳۱۳
دانیال شہزادہ — ۱۴۵
دبیر، امین خاں — ۷
دربار آصف گز ۱۰۱ — ۱۱۰
درجات الرفیعہ (دک) — ۳۹۴
درگ — ۱۸۶
دسنا دیو — ۱۲۱
دستورِ دینار — ۴۱
دستور العمل قاضی عبد النبی — ۱۴۵
دلاور خاں — ۶۳
دلپت راؤ بندیلہ — ۳۰۳
دلیر خاں — ۲۶۳، ۲۶۴، ۲۶۷،
۲۸۱، ۳۷۴
دولت آباد — ۸۷، ۱۸۲ تا
۱۸۴، ۱۸۹ تا ۱۹۲، ۱۹۴،
۲۳۱، ۳۱۵، ۳۲۴
دولت خاں (دیکھو دولت قلی)
دولت قلی — ۴۴، ۴۵، ۴۹،
۵۸، ۶۳، ۷۰، ۷۴، ۹۰
دوم کنڈہ — ۴۰۵
دیار بکر — ۲۱
دیو رائے — ۳۹
دیورکنڈہ — ۴۱، ۴۳، ۶۳، ۶۵،
۵۰، ۶۲، ۱۱۰، ۳۵۱، ۳۷۵،
۴۰۲
دیوگڈہ — ۲۲۰
دہارور — ۴۳، ۱۳۴، ۱۸۱
دھرمار اؤ — ۱۲۲، ۱۵۶
دھول پیٹ — ۲۸۶

(ر)

راجپوتانہ — ۱۳۹، ۲۷۵
راجمندری — ۴۱، ۴۳، ۹۰،
۹۲، ۹۹، ۱۰۳، ۱۱۴،
۱۱۸، ۱۳۴، ۱۸۷، ۳۵۱،
۳۶۷، ۳۷۶
راجہ علی خاں — ۱۴۱،
۱۴۴، ۱۴۵
راما نج راؤ، ڈی — ۴۰۳، ۴۰۵
رام چندر — ۴۲، ۱۱۸
رام درہ — ۲۷۷
رام راج — ۵۶، ۶۵ تا ۷۵،
۷۶، ۸۵ تا ۹۷، ۱۱۴،
۱۱۵، ۱۹۲، ۱۹۸
رام گیر — ۲۲۶، ۳۸۳
راگھون — ۴۰۶
راوت راؤ — ۱۲۱
رائچور — ۹۶، ۹۹
رائے راؤ — ۱۱۲
رچرڈ موہن — ۲۰۶
رحیم داد خاں — ۱۱۴
رزاق علی — ۳۱۷
رسالہ مقداریہ — ۱۵۱
رستم خان — ۱۱۶، ۱۱۷،
۱۸۲، ۳۰۳
رستم راؤ — ۱۱۶، ۲۶۴،

۲۸۲، ۲۸۳، ۲۸۵، ۲۹۱

رستم راؤ بیگنا — ۲۶۹

رضا قلی — ۲۰۲

رضی الدین شاہ — ۲۳۰

رفعت خاں لاری — ۹۲، ۱۰۲

رقعاتِ عالمگیری — ۱۹۹، ۲۱۳، ۲۲۰ تا ۲۲۲، ۳۶۴

رندولہ خاں — ۱۸۳، ۱۸۴، ۱۹۷، ۱۹۸

رنگیا مستری — ۳۱۹

رحمت خاں — ۳۰۷

روح اللہ خاں بخشی — ۳۰۰، ۳۰۵، ۳۰۷، ۳۰۹، ۳۱۰

رونقی — ۱۷۱، ۳۹۲

ریاض السالکین — ۲۹۴

(ز)

زبردست خاں — ۱۲۴

زبیری — ۸۹، ۹۴، ۱۸۲، ۱۸۴، ۲۳۲

زمان خاں — ۱۸۱

زنبیل مصطفیٰ خاں، امیر — ۱۲۹، ۱۳۷، ۱۸۷

زور، محی الدین قادری، سید — ۱۱۲ تا ۱۲۵، ۱۳۰، ۱۵۱، ۱۵۳، ۱۵۶، ۳۶۲، ۳۶۳، ۳۸۳، ۳۹۸، ۴۰۳، ۴۰۴

زین العابدین آملی — ۳۹۳

زین العابدین، میر — ۱۱۷، ۱۱۸، ۱۲۱، ۱۲۲، ۱۵۶، ۲۸۸

زینت ساجدہ — ۴۰۳، ۴۰۵

(س)

ساب خاں — ۹۰

ساباجی — ۱۱۷

سارنگ تمیا لاریڈی — ۴۰۵

سارو راؤ — ۹۲

ساماجی — ۱۵۶

سان تھوم — ۲۰۰، ۲۰۱، ۲۰۳، ۲۰۶، ۲۳۴، ۳۷۲

سبا راؤ — ۳۰۲

سبحان قلی — ۵۸، ۶۹، ۷۳، ۷۴، ۷۸، ۷۹، ۱۰۰

سپ رس — ۳۹۹

سدی پیٹ — ۲۳۷

سدی تمیا — ۹۰

سدی بوٹ — ۱۹۹، ۲۱۶، ۳۶۶

سدی جوہر — ۲۶۴

سدی مسعود — ۲۶۷

سراج — ۱۷۱

سربراہ خاں — ۳۰۱

سرو ما — ۲۹۰

سری رنگ پٹن — ۱۹۷

سری رنگ رائل — ۱۹۹ تا ۲۰۱، ۲۱۴، ۲۱۸

سری تمیا — ۹۰

سری رام — ۳۰۵

سرنیگارا منجری (ک) ۳۰۶

سعادت خاں — ۲۹۵ تا ۲۹۷

سعادت علی رضوی میر — ۸۵، ۳۴۲

سفرنامہ برنیئر — ۲۲۸

سفرنامہ فرائر — ۲۴۴

سفرنامہ منوچی — ۲۰۲، ۲۱۵، ۲۱۶، ۲۲۶، ۲۳۷

سکندر امیرزادہ — ۵۸

سکندر ثانی — ۱۷، ۱۹، ۲۰، ۲۵

سکندر عادل شاہ — ۳۶۱، ۲۶۷ تا ۲۷۹، ۳۱۳، ۳۳۲

سکاکول — ۹۰، ۱۱۳، ۱۱۴، ۱۹۸

سگریو وجنم (دک) ۴۰۲
سدا فتہ العصر (دک) ۳۹۴
سلطان خوارزم ۔ ۱۸
سلطان قلی، قطب الملک ہمدانی ۔ ۲۰ تا ۲۴،
۲۶ تا ۲۹، ۳۱، ۳۵
سلطان قلی قطب شاہ (قطب شاہی بانی سلطنت)
۱۲، ۱۳، ۱۷، ۴۰، ۴۱، ۴۳،
۴۴، ۴۶، ۴۸، ۵۷، ۵۸، ۶۱،
۸۰، ۲۳۸، ۲۶۱، ۳۸۱، ۳۹۷
سلطان محمد قلی قطب شاہ (دک)
۱۱۳ تا ۱۲۵، ۱۳۰،
۱۵۳، ۱۵۶
سلطان محمود ۔ ۳۱، ۳۶، ۴۳
سلطان مرزا ۔ ۱۱۱، ۱۱۶
سلطان نگر ۔ ۱۶۴
سلوات الغریب (دک) ۳۹۴
سمندر بیگ ۔ ۲۸۵
سینھاجی ۔ ۲۷۳ تا ۲۷۵،
۲۷۸، ۲۸۰، ۲۸۱، ۳۰۱،
۳۲۵
سنجر خاں ۔ ۷۸، ۱۱۵، ۱۱۶،
۲۰۷، ۲۶۴
سنگر آچاریہ ۔ ۴۰۲، ۴۰۳

سوریجی مادھو رایا ۔ ۴۰۵
سوریا پرکاش راؤ ۔ ۲۵۶
سیاحت نامہ تھیونو ۔ ۱۲۹،
۲۳۷، ۳۴۸، ۳۵۲،
۳۵۳، ۳۵۶، ۳۵۷،
۳۶۷، ۳۶۸، ۳۷۰، ۴۱۹
سیاحت نامہ ٹیورنیر ۔ ۱۹۹،
۲۱۷، ۲۲۱، ۲۲۴، ۲۲۶،
۲۳۶، ۲۳۷، ۲۳۹،
۳۴۵، ۳۴۶، ۳۴۸،
۳۵۶، ۳۶۰، ۳۶۵،
۳۶۷، ۳۶۸، ۴۱۷
سید آباد ۔ ۱۵۱
سید احمد ۔ ۱۳۷ تا ۱۳۹،
۲۲۱، ۲۲۴، ۲۳۵،
۲۳۶، ۲۴۰ تا ۲۴۲،
۲۴۴، ۲۶۵، ۳۳۲،
۳۹۳
سید الیاس ۔ ۲۳۱
سید جی ۔ ۷۶
سید جی سلحدار ۔ ۶۳، ۶۴،
۶۶، ۶۸، ۷۵
سید حسن ۔ ۱۲۲، ۳۹۳

سید حیدر ۔ ۱۲۴
سلیم خاں ۔ ۳۰۱
سید سلطان ۔ ۲۰۴، ۲۲۴،
۲۴۳، ۲۴۹
سید علی ۔ ۲۴۹
سید محمد ۔ ۳۹۳، ۴۰۰
سید مخدوم ۔ ۲۷۸
سید مرتضےٰ ۔ ۱۳۴، ۱۳۷،
سید مظفر ۔ ۲۰۶، ۲۰۷، ۲۴۴،
۲۴۶ تا ۲۴۹، ۲۵۲،
۲۵۴ تا ۲۵۸، ۲۷۲، ۲۹۳،
سید ہاشم ۔ ۲۵۶، ۲۷۲
سیدم ۔ ۲۸۳ تا ۲۸۵،
۲۸۹، ۲۹۴
سیف الملوک بدیع الجمال ۔ ۴۰۰
سیف خاں عین الملک ۔ ۶۹ تا
۷۱، ۱۷۴، ۲۲۷، ۲۳۸
سینٹ جارج ۔ ۲۰۹
سینٹ طامس ۔ ۲۰۰
سیکاکول ۔ ۳۵۱، ۳۵۶
سیلون ۔ ۳۷۳
سین گڈھ ۔ ۲۲۹
سیواجی بھونسلہ ۔ ۱۸۳، ۲۱۰،

۲۱۱، ۲۲۹ تا ۲۳۱، ۲۵۳،
۲۶۲، ۲۶۴، ۲۶۷، ۲۷۳،
۲۷۴، ۲۸۱، ۳۱۹

(ش)

شاہ جہاں - ۷۴، ۱۵۴، ۱۵۵،
۱۸۰، ۱۸۱ تا ۱۸۹، ۱۹۲،
۱۹۳، ۲۱۲، ۲۱۴، ۲۱۸،
۲۲۴، ۲۲۶، ۲۷۵، ۲۷۸،
۳۳۶، ۲۰۳۶، ۴۲۷
شاہ جہاں آباد - ۳۱۸
شاہ جی - ۱۸۳، ۱۸۴، ۱۸۹،
۱۹۸، ۲۱۰
شاہ چراغ - ۱۱۴
شاہ خواندکار - ۱۵۷
شاہ درگ - ۱۳۶، ۱۳۸
شاہ راجو - ۱۲۳، ۲۴۰، ۲۴۳،
۲۴۵، ۲۱۰، ۳۲۶، ۳۲۷،
۳۶۳
شاہ راجو ثانی - ۴۰۶
شاہ رخ مرزا - ۱۷، ۱۹، ۱۴۳
شاہ زادہ الوند - ۲۰
شاہ زادہ محمد - ۲۱
شاہ زادہ یوسف - ۲۱

شاہ طاہر - ۶۴، ۶۵
شاہ عالم - ۲۶۸، ۲۸۲،
۲۹۱، ۲۹۲، ۲۹۸، ۲۹۹
شاہ علی - ۱۸۷
شاہ علی بیگ - ۱۸۸، ۱۳۹
شاہ قاضی - ۱۷۵
شاہ محمد انجلو، امیر - ۱۰۳،
۱۳۵، ۳۸۵
شاہ محمد، عرب - ۱۷۲، ۱۷۵
شاہ میر - ۱۲۹، ۱۳۶، ۱۳۷،
۱۵۲، ۱۵۳، ۴۱۰
شاہ میر اصفہانی - ۱۵۱
شاہ میراں جی - ۳۹۵
شاہ میر طباطبا - ۱۱۱، ۱۱۲،
۱۵۱، ۴۱۰
شاہ نواز خاں - ۲۱۲
شاہ یوسف - ۱۶۰
شاہی - ۴۰۱
شائستہ خاں - ۱۸۴، ۲۱۲،
۲۲۵، ۲۳۰
شتاب خاں - ۹۰، ۹۲
شجاع - ۲۱۹
شجاع الملک - ۱۹۲
شرزہ خاں - ۲۳۱، ۲۳۲

شریف الملک - ۲۸۸
شفقت خاں - ۵۴
شفیق، لچھمی نارائن - ۳۲۱
شکر بی بی - ۴۰۳
شمشیر خاں - ۲۱۱
شنگرم - ۷۱
شوار - ۳۷۷
شولاپور - ۵۰، ۵۱، ۵۶،
۸۳، ۱۳۸، ۲۷۹، ۲۸۱، ۲۹۱
شیخ سعدی - ۳۲۲
شیخ محمد - ۹۰، ۳۴۲
شیخ محمد ابن خاتون - ۱۵۱، ۱۷۲،
۱۷۳، ۱۷۵، ۱۷۶، ۱۸۶،
۱۸۸، ۱۸۹، ۱۹۳، ۳۹۲
شیخ محمد حکیم الملک - ۳۹۳
شیخ محمد طاہر - ۴۳۴
شیخ محمد نقشبندی - ۳۱۲
شیخ منہاج - ۲۶۴، ۲۸۲،
۲۸۴ تا ۲۸۶، ۲۹۲، ۲۹۸
شیخ نظام - ۳۰۰
شیخ ہارون - ۳۹۲
شیراز - ۳۴۹
شیر خاں - ۹۰

(ص)

صاعدی، نظام الدین ـ ۱۸۷ تا
۱۸۹، ۱۹۰، ۳۳۶، ۳۴۴،
۳۴۸، ۳۶۲، ۳۷۰

صفدر خاں ـ ۲۸۰

صف شکن خاں ـ ۲۹۸، ۳۰۰،
۳۰۱، ۳۰۷

صلابت خاں ـ ۶۹، ۷۳، ۷۴،
۷۷، ۹۹، ۱۳۳، ۲۳۰، ۲۶۴

(ض)

ضیاء الدین محمد، نیشاپوری ـ ۱۲۹

(ط)

طاہر محمد خاں ـ ۱۱۴، ۱۱۹

طبعی ـ ۴۰۱

طوطی نامہ ـ ۴۰۰

(ظ)

ظریف الملک ـ ۱۳۴

ظل اللہ ـ ۳۸۸، ۳۸۹

ظل اللہ گورہ ـ ۳۳۶

(ع)

عادل خاں ـ ۱۱۸

عالمگیرنامہ ـ ۲۷۲، ۳۲۴

عالی، نعمت خاں ـ ۲۸۹، ۲۹۵

۳۰۰، ۳۰۲، ۳۰۵،
۳۲۲، ۳۲۳

عباس صفوی، شاہ ـ ۱۲۹،
۱۷۳، ۲۰۲

عبدالجبار خاں آصفی ـ ۳۲۷

عبدالجبار گیلانی ـ ۳۹۲

عبدالصمد ـ ۲۶۱

عبدالحمید لاہوری ـ ۱۸۱ تا
۱۸۴، ۱۸۷، ۱۹۰ تا
۱۹۵، ۲۱۸، ۴۲۹، ۴۳۱، ۴۳۴،
۴۳۲، ۴۳۵

عبدالرحمٰن، میر ـ ۲۵۳

عبدالرسول ـ ۱۸۳

عبدالحق ـ ۳۹۴

عبدالرزاق ایرانی ـ ۶۷

عبدالرزاق لاری ـ ۲۹۸،
۳۰۳، ۳۰۷، ۳۰۸،
۳۱۶ تا ۳۱۸

عبدالفتح مرزا ـ ۱۰۹، ۱۱۰،
۱۵۷، ۳۶۱

عبدالقادر ـ ۳۱۷

عبدالقادر شاہ ـ ۱۰۹،
۱۱۲، ۱۱۹، ۱۲۰، ۱۲۳،
۱۵۷، ۳۶۱، ۳۶۲

عبدالکریم ـ ۴۳، ۴۵،
۵۸، ۶۵، ۳۱۳، ۳۱۷

عبداللطیف شیخ ـ ۳۹۲

عبداللطیف گجراتی ـ ۱۹۱،
۱۹۲، ۲۱۸

عبداللطیف ملا ـ ۴۲۸، ۴۳۰

عبدالمجید خاں ـ ۲۳۶،
۲۴۵، ۳۹۴

عبداللہ ـ ۲۴۷، ۴۲۸

عبداللہ خاں ـ ۱۴۶،
۱۸۵، ۱۸۷

عبداللہ خاں بارہہ ـ ۲۸۰،
۲۸۳، ۲۹۹، ۳۱۶

عبداللہ خاں پنی ـ ۳۰۶، ۳۰۸،

عبداللہ قاضی ـ ۳۲۰

عبداللہ قطب شاہ ـ ۱۵۵،
۱۵۷، ۱۶۴، ۱۶۸، ۱۶۹،
۱۷۰، ۱۷۲، ۱۷۳،
۱۷۵ تا ۱۷۷، ۱۸۵،
۱۸۶، ۱۸۸، ۱۹۲ تا ۱۹۴،
۱۹۸، ۲۰۰ تا ۲۰۲، ۲۰۶،
۲۰۷، ۲۱۴، ۲۱۷،
۲۱۹ تا ۲۲۱، ۲۲۳ تا
۲۲۸، ۲۳۱ تا ۲۳۳،

۲۳۵ تا ۲۴۱، ۲۴۳ تا ۲۴۶،
۲۴۹، ۲۵۲، ۲۵۸، ۲۹۰،
۳۲۶، ۳۳۲، ۳۳۶، ۳۳۰،
۳۳۸، ۳۴۱، ۳۴۳ تا ۳۴۵،
۳۴۷، ۳۴۸، ۳۵۲ تا
۳۵۴، ۳۵۹، ۳۶۰، ۳۶۳،
۳۶۶، ۳۶۷، ۳۷۱، ۳۷۴،
۳۸۰، ۳۸۶، ۳۹۲، ۳۹۳،
۳۹۶، ۳۹۸، ۴۰۰، ۴۰۱،
۴۲۱، ۴۲۲، ۴۲۵،
۴۲۷، ۴۲۹، ۴۳۴
عبداللہ مرزا (دیکھو عبداللہ قطب شاہ)
عجم — ۲۴
عراق — ۱۹، ۲۳
عرب — ۱۹
عرب خاں — ۹۰
عرب شاہ محمد — ۱۰۷
عرب شیرازی — ۱۰۵
عزیز الملک — ۹۳
عزیز خاں — ۹۰، ۳۰۱
عطاء اللہ — ۲۵۷
علاء الدین ثانی — ۱۲، ۳۳
علاء الدین حسن بہمنی — ۱۱
علاء الدین طباطبا، میر — ۱۵۸
علائی، میر مجد الدین — ۳۹۲
علم خاں — ۷۸، ۱۱۷، ۱۲۱
علی اصغر بلگرامی — ۲۰۰، ۲۰۲،
۲۲۴، ۲۲۷، ۲۵۰
علی برید — ۶۴، ۶۵، ۸۹، ۹۱،
۹۶، ۹۷، ۱۳۵، ۱۳۶
علی بن عزیز اللہ — ۸۴
علی بن طیفور بسطامی — ۱۵۴،
۲۰۲، ۳۲۹، ۳۹۲
علی بن معصوم، سید — ۳۹۳
علی حسینی — ۳۹۴
علی خاں لُر — ۱۱۴، ۱۱۹، ۲۲۷
علی شبر، میر — ۲۱
علی عادل شاہ (اول) — ۸۷، ۸۹،
۹۰، ۹۱، ۹۳، ۹۵ تا ۹۷،
۱۰۲، ۱۳۱ تا ۱۳۶،
علی عادل شاہ (دوم) — ۲۳۰ تا ۲۴۲،
۲۶۱، ۳۱۹، ۳۹۶
علی قلی — ۲۲
علی نامہ — ۲۳۰
عماد الدین شیرازی — ۱۰۰، ۳۸۵
عماد شاہ — ۵۳
عمدۃ الملک — ۴۳۴
عمل صالح (دکن) — ۲۱۶، ۲۱۸،
۲۲۰، ۲۲۱، ۲۲۵، ۲۲۶
عمان — ۱۹
عنایت خاں — ۳۱۳، ۳۳۲
عنبر خاں — ۶۸
عنایت اللہ — ۱۰۲
عین الملک (کنعانی) — ۵۲ تا
۵۴، ۵۷، ۶۷، ۶۸، ۷۱ تا
۷۳، ۷۸ تا ۸۰، ۸۹، ۹۰،
۱۰۲، ۱۹۲، ۱۳۴، ۲۲۷،
۲۳۸، ۳۴۶

(غ)

غازی الدین خاں (فیروز جنگ)
۳۰۳
غازی خاں — ۱۲۰
غلام حسین — ۲۳۸
غلام علی مرزا — ۴۰۱
غلام یزدانی — ۳۴۰، ۳۵۸
غواصی — ۳۹۵ تا ۳۹۷، ۴۰۰
غیاث الدین بلبن — ۱۰۴
غیاث الدین قاسمی، مُلّا — ۹۶

(ق)

قاکس — ۳۰۴

قائمہ ۔ ۳۰۱
فتح الملک ۔ ۱۲۳
فتح اللہ سمنانی، ملا ۔ ۳۹۲
فتح اللہ شیرازی ۔ ۱۴۰
فتح اللہ عماد الملک ۔ ۳۱
فتح پور سیکری ۔ ۳۱۷
فتح خاں ۔ ۱۸۰، ۱۸۲، ۱۸۳، ۱۸۸
فخر الملک ۔ ۱۲۹
فرائر (مورخ) ۔ ۲۳۴، ۲۷۹
فرگاٹن، امیر ۔ ۹۹
فضل اللہ شیرازی ۔ ۳۹۲
فلک نما ۔ ۳۱۶
فیروز ۔ ۳۹۷
فیروز جنگ ۔ ۲۹۸، ۳۰۰، ۳۰۳، ۳۰۵
فیروز شاہ بہمنی ۔ ۱۱، ۲۴
فیض اللہ بیگ ۔ ۳۱۹
فیضی ۔ ۱۴۲، ۳۹۵، ۴۰۹

(ق)

قاسم برید ۔ ۳۱، ۳۴
قاسم بیگ ۔ ۹۶، ۱۷۱، ۱۷۳، ۱۷۴، ۳۴۱
قاسم بیگ شیرازی ۔ ۳۸۵
قاسم طبسی ۔ ۳۸۵
قاسم علی سجن لال ۔ ۲۵۷
قاسم کوٹ ۔ ۱۰۰، ۱۱۷، ۱۱۸، ۱۱

۱۳۴، ۱۸۷، ۱۸۸
قاضی سمنانی ۔ ۱۶۰، ۳۸۶
قرا بیرم ۔ ۵۸
قرا تورامش ۔ ۵۸
قرا تورسن ۔ ۵۸
قرا خاں ۔ ۱۸، ۵۸
قرا محمد ۔ ۵۸
قرا منصور ۔ ۵۸
قرا یوسف ۔ ۱۷ تا ۱۹، ۲۵، ۵۸
قطب الدین ۔ ۴۴ تا ۴۷، ۵۸، ۶۳
قطب الدین نعمت اللہ ۔ ۱۷۰، ۳۸۸
قطب الملک ۔ ۳۱
قطب الملک ہمدانی (دیکھو سلطان قلی قطب شاہ)
قطب شاہ آباد ۔ ۱۲۲
قطب مشتری ۔ ۱۱۳، ۳۹۹، ۴۰۸
قلیچ خاں ۔ ۲۹۹
قلی خاں مرزا ۔ ۱۹۴
قلی مرزا ۔ ۱۵۷، ۱۶۹

قنبر علی، حاجی ۔ ۱۳۰، ۳۴۱
قندھار ۔ ۵۵، ۱۳۹، ۱۸۱، ۱۸۴، ۱۸۷، ۲۱۳، ۲۲۰
قوام الدین ۔ ۲۵۳

(ک)

کابل ۔ ۱۳۹، ۳۵۹
کارومنڈل ۔ ۲۰۰، ۲۰۱، ۲۰۳، ۳۶۴، ۳۷۱
کاشف الاسرار ۔ ۳۹۲
کاکتیا ۔ ۱۱
کاکن ۔ ۱۰۰، ۱۳۷،
کالا پہاڑ (کھیرا پارہ) ۱۸۷
کاماجی ۔ ۶۴
کام بخش، محمد ۔ ۳۰۴، ۳۲۳
کبر بن المدنی ۔ ۳۹۳
کتب خانہ آصفیہ ۔ ۲۰
کتب خانۂ ادارۂ ادبیات اردو ۔ ۳۲۴
کتب خانۂ سالار جنگ ۔ ۲۰، ۳۰۲، ۳۸۵، ۳۸۶، ۳۸۸، ۳۸۹، ۴
کتب خانۂ سجن لال ۔ ۳۳۷
کدھبا ۔ ۱۰
کرافٹ ۔ ۲۰۴
کرشنا ۔ ۱۰، ۲۴، ۸۶، ۹۷، ۱۱۵، ۱۳۳، ۳۳۶، ۳۶۴، ۳۶۷

کرشنا سنگھ - ۲۹۹
کرشنا سوامی آینگار - ۹۷
کرناٹک - ۱۱، ۱۴، ۱۷، ۱۱۹، ۱۹۶ تا ۱۹۹، ۲۰۱، ۲۰۲، ۲۰۴، ۲۰۵، ۲۰۷، ۲۱۰، ۲۱۱، ۲۱۴، ۲۱۵، ۲۱۷، ۲۱۸، ۲۳۴، ۲۵۲، ۲۵۵، ۲۵۹، ۲۶۹، ۲۸۱، ۳۲۱، ۳۴۳ تا ۳۵۲، ۳۵۸، ۳۵۹، ۳۶۶، ۳۶۷، ۳۷۶
کریم نگر - ۱۷
کڑپہ - ۱۹۹، ۲۱۶، ۳۶۶
کڑنگل - ۲۹، ۳۸
کشتم راج - ۱۲۱، ۱۲۲
کشمیر - ۱۳۹
کشن رائے - ۱۴
کشور خاں - ۱۰۲
کشور خاں لاری - ۹۸، ۱۳۴
کشور سنگھ - ۲۹۹
کلام الملوک - ۵۸، ۳۳۲
کلپاگور - ۵۲
کلکور - ۱۰۰، ۱۱۴، ۱۳۷، ۱۹۸
کلیات غواصی - ۳۶۳
کلیاتِ محمد قلی قطب شاہ - ۹۸، ۳۰۰، ۳۴۴
کلیان - ۸۳، ۸۷، ۸۹
کلیانی - ۲۲۸

کلیم، ابو طالب - ۳۹۵
کمال الدین ماژندرانی - ۱۲۴، ۱۴۷، ۳۸۸
کمال الدین، سید - ۱۵۸
کمال مرزا - ۱۵۷، ۱۶۹
کمبم - ۱۹۹
کندی کوٹہ - ۱۱۳، ۱۱۵، ۱۱۶، ۱۲۵، ۱۹۸، ۱۹۹، ۳۶۶، ۳۶۷
کندی کوری رُدراکوئی - ۴۰۲
کنڈہ پلّی - ۱۱۴، ۳۶۷
کنزاللغات - ۲۰
کوکلتاش - ۲۶۲، ۲۶۸، ۲۷۳، ۲۷۴، ۲۸۲، ۲۸۳
کوکن - ۵۶، ۱۸۴
کولاس - ۱۰، ۵۳، ۵۴، ۱۳۵، ۳۵۱، ۳۷۴
کولور - ۳۶۶، ۳۶۷
کوندھانہ - ۱۳۴
کونڈبیر - ۴۲، ۱۰۰، ۲۸۱، ۳۵۴، ۳۵۹
کونڈپلّی - ۸۸، ۲۵۹، ۲۸۱، ۳۵۱، ۳۵۴، ۳۵۹
کوہِ طور - ۲۱۶
کوئل کنڈہ - ۴۲، ۴۳، ۴۷ تا ۸۰، ۹۰، ۱۳۳، ۳۵۱، ۳۵۴

۳۷۵
کومیر - ۱۰، ۶۵، ۲۸۴، ۲۹۰
کھم مبٹ - ۴۲، ۳۵۱، ۳۵۴، ۳۷۱، ۳۷۵
کیسری راؤ - ۹۰
کیقباد - ۱۹، ۲۰

(گ)

گاویل - ۱۳۲
گجرات - ۳۰، ۳۹، ۳۹۵، ۳۹۶
گجھوتی - ۱۹۵
گڈسی پیرم - ۲۸۳، ۲۸۵
گرانڈف (مورخ) ۲۲۵
گردھاری لال احقر - ۲۲۵، ۲۲۶، ۲۷۲
گلبرگہ - ۱۴، ۴۸ تا ۸۶، ۱۱۰، ۲۶۳، ۲۶۴، ۲۶۷، ۲۹۶، ۲۹۷، ۳۳۳، ۳۶۱، ۳۸۱
گلزار آصفیہ - ۲۳۹، ۲۴۲، ۲۴۳، ۳۲۳
گنٹور - ۹۰، ۱۴۱، ۱۱۶ تا ۱۱۸، ۳۵۱
گندی کوٹہ - ۲۱۶
گنگا - ۱۰
گنگا دھر - ۴۰۲
گوا - ۱۲۹، ۲۱۶
گوپنا رام داس - ۳۳۷

گوداوری۔۔۱۰، ۴۲، ۱۱۳، ۱۱۴،
۱۴۳، ۳۳۶، ۳۷۱
گوشہ محل۔ ۳۲۳
گولکنڈہ۔ ۹، ۱۳، ۱۷، ۲۰، ۲۱،
۲۵، ۲۹، ۳۲، ۳۹، ۴۰تا
۴۵، ۴۹تا ۵۷، ۶۱تا ۶۵،
۷۰، ۷۱، ۷۳، ۷۵تا ۸۴،
۴۹تا ۵۷، ۶۱تا ۶۵، ۷۰، ۷۱،
۷۳، ۷۵تا ۷۷، ۶۱تا ۶۵،
۷۰، ۷۱، ۷۳، ۷۵تا ۷۷،
۷۹تا ۸۱، ۸۴تا ۸۶، ۸۸،
۹۰تا ۹۲، ۹۴، ۹۹تا ۱۰۱،
۱۰۳، ۱۰۴، ۱۰۹، ۱۱۰، ۱۱۵، ۱۱۶،
۱۱۹تا ۱۲۱، ۱۲۳تا ۱۲۹،
۱۳۲تا ۱۳۷، ۱۴۱، ۱۴۳،
۱۴۴، ۱۴۶تا ۱۴۸، ۱۵۰، ۱۵۲،
۱۵۳، ۱۵۸تا ۱۶۱، ۱۶۳،
۱۶۹، ۱۷۲تا ۱۷۴، ۱۷۶، ۱،
۱۷۹، ۱۸۰، ۱۸۴تا ۱۹۳،
۱۹۵تا ۱۹۷، ۲۰۳، ۲۰۹تا
۲۱۵، ۲۱۷، ۲۲۱تا ۲۲۳،
۲۲۶تا ۲۲۸، ۲۳۱، ۲۳۶، ۲۳۹،
۲۴۱تا ۲۴۴، ۲۴۸تا ۲۵۰،
۲۵۴، ۲۶۲، ۲۶۵تا ۲۶۷، تا
۲۶۹، ۲۷۲، ۲۷۴تا ۲۷۶، ۲۷۶تا
۲۸۱، ۲۸۳، ۲۸۵، ۲۸۶تا ۲۸۷،
۲۹۰، ۲۹۱، ۲۹۳تا ۲۹۷،
۳۰۱، ۳۰۲، ۳۰۴، ۳۰۵،
۳۱۳، ۳۱۴، ۳۱۸تا ۳۲۲،
۳۲۵، ۳۲۷، ۳۲۹، ۳۳۴،
۳۴۰تا ۳۴۲، ۳۴۷، ۳۴۹، ۳۵۲،
۳۵۴، ۳۵۵، ۳۵۷، ۳۵۹،
۳۶۰، ۳۶۲، ۳۶۴تا ۳۶۶،
۳۶۸تا ۳۷۱، ۳۷۶، ۳۷۷،
۳۸۱، ۳۸۳، ۳۹۳، ۳۹۴،
۳۹۶، ۴۰۵، ۴۰۸، ۴۱۰، ۴۱۱،
۴۱۴، ۴۱۷، ۴۱۹تا ۴۲۱، ۴۲۴، ۴۳۰
گولکنڈے کے تعلقات (دکن) ۳۳۵،
۳۵۰، ۳۵۴، ۳۵۵، ۳۵۷،
۳۶۰، ۳۶۲، ۳۶۵تا ۳۷۴،
۳۷۶تا ۳۷۹، ۳۸۲، ۳۹۴،
۴۱۷، ۴۲۴
گولکنڈے کے عربی شعراء (دکن) ۲۳۶،
۲۴۵
گھنپورہ۔ ۲۴، ۷۸، ۷۹، ۹۰،
۱۳۳، ۳۵۱، ۳۵۴، ۳۷۵

(ل)

لاہور۔ ۵۹، ۳۶۸، ۴۱۷، ۴۱۸
لطیف۔ ۳۰۱
لکھوجی جادو رائے۔ ۱۸۳
لنگپا۔ ۲۶۹، ۲۸۱، ۲۸۲، ۳۴۹
لنگم پلی۔ ۱۷۷
لینگ ہارن۔ ۲۰۸
لوتی (سیاح) ۹

(م)

مآثر الامراء۔ ۱۵۲، ۱۵۶، ۲۱۵،
۲۲۰، ۲۲۲، ۳۱۷، ۳۵۷
مآثر دکن۔ ۲۰، ۳۹، ۲۰۲، ۲۰۴، ۲۲۴،
۲۲۷، ۲۵۰، ۳۲۷، ۳۴۱، ۳۴۲
مآثر عالمگیری۔ ۲۳۶، ۲۳۷، ۲۵۴،
۲۵۶، ۲۵۹، ۲۷۰، ۲۸۰، ۲۸۸،
۲۸۹، ۲۹۱، ۲۹۷، ۳۰۴، ۳۰۵،
۳۱۲، ۳۱۴، ۳۵۶، ۴۱۸
مادنّا۔ ۲۰۷، ۲۰۸، ۲۱۰، ۲۳۷،
۲۴۶، ۲۵۱، ۲۵۲، ۲۵۵تا
۲۵۹، ۲۶۲، ۲۶۳، ۲۶۸تا
۲۷۳، ۲۷۸، ۲۸۲، ۲۸۳،
۲۸۶، ۲۹۳تا ۲۹۵، ۳۳۸،
۳۴۳، ۳۵۰، ۳۵۱، ۳۵۳،
۳۸۲
مادنّا بجواڑے۔ ۲۸۱
مالدیو۔ ۳۷۳
مالوہ۔ ۱۳۹
مان سنگھ۔ ۲۸۳، ۲۸۵
ماہ بانو۔ ۲۳۸

ماہ نامہ — ۲۳۸، ۲۳۹، ۲۴۵، ۳۰۹ تا ۳۱۱، ۳۲۶، ۳۵۳، ۳۶۲، ۴۰۳، ۴۰۷، ۴۰۹
مجاہد خاں — ۱۲۲
مجاہد شاہ بہمنی — ۶۷، ۳۶۱
مجدد الدین، میر — ۱۷۰
مجلہ عثمانیہ — ۲۳۷
مچھلی بندر — ۳۷۲
مچھلی پٹم — ۳۰، ۳۴، ۴۴، ۳۵۱، ۳۷۵
محب اللہ شاہ — ۱۱۹، ۳۶۳
محبوب نگر — ۴۷
محمد آباد — ۳۰، ۱۲۲
محمد ابراہیم خادم — ۳۰۲
محمد ابراہیم (دیکھو خلیل اللہ خاں)
محمد اصفہانی، حاجی — ۱۲۸، ۱۴۳
محمد امین — ۳۱۹ تا ۳۲۱
محمد امین، مرزا — ۱۰۹، ۱۷۸
محمد امین شہرستانی، مرزا — ۱۵۴، ۱۵۵
محمد بن خاتون، شیخ — ۳۴۱، ۳۴۲
محمد بن عمر — ۳۶۳
محمد تقی — ۲۸۸
محمد تقی (شریف الملک) — ۱۷۴
محمد جعفر — ۲۷۹
محمد داؤد — ۲۸۸
محمد رضا — ۱۷۲، ۱۷۳
محمد رضوی، میر — ۱۴۲
محمد ساقی — ۲۳۷، ۲۵۹، ۲۷۲، ۲۸۹، ۲۹۱، ۲۹۲، ۲۹۷، ۳۱۱ تا ۱۱۳، ۳۲۴، ۳۶۸، ۴۰۹، ۴۱۷
محمد سعید اردستانی — ۳۴۳
محمد سعید میر جملہ — ۱۹۸، ۱۹۹، ۲۰۰ تا ۲۰۳، ۲۱۰، ۲۱۴ تا ۲۲۰، ۲۲۳، ۲۲۳، ۲۲۶ تا ۲۲۸، ۲۵۴، ۲۵۵، ۲۵۸، ۲۷۸، ۳۴۹، ۳۵۲، ۳۶۶، ۳۶۸
محمد سلطان — ۲۲۰ تا ۲۲۲، ۲۲۴ تا ۲۲۶، ۲۳۶، ۳۳۲
محمد شاہ اول — ۲۹، ۳۰
محمد شاہ ثانی — ۲۴، ۲۵
محمد شاہ لشکری — ۱۲، ۱۳، ۲۵
۳۴
محمد طاہر، شیخ — ۱۹۲، ۱۹۳
محمد عادل شاہ — ۱۵۷، ۱۶۹، ۱۷۵، ۱۸۸، ۱۹۰، ۲۲۸ تا ۲۳۱
محمد عمر — ۳۱۳
محمد عمر نقشبندی — ۳۳۲
محمد قطب شاہ (ظل اللہ) — ۱۲۴، ۱۳۰، ۱۴۷، ۱۴۸، ۱۵۵، ۱۵۷ تا ۱۵۹، ۱۶۲، ۱۶۳، ۱۶۹، ۱۷۳، ۱۷۹، ۱۸۵، ۱۹۲، ۱۹۵، ۱۹۸، ۲۴۳، ۳۳۶، ۳۳۸، ۳۴۱، ۳۴۳، ۳۳۵ تا ۳۴۳، ۳۵۳، ۳۵۹، ۳۶۶، ۳۸۷، ۳۹۹، ۴۰۵، ۴۱۹
محمد قلی — ۲۰
محمد قلی بیگ — ۳۴۱
محمد قلی قطب شاہ — ۱۰۹، ۱۱۳، ۱۱۴، ۱۲۳، ۱۲۶، ۱۲۸، ۱۳۶، ۱۴۱، ۱۴۷، ۱۵۳ تا ۱۵۵، ۱۶۳، ۱۶۵، ۲۲۷، ۲۳۳، ۲۳۴، ۲۳۱، ۳۳۱ تا ۳۴۳، ۳۴۶، ۳۵۲، ۳۵۹، ۳۶۲، ۳۶۳، ۳۸۳، ۳۸۶، ۳۹۷، ۳۹۹، ۴۰۰، ۴۰۳، ۴۰۴، ۴۰۵، ۴۰۸، ۴۱۱ تا ۴۱۴، ۴۱۶، ۴۱۷، ۴۲۰، ۴۲۱
محمد معصوم — ۲۷۹
محمد نگر — ۳۹، ۱۲۹، ۳۵۱، ۳۷۴
محمود — ۳۹۷
محمود شاہ — ۱۲، ۱۳، ۲۹، ۳۲، ۳۳، ۳۹
محمود شاہ بہمنی — ۴۲، ۴۳ تا ۲ ۳۳، ۳۱۴
محمود شاہ گجراتی — ۳۱
محمود گاوان، خواجہ — ۱۲، ۱۳، ۲۵، ۳۲، ۳۳
محمود ہمدانی، میر — ۴۶، ۴۷
مدراس — ۲۰۰، ۲۰۱، ۲۰۳، ۲۰۴، ۲۰۷، ۲۰۹، ۲۱۶، ۲۵۷، ۲۵۹، ۲۶۰، ۳۴۳، ۳۹۲
مدراس پٹم — ۲۰۵
مدراس کے اوراق پارینہ (دکن) — ۱۹۹، ۲۰۱، ۲۰۳ تا ۲۰۷، ۲۰۹، ۲۱۵، ۲۵۷
مدگل — ۶۹، ۹۹
مدواڑہ — ۱۲۱، ۱۲۲
مدرا — ۱۹۷، ۲۱۰
مراد — ۱۴۳
مراد بخش — ۲۱۳
مراری راؤ — ۱۸۳

مرتضیٰ خاں - ۹۰، ۹۶، ۱۱۲
مرتضیٰ خاں سبزواری - ۱۴۰
مرتضیٰ نظام شاہ - ۱۳۱ تا
۱۳۸، ۱۴۰، ۱۴۶، ۱۸۰،
۲۸۲، ۲۸۳، ۱۸۵
مرتضیٰ نگر - ۹۰، ۱۸۷،
۳۵۱، ۳۷۵
مرزا اصفہانی طباطبا دیکھو
شاہ میر طباطبا
مرزا خدا بندہ - ۱۰۹، ۱۵۷
مرزا شریف شہرستانی - ۱۷۰
مرزا عزیز - ۱۴۰
مرزا محمد - ۲۹۵
مرزا مسعود - ۱۴۲
مرزا مشہدی، سید - ۱۳، ۳۰
مرن گنجلی - ۴۰۲
مریم خاتون - ۲۰
مسعود خاں - ۲۶۴ تا ۲۶۸
مسکی میاں - ۲۰۷
مسولی پٹم - ۱۰، ۲۰۰،
۲۰۶ تا ۲۰۹، ۲۵۹،
۳۵۰، ۳۶۲، ۳۷۰،
۳۷۲، ۳۷۳، ۳۷۶، ۴۲۵
مشک محل - ۴۲۱
مشہد - ۲۴۹
مصطفیٰ آباد - ۱۲۲
مصطفیٰ خاں - ۱۵۸،
۱۵۹
مصطفیٰ خاں اردستانی -
۶۹، ۷۳ تا ۷۵،
۷۷، ۸۲ تا ۸۵، ۸۷،
۸۸، ۹۱، ۹۲، ۹۴،
۹۶، ۱۰۱، ۱۰۲، ۱۲۲،
۳۴۲
مصطفیٰ خاں، سید محمد -
۱۸۷
مصطفیٰ خاں لاری - ۲۹۸،
۳۰۰، ۳۰۶، ۳۰۷،
۲۴۶، ۳۱۶
مصطفیٰ نگر - ۸۸،
۹۰، ۱۱۱، ۳۵۱، ۳۷۵
مظفر علی، خواجہ - ۱۷،
۱۷۲، ۳۴۵
مظہر الدین، شاہ - ۳۶۱
معز الدین - ۲۸۵
معز الدین مشرف - ۱۹۲
معظم، شہزادہ - ۲۶۱،
۲۶۲، ۲۷۷ تا ۲۸۵،
۲۸۶، ۲۸۸، ۲۸۹،
۲۹۱، ۲۹۳
معین الدین، شیخ - ۱۹
مفتاح التواریخ - ۲۳۷
مقبول خاں - ۷۸
مقرب خاں - ۱۳۳، ۱۸۲
مقصود علی، میر - ۱۵۸، ۱۵۹
مقیمی - ۳۹۶
مگنجارام - ۴۲
مکرمت الدولہ - ۱۹۱
مکند راج - ۱۱۸، ۱۲۲
مکند رائے - ۱۱۷، ۱۲۱
مکہ مسجد - ۱۶۵
ملا خیالی - ۳۹
ملا تقی - ۳۴۳
ملا تقیائی شیرازی - ۱۹۲،
۳۹۲
ملا عرب - ۳۹۲
ملا نصرتی - ۲۳۰،
۲۳۲، ۳۹۶
ملا وجہی - ۱۱۳، ۳۹۵،
۳۹۷، ۳۹۹، ۴۰۸
ملتفت خاں - ۸۰، ۲۱۳
ملک احمد بحری - ۳۱
ملک الماس - ۱۷۱
ملک برید - ۴۸، ۴۹
ملک شیرن - ۹۲، ۹۹
ملک صالح - ۲۰
ملک عنبر - ۱۴۳، ۱۴۶ تا
۱۴۸، ۱۷۹، ۱۸۰، ۲۳۲،
۳۴۰
ملک یوسف - ۱۷۱
ملکھیڑ - ۲۰۹، ۲۶۳ تا
۲۶۵، ۲۶۸، ۲۷۴،
۲۸۱، ۲۸۲، ۲۸۴،
۲۸۶، ۲۸۹، ۲۹۴
ملنگور - ۳۵۱، ۳۷۴
منتخب التواریخ - ۲۳۷
منتخب اللباب - ۱۷۲،
۲۳۸، ۲۳۹، ۲۴۱،
۲۴۶، ۲۷۱، ۲۷۲،
۲۸۶، ۲۹۵، ۲۹۶، ۳۱۷،
منور خاں حبشی - ۱۷۱،
۱۷۳، ۱۷۴
منگوارم - ۳۹
منوچی - ۲۲۳، ۲۲۶،
۲۷۱، ۲۷۳، ۲۹۱،
۲۹۲، ۳۱۲، ۳۲۳،
۳۶۶، ۳۷۰، ۳۷۶،
۴۰۹
منوہر راج - ۱۱۶
موٹ پلی - ۱۰
موسیٰ بیگ خاں - ۲۵۶

موسیٰ خاں - ۲۰۶، ۲۰۷،
۲۲۳، ۲۴۶ تا ۲۴۸،
۲۵۲، ۲۵۴، ۲۵۶
موسیٰ کاظم - ۱۵۸
موسلمورگ - ۱۱۴، ۱۱۵،
۱۵۶، ۱۹۸
مومن پیٹ - ۱۵۱
مہابت خاں - ۱۴۶، ۱۴۷،
۱۸۱، ۱۸۳، ۱۸۴، ۱۸۹،
۱۹۰، ۲۳۱، ۲۸۶، ۳۱۰
مہاراشٹرا - ۱۱
مہاکوٹھ - ۱۸۳
مہدی قلی - ۱۴۴، ۳۴۱
مہدی قلی بیگ - ۱۱۷
مہذب الدین احمد - ۳۹۴
میاں یدو - ۸۹
میاں بھائی - ۹۰
میدک - ۵۳، ۳۵۱، ۳۷۴
میر آتش - ۲۹۸، ۳۰۰
میر ابو القاسم - ۱۳۵
میر ابو طالب ناظر - ۴۱۶
میراں حسین - ۱۳۸
میر پیٹ - ۱۵۱
میر جعفر شاہ - ۱۸۵
میر جملہ (ابن الملک) ۷۷،
۱۱۱، ۱۱۴، ۱۱۸، ۱۱۹،
۱۲۱، ۱۲۲، ۱۲۴، ۱۲۵،
۱۵۲ تا ۱۵۴، ۱۹۲،
۳۴۲
میرزادہ سکندر - ۱۹
میر محمد امین شہرستانی - ۱۵۱،
۱۵۷، ۱۵۹، ۱۸۶،
۳۴۳، ۳۴۶، ۳۸۶
میر شاہ طباطبا (دیکھو شاہ میر طباطبا)
میر عالم - ۴۱۶
میر فصیح - ۲۲۵
میر قاسم (ناظر الممالک)
۱۷۳، ۳۴۴
میرک معین سبزواری - ۱۲۸،
۱۳۷، ۱۵۳، ۱۸۶،
۴۱۶
میر محمد اسفرائینی - ۱۷۴
میر منیر - ۱۴۲
میر مومن استرآبادی - ۱۵۰،
۱۵۱، ۱۵۴، ۱۵۹
۱۲۲، ۱۷۰، ۱۷۳،
۲۱۸، ۳۳۸، ۳۴۲،
۳۸۶، ۴۱۸
میر میراں - ۲۲۳
میر ہاشم - ۲۸۹
بیسور - ۲۰۰
میگس تعبیر - ۱۰

(ن)

نارائن راؤ - ۳۰۷،
۳۴۴
نارائن کھیٹر - ۵۲،
۵۳، ۵۷
نارائن ماما پنڈت - ۶۲
ناسک - ۱۸۱، ۱۸۴
ناصری خاں - ۱۸۱
ناظر محل، زمرہ - ۲۸۴
ناکاوی - ۱۰۰، ۱۳۷
ناگلونچا - ۳۷۱
نامدار خاں - ۲۰۷
ناندیڑ - ۱۸۴، ۱۹۲،
۲۲۰، ۲۲۱
نانک واڑی - ۷۰،
۸۰
نبات گھاٹ - ۴۱۶
نجیب اشرف ندوی - ۱۹۹،
۲۱۳، ۲۲۰، ۲۲۱
ندی محل - ۴۲۱
نذر محمد - ۲۱۱
نرسا پور - ۳۶۷،
۳۷۰، ۳۷۱
ترسم راج - ۱۱۵
ترن، کشتا یا کھیا تم (دک)،
۴۰۲
نزہت الجلیس (دک)، ۳۹۴
نصیر الملک - ۱۹۲
نصیری خاں - ۱۷۸
نظام الدین - ۱۷۰،
۱۷۵، ۳۸۷، ۴۲۱
نظام الدین احمد حکیم - ۱۷۶،
۴۰۹
نظام الدین احمد (دربار عبد اللہ قطب شاہ) ۲۳۵
نظام الدین صاعدی - ۱۸،
۱۵۵، ۲۳۳، ۲۴۵
نظام الملک بحری - ۱۲
نظام بخش - ۳۰۴
نظام پٹن - ۱۱۴، ۳۵۱،
۳۷۵، ۳۷۶
نظام علی خاں - ۳۲۱
نعمت خان عالی - ۱۷۰،
۲۸۹، ۲۹۵،
۲۹۶
نکنا رائے - ۷۶
نلدرگ - ۱۱۱، ۱۲۸،
۱۲۹، ۱۳۶ تا ۱۳۸،
۱۵۲، ۱۵۳، ۲۶۳
نلنگور - ۱۶۴
نندیال - ۱۱۴، ۱۱۵،

۱۵۶، ۱۹۸ وزیگاپٹم — ۱۹۸ وینس — ۱۹۶، ۱۹۷ ہندوستان — ۹، ۲۶، ۲۲ تا

نور اللہ — ۳۹۲ وشنو وردھن — ۱۰۰ وینکٹادری — ۹۷، ۹۸، ۲۴، ۱۲۷

نورالدین نعمت اللہ ثانی ۳۲۳ وفا خاں — ۱۸۷، ۱۸۸ وینکٹ پتی — ۸۹، ۱۱۴، ہنمکنڈہ — ۲۵۷، ۲۵۸

نورالہدی — ۴۱۱ وقائع گولکنڈہ — ۳۰۰، ۱۱۶، ۱۹۶، ۱۹۸ ہیوبرٹ (سیاح) ۲۳۸،

نوری — ۴۰۱ ۳۰۲، ۳۰۵، ۳۲۳ وینکٹی نائک — ۴۱ ۲۹۱

نیرو — ۲۳۳ ولیم میتھولڈ — ۳۶۶، ۳۶۸، ۳۷۳، ویلور — ۹۰، ۱۹۷، ۲۱۱ (ی)

۲۷۶، ۳۷۱، ۴۲۴

نیک نام خاں (رضا قلی) ونٹر اینڈ ورڈ — ۳۰۳، ۳۰۴ (ھ) یار قلی، جمشید قطب شاہ — ۵۸

۳۹، ۲۰۲ تا ۲۰۴، وجئی ولاسم — ۴۰۵ ہادی داد خاں — ۲۲۰ یافث بن نوح — ۱۸

۲۰۶، ۲۰۷، ۲۳۲، وجیا نگر — ۳۸ تا ۴۲، ۵۵، ہاشمی، نصیر الدین — ۳۸۵، یکجہت خاں — ۱۲۰

۲۵۲، ۳۴۹، ۳۵۲ ۵۶، ۶۶ تا ۶۸، ۷۶، ۷۷، ۳۸۶، ۳۹۲، ۴۰۱، ۴۰۳ یکوجی — ۲۱۰

(و) ۸۲، ۸۴ تا ۸۸، ۹۳ تا ہدیہ سلطانہ — ۹۶

ورنگل — ۲۳، ۴۰، ۹۸، ۱۱۴، ۱۲۰، ۱۳۱، ہری چندر — ۴۲، ۱۲۱ یلتم راج — ۸۶، ۹۷، ۹۹،

۴۲، ۴۳، ۲۶۹، ۱۳۳، ۱۳۹، ۱۹۶، ہری ہر — ۱۹۷ ۱۱۴، ۱۱۶، ۱۳۳، ۱۹۶، ۱۹۸

۲۸۱، ۲۸۷، ۳۵۱، ۱۹۸، ۳۰۲ ہمت خاں — ۲۸۳، ینکنا — ۲۶۹

۳۷۳ ہیدم وینکٹ تارا — ۳۲۸ ۲۸۵ یورپین دکھنی مخطوطات — ۳۸۵،

۳۸۶، ۴۰۱

وزیر الملک — ۱۳۷ ویس تھجیس آف ورلڈ مدراس ہمدان — ۲۰، ۲۳، یوسف — ۱۷۸

یوسف عادل خاں — ۳۱، ۳۵،

وزیر خاں — ۱۸۲ ۱۹۹، ۲۰۱، ۲۰۵ ۲۶، ۳۳۳ ۳۸۶، ۴۰۱

یوچی بیگ — ۱۹۲